کاروانِ تجلّیٔ سادات

(آگرہ و نواحِ آگرہ کے سادات کی تاریخ)

مؤلف

انتظار رضا رضوی نازؔ اکبرآبادی

ناشر

ادارہ احیاءِ تراثِ اسلامی کراچی۔ پاکستان

(آگرہ و نواحِ آگرہ کے سادات کی تاریخ)

مؤلف

انتظار رضا رضوی نازؔ اکبر آبادی

ناشر

ادارہ احیاءِ تراثِ اسلامی کراچی۔ پاکستان

کتاب کا نام	کاروان تجلی سادات
مرکزی موضوع	آگرہ و نواح آگرہ کے سادات کی جدید و مستند تاریخ
مولف کتاب	سید انتظار رضا رضوی ناز اکبر آبادی
کمپوزنگ	جعفری گرافکس فون 6364924
پبلشر	ادارہ احیائے تراث اسلامی
سال اشاعت	جون ۱۹۹۷ء / صفر ۱۴۱۸ھ
تعداد اشاعت	۱۰۰۰
کتاب ملنے کے ذرائع	احمد بک سیلرز 20/718 ایف بی ایریا انچولی سوسائٹی کراچی
ہدیہ	200 روپے

مؤلفِ کتاب

سید انتظار رضا رضوی نازؔ اکبرآبادی

انتساب

جناب سید موسیٰ مبرقع علیہ الرحمۃ کے نام جو امام علی رضا کے پوتے، امام محمد تقی الجواد کے فرزند اور امام علی نقی کے بھائی تھے۔ آپ کی ۲۴۰ ہجری میں ہجرت مدینہ سے ہم سادات کا سفر ہجرت شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ موصوف ہی کاروان تجلی سادات کے اولین قافلہ سالار تھے آپ ہی قم و مشہد، بیانہ وہیلک اور شاہ گنج آگرہ کے سادات رضوی کے مورث اعلیٰ قرار پائے ہیں۔

فہرست ابواب

کتاب اور مولف کا تعارف

زیرِ نظر کتاب کاروان تجلّی سادات ۔ ایک تاریخی تالیف ہے جس کے مرکزی موضوع کا تعلق آگرہ و نواح آگرہ کے سادات کرام سے ہے ۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت مشرقی راجپوتانہ میں ریاست ہائے بھرتپور و دھولپور اور مغربی یوپی (اتر پردیش ۔ انڈیا) کے اضلاع آگرہ و متھرا میں سادات مذکورہ کی متعدد بستیاں واقع تھیں جو مسلم کش فسادات میں تباہ و تاراج ہو گئیں ۔ یہ ہی وہ ممتاز خطہ ہے جس کو سر سید احمد خان اور محمد حسین آزاد نے برج بھاشا کا علاقہ قرار دیا تھا اسی جگہ لسانی مؤرخوں کے مطابق اردو زبان نے جنم لیا۔ تاریخی اعتبار سے یہ علاقہ حکومت و ثقافت اور علم و ادب کا عظیم مرکز رہا ہے ۔

بظاہر موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کا حلقہ مطالعہ کافی محدود ہونا چاہیئے لیکن سادات مذکورہ کے تذکرے کے علاوہ اس میں دیگر اہم موضوعات کی شمولیت نے اس کو وسعت بھی دیدی اور اس کی افادیت میں بھی اضافہ کیا ہے ۔ گویا دیگر تواریخ کے امتزاج نے اس کتاب کے حسن کو اور نکھار دیا ہے ۔ تاریخ اسلام ، تاریخ شیعیت ، تاریخ ہجرت ، تاریخ عزاداری اور تاریخ ادب اردو کے بعض اہم اجزاء کو ایک خاص ترتیب و توازن کے ساتھ پیش کر کے اس مخصوص موضوعاتی کتاب کو عام قاری کے لئے بھی خاصی دلکش اور لائق توجہ بنا دیا ہے ۔ اس لئے یہ تاریخی تالیف مرکزی موضوع کی محدودیت کے باوجود محدود نہیں رہی ۔ اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہی ٹھہرے گی کہ سادات آگرہ و نواحِ آگرہ کی مخصوص تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ قارئین کو دیگر متعلقہ تواریخ سے بھی بڑی حد تک آگاہی ہو جائے گی نیز تعلیمی اداروں میں ہماری تواریخ سے عدم واقفیت سے پیدا ہونے والے نقصان کی تلافی بھی ہو سکے گی ۔ علاوہ ازیں یہ تاریخی پیشکش

مستند حوالوں سے اس طرح مربوط اور مزین کی گئی ہے کہ اس سے پہلے اس نوعیت کی کسی دوسری کتاب میں یہ اہتمام نظر نہیں آتا۔ اس تالیف کی ایک اہم خوبی اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں خاندانی روایات کے بجائے تاریخی شواہد ہی کو مرکز تحریر قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ابواب اور عنوانات ہی سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مختصراً اس تاریخی کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی متلاشی ہر صاحب ذوق قاری کی نگاہیں رہا کرتی ہیں۔

یہ تاریخی تالیف بے شمار کتابوں کے زبردست انبار میں فقط ایک اور کتاب کا اضافہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی کتاب کا شاندار اور قیمتی اضافہ ہے جو کئی لحاظ سے منفرد بھی ہے اور دلکش و فکر انگیز بھی۔ اس کے مندرجات میں مذہب و سیاست، اخلاق و شرافت اور ادب و شاعری کے اعلیٰ نمونوں کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کا دامن ایسے موتیوں سے مالا مال ہے جن کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑے گی اور قارئین کے اذہان و افکار کو تابندگی دیتی رہے گی۔ اس لئے یہ کتاب محض کتب خانوں کی الماریوں ہی میں محفوظ نہیں رہے گی بلکہ کافی وسیع پیمانے پر پڑھی جانے والی مقبولیت پانے والی اور زندہ رہنے والی اہم کتابوں میں شامل رہے گی۔

اس کتاب کے مولف جناب انتظار رضا رضوی نازاکبر آبادی پہلودار شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ شاعر و ادیب، معلم و مفکر اور مصنف و محقق ہیں۔ آپ کئی تصانیف و تالیفات پیش کر چکے ہیں۔ ان میں قران السعدین، تجلیات فکر، ذکر جمیل، قرات درد اور طویل نظم ذکر اسلام تا بہ اکبر جام ممتاز ہیں۔ موصوف آگرہ میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ ۱۹۳۴ء میں منشی کامل کی سند لی۔ ۱۹۳۲ء ہی میں مرکزی تار گھر آگرہ میں ملازمت کرنا پڑی۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۷ء تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور ضلع آگرہ کے ممتاز مگر خفیہ کارکنوں میں شمار ہوئے۔ عام انتخابات سے ذرا قبل سید علی

ظہیر اور حسین بھائی لالجی کی مسلم لیگ مخالف مہم کو ناکام بنانے میں نوجوانان آگرہ کی قیادت کی اور مسلم لیگ کے حق میں اور قائد اعظم سے متعلق کئی نظمیں تحریر کتیں۔ ۱۹۴۵۔ ۱۹۴۶۔ میں ایک بہت بڑی سماجی بدی (کھلی جو بہت بڑا جوا گھر تھا) کے خلاف جدوجہد کی رہنمائی کی۔ عزاخانہ شاہ گنج آگرہ میں مدرسہ شبینہ قائم کیا جہاں چھٹی سے دسویں تک کے طلباء کی مفت کوچنگ کا خاص بندوبست تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں opt کرکے پاکستان تشریف لے آئے اور جولائی ۱۹۸۳ء میں قبل از وقت پینشن لے لی۔ محکمہ ٹیلیگراف میں اپنی سخت گیری اور حق گفتاری کے باوصف آپ کی ہر دل عزیزی لوگوں کے لئے باعث حیرت رہی۔

۱۹۳۸ء سے شعر گوئی کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ نے ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے اور بہت کچھ کہا ہے مگر زیادہ تر سرمایہ کلام محفوظ نہ رہ سکا آپ کے کلام میں پختگی، بے ساختگی، اور تفکر کی خوبیاں نمایاں ہیں۔ آپ کی شاعری میں فکر اور جذبہ پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ طبیعت میں بے نیازی، خودداری، انسان دوستی، منافقت اور ظلم سے نفرت، حق گوئی اور حق شعاری سے گہری وابستگی رچی بسی ہوئی ہیں۔ زندگی بھر دیانتداری اور اصول پرستی جیسی اقدار پر عمل پیرا رہے اور کسی حال میں بھی بدعنوانی اور بد کرداری کا ہلکا سا دھبہ بھی اپنے دامن پر نہ آنے دیا۔ معاشرے میں ایسے کردار کے لوگ بالخصوص شاعروں میں خال خال ہی نظر آسکیں گے۔ بصارت چشم کی شدید خرابی کے باوجود مطالعہ اور تصنیف و تالیف ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کتاب ہذا آپ کا عظیم کارنامہ قرار پائے گی۔

سرزمین آگرہ و نواح صدیوں سے مردم خیز رہی ہے اور درجنوں نابغہ روزگار حضرات پیدا کئے ہیں۔ اردو شاعری کی تشکیل اور تعمیر میں شعرائے اکبر آباد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کے اسمائے گرامی آج بھی ادب اردو کی آبرو ہیں۔ ناز اکبر آبادی اسی دبستان اکبر آباد سے تعلق رکھتے ہیں جس سے میر، نظیر، غالب، منیر شکوہ آبادی، نسیم بھرتپوری، بزم آفندی، نجم آفندی، میکش اکبر آبادی، سیماب اکبر

آبادی، صبا اکبرآبادی اور علی سردار جعفری جیسے عظیم شاعر اور اساتذہ فن وابستہ تھے۔ آپ کے کلام میں اکبر آباد کے مخصوص لب و لہجہ اور اسلوب کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ موجودہ شعرائے اکبر آباد میں آپ ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ آپ کی شعری اور نثری تخلیقات میں اتنی تاب و توانائی موجود ہے جو مستقبل بعید میں بھی آپ کی معنوی زندگی کی ضمانت دے سکے۔ آپ کی ایک غزل کے چند اشعار پر اس تعارف کو ختم کرتا ہوں جس کا آخری شعر آپ کے کردار کے بارے میں میرے موقف کی تائید کرتا ہے۔

جو بار درد اٹھائے ہیں غم رسیدہ بھی
خمیدہ سر تو نہیں ہیں کمر خمیدہ بھی

چمن کا رنگ نکھارا ہے صورت شبنم
میں اس فروغ بہاراں میں آب دیدہ بھی

بقدر فکر کھلیں گے نئے نئے معنی
حیات شوق ابھی حرف خط کشیدہ بھی

در آگہی ہے اندھیرے میں روشنی کی کرن
طلوع صبح تو ہے لاکھ شب گزیدہ بھی

نہ کوئی داغ نہ دھبہ نہ گرد رسوائی
مرا لباس پرانا بھی دریدہ بھی

مدبر رضوی
اسکرپٹ ایڈیٹر
کراچی ٹیلی ویژن

بعض اہم نگارشات کے اقتباس

سادات کی اصطلاح

کعبتہ اللہ کی دیواریں بلند کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی مشترکہ ذریت کے بارے میں خصوصی دعا کی تھی جس کی قبولیت کے بطور اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل سے فرمایا کہ "میں نے اسمٰعیل کی بابت تیری بات سنی ۔ میں اس کو برکت اور کشادگی عطا کروں گا۔ اس سے بارہ سردار (سید) ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔" نسل اسمٰعیلؑ کے خاص افراد کے لئے سید (سردار یا حاکم) کی اصطلاح استعمال ہوئی جو آج تک آلِؑ رسولؐ کے لئے لفظ سادات سے مختص ہے

آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ

" ہر نبیؐ کی ذریت کو اللہ نے اس کے صلب میں رکھا مگر میری ذریت کو علیؑ کے صلب میں نیز یہ کہ تمام لڑکیوں کی اولاد اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے سوائے فاطمہ کے کہ ان کا باپ میں ہوں ۔ " بارہ سرداروں سے واضح اشارہ آئمہ اہلبیتؑ ہی کی طرف نظر آتا ہے کہ ان آئمہ اثنا عشر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

(توریت سفر تکوین باب ۱۷ ، صواعق محرقہ علامہ حجر مکی ، تاریخ اسلام جلد اول علامہ سید علی نقی ، سر الجلیل شاہ عبدالعزیز دہلوی)

رضوی سادات کا اختصاص

حضرت امام علی رضا کی اولاد اور ذریت کو رضوی سید قرار دیا گیا ہے۔ نامور اور ممتاز علماء کی معتبر نگارشات کے مطابق امام رضا کے بعد تمام آئمہ کو ابن الرسولؐ کے بجائے ابن الرضا ہی کہا گیا نیز امام محمد تقی الجواد، امام علی نقی اور امام حسن عسکری کی اولاد و اخلاف کو امام رضا ہی سے نسبت دی گئی ہے اور رضوی سادات مانا گیا ہے۔ ان میں جناب ابو جعفر سید موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی الجواد کی ذریت بھی شامل ہے۔ خود امام محمد تقی الجواد نے ہدایت کی تھی کہ حضرت امام رضا کے بعد تمام سادات خود کو امام رضا ہی سے منسوب کریں۔ ثقہ ترین علماء کی تحریروں کی رو سے تمام علمائے اعلام اور آئمہ انساب اس امر پر متفق ہیں کہ اولاد و ذریت امام محمد تقی الجواد مع اولاد امام علی نقی و امام حسن عسکری علیہم السلام سب رضوی ہیں نیز یہ کہ امام رضا کے بعد کے آئمہ سے جو سادات ہیں وہ سب رضوی ہی نامزد ہوئے ہیں۔ اس لئے نقوی، تقوی یا تقوی الرضوی کی تفریق کا کوئی حقیقی جواز نہیں ہے۔

(مجالس المومنین علامہ قاضی نوراللہ شوستری، علام الوری، بدر مشعشع، علامہ مجلسی، علامہ طبرسی)

سادات آگرہ و نواح کے اعزازات

(۱) وہ اعلانیہ شیعہ رہے اور کبھی تقیہ اختیار نہ کیا۔ (۲) انہوں نے کبھی کسی مقتدر کے آگے سر نہ جھکایا۔ بیانہ و ہیلک سے متعلق ۱۷۰۵ء اور ۱۷۷۲ء کے واقعات اس کے گواہ ہیں (۳) وہ برصغیر میں اولین عزادار قرار پائے۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں سلطان غوری کی فتح کے بعد ان کے بزرگان سلف نے بیانہ و اجمیر میں تعزیہ داری کی اساس رکھی تھی۔ (۴) قدیم ہند میں مسلم اقتدار کے قیام و استحکام میں ان کے بزرگوں کا نہایت اہم کردار تھا وہ غزنی اور غور کی افواج کے سرداروں اور عمائدین میں ممتاز تھے نیز مفتوحہ علاقوں کے حاکم بھی رہے۔ (۵) سلاطین دہلی بالخصوص خلجی کے عہد میں سادات بیانہ کے قاضی برادران چیف جسٹس تھے بعد کے ادوار میں بھی وہ اعلیٰ ریاستی عہدوں پر فائز رہے۔ (۶) جنگ آزادی ۱۸۵۷ بالخصوص جنگ شاہگنج آگرہ میں انہوں نے قائدانہ رول ادا کیا۔ (۷) علی گڑھ تحریک سے لیکر تحریک پاکستان تک تمام قومی اور ملی تحاریک میں انہوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ (۸) اردو شاعری کی تعمیر میں شعرائے اکبرآباد کا زبردست حصہ ہے گذشتہ پانچ صدیوں میں جتنے بڑے شاعر گذرے ان کی اکثریت دبستان آگرہ نواح ہی سے وابستہ تھی (۹) تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں قیام و فروغ عزاداری، مراکز عزا کی تاسیس و انصرام، جلوس ہائے عزا کے بنیادی اہتمام اور جدید اردو مرثیہ نگاری کے آغاز میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ (۱۰) پاکستان میں تحریک جعفریہ کے رہنماؤں میں سادات شاہگنج آگرہ کے سید محمود الحسن رضوی مرحوم ممتاز تھے۔ آپ نے شریعت بل اور ناموس صحابہ بل کی مخالفت میں نہایت اہم اور قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ (۱۱) کراچی میں پہلی مہاجر بستی (گولیمار) ۱۹۴۷ء کے اواخر میں وجود میں آگئی تھی۔ یہاں آگرہ و نواح کے سادات و مومنین بڑی تعداد میں آباد ہوئے اور پہلا مرکز عزا قائم ہوا جو امام باڑہ جعفریہ مشہور ہے۔ ۱۹۴۸ء میں یہاں سے کراچی کا پہلا جلوس عزا نکالا گیا اس کے بعد کراچی شہر کا اولین مرکزی جلوس عزا اسی بستی کی انجمن پنجتنی آگرہ کی قیادت میں برآمد ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں یہاں جدید اردو مرثیہ گوئی کی بنیاد رکھنے والوں میں مرزا غضنفر حسین عروج بھرتپوری سرفہرست تھے۔ جدید نوحہ خوانی جس کو صرا کا نام دیا گیا ہے اسی بستی کے ڈاکٹر سید علی اوسط رضوی مرحوم کی ایجاد کردہ ہے۔ کراچی کی ثقافتی زندگی پر اس بستی کی چھاپ بڑی گہری ہے۔

رضوی سادات کا اختصاص

حضرت امام علی رضا کی اولاد اور ذریت کو رضوی سید قرار دیا گیا ہے۔ نامور اور ممتاز علماء کی معتبر نگارشات کے مطابق امام رضا کے بعد تمام آئمہ کو ابن الرسولؐ کے بجائے ابن الرضا ہی کہا گیا نیز امام محمد تقی الجواد، امام علی نقی اور امام حسن عسکری کی اولاد و اخلاف کو امام رضا ہی سے نسبت دی گئی ہے اور رضوی سادات مانا گیا ہے۔ ان میں جناب ابوجعفر سید موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی الجواد کی ذریت بھی شامل ہے۔ خود امام محمد تقی الجواد نے ہدایت کی تھی کہ حضرت امام رضا کے بعد تمام سادات خود کو امام رضا ہی سے منسوب کریں۔ ثقہ ترین علماء کی تحریروں کی رو سے تمام علمائے اعلام اور آئمہ انساب اس امر پر متفق ہیں کہ اولاد و ذریت امام محمد تقی الجواد مع اولاد امام علی نقی و امام حسن عسکری علیہم السلام سب رضوی ہیں نیز یہ کہ امام رضا کے بعد کے آئمہ سے جو سادات ہیں وہ سب رضوی ہی نامزد ہوئے ہیں۔ اس لئے نقوی، تقوی یا تقوی الرضوی کی تفریق کا کوئی حقیقی جواز نہیں ہے۔

(مجالس المومنین علامہ قاضی نوراللہ شوستری، علام الوری، بدر مشعشع، علامہ مجلسی، علامہ طبرسی)

سادات آگرہ و نواح کے اعزازات

(۱) وہ اعلانیہ شیعہ رہے اور کبھی تقیہ اختیار نہ کیا۔ (۲) انہوں نے کبھی کسی مقتدر کے آگے سر نہ جھکایا۔ بیانہ و بیلک سے متعلق ۱۷۰۵ء اور ۱۷۷۲ء کے واقعات اس کے گواہ ہیں (۳) وہ برصغیر میں اولین عزادار قرار پائے۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں سلطان غوری کی فتح کے بعد ان کے بزرگان سلف نے بیانہ و اجمیر میں تعزیہ داری کی اساس رکھی تھی۔ (۴) قدیم ہند میں مسلم اقتدار کے قیام و استحکام میں ان کے بزرگوں کا نہایت اہم کردار تھا وہ غزنی اور غور کی افواج کے سرداروں اور عمائدین میں ممتاز تھے نیز مفتوحہ علاقوں کے حاکم بھی رہے۔ (۵) سلاطین دہلی بالخصوص خلجی کے عہد میں سادات بیانہ کے قاضی برادران چیف جسٹس تھے بعد کے ادوار میں بھی وہ اعلیٰ ریاستی عہدوں پر فائز رہے۔ (۶) جنگ آزادی ۱۸۵۷ بالخصوص جنگ شاہگنج آگرہ میں انہوں نے قائدانہ رول ادا کیا۔ (۷) علی گڑھ تحریک سے لیکر تحریک پاکستان تک تمام قومی اور ملی تحاریک میں انہوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ (۸) اردو شاعری کی تعمیر میں شعرائے اکبر آباد کا زبردست حصہ ہے گذشتہ پانچ صدیوں میں جتنے بڑے شاعر گذرے ان کی اکثریت دبستان آگرہ نواح ہی سے وابستہ تھی (۹) تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں قیام و فروغ عزاداری، مراکز عزا کی تاسیس و انصرام، جلوس ہائے عزا کے بنیادی اہتمام اور جدید اردو مرثیہ نگاری کے آغاز میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ (۱۰) پاکستان میں تحریک جعفریہ کے رہنماؤں میں سادات شاہگنج آگرہ کے سید محمود الحسن رضوی مرحوم ممتاز تھے۔ آپ نے شریعت بل اور ناموس صحابہ بل کی مخالفت میں نہایت اہم اور قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ (۱۱) کراچی میں پہلی مہاجر بستی (گولیمار) ۱۹۴۷ء کے اواخر ہی میں وجود میں آگئی تھی۔ یہاں آگرہ و نواح کے سادات و مومنین بڑی تعداد میں آباد ہوئے اور پہلا مرکز عزا قائم ہوا جو امام بارہ جعفریہ مشہور ہے۔ ۱۹۴۸ء میں یہاں سے کراچی کا پہلا جلوس عزا نکالا گیا اس کے بعد کراچی شہر کا اولین مرکزی جلوس عزا اسی بستی کی انجمن پنجتنی آگرہ کی قیادت میں برآمد ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں یہاں جدید اردو مرثیہ گوئی کی بنیاد رکھنے والوں میں مرزا غضنفر حسین عروج بھرتپوری سرفہرست تھے۔ جدید نوحہ خوانی جس کو صرا کا نام دیا گیا ہے اسی بستی کے ڈاکٹر سید علی اوسط رضوی مرحوم کی ایجاد کردہ ہے۔ کراچی کی ثقافتی زندگی پر اس بستی کی چھاپ بڑی گہری ہے۔

چند وضاحتیں

۱) یہ کتاب تاریخی نوعیت کی ہے اور تاریخ حقائق بیان کرتی ہے خواہ کتنے ہی تلخ اور تکلیف دہ کیوں نہ ہوں۔

۲) یہ کتاب بڑی حد تک امامیہ افکار کی ترجمان ہے لہذا اس کتاب میں ایسے واقعات کا ذکر بھی ملے گا جو بعض حضرات کے مخصوص عقائد سے مطابقت نہ رکھتے ہوں گے۔ ہم نے ان کو مستند تاریخی حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا ہے اور بڑی حد تک محض واقعات کے بیان ہی پر اکتفا کی ہے۔ اس لئے اگر کسی کو مندرجات سے تکلیف پہنچی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔

۳) یہ کتاب سادات آگرہ و نواح کی تاریخ ہے اور بنیادی طور پر ان ہی کے لئے لکھی گئی ہے۔ یاد رہے کہ سادات کا اختصاص مشترکہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں شہرہ آفاق ہے۔ اس ضمن میں جو حضرات خود کو سادات کرام میں شامل سمجھتے اور سید ہونے کے مدعی ہیں ہم نے بھی ان کو سید ہی لکھا ہے۔ ہماری تحریر کسی کی سیادت کے حق میں سند نہیں ہوگی۔

کاروان تجلی سادات کا منظوم خلاصہ

(از مولف کتاب - ناز اکبر آبادی)

ہوئی گہری جو عہد ظلم کی شب
جیسے سو سال کی بھیانک رات
بربریت کا دور دورہ تھا
خونچکاں تھی ہر ایک قدر حیات
حق پرستوں کی زندگی تھی عذاب
اہل ایماں تھے مورد آفات
قتل سادات کی گھٹا چھائی
خون سادات کی ہوئی برسات
اس زمانے میں ہجرتیں وہ ہوئیں
جن سے تاریخ کے ہیں پر صفحات
دو سو چالیس تھا سنِ ہجری
نکلا یثرب سے ایک خیل ثقات
اس کے سالار کارواں ٹھہرے
موسیٰ مبرقع ستودہ صفات
رہا کوفے میں چند سال مقیم
کی تھی کاشان میں بسر اوقات
قم و مشہد، بیانہ و بہیلک
ان منازل سے اس کا ربط حیات
شاہ گنج آگرہ میں دو سو برس
اس کا عہد بلندیٔ درجات

چند وضاحتیں

۱) یہ کتاب تاریخی نوعیت کی ہے اور تاریخ حقائق بیان کرتی ہے خواہ کتنے ہی تلخ اور تکلیف دہ کیوں نہ ہوں۔

۲) یہ کتاب بڑی حد تک امامیہ افکار کی ترجمان ہے لہذا اس کتاب میں ایسے واقعات کا ذکر بھی ملے گا جو بعض حضرات کے مخصوص عقائد سے مطابقت نہ رکھتے ہوں گے۔ ہم نے ان کو مستند تاریخی حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا ہے اور بڑی حد تک محض واقعات کے بیان ہی پر اکتفا کی ہے۔ اس لئے اگر کسی کو مندرجات سے تکلیف پہنچی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔

۳) یہ کتاب سادات آگرہ و نواح کی تاریخ ہے اور بنیادی طور پر ان ہی کے لئے لکھی گئی ہے۔ یاد رہے کہ سادات کا اختصاص مشترکہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں شہرہ آفاق ہے۔ اس ضمن میں جو حضرات خود کو سادات کرام میں شامل سمجھتے اور سید ہونے کے مدعی ہیں ہم نے بھی ان کو سید ہی لکھا ہے۔ ہماری تحریر کسی کی سیادت کے حق میں سند نہیں ہوگی۔

کاروان تجلی سادات کا منظوم خلاصہ

(از مولف کتاب - ناز اکبرآبادی)

ہوئی گہری جو عہد ظلم کی شب
جیسے سو سال کی بھیانک رات
بربریت کا دور دورہ تھا
خونچکاں تھی ہر ایک قدر حیات
حق پرستوں کی زندگی تھی عذاب
اہل ایماں تھے مورد آفات
قتل سادات کی گھٹا چھائی
خون سادات کی ہوئی برسات
اس زمانے میں ہجرتیں وہ ہوئیں
جن سے تاریخ کے ہیں پُر صفحات
دو سو چالیس تھا سن ہجری
نکلا یثرب سے ایک خیل ثقات
اس کے سالار کارواں ٹھہرے
موسیٰ مبرقع ستودہ صفات
رہا کوفے میں چند سال مقیم
کی تھی کاشان میں بسر اوقات
قم و مشہد ، بیانہ و ہیلک
ان منازل سے اس کا ربط حیات
شاہ گنج آگرہ میں دو سو برس
اس کا عہد بلندئی درجات

چند وضاحتیں

۱) یہ کتاب تاریخی نوعیت کی ہے اور تاریخ حقائق بیان کرتی ہے خواہ کتنے ہی تلخ اور تکلیف دہ کیوں نہ ہوں۔

۲) یہ کتاب بڑی حد تک امامیہ افکار کی ترجمان ہے لہذا اس کتاب میں ایسے واقعات کا ذکر بھی ملے گا جو بعض حضرات کے مخصوص عقائد سے مطابقت نہ رکھتے ہوں گے۔ ہم نے ان کو مستند تاریخی حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا ہے اور بڑی حد تک محض واقعات کے بیان ہی پر اکتفا کی ہے۔ اس لئے اگر کسی کو مندرجات سے تکلیف پہنچی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔

۳) یہ کتاب سادات آگرہ و نواح کی تاریخ ہے اور بنیادی طور پر ان ہی کے لئے لکھی گئی ہے۔ یاد رہے کہ سادات کا اختصاص مشترکہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں شہرہ آفاق ہے۔ اس ضمن میں جو حضرات خود کو سادات کرام میں شامل سمجھتے اور سید ہونے کے مدعی ہیں ہم نے بھی ان کو سید ہی لکھا ہے۔ ہماری تحریر کسی کی سیادت کے حق میں سند نہیں ہوگی۔

کاروان تجلی سادات کا منظوم خلاصہ

(از مولف کتاب - ناز اکبر آبادی)

ہوئی گہری جو عہد ظلم کی شب
جیسے سو سال کی بھیانک رات
بربریت کا دور دورہ تھا
خونچکاں تھی ہر ایک قدر حیات
حق پرستوں کی زندگی تھی عذاب
اہل ایماں تھے مورد آفات
قتل سادات کی گھٹا چھائی
خون سادات کی ہوئی برسات
اس زمانے میں ہجرتیں وہ ہوئیں
جن سے تاریخ کے ہیں پر صفحات
دو سو چالیس تھا سن ہجری
نکلا یثرب سے ایک خیل ثقات
اس کے سالار کارواں ٹھہرے
موسیٰ مبرقع ستودہ صفات
رہا کوفے میں چند سال مقیم
کی تھی کاشان میں بسر اوقات
قم و مشہد ، بیانہ و بیلک
ان منازل سے اس کا ربط حیات
شاہ گنج آگرہ میں دو سو برس
اس کا عہد بلندئ درجات

تھی یہ نام آوروں کی آبادی
یہاں رہتے تھے مقتدر حضرات
سارے برصغیر ہند میں تھا
سب سے ممتاز مرکز سادات
سب محاذوں پہ پیش پیش رہا
پرورش کیں تمام تحریکات
کانگرس کی نظر میں کانٹا تھا
لیگ کے واسطے سکون حیات
جن سے اس کے قدم بھی کانٹ اٹھے
تھے وہ تقسیم ہند کے حالات
ہونے والی تھی صبح نو طلوع
ابھی باقی تھی کچھ اندھیری رات
خوں میں لت پت عروس آزادی
کیا عجب شان کی چڑھی بارات
آدمیت تھی چور زخموں سے
رقص ابلیس کا سماں دن رات
ہوا غلطاں لہو میں راجستھان
نذر آتش مراکز سادات
گلشن شاہ گنج بھی اجڑا
لٹتے گھیرے پڑے مضر اثرات
برہنائے قیام پاکستاں
پھر سفر کی ملی عجب سوغات
کارواں کے اکھڑ گئے خیمے
ہر طرف منتشر شکستہ قنات
لٹ گئی شاہ گنج کی رونق
گویا بیوہ ہوئی نگار حیات

جن سے بستی کا نام روشن تھا
سب بھلا آگئے پیچھے خدمات
لالہ زاروں میں ڈھل گئے جنگل
سندھ میں اسقدر ہوئی برسات
اپنی قسمت کے بن گئے مالک
پائی ہندو کی بندگی سے نجات
تنگ ظرفوں کو اقتدار ملا
محسنوں کے بھلائے احسانات
اس چمن کا وجد جن کے سبب
وہی محروم لذت ثمرات
اس کی تشکیل سے جنہیں کد تھی
ہیں ریاست کے قاضی الحاجات
سب وسائل ہپ قبضہ کر بیٹھے
کچھ مراعات یافتہ طبقات
پی رہے ہیں مہاجروں کا لہو
جی رہے ہیں یہ محسنوں کی حیات
اپنے ہی گھر میں ہم ہیں بیگانے
اپنی ہی ملکیت میں بے اوقات
اب بھی رستا ہے زخم مجبوری
درد غربت کی ہے کسک دن رات
اہل حق کو کہیں اماں نہ ملی
نامساعد رہے سدا حالات
سر سے گزری ہیں خون کی موجیں
ہوگیا لالہ رنگ آب فرات
سندھ و گنگ و جمن کے ساحل پہ
کتنے ڈوبے سفینہ ہائے نجات

طے کیا ہے بڑے مراحل کو

اللہ اللہ اس کا عزم و ثبات

بار صدیوں میں ابھرتیں تو کہیں

منفرد اس کی جدوجہد حیات

آں جلالت سے آج تک ہے عکس روشن

کاروان تجلی سادات

مقدمہ

(آغازِ نگارش)

از

مولف کتاب

"آغازِ نگارش" کے بعض موضوعات

۱۔ سرنامۂ کلام...... حضرت علی کا قول محکم
۲۔ تقریر و تحریر کی انسانی صلاحیت
۳۔ علم و دانش کی فضیلت
۴۔ تحریری کارناموں کی آفاقیت
۵۔ کتاب ہذا کی ضرورت تالیف
۶۔ اس تاریخی تالیف کا انفرادی مقام
۷۔ تالیف میں غیر معمولی دشواریاں
۸۔ کتاب ہذا کی وجہ تسمیہ
۹۔ کتاب کے ابواب و عنوانات کا خلاصہ
۱۰۔ معتبر شجرہ نگاری کا مسئلہ
۱۱۔ رضوی سادات شاہ گنج آگرہ کا نسب نامہ
۱۲۔ کتاب کی پیشکش میں تاخیر کے اسباب
۱۳۔ معاونین و مددگاران خصوصی
۱۴۔ اظہار تاسف و تشکر
۱۵۔ سادات مذکورہ کے شاندار مستقبل کے واضح آثار

۳

"کاروان تجلّی سادات"

آغاز نگارش

"بولو تاکہ تمہاری شناخت ہو اور لکھو تاکہ تم زندہ رہو" ۔ یہ باب مدینتہ العلم کا قول محکم ہے۔ اس چھوٹے سے جملے میں حضرت علیؑ نے غور و فکر کے لئے ایک جہان معانی کو سمو دیا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ تقریر و تحریر کی صلاحیت انسان کی دیگر تمام صلاحیتوں میں نہایت اہم اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہ علم کے اظہار کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ البتہ تقریر کا اثر دیرپا نہیں ہوتا جب کہ تحریر کی اثر آفرینی کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے جو وقت گزراں کے ساتھ معدوم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ مشاہدہ گواہی دیتا ہے کہ تحریری کارنامے زمان و مکان کی سرحدوں کو عبور کر کے آفاقیت کی لامحدود فضا میں پرواز کرتے نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ عالم بشری میں درجنوں عظیم مقرر اور خطیب گزرے ہیں جن کے فن تقریر کا لوہا مانا گیا ہے لیکن ان کی تقاریر اور خطبات کے اثرات محدود اور وقتی ہی رہے اور ان میں سے چند کو بھی وہ دائمی مقام حاصل نہ ہو سکا جو اکثر مصنفوں اور مورخوں کو نصیب ہوا۔ موجودہ صدی عیسوی ہی کو لیجئے جو اختتام کے قریب ہے۔ اس میں متعدد نامور خطیب اور مقرر ہوئے۔ ان میں مولانا سید سبط حسن، مولانا سید کلب حسین، مولانا سید محمد دہلوی، حکیم سید مرتضیٰ حسین الہ آبادی، مولانا سید اظہر حسین زیدی، حافظ کفایت حسین اور علامہ رشید ترابی جیسے حضرات کو ابھی لوگ بھولے نہ ہوں گے کہ ان کی یاد گویا گزشتہ کل کی بات ہے۔ تاہم ان کی گل فشانی کی بہار بے خزاں نہ رہی اور ان کی

شعلہ بیانی شعلۂ مستعجل ہی ثابت ہوئی ۔ ان کی یادوں کے نقوش بیتے ہوئے لمحوں کی طرح مسلسل دھندلا رہے ہیں اور آئندہ وقت کے تیز بہاؤ میں لہروں کی مثال گم ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اگلی صدی عیسوی میں تلاش بسیار کے بعد ہی شاید کسی کو ان کے نشانات وجود نظر آسکیں۔ لیکن بہت سے مولفوں ، مصنفوں اور مورخوں کی تحریری کاوشیں آج بھی زندہ ہیں اور مستقبل بعید میں بھی زندہ رہیں گی کیونکہ ان میں ان کے خالق اب تک سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ علامہ سید رضی نہج البلاغہ کے علامہ مجلسی بحارالانوار کے ، علامہ یعقوب کلینی اصول کافی کے ، شہید ثالث مجالس المومنین کے ، علامہ فیضی ساطع الالہام (عربی میں بے نقط تفسیر قرآن کے ، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی شہید اعظم کے ، آغا سلطان مرزا البلاغ المبین کے ، علامہ سید علی نقی شہید انسانیت کے ، سادات آگرہ و نواح آگرہ کے چودھری نظیر الحسن رضوی ، فوق المیزان کے ، سادات شاہ گنج آگرہ کے مولانا سید محمد رضوی اکبر آبادی تنزیہہ القرآن (ردعیسائیت) کے مرتب و مولف اور مصنف تھے۔ یہ عظیم تصانیف اور تالیفات خود بھی زندہ ہیں اور اپنے خالقوں کی معنوی زندگی کی ضامن بھی ہیں کہ ان کتابوں سے لاکھوں انسانوں کی دینی ، فکری اور علمی رہنمائی کا اہم کام انجام پاتا رہا ہے۔

یہ کلیہ افراد تک محدود نہیں بلکہ اس کا اطلاق اقوام عالم پر بھی ہوتا ہے۔ اس کارگاہ جہاں میں وہی قومیں کامیاب و کامران رہی ہیں جنہوں نے علم و دانش کے چراغ جلا کر انسانیت کو جہل و ضلالت کے اندھیروں سے نجات دلائی ۔ نوع انسانی کی فلاح اسلام کا طرہ امتیاز ہے اور حصول علم پر جس قدر زور اسلام کے ہادیوں نے دیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ داعیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیؐ شہر علم و حکمت تھے اور حضرت علیؑ مرتضیٰ اس کا دروازہ ۔ یہ عظیم ورثہ آئمہ اہلبیتؑ کے توسط سے ہم تک پہنچا جو علوم سائنس

کے اولین محقق و موجد قرار پائے اگرچہ ہم نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ آئمہ کبار کے سینکڑوں شاگردوں نے آلِ محمدؐ کے علوم کی نشرواشاعت میں کلیدی رول ادا کیا اور اقوام عالم کو مالا مال کر دیا۔ یہ ہی سبب تھا کہ جب جزیرہ نمائے عرب میں انسانی تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلی رہی تھی تو مغربی دنیا (ہسپانیہ، فرانس، جرمنی اور انگلستان) جہل اور بربیت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مگر ہم مسلمانوں کی بد قسمتی تھی کہ وفات پیغمبر کے بعد ہم نے سیاسی مصلحتوں کے تحت علم کے بجائے تلوار کا سہارا لیا اور اپنے دین ومذہب کی اشاعت پر طاقت کا الزام رکھوالیا۔ حالانکہ اس تاریخی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عہد رسالت میں غلبہ اسلام مادی طاقت کا رہین منت نہ تھا۔ طلوع اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں مسلط کردہ لڑائیاں قطعی دفاعی نوعیت کی تھیں، جن میں حفاظت خود اختیاری کیے لئے تلواریں نیاموں سے باہر آئی تھیں۔ دین کے ابلاغ اور حق کے فروغ میں محمدؐ و آلِ محمدؐ، سادات عظام، اصحاب کبار اور صوفیائے کرام کی ذاتی کوششوں اور سیرت و کردار کے پسندیدہ پہلوؤں کا زبردست عمل دخل تھا۔ اور یہ بھی تاریخی صداقت ہے کہ جہاں بھی اشاعت اسلام میں تلوار کی طاقت کا عنصر غالب رہا وہاں اسلامی اثرات عارضی ہی ثابت ہوئے ہسپانیہ اور سندھ قدیم کی مثالیں اس استدلال پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں۔ ہسپانیہ فوجی مہم جوئی کے نتیجے میں "مسلمان" ہوا تھا اور آٹھ سو سال کی طویل حکمرانی کے باوجود اب وہاں مسلم آثار ہی معدوم ہو چکے ہیں جب کہ سندھ قدیم میں سادات، صحابہ اور صوفیوں کی محنت اور حسن اخلاق سے اسلام پھیلا تھا۔ ۹۳ ہجری مطابق ۷۱۱ عیسوی میں محمد بن قاسم کے حملہ سندھ سے کافی قبل یہاں اسلام کے آفاقی اصولوں اور آلِ محمدؐ کی پاکیزہ سیرت کا چرچا ہو چکا تھا اور یہاں کے ہندو جاٹ حضرت علیؑ کے عہد خلافت (۳۵ - ۴۰ ھ) میں مکران اور نواح

بلکہ قلات و خضدار تک آکر اسکونت اختیار کرنے والے پانچ صحابہ و تابعین کی سیرت سے متاثر ہوچکے تھے جو اہلبیت کے شیعہ تھے۔ اسی لئے جناب حارث بن مرہ العبدی کو غیر ضروری مادی طاقت کے استعمال کی ضرورت ہی نہ رہی تھی کہ فضائے سندھ قبول اسلام کے لئے سازگار ہوچکی تھی ۔ دیکھ لیجئے کہ سندھ میں اسلام آج تک زندہ و توانا ہے۔ لہذا تاریخ کا یہ فیصلہ قطعی درست ہے کہ اگر ملت مسلمہ تلوار کے بجائے علم کے پرچم اور حکمت و دانش کے چراغ اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اطراف عالم میں پھیل گئی ہوتی تو آج اقوام عالم میں ہماری حیثیت کچھ اور ہوتی اور ہم مغرب کی علمی محکومی کی ذلت سے دوچار نہ ہوتے۔

تالیف کی ضرورت

اسلام کے اولین مفکر اور تمام دانشوروں کے مرشد اعظم حضرت علیؑ مرتضیٰ کا متذکرہ بالا قول ۔ لکھو تاکہ تم زندہ رہو ۔ نے راقم الحروف کی فکر کو مہمیز دی اور کتاب ہذا کی تدوین و تالیف کی طرف رہنمائی کی تاکہ مشرقی راجپوتانہ اور آگرہ و متھرا کے سادات کی طویل داستان حیات کو ضبط تحریر میں لا کر اپنی مستقبل کی قومی زندگی کو یقینی بنایا جاسکے۔ یہ کام یوں بھی ضروری ہوگیا تھا کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں قتل و غارت گری کے باعث سادات مذکورہ کی بستیاں اجڑ گئی تھیں اور سادات متعلقہ بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت پر مجبور ہوگئے تھے۔ پاکستان میں کسی منصوبہ بندی کے بغیر وہ مختلف علاقوں اور شہروں میں بس گئے اس طرح عملاً بکھر کے رہ گئے ہیں۔ قطعی طور پر بدلے ہوئے حالات اور نامانوس ماحول میں اپنی مخصوص شناخت کی ضرورت کا شدت سے احساس کیا جاتا رہا۔ گزشتہ ربع صدی میں برادریوں اور مختلف گروہ افراد میں اپنی نسبتی بنیاد (Roots) کی تلاش کا رجحان زیادہ بڑھا ہے بالخصوص ان لوگوں کو بہت زیادہ فکر لاحق ہے جو ہندو پاکستان سے

مستقبل کی تعمیر کے لے عزم و حوصلہ اور ترغیب کا کام دے سکے۔ یہ اہتمام اس وجہ سے بھی لازمی ہوگیا کہ تعلیمی اداروں میں ہماری تواریخ کی تدریس سے مسلسل اغماض برتا جاتا ہے۔ اسلئے اس کتاب کے مذکورہ ابواب کے باعث ہمارے طلبا ہماری تواریخ سے کما حقہ، واقف بھی ہوجائیں گے اور ان کے ممکنہ ذہنی خلفشار کا سدباب بھی ممکن ہوجائے گا۔ لہذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کتاب سے قبل اس نوعیت کی کوئی تاریخی کتاب منظرعام پر نہیں آئی ہے۔

تالیف میں مشکلات

سادات مذکورہ کی داستان حیات کا تعلق سابق مشرقی راجپوتانہ میں ریاست ہائے بھرتپور و دھولپور اور مغربی یوپی (اتر پردیش) میں اضلاع آگرہ و متھرا سے تھا۔ جس کو ہم آگرہ و نواح آگرہ سے معنون کرتے اور اپنی عظیم برادری قرار دیتے ہیں۔ یہ علاقہ بالخصوص مشرقی راجپوتانہ ۱۹۴۷ عیسوی میں مسلم کش فسادات سے شدید طور پر متاثر ہوا تھا۔ اور سادات کی بستیاں اجڑ گئی تھیں۔ اس علاقے کے مراکز سادات ہماری قومی تاریخ کے امین تھے اور ان ہی میں ہماری دستاویزات موجود تھیں جن کو سادات مذکورہ ساتھ نہ لاسکے اور تقسیم ہند کے بعد ان کا حصول ممکن نہ ہوسکا۔ شاہ گنج آگرہ ان تمام سادات کی بستیوں کا حسین گلدستہ اور اہم ترین مرکز تھا جو قبل تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں ان تباہ حال سادات کا میزبان بنا جو ہجرت پر مجبور ہوگئے تھے۔ نفسیاتی اثرات اور دیگر سیاسی و معاشی وجوہ کے باعث اہل شاہ گنج آگرہ کو بھی رخت سفر باندھنا پڑا اور عجلت، بے خبری اور مستقبل بینی سے عدم توجہی کے نتیجے میں سادات شاہ گنج آگرہ بھی ضروری دستاویزات اپنے ہمراہ نہ لاسکے عام خیال تھا کہ دونوں ممالک کے روابط استوار ہوجائیں گے آمد و رفت کی مشکلات ختم ہوجائیں گی اور کاغذات کا حصول ممکن ہوجائے گا لیکن ایسا نہ

جا کر دور دراز کے ممالک میں بس گئے ہیں۔ ہماری عظیم برادری کے افراد بھی کافی تعداد میں کینیڈا، امریکہ، انگلستان اور جرمنی وغیرہ میں جا کر آباد ہوگئے ہیں۔ اس لئے اپنی پہچان ان کے لئے ایک اہم مسئلہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہ تالیف ایسے حضرات کے لئے زیادہ مفید فکر انگیز اور رہنما ثابت ہوگی۔

تالیف کی انفرادیت

پاکستان میں دیگر برادریوں کی روداد زندگی یا تاریخ میں دو پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ اول یہ کہ ان میں تاریخ کم اور شجرہ نگاری زیادہ ہے۔ دوم یہ کہ ان میں خاندانی روایات کی بھرمار ہوتی ہے اور تاریخی شواہد کی بے حد کمی۔ لیکن ہم نے سعیٔ بلیغ کی ہے کہ یہ تاریخ واقعی تاریخ کہلائے۔ ہم نے معتبر خاندانی روایات کے بجائے تاریخی شہادتوں ہی کو محور تحریر بنایا ہے اور کوئی ایسی بات یا واقعہ نہیں لکھا جو تاریخی حوالہ جات سے مشروط نہ ہو علاوہ ازیں اس داستان حیات (سادات آگرہ و نواح کی تاریخ) کو دیگر متعلقہ تواریخ سے اس طرح پیوستہ و مربوط کیا ہے کہ تاریخ اسلام، تاریخ ہجرت، تاریخ شیعیت اور تاریخ عزاداری کے اہم پہلو اور واقعات بیک وقت نگاہ مطالعہ کے روبرو آجائیں اور ہمارے قارئین بالخصوص ہماری عظیم برادری کے افراد کو اپنی مخصوص تاریخ کے آئینے میں تمام مذکورہ تواریخ کے خدوخال واضح طور پر دکھلائی دیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنا پروقار چہرہ بھی۔ یہ خصوصی اہتمام ہم نے کتاب میں باب اول، باب دوم اور باب پنجم کو شامل کرکے کیا ہے تاکہ باب سوم اور باب چہارم (آگرہ و نواح میں سادات کی بستیاں اور سادات شاہ گنج آگرہ کے چند خاندانوں کا اجمالی ذکر) کا مطالعہ ان ابواب کے سیاق و سباق میں کیا جاسکے اور بعد کے ابواب پنجم تا ہفتم کا مطالعہ ہماری نسل نو اور آئندہ کی نسلوں کو اپنی عظمت رفتہ کی روشنی میں اپنی عظمت

ہو سکا۔ علاوہ ازیں جن معدودے چند حضرات کی تحویل میں کچھ تاریخی مواد تھا انہوں نے تعاون نہ کیا۔ سابقہ بستیوں سے تعلق رکھنے والے بعض پرجوش مبلغ حضرات جو تاریخی مواد کے حامل ہونے کا بلند بانگ دعویٰ کرتے تھے، تہی دامن نکلے اور ہماری کچھ بھی مدد نہ کر سکے۔ ان حالات میں تاریخ نویسی بے حد دشوار مرحلہ تھی اس لئے ہمیں مختلف کتابوں، رسالوں اور جریدوں کا عمیق مطالعہ کر کے ضروری تاریخی مواد حاصل کرنا پڑا۔ ان دشواریوں کے علاوہ کراچی کے تشویش ناک حالات نے بھی بڑی رکاوٹ ڈالی کہ ہنگاموں اور ہڑتالوں کے باعث رفتار کار تقریباً رک کر رہ گئی تھی اور یہ صورت حال طویل عرصہ تک کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہی نیز میری اور میرے ساتھیوں کی صحت بھی مسلسل خراب اور روبہ زوال رہی ۔ سید محمود الحسن رضوی جو عارضہ دل میں طویل عرصہ سے مبتلا تھے نومبر ۱۹۹۶ء میں ہم سے بچھڑ گئے۔ خانگی پریشانیوں کے باعث سید حسن مشیر کا تعاون جاری نہ رہ سکا۔ میری بصارت چشم جو پہلے ہی بے حد خراب و خستہ تھی نے لکھنے پڑھنے کا مزید بوجھ اٹھانے سے قطعی انکار کر دیا کہ میری بینائی تشویشناک حدوں کو چھو رہی تھی ۔ اپنی نہایت کمزور بصارت چشم کے باعث میرے لئے ہزاروں صفحات پر مشتمل مخصوص کتابوں کا مطالعہ بڑا مہنگا پڑا۔ دراصل اس کارتدوین و تالیف میں مجھے اپنی بینائی کو داؤ پر لگانا پڑا ہے اس لئے اس کو جہاد سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بہرکیف فروری ۱۹۹۷ء میں مجھے اپنی آنکھ کا آپریشن کروانا پڑا جو خطرے سے خالی نہ تھا تاہم اللہ تعالی کا فضل و کرم شامل حال رہا کہ آپریشن کامیاب ہوا اور بصارت بڑی حد تک بحال ہو گئی ۔ اس طرح تقریباً ایک سال کے طویل وقفہ کے بعد میں پھر کارتالیف میں منہمک ہو گیا اگرچہ اب میں اپنے شرکائے کار کی مدد و معاونت سے محروم تھا اور یوں اس کار عظیم کی تکمیل مجھے تقریباً تن تنہا کرنا پڑی ہے۔

تالیف کی وجہ تسمیہ

ہماری داستان تاریخ بارہ صدیوں کی طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہے جو ہمارے مورث اعلیٰ جناب سید موسیٰ مبرقع علیہ الرحمتہ کی ہجرت مدینہ ۲۴۰ ہجری سے شروع ہوئی تھی ۔ اس طویل مسافت کے دوران ہم نے کئی مقامات پر ڈیرے ڈالے ، اپنے وجود کے نشانات ثبت کئے اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے۔ عرب ، ایران اور ہند قدیم میں مدینہ ، کوفہ ، کاشان ، قم مشہد ، بیانہ ، ہیلک و نواح اور شاہ گنج آگرہ میں ہمارے کاروان ہجرت نے اپنے خیمے نصب کئے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد پھر سفر پر روانہ ہونا پڑا۔ اس طرح ہمارا تا حال کا آخری سفر شاہ گنج آگرہ سے پاکستان کی طرف ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۷ھ میں واقع ہوا ہے۔ گویا ہم کاروان کی مثال چلتے اور ٹھہرتے رہے ہیں اسی لئے ہم نے اپنی داستان حیات (تالیف ہذا) کا نام کاروان تجلی سادات رکھا ہے۔ کاروان کی اسی کیفیت کا عکس جمیل ان اشعار میں بھی نظر آئے گا جن کے ذریعے میں نے اسی تاریخی کتاب کے اہم ترین مندرجات کا منظوم خلاصہ پیش کیا ہے جو ــــ صفحہ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

معتبر شجرہ نگاری کا مسئلہ

اگرچہ یہ تالیف ہر اعتبار سے ایک مستند تاریخ ہے تاہم سادات مذکورہ کے حسب نسب کے سلسلے میں شجرہ نگاری سے کسی حد تک مفر بھی نہ تھا۔ یہ مسئلہ اہم بھی تھا اور دشوار بھی چونکہ مختلف ادوار اور علاقوں میں بعض حضرات نے شجرہ نگاری کی جانب توجہ تو دی لیکن غور و فکر سے زیادہ کام نہ لیا جس کے باعث نسب ناموں میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں ان کی بنیادی وجہ سادات کی بار بار ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت رہی ہے۔ اہم ترین خامی نسلوں کی ضروری تعداد میں حد درجہ کمی ہے یعنی متعدد

نسلی کڑیاں غائب ہیں مثلاً حضرت امام علی رضا سے اب تک بارہ صدیوں میں اکثر شجرہ نگاروں نے بیس تا پچیس نسلوں پر اکتفا کی ہے جب کہ مسلمہ اصول کے مطابق یہ چھتیس تا بیالیس سلسلے ہونا چاہیں کیونکہ ایک صدی میں تین نسلوں اور دو صدیوں میں سات نسلوں کی موجودگی کا اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے سامنے ایک درجن سے زائد شجرے ہیں ان میں عزاخانہ شاہ گنج آگرہ میں کندہ شجرہ مرتبہ میر ضامن علیؒ ہیلک کے سید الطاف علی رسالدار، سید عابد علی کتب فروش لکھنو کا مرتب کردہ شجرہ سادات شاہ گنج آگرہ (اکبر جام) کے سید عزیز الحسن بن سید قادر علی، سادات بھرتپور کے سید موسیٰ رضا شاہ، تحصیلدار سید ظہیر الحسن رضوی، سید منظور احمد جعفری، شاہ گنج کے سید زوار حسین عرف بدھا اور فتح پور سیکری کے حکیم سید انوار حسین رضوی کے مرتب کردہ شجرے ممتاز ہیں۔ ہم نے گہری نگاہ سے مطالعہ کرکے سادات شاہ گنج آگرہ کا شجرہ ترتیب دیا ہے جو جملہ خامیوں سے بھی پاک ہے اور مسلمہ اصول پر بھی پورا اترتا ہے۔ لہٰذا یہ ہی نسب نامہ اب مستند و معتبر قرار پائے گا۔

کتاب کے ابواب

یہ تاریخی تالیف سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول (اسلام اور اس کی قیادت) میں حقیقی تاریخ اسلام کو سمیٹ لیا گیا ہے جو ۵۷۰ء ولادت رسالت مآبؐ ۸۷۵ء شہادت امام حسن عسکری کی تین سو سالہ مدت پر محیط تھی اور یہ ہی اسلامی قیادت کا سنہری پاکیزہ اور قابل فخر عہد تھا۔ باب دوم (ہجرتوں کے سلسلے اور تشیع کا فروغ) کے تحت ہجرت و شیعیت کی طویل تاریخ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور ان سخت مراحل کا مختصر ذکر کیا گیا ہے جن سے کاروان سادات کو اپنی طویل مسافت کے دوران گزرنا پڑا ہے اور جن کے باعث برصغیر میں ان کی موجودگی کا تاریخی جواز بیانہ و نواح اور آگرہ

و نواح میں فراہم ہوتا ہے۔ باب سوم (آگرہ و نواح میں سادات کی بستیاں)
کے زیر عنوان مشرقی راجپوتانہ میں ریاست ہائے بھرتپور و دھولپور اور مغربی
یوپی (اتر پردیش) کے اضلاع آگرہ و متھرا میں سادات عظام کی درجنوں
بستیاں اور آبادیاں ظہور پذیر ہوئیں جنہوں نے تاریخ ساز کارنامے انجام
دیئے اور درجنوں نابغۂ روزگار لوگ پیدا کئے اور یہ ہی تالیف ہذا کا اہم ترین
موضوع بھی ہے۔ باب چہارم میں سادات شاہ گنج آگرہ کے خاندانوں کا تذکرہ
میں ہم نے ڈہائی درجن خانوادوں کا مختصر احوال بیان کیا ہے جس کی اساس
سادات مذکورہ کے نامور اہل قلم کی نگارشات پر رکھی ہے۔ باب پنجم ۔
عزاداری میں ہماری روایات کے تحت ہم نے برصغیر میں قیام و فروغ
عزاداری کے ضمن میں آگرہ و نواح آگرہ کا خصوصی تذکرہ کیا ہے اور تاریخی
شواہد سے واضح کیا ہے کہ اس علاقے کی عزاداری و شیعت میں امتیازی
حیثیت اور اولیت کا اعزاز ہمیں حاصل ہے۔ باب ششم ۔ آگرہ و نواح کا
دبستان شاعری کے زیر عنوان دبستان اکبر آباد کے امتیازی تشخص اور انفرادیت
کا اجمالی بیان کیا گیا ہے جو نامور اور ثقہ اہل علم و فن کی تحریروں پر مبنی ہے
اس میں ۲۳ بڑے اور باکمال اساتذہ اور ۲۷ ممتاز شعراء کا بہایت مختصر ذکر کیا
گیا ہے۔ قارئین کرام ملاحظہ کریں گے کہ سولھویں صدی عیسوی کی نصف
ثانی سے موجودہ صدی عیسوی کے اواخر تک گزشتہ پانچ صدیوں میں اکبر آباد
و نواح اکبر آباد کے ممتاز شعراء کی ایک کہکشاں سی افق ادب پر جلوہ گر رہی
ہے۔ ہر دور شاعری میں عظیم شعرائے اکبر آباد کی موجودگی ہی دبستان اکبر
آباد کے مسلسل وجود کی بین دلیل ہے۔ ان میں ملا شیدا، میر سجاد، خان آرزو
میر تقی میر، میاں نظیر اکبر آبادی، مرزا مظہر جانجاناں، مرزا فصیح، مرزا غالب
منیر شکوہ آبادی، نسیم بھرتپوری، محمود پہرسری، بزم آفندی، علامہ سیماب،
علامہ نجم آفندی، علامہ میکش اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی اور علی سردار

جعفری جیسے عظیم شعراء و اساتذہ فن نمایاں ہیں۔ باب ہفتم ۔ شخصیات کے سلسلے میں ہم نے فقط ان حضرات کا مختصر ذکر یا تعارف پیش کیا ہے جن کے ضروری کوائف ہمیں مل سکے ہیں۔ یہ تعداد بھی ساڑھے پانچ سو سے زائد بنتی ہے تاہم اس کو بھی مکمل فہرست قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ بہت سے قابل ذکر لوگ تذکرے سے محروم رہ گئے ہیں۔ اس باب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) مشاہیر ۔ ناقابل فراموش ہستیاں (ب) وہ حضرات جن کا تذکرہ دیگر کتابوں اور رسائل و جرائد میں ملتا ہے ان میں فقط ان افراد کا انتخاب کیا گیا ہے جن کا ذکر کم از کم تین مختلف مطبوعات میں ملتا ہو ۔ اور (ج) دیگر ممتاز اور اہم اشخاص ان کو مزید ذیلی عنوانات کے تحت منقسم کیا گیا ہے مثلاً اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ، اعلیٰ منصب داران ، عسکری شخصیات ، علماء و فضلا ، مصنف و مترجم ، جج صاحبان ، صحافی ، ڈپٹی کلکٹرز ، تحصیلداران ، انجینئرز ، ڈاکٹرز ، پولیس افسران ، وکلا اور بینک افسران وغیرہ کی ایسی فہرستیں الگ الگ دی گئی ہیں جن کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات ہمیں حاصل ہوسکیں ہیں۔ ان میں درجنوں ایسے افراد ہیں جنہوں نے تاریخ ملک و ملت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور جو آگرہ و نواح کی آبرو کہلانے کے مستحق ہیں۔ شاہ گنج آگرہ کا مرکز سادات برصغیر میں کئی اعتبار سے منفرد تھا مثلاً (۱) اٹھارویں صدی عیسوی کی نصف ثانی اور بیسویں صدی عیسوی کی نصف اول کے مختصر مدت کے دوران یہاں کئی کلکٹرز ، اٹھارہ ڈپٹی کلکٹرز اور درجنوں اعلیٰ سول اور فوجی منصب داروں کے علاوہ سیاسی ، سماجی اور علمی و ادبی شخصیات بڑی تعداد میں برسر عمل نظر آتی ہیں۔ اس زمانے میں یہ اعلیٰ مناصب ہندوستانیوں کے لئے شجر ممنوعہ تھے۔ (۲) سلطان محمد غوری کی فتح کے بعد اس کے ورثائے ہند بالخصوص التمش کے عہد میں اعلیٰ ریاستی عہدوں پر فائز رہے۔ علم و فضل میں سادات بیانہ کی فضیلت مسلمہ تھی ۔

ان ہی سادات کے اخلاف نے شاہ گنج آگرہ کو آباد کیا تھا۔ (۳) عہد مغلیہ میں اعلیٰ عسکری اور انتظامی مناصب پر متمکن رہے (۴) ریاست بھرتپور کے قیام و فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ (۵) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ممتاز کردار ادا کیا۔ جنگ شاہ گنج آگرہ کے مجاہد رہنماؤں میں اس مرکز سادات کے پانچ افراد ممتاز تھے۔ اس جنگ شاہ گنج آگرہ کی بڑی اہمیت و انفرادیت تھی کہ تین ماہ تک انگریز فوج قلعہ آگرہ میں محصور رہی اور شاہ گنج کے اطراف کے ۵۶ محلے صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اس جنگ شاہ گنج کا احوال متعدد تواریخ میں ملتا ہے ان میں وہ لوگ جنہوں نے انڈیا پر حکومت کی (انگریزی) مصنفہ فلپ وڈرف ۱۸۵۷ء کا محاربہ عظیم، تاریخ آگرہ، مرقع اکبر آباد وار سر کنین ڈائل کا مشہور ناول "دی سائن آف فور" نمایاں ہیں۔ (۶) مسلم نشاۃ ثانیہ اور علی گڑھ تحریک میں جاندار حصہ لیا جس کی روشن ترین مثال میر تراب علی ڈپٹی کلکٹر تھے جو سرسید کے اہم ترین مددگاروں اور دوستوں میں ممتاز تھے۔ (۷) آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے والوں میں اس مرکز سادات کی دو نہایت قد آور شخصیات تھیں یعنی خان بہادر سید آل نبی رضوی اور بابا سید محمد علی جعفری۔ (۸) محاذ حسینی کی تحریک (۱۹۳۸ء۔ ۱۹۳۹ء) میں بڑا وقیع کردار ادا کیا۔ اس میں انجمن پنجتنی آگرہ کی خدمات اہم تھیں راقم الحروف (ناز اکبر آبادی) اس میں عملی حصہ لینے اور قید و بند کی تکالیف اٹھانے والوں میں سب سے کم عمر تھا۔ (۹) نظریاتی اختلاف کے باوجود تحریک خلافت میں بھرپور شمولیت اختیار کی۔ ترکی جانے والے طبی وفد میں بیرسٹر سید حسن عابد جعفری نمایاں تھے جو سادات شاہ گنج آگرہ ہی کے ایک ممتاز سپوت تھے۔ (۱۰) تحریک پاکستان (۱۹۴۰ء۔ ۱۹۴۷ء) کو پروان چڑھانے میں بنیادی رول ادا کیا اور علی ظہیر اور حسین بھائی لالجی کی مسلم لیگ مخالف مہم کو ناکام بنانے میں نوجوانان سادات نے زبردست جدوجہد

کی جس کی قیادت راقم السطور ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ (۱۱) اس مرکز سادات نے ایسے درجنوں نابغہ روزگار افراد پیدا کئے جنہوں نے تاریخ ملک و ملت پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں سے چند کا تذکرہ مشاہیر میں کیا گیا ہے۔ اس مرکز سادات کی اہم ترین انفرادیت یہ تھی کہ یہاں کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا اور ہمیشہ مسلمانوں بالخصوص سادات کی بالادستی قائم رہی۔

تالیف میں تاخیر

یہ حقیقت ہے کہ اس تاریخی کتاب کو پیش کرنے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے اس کی چند وجوہ یہ ہیں۔ میری اور میرے اہم شرکائے کار کی صحت مسلسل خراب اور روبہ زوال رہی۔ سید محمود الحسن رضوی جو عارضہ قلب میں مبتلا تھے ۲۳ نومبر ۱۹۹۶ء کو داغ مفارقت دے گئے، سید حسن مشیر خانگی پریشانیوں کے باعث خاطر خواہ تعاون نہ کر سکے۔ میری بصارت چشم کی صورت حال نہایت سنگین تھی کہ اگست ۱۹۹۶ء سے مئی ۱۹۹۷ء تک میں لکھنے پڑھنے کے لائق ہی نہ تھا۔ فروری ۱۹۹۷ء میں مجھے آنکھ کا آپریشن کروانا پڑا جو خطرناک تھا اور ابواب کتاب کے تاریخی حوالہ جات میں کہیں رکھ کر بھول گیا یا مجھ سے گم ہو گئے جن کو سینکڑوں منتشر اوراق میں تلاش کرنا اور اپنی یادداشت کی مدد سے از سر نو لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس آخری مرحلہ تدوین میں مجھے اس کار عظیم کی تکمیل تن تنہا کرنا پڑی ہے۔ سید محمود الحسن رضوی مرحوم کے انتقال نے میری مشکلات تالیف میں بڑا اضافہ کر دیا۔ میرا احساس تنہائی "نظم بیاد محمود" کے بعض اشعار میں ڈھل گیا جو میں نے مرحوم کے چہلم (۲۷ دسمبر ۱۹۹۶ء) کے موقع پر کہ کر پمفلٹ کی صورت میں تقسیم کی تھی۔ چند شعر یہ تھے۔

مجھ سے تھا اشتراک تحریری
آخر وقت تک رہا جاری

سانس رکتا رہا قدم نہ رکا
منزلوں میرے ساتھ چلا
راہ ہستی میں کھو گیا آخر
دور نظروں سے ہوگیا آخر
ابھی باقی بہت ہے کار کتاب
اب میں تنہا ہوں اور بار کتاب

یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوئی چند افراد برادری نے اپنی خدمات پیش کیں جو نوعت کار کے لحاظ سے میرے لئے زیادہ کارآمد نہ تھیں۔ ایسے افراد میں لیفٹننٹ کرنل سید علی امام جعفری اور ممتاز سوزخواں حاجی سید فائق حسین رضوی نمایاں ہیں۔ میں ان دونوں حضرات کا ممنون ہوں۔

اظہار تاسف و تشکر

اس تاریخی کتاب کی تالیف کے ضمن میں بعض لوگوں نے بڑا مایوس کیا اور کسی صورت تعاون پر آمادہ نہ ہوسکے۔ ان میں سادات شاہ گنج آگرہ کے ایک اہم خاندان کے ایک صاحب نمایاں ہیں ان کی تحویل میں سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ کی قلمی تاریخ کی جلد اول ہے جس میں مصنف نے اپنے بزرگوں کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ اگر ہمیں یہ جلد یا اس کے ضروری اقتباسات مل جاتے تو عدم تعاون کرنے والے صاحب ہی کے بزرگوں کا تذکرہ زیادہ بہتر انداز میں ہوجاتا۔ اسی طرح بعض خاندانوں کے موجودہ ورثا نے قطعی توجہ نہ دی اور ان کے خاندانوں کی ممتاز شخصیات محروم ذکر رہ گئی ہیں۔ دبستان اکبرآباد کے ضمن میں شعرائے آگرہ کے کوائف اور نمونہ کلام درکار تھے لیکن بعض شعرا کے ورثا اور تلامذہ نے بے حسی اور عدم توجہی کا مظاہرہ کیا۔ اس لئے سید مصطفیٰ حسین مصطفیٰ، آغا محمد جواد مازندرانی، سید علی حسنین عندلیب، سید محمد سلیمان شائق، ثمر ہوشنگ آبادی، مشہود جعفری

اور سرفراز ابد وغیرہ کا تذکرہ نہ ہوسکا یا بیان احوال میں واضح کمی رہ گئی ہوگی مجھے ان عزیزوں اور دوستوں سے بجا طور پر شکوہ ہے جنہوں نے توجہ نہ دی۔ بعض کرم فرماؤں کے ارسال کردہ کوائف و نمونہ کلام ہمیں بڑی تاخیر سے ملے ہیں جو شامل کتاب نہ ہوسکے۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ بعض مستحق ذکر حضرات کسی بھی وجہ سے ذکر سے محروم رہ گئے۔

اس کتاب کی تدوین کے مختلف مراحل میں درج حضرات نے قابل قدر مدد و معاونت فرمائی ہے۔

(۱) سید محمود الحسن رضوی مرحوم ملت جعفریہ پاکستان کے دل و دماغ کا درجہ رکھتے تھے۔ مرحوم نے ابتدائے کار سے اپنی وفات تک مسلسل ساتھ دیا۔ اگر ان کا خصوصی تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ کتاب اس انداز میں پیش نہیں کی جاسکتی تھی (۲) سید محمد مدبر (مدبر رضوی) پاکستان ٹیلی وژن سینٹر کراچی میں اسکرپٹ ایڈیٹر ہیں اور چلتی پھرتی لائبریری کی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے مشوروں نے کتاب کی منزلت بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ (۳) سید حسن مشبر تاریخی کتب و مواد فراہم کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ابتدائی مراحل تدوین میں اور تاریخی حوالہ جات مہیا کرنے میں ان کا تعاون بڑا قیمتی تھا۔ (۴) سید علی اطہر جعفری اکبرآبادی مرحوم نے بالکل آغاز میں مدد کی۔ (۵) ڈاکٹر سید نیر رضا (مقیم حال امریکہ اور میرے ایک بیٹے) نے کتاب کے ابتدائی تین ابواب کو اپنی خوبصورت تحریر میں لکھا تھا۔ جو ان کو اپنے نسبی بزرگ سید دائم علی سے ورثے میں ملی ہے۔ (۶) سید غلام السیدین تاباں جارچوی نے تدوین کے درمیانی مرحلے میں کافی تعاون کیا۔ موصوف معروف شاعر ہیں اور میرے کوئٹہ کے قیام کے دوران کے دوستوں میں نمایاں ہیں۔ (۷) سید فضیلت مہدی نے خصوصی مدد کی ہے موصوف میرے بھتیجے ہیں اور معروف مصنف و صحافی بھی ہیں نیز حکومت سندھ میں سیکشن آفیسر ہیں۔

(۸) سید اختر رضا جعفری نے آخری مرحلہ تالیف میں ناقابل فراموش مدد کی ہے موصوف میرے نواسے اور قابل ذکر صحافی اور کئی اخبارات کے سب ایڈیٹر ہیں۔

(۹) سید کوثر مہدی نے ابتدائی مرحلہ تالیف میں مدد کی - موصوف حبیب بینک کراچی میں افسر ہیں اور میرے قریبی عزیز ہیں۔

اس کتاب کی طباعت ممکن نہ ہوتی اگر ہمارے بعض قرابت داروں نے مالی تعاون از خود نہ کیا ہوتا۔ ایسے ممتاز حضرات کی فہرست آخری صفحہ پر دی گئی ہے اس مرحلے پر بعض مرحوم دوستوں اور عزیزوں کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی - سید علی عارف رضوی مرحوم نے سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ کی تاریخ قلمی جلد ۲ کی نقل فراہم کی تھی جس کی اساس پر ہم نے باب ۴ ترتیب دیا ہے۔ سید رضا رضوی مرحوم ماضی قریب کے دانشوروں میں تھے ہم نے آگرہ میں "کھلی" کے خلاف اور مسلم لیگ کے حق میں مل کر کام کیا تھا۔ مرحوم تاریخی مواد کے سلسلے میں سید حسن مشبر کے پیش رو تھے اور بذات خود ایک کتب خانے کا درجہ رکھتے تھے۔

آخر میں دو اہم باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ انسان کی کوئی کاوش حرف آخر نہیں ہوتی اس میں خوب سے خوب تر کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ لہذا یہ تالیف بھی خامیوں اور غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتی اور بعض نقطہ ہائے نظر سے نامکمل تصور ہوگی - لیکن ہم نے بنیاد رکھ دی ہے اس پر عالیشان عمارت کی تعمیر کا قوی امکان موجود ہے۔ خدا کرے کوئی زیادہ باصلاحیت و باہمت شخص اٹھے اور مستقبل میں اس کام کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرے۔ دوم یہ کہ عمل ارتقاء سے گزرنا سب افراد اور قوموں کا مقدر ہے ہم اپنے کاروان ہجرت کو قافلۂ ارتقاء تصور کرتے ہیں۔ میری ایک غزل کا شعر ہے۔

رہ حیات میں بڑھتے رہے انہی کے قدم۔
جنہوں نے قافلۂ ارتقا کا ساتھ دیا

اگرچہ ہم کچھ پیچھے ضرور رہ گئے ہیں تاہم گرد کاروان کے رحم پر بھی نہیں رہے۔ اعداد و شمار کے آئینے میں دیکھا جائے تو ہم سادات آگرہ و نواح کی ترقی کا گراف گزشتہ ایک صدی (۱۸۴۷ء۔ ۱۹۴۷ء) کے دوران مسلسل اوپر کی طرف بڑھتا رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ہمیں نہایت سنگین صورتحال کا سامنا کرنا پڑا اور ترقی کا سفر تقریباً رکا رہا۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۵ء کی ربع صدی میں ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی سخت جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ اب ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ارتقاء کی سمت ہمارا سفر شروع ہو چکا ہے۔

گزشتہ پچیس برس میں ہم نے تقریباً ہر شعبہ زندگی میں نمایاں ترقی کی ہے ہمارا معیار تعلیم بھی اونچا ہوا ہے اور ہماری معاشی و سماجی حیثیت بھی بڑھی ہے۔ باب ہفتم (شخصیات) کا مطالعہ اس کی تصدیق کرے گا۔ یہ صورت حال کافی خوش آیند اور پر امید نظر آتی ہے اور زیادہ بہتر مستقبل کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔ مثلاً (۱) گزشتہ سو سالہ مدت (۱۸۴۷ء۔ ۱۹۴۷ء) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات میں دو پی ایچ ڈی اور فقط ایک ڈبل ایم اے ہوئے جب کہ گزشتہ نصف صدی سے بھی کم عرصے (۱۹۵۰ء۔ ۱۹۹۵ء) میں تین پی ایچ ڈی اور تین ڈبل ایم اے ریکارڈ کئے گئے۔ (۲) اسی مدت میں پہلے ایک بھی چارٹرڈ اکاونٹنٹ اور اعلیٰ ڈگری یافتہ فرد نہ تھا جب کہ موجودہ عرصہ میں چار چارٹرڈ اکاونٹنٹ اور اعلیٰ ڈگری یافتہ ہوئے۔ (۳) پہلے صنعت و تجارت میں خاص طور پر ایک ایکسپورٹ امپورٹ میں فقط ایک شخص قابل ذکر تھا جب کہ موجودہ عہد میں یہ تعداد چھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ (۴) اعلیٰ منصب داران (موجودہ گریڈ ۲۰ سے اوپر) ماضی بعید میں فقط تین اشخاص ہوئے جب کہ ماضی قریب اور موجودہ عہد میں یہ تعداد آٹھ تک پہنچ چکی ہے۔ (۵) مصنف و مترجم اور صحافی حضرات پہلے صرف چھ تھے اب یہ تعداد پندرہ سے

بڑھ گئی ہے۔ گویا گزشتہ اور موجودہ تعداد میں تین سو فیصد سے بھی زیادہ کا فرق بالکل واضح ہے۔ اور یہ ہمارے سفر ارتقا میں تیز رفتاری کا مظہر بھی ہے اور "کاروان تجلی سادات" کی غیر معمولی صلاحیتوں کا آئینہ دار بھی۔ یہ کتاب سادات مذکورہ کے عزم و حوصلے کو مہمیز دے کر ان کے اکیسویں صدی عیسوی میں داخلے کو باوقار بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

ہم نے گزشتہ بارہ صدیوں میں (۹) ہجرتیں کی ہیں اور ہم عمل ہجرت سے مسلسل گزر رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ہجرت سادات کرام کا مقدر بن گئی ہے۔ جدید ایران کے دانشور ڈاکٹر علی شریعتی کے بقول "نقل مکانی یا ہجرت ہمیشہ سے تہذیب و تمدن کی ترقی کا ذریعہ رہی ہے۔ عالم انسانیت جن ستائیس تہذیبوں سے آشنا ہے وہ سب ہجرت ہی کے بطن سے پیدا ہوئی ہیں۔" اس لئے مشکلات کے باعث ہجرت سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ سنت رسولؐ و آئمہؑ بھی ہے۔

بحمد اللہ ہم تیرہ شبی کے دور سے نکل آئے ہیں اور طلوع سحر کے آثار روشن تر نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مورخ کو بعض تلخ حقائق پیش کرنا پڑتے ہیں اور حق کی بات عام طور سے لوگوں کو ناگوار ہوتی ہے ہوسکتا ہے کہ کتاب ہذا کے مندرجات میں بھی بعض ایسے عناصر موجود ہوں جو بعض قارئین کو پسند نہ آئیں اگر کسی کو ان سے تکلیف پہنچی ہو تو میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

میں نے اپنی بے بضاعتی اور سنگین دشواریوں کے باوجود یہ تاریخی کتاب پیش کر دی ہے اب یہ قارئین کا اپنا اثاثہ ہے اور وہی اس کے بہتر قدرشناس و نقاد قرار پائیں گے۔

سید انتظار رضا ناز اکبرآبادی

کراچی / جون ۱۹۹۷ء ۔ صفر ۱۴۱۸

ابواب و عنوانات

باب اول ۔ اسلام اور اس کی قیادت

ابتدائے آفرینش انبیاء کرام کا دین ۔ بنی ہاشم کی وراثت ۔ آل عمران اور خلافت و امامت الہیہ ۔ اعلان غدیر ۔ حضرت علیؑ کی خلافت کے مخالفین ۔ ثقیفہ سے کربلا تک ۔ کربلا کے بعد آئمہ اہلبیت ۔ آئمہ کے جہاد پر ایک نظر ۔

باب دوم ۔ ہجرتوں کے سلسلے اور تشیع کا فروغ ۔

(الف) ہجرتوں کے سلسلے ۔ ہجرت کا مفہوم اور اہمیت ۔ رسول اکرمؐ ، اصحاب رسول ، آئمہؑ ، اولاد آئمہ اور سادات و مومنین کی ہجرتیں ۔ برصغیر کی طرف اہم ہجرتوں کا تعارف اور ان کے نتائج

(ب) شیعت اور افکار امامیہ کی ہمہ گیر ترقی ۔ برصغیر میں تشیع کا نفوذ اور فروغ ۔ سادات و مومنین کی متعدد بستیوں کا قیام ۔ شیعی ریاستوں کا ظہور ۔ شاہان دہلی اور مغلیہ حکمرانوں کے عہد میں سادات بیانہ و نواح کی فضیلت ۔ سادات ہیلک و بیانہ کی اورنگ زیب کے عہد آخر میں ہجرت اور شاہ گنج آگرہ کے مرکز سادات کا ظہور ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سادات مذکورہ کا کردار جنگ شاہ گنج آگرہ کی اہمیت و انفرادیت ۔ مسلم نشاۃ ثانیہ ، علی گڑھ تحریک اور تحریک پاکستان میں قائدانہ کردار وغیرہ ۔

باب سوم ۔ آگرہ و نواح میں سادات کی بستیاں

محمود غزنوی اور محمد غوری کی فوجی مہمات کے نتیجے میں سادات کی متعدد بستیوں کا ظہور راجپوتانہ کی فوجی اور سیاسی اہمیت ۔ بیانہ و نواح میں سادات

سادات کی اہم اور ممتاز آبادیاں جن میں بیانہ، ہیلک، پہرسر، رارے، ندبیئ، سید پورہ، غوشنہ، تحصساور، اول، مہابن، باڑی، فتح پور سیکری، بھرتپور شہر اور شاہ گنج آگرہ نمایاں تھے۔ یہ بستیاں مشرقی راجپوتانہ اور آگرہ و متھرا کے اضلاع میں واقع تھیں۔ اسی علاقے کو ہم آگرہ و نواح آگرہ سے معنون کرتے ہیں۔ یہاں کے سادات نے کارہایا عظیم انجام دیئے اور تاریخ ملک و ملت پر گہرے نقوش ثبت کئے۔ ان نابغۂ روزگار حضرات کا تذکرہ اس تالیف کا اہم ترین موضوع بھی ہے۔

باب چہارم۔ سادات شاہ گنج آگرہ کے چند خاندانوں کا تذکرہ

اس باب میں تیس خاندانوں کا مختصر احوال ہے جن میں پانچ بڑے اور ابتدائی آباد کار تھے باقی پچیس ان خانوادوں کا تعارف ہے جو ۱۷۰۷ء۔ ۱۹۲۰ء کے دوران شاہ گنج آگرہ میں آکر بستے رہے۔

باب پنجم۔ عزاداری میں ہماری روایات

اس میں عزاداری کی طویل تاریخ کا خلاصہ پیش کیا ہے اور بیانہ و نواح اور آگرہ و نواح میں سادات کی متعدد آبادیوں کی عزاداری اور محرم کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں نیز تاریخی شہادتوں سے واضح کیا گیا ہے کہ اس علاقے کے سادات نے ہندو ریاستوں کو کس قدر متاثر کیا اور یہ کہ یہ سادات کھلی ہوئی شیعیت پر عمل پیرا تھے اور عزاداری میں اولیت و انفرادیت کا امتیاز بھی رکھتے تھے۔ اس باب میں آگرہ کے محرم اور شاہ گنج کی عزاداری کا خصوصی تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

باب ششم۔ اکبرآباد و نواح کا دبستان شاعری

آگرہ (اکبرآباد) کی علمی اور ادبی منزلت۔ گذشتہ پانچ صدیوں میں یہاں کے شعرا و ادبا اور اساتذہ فن کی کہکشاں سی افق ادب پر جلوہ گر رہی۔ ہر دور شاعری میں عظیم شعرائے اکبرآباد کی موجودگی اور برتری۔ دبستان اکبرآباد کے بارے میں نامور اہل قلم کے ارشادات۔ بعض ادبی حلقوں کی اکبرآباد اور عظیم شعرائے اکبرآباد کی بابت تنگ نظری۔ جناب حمایت علی شاعر کا محققانہ مضمون۔ جدید مرثیہ اور اس کے پاکستان میں معماروں کے ضمن

میں بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ کے مولف کی کوتاہ نظری ۔ بڑے شعراء اور اساتذہ فن آگرہ و نواح ہی سے اٹھے ۔ ۹۵ شعرائے آگرہ و نواح کا تعارف ۔

باب ہفتم ۔ شخصیات

(الف) مشاہیر (ب) وہ ممتاز حضرات جن کا تذکرہ دیگر مطبوعات میں ملتا ہے (ج) دیگر نمایاں اشخاص ۔ اس حصہ (ج) کو ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً اعلیٰ منصب داران ، اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ، عسکری شخصیات ، ڈپٹی کلکٹرز ، تحصیلداران ، علماء و فضلا اور حفاظ ، مصنف و مترجم اور صحافی ، انجینئرز ، ڈاکٹرز ، وکلاء ، پولیس افسران ، بینک افسران وغیرہ ۔ یہ ساڑھے پانچ سو سے زائد اشخاص کی فہرستیں ہیں تاہم نامکمل ہیں کہ بہت سے تذکرے سے محروم رہ گئے ہیں۔ واضح رہے کہ تقسیم ہند تک موجودہ پاکستانی علاقوں میں ضلعی سربراہ ڈپٹی کمشنر کہلاتا ہے جب کہ باقی ماندہ ہندوستان میں اس کو کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہتے تھے۔ کلکٹر کا نائب ڈپٹی کلکٹر کہلاتا تھا۔ یہ دونوں عہدے ۱۹۳۵ء تک ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے لئے شجر ممنوعہ تھے لیکن آگرہ و نواح آگرہ کے سادات و مومنین میں تین کمشنر بندوبست ، چار کلکٹرز اور ۱۸ ڈپٹی کلکٹرز فقط ۱۸۵۰ء اور ۱۹۴۰ء کی نوے سالہ مدت میں ہوئے۔ یہ ہی سبب تھا کہ ماہنامہ شیعہ کھجوہ (بہار) کو اپنے شمارے مارچ ۱۹۱۴ء میں لکھنا پڑا کہ " جتنے مقتدر اور صاحب ثروت سادات شاہ گنج آگرہ میں بستے ہیں کسی اور مرکز سادات میں نہیں ہوتے۔ "

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اول

اسلام اور اس کی قیادت

انبیائے کرام کا دین

اک وقت تھا کہ وقت کا وجود ہی نہ تھا۔ کون ومکان تھے نہ زمین وآسماں۔ فقط اللہ کی ذات قدیم تھی اور کچھ نہ تھا۔ پھر اس نے چاہا کہ اس کی معرفت ہو تو نور محمدیؐ کو خلق فرمایا۔ یہ نور دراصل پانچ انوار کا مجموعہ تھا۔ یہ ہی آفرینش کا نقطۂ آغاز تھا۔ پھر انوار وارواح ملائکہ وانبیاءؑ کو خلعت وجود عطا ہوا۔ اس کے بعد عمومی ارواح اور مادہ کی پیدائش ہوئی۔ آسمانوں پر فرشتے اور زمین پر جنات (بنی جان) تھے۔ مؤخر الذکر نے زمین پر فتنہ وفساد اور کشت وخون کا بازار گرم کردیا جس کے نتیجے میں پوری قوم جن پر عذاب الہیٰ نازل ہوا اور وہ غارت کردی گئی سوائے چند نیکوکاروں کے جن کو بچا لیا گیا۔ ان ہی میں سب سے زیادہ عبادت گزار فرد کو صفوف ملائکہ میں شامل کردیا گیا۔ یہ عزازیل تھا۔ کائنات کی تزئین ہوچکی تو خالق نے فرشتوں کے مابین اعلان کیا کہ " میں زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔" ملائکہ نے جو زمین میں جنات کی قتل وغارت گری دیکھ چکے تھے، بعض معروضات پیش کیں جن کو خالق علیم وحکیم نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ " جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔" فرشتے خاموش ہوگئے۔ پھر خالق نے خاک وآب سے ایک خاص پیکر تیار کیا اور ملائکہ سے ارشاد فرمایا کہ " جیسے ہی میں اس میں اپنی روح پھونک دوں، تم سب سجدے میں جھک جانا۔" یہ ابوالبشرؑ حضرت

آدمؑ تھے۔ تمام فرشتے سجدہ تعظیمی میں خم ہوگئے سوائے عزازیل کے جس نے سجدے سے انکار کردیا۔ (۱) رب العالمین نے اس سے انکار کی وجہ پوچھی اور کہا "کیا تو نے خود کو عالیین میں سمجھا۔" عزازیل نے عالیین (بڑے عزت دار لوگوں) میں ہونے کی تو جسارت نہ کی مگر آدم پر اپنی برتری کے دعویٰ پر قائم رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شیطان وابلیس قرار دے کر عالم بالا سے نکال دیا۔ وہ نکل تو گیا مگر اس نے دعویٰ کیا کہ "وہ نسل آدم سے بدلہ لے گا اور صراط مستقیم پر بیٹھ کر قیامت تک اولاد آدم کو گمراہ کرتا رہے گا۔" خالق حکیم نے اس کی درخواست پر "اسکو وقت معلوم تک کی مہلت دیدی" اور فرمایا کہ "تو میرے مخلص بندوں کو بہکانے میں ناکام رہے گا۔" اس کے بعد آدمؑ اور ملائکہ کا امتحان لیا گیا جو اسمائے پنجتن پاکؑ کو ان کے انوار پر منطبق کرنے سے متعلق تھا۔ آدمؑ کامیاب اور فرشتے ناکام رہے۔ فرشتوں پر آدم کی فضیلت واضح ہوگئی۔ (۲) "آدم کے پیکر سے بچی ہوئی مٹی سے حوا کی خلقت کی گئی"۔ (۳) بعدہ ان دونوں کو جنت میں قیام کے لئے بھیج دیا جہاں ایک خاص درخت کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔ حضرت آدمؑ سے ترک اولیٰ ہوا جس کی پاداش میں آپ کو مع حضرت حوا زمین پر اتار دیا گیا جہاں ایک وقت تو بہرحال ان کو آنا ہی تھا۔ "آدم نے توبہ کی۔ اللہ نے آدم کو کچھ کلمات سکھلائے جن کے طفیل میں توبہ قبول ہوئی۔" (۴) علامہ سیوطی کی "درمنثور" جلد اول ۶۰-۶۱ مطبوعہ میمونہ مصر ۱۳۱۴ ہجری (جو مکتب العلوم لائبریری ناظم آباد کراچی میں دستیاب ہے) تفسیر صافی اور بحار الانوار جلد ۶ میں علامہ مجلسی کی تشریحات کی رو سے یہ اسماء اور کلمات پنجتن پاکؑ کے اسمائے گرامی تھے اور عالیین بھی یہی بزرگ ہستیاں تھیں۔

حضرات آدمؑ وحوا زمین پر تشریف لائے۔ اللہ نے ان کی نسل کو بڑی وسعت عطا کی اور وہ خوب پھلی پھولی۔ آپؑ کے بہت سے بیٹوں میں ہابیل

اور قابیل بھی تھے۔ ہابیل کی بلند کرداری سے قابیل کی پست فطرتی کو حسد پیدا ہوگیا اور قابیل نے ہابیل کو قتل کردیا۔ زمین پر یہ پہلا انسانی خون تھا جو بہایا گیا اور یہ ہی پہلا کار ابلیسی بھی تھا۔ اب خیروشر اور حق و باطل کا وہ تصادم شروع ہوگیا جس کا شیطان نے اپنے اخراج کے وقت اعلان کیا تھا۔ چنانچہ تقاضائے عدل تھا کہ نوع بشر کو ابلیس کے شر سے بچانے کی خاطر اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ایسا انتظام کردے جو انسان پر حجت بھی ہو اور شیطنت کے واسطے میدان بھی خالی نہ رہے۔ لہذا پروردگار عالم نے نوع بشر کو عقل سلیم کی عطا پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنی طرف سے ہادیان انسانیت مقرر کرنے کا بندوبست بھی فرمایا۔

مندرجہ بالا آیات قرآنی کے حوالوں سے درج ذیل اہم نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ زمین پر اپنا نمائندہ (خلیفہ، رسول، امام) مقرر کرنا فقط اللہ کا کام ہے۔ اس میں کسی نبیؑ یا رسولؑ کی مرضی کو بھی دخل نہیں چہ جائیکہ کسی نبی کی امت یا امتی کو یہ حق دیا جاسکتا ہے۔ دوم یہ کہ کچھ بڑے عزت دار لوگ (عالیئین) موجود تھے جو سجدہ آدمؑ سے مستثنیٰ تھے۔ سوم یہ کہ آدم اور فرشتوں کا امتحان قطعی برابری کا تھا کہ دونوں کو اسمائے پنجتنؑ پاک بتلائے تھے اور ان کو انوار پنجتنؑ پر منطبق کرنا تھا جو عرش الہیٰ پر چمک رہے تھے۔ چہارم یہ کہ اللہ عالم الغیب ہے پھر بھی وہ شیطان سے انکار سجدہ کی وجہ پوچھتا ہے لہذا آئندہ کسی نبی یا امام کو اس قسم کی صورتحال پیش آئے تو اسکو ان کی لاعلمی سے تعبیر نہ کیا جائے۔ پنجم یہ کہ باپ سے شکست کھا کر اس کی اولاد سے انتقام لینا ابلیسی ذہنیت کی پیروی ہے جو تاریخ اسلام کے بعض اہم واقعات میں نظر آتی ہے۔

مختلف ادوار اور اقوام میں جتنے ہادیان انسانیت مقرر ہوئے وہ سب اللہ کے منتخب بندے اور انسانوں میں ہر اعتبار سے صاحبان فضیلت تھے۔

ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ یہ ممتاز حضرات ایک ہی گروہ حق سے تعلق رکھتے تھے اور سب کے سب تبلیغ دین وحق پر مامور تھے۔ تاہم جن درمیانی مدتوں میں کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں کیا گیا اس زمانے میں بھی ہدایت انسانی کا اہتمام کیا جاتا رہا اور امتوں میں دین وحق پر قائم رہنے والے مخصوص افراد کا کوئی نہ کوئی گروہ موجود رہا۔ یہ ہی وہ حضرات ہیں جن کو انبیاء کا وارث اور وصی قرار دیا گیا۔ نص قرآنی کے مطابق اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہے۔ یہ ہی تمام انبیاء اور وارثین انبیاء کا دین ہے۔ تاہم تمدن انسانی کے ارتقائی مراحل اور ضروریات بشری کے تقاضوں کے باعث شریعتوں میں کچھ اختلاف بھی ہے لیکن اپنی تعلیمات کے جوہر وروح کے اعتبار سے سب کے سب توحید کے علمبردار، حق کے مبلغ اور دین اسلام کے داعی تھے۔ ناز اکبرآبادی کا شعر ہے۔

تعلیم انبیاءؑ میں نہیں کوئی اختلاف
لے تو جدا جدا ہے مگر ساز ایک ہے

قرآن حکیم کی آیات اس کی دلالت پر صاد کرتی ہیں اور ان کو مسلم، مسلمان اور امت مسلمہ میں شمار کرتی ہیں۔ سورہ بقرہ ۱۲۷۔۱۲۹ کے مطابق حضرات ابراہیمؑ و اسمعیلؑ نے کعبہ کی تعمیر نو کے وقت اپنی مشترک ذریت میں سے امت مسلمہ اٹھانے اور ان میں ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی جس کی منصبی ذمہ داریوں کی نشاندہی بھی کر دی تھی جو سورہ جمعہ میں قبولیت دعا کے طور پر رسولؐ ہاشمی وامیؐ کے خصوصی فرائض سے متعلق ہیں سورہ آل عمران ۶۷ کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ باطل سے کترا کر چلنے والے سچے مسلمان تھے۔ سورہ آل عمران ۵۲ اور سورہ مائدہ ۱۱۱ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے مسلمان ہونے کا اقرار کیا تھا۔ سورہ انبیاء ۹۲ میں ارشاد ہوا کہ یہ تمہارا گروہ ایک ہی گروہ ہے اور اللہ

تمہارا پروردگار ہے (یہ تمام انبیاء کا ایک ہی امت مسلمہ میں ہونے کی دلیل ہے) سورہ حج ۷۸ میں حکم ہوا کہ اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو جیسا حق جہاد ہے کہ تمہیں منتخب کرلیا ہے۔ تم ابراہیم کی ملت ہو اور اس نے پہلے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا تھا (اس کا مصداق آل محمدؑ ہیں)۔ سورہ انعام ۱۶۱۔ ۱۶۳ میں رسول کو حکم ہوا کہ کہہ دو کہ مجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کی گئی ہے جو صحیح دین ابراہیم حنیف کی ملت ہے۔ میری پوری زندگی اللہ کے لئے ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں۔

ان آیات سے قطعی واضح ہوجاتا ہے کہ تمام انبیاءؑ دین اسلام ہی کے داعی اور پیروکار تھے اور سب ایک ہی گروہ حق کے افراد تھے جو امت مسلمہ کے نام سے مختص ہوا۔ انبیاءؑ کے بعد ان کے حقیقی جانشین اور وارث ہر زمانے میں موجود رہے جو الہیٰ سلسلۂ ہدایت کا تسلسل تھا۔ یہ ہی اوصیائے انبیاء کا وہ گروہ ہے جو ہر عہد میں شرک وظلم اور شراب وبدکاری سے دور رہا۔ ان میں حلال وحرام کا تصور بھی موجود تھا جیسا کہ ابن ہشام اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ "کعبۃ اللہ کی مرمت کے وقت قریش کی ایک ممتاز شخصیت نے کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ اے گروہ قریش! خیال رکھنا کہ اس تعمیر میں تمہاری حلال کمائی کے سوا کوئی حرام کا پیسہ مثلاً زنا کاری کا معاوضہ، سود کی رقم اور کسی سے خرد برد کیا ہوا مال نہ لگنے پائے۔" یہ اعلان واتنباہ کرنے والے ابووہب بن عروہ بن عمران بن مخزوم تھے جو رسالتمآبؐ کی دادی کے بھائی تھے۔ (۵)

اگرچہ تمام انبیاء مسلمان اور امت مسلمہ ہی کے افراد تھے تاہم شریعتوں میں بعض اختلافات، توریت وانجیل میں تحریفات اور انبیاء کی اصل تعلیمات سے انحراف کے باعث حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ کی امتوں کا راستہ مختلف ہوگیا اور وہ امت مسلمہ سے کٹ کر یہود ونصاریٰ کہلائے۔ قرآن مجید

کی آیات اس کا واضح اعلان کرتی ہیں ۔ سورہ مائدہ ۱۲ ۔ ۱۳ میں یہود و نصاریٰ کی عہد شکنی اور اپنے نبی کی تعلیمات کو بھلا دینے کا الزام موجود ہے۔ نیز اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے خطاب ہے کہ تمہارے پاس ہمارا رسول کتاب اور نور کے ساتھ آیا ہے جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔ وہ ہمارے احکام تم تک واضح طور پر پہنچاتا ہے اور وہ سب کچھ کھول کر بیان کرتا ہے جسے تم کتاب میں سے چھپاتے تھے۔ سورہ مائدہ ۵۱ میں صاحبان ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو دوست نہ رکھیں کہ یہ ظالم امتیں ہیں ۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ جادہ حق سے ہٹی ہوئی گمراہ اور ظالم امتیں ہیں جو مسلمانوں کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے۔ لہذا حضورؐ رسالتمآب کے عہد نبوت میں یہودیوں اور نصرانیوں کے علاوہ جو معدودے چند افراد دین ابراہیمی پر قائم تھے بس وہی سچے مسلمان تھے اور امت مسلمہ کا تسلسل بھی ۔ یہی وہ دیندار اور حق پرست جماعت تھی جو آباء واجداد رسول ہاشمیؐ پر مشتمل تھی ۔ اس گروہ کے اسلاف اور اخلاف دونوں نے دین اسلام اور اللہ کے نبی آخرالزماںؐ کی حفاظت و حمایت میں قربانیوں اور فداکاریوں کی وہ عظیم الشان داستان رقم کی ہے جو سادہ و رنگین بھی ہے اور منفرد و بے مثال بھی ۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتداء ہے اسمٰعیلؑ

بنی ہاشم کی وراثت انبیاء

قرآن حکیم کی مندرجہ بالا آیات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی دعا ، اس کی قبولیت ، مشترکہ ذریت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ میں امت مسلمہ کا قیام ، رسولؐ امی کی بعثت امامت و خلافت الہیہ کی تشریحات سے یہ بات قطعی

صاف ہوجاتی ہے کہ حضور اکرمؐ تک جو وراثت انبیاء پہنچی اس کے محترم سلسلے کی پہلی کڑی جناب قیدار اور آخری کڑی حضرت ہاشم تھے۔ آخرالذکر کے جلیل القدر فرزند اور حضرات عبداللہ وابوطالب کے پدر بزرگوار حضرت عبدالمطلب تھے۔ جناب ہاشم کے پیش رو بزرگوں کا سلسلہ حضرت اسمعیلؑ بن حضرت ابراہیمؑ تک جاتا ہے۔ ان ہی کی نسل میں حضرت محمد مصطفیٰؐ آخری رسولؐ ہوئے۔

تاریخ اسلام جلد اول اور شہید انسانیت مصنفہ علامہ سید علی نقی مجتہد کی تحریر کی روشنی میں حضرت اسمعیلؑ کے دم قدم سے بے آب وگیاہ سرزمین مکہ آباد وشاداب ہوئی ۔ چشمۂ زمزم نمودار ہونے کے باعث قبیلۂ جرہم مکہ میں آباد ہونے والا پہلا قبیلہ تھا۔ اسی میں آپؑ کی پرورش ہوئی اور ازدواجی رشتہ قائم ہوا۔ آج سارے عالم میں آل اسمعیلؑ ہی عظمت وافتخار کا نشان تسلیم ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کے وعدے کی تکمیل بھی تھی جو اس نے حضرت ابراہیمؑ سے کیا تھا۔ تورات ، سفر تکوین باب ۱۷ میں مذکور ہے " اور میں نے اسمعیلؑ کے بارے میں تیری بات سنی ۔ میں اس کو برکت اور کشادگی دونگا۔ اس سے بارہ سردار ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ " نسل اسمعیلؑ کے خاص افراد کے لئے سردار (سید) کی اصطلاح استعمال ہوئی جو آج تک آلؑ رسولؐ کے لئے لفظ " سادات " سے مخصوص ہے۔ سادات کا اختصاص حضرت علیؑ وفاطمۂ زہرا کی مشترکہ اولاد سے شہرہ آفاق ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ " ہر نبی کی ذریت کو اللہ نے اس کے صلب میں رکھا اور میری ذریت کو علیؑ کے صلب میں ۔ " نیز یہ کہ " تمام لڑکیوں کی اولاد اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے سوائے فاطمہؑ کے کہ ان کا باپ میں ہوں ۔ " (۶) شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ " آنحضرتؐ کی ذریت مندرجہ بالا میں یہ راز ہے کہ حضرت علیؑ آنحضرتؐ کی صورت مثالی تھے یا عینک مطالعہ ان

کی نسبت آنحضرت سے ایسی ہے جیسی کہ فروع کی اصل سے یا ظل کی صاحب ظل سے۔" جیسا کہ فضائل صحابہ واہلبیت۔ عزیز الاقتباس صفحہ ۱۸۲ اردو ترجمہ محمد ایوب قادری میں درج ہے۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ " اللہ نے اولاد اسمٰعیلؑ کو جمیع اقوام عالم میں برگزیدہ فرمایا۔ ان میں قریش کو، قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں مجھے فضیلت دی۔" آپؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سے فرمایا کہ " اے فاطمہؑ! میں نے اپنے خاندان میں افضل ترین شخص (علیؑ) سے تیرا عقد کیا ہے۔" (۷) عصر جدید کے مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی رقم طراز ہیں کہ " بنو عباس، بنوہاشم تو ضرور ہیں لیکن وہ آنحضرتؐ کے چچا کی اولاد ہیں، آنحضرتؐ کی بیٹی کی اولاد نہیں ہیں یعنی سادات نہیں ہیں۔ سادات کو خاندان نبوت کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان میں آنحضرتؐ کا خون حضرت فاطمہؑ کے ذریعے شامل ہے جب کہ عباسیوں میں اس خون کی آمیزش نہیں ہے لہذا عباسیوں کو خاندان نبوت نہیں کہا جاسکتا۔ (۸)

حضرت اسمٰعیلؑ کے بہت سے فرزندوں میں جناب قیدار کی شخصیت اہم ہے۔ آپ ہی کی اولاد حجاز میں پھلی پھولی۔ آپ ہی رسولؐ ہاشمی وامی کے جد تھے۔ جناب قیدار کے پوتے جناب معد تھے جن کی نسل حجاز ہی میں آباد رہی ان ہی کی نسل میں کنانہ تھے جن کے فرزند نضر کی اولاد میں مالک ہوئے جو بنی ہاشم کے مورث ٹھہرے۔ مالک کے بیٹے فہر تھے جن کا لقب قریش تھا۔ ان ہی میں کلاب بن مرہ تھے۔ ان کے بیٹوں میں قصیٰ تاریخ عرب میں اہم ترین فرد شمار ہوئے۔ یہ بڑے مدبرانہ اور حکیمانہ دماغ کے مالک تھے۔ ان کے اقوال واحکام قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے قریش کی شیرازہ بندی کی اور اطراف کعبہ میں ان کو آباد کیا۔ کعبہ کی تولیت ان کے پاس آئی اور یہ دینی اور دنیوی امور دونوں کا مرکز قرار پائے۔ ان کے بیٹوں میں

عبد مناف اور عبد الدار نے شہرت پائی ۔ جناب عبد مناف نے تو جناب قصیٰ کی زندگی ہی میں اہمیت اور شہرت پالی تھی ۔ آپ کا اصل نام مغیرہ تھا۔ آپ کے چار فرزند ہاشم ، عبد شمس ، مطلب اور نوفل تھے۔ جناب ہاشم کا اصل نام عمرو تھا۔ آپ نہایت فیاض اور مہمان نواز تھے۔ آپ ہی جناب عبد مناف کے حقیقی جانشین بھی تھے۔ عبد شمس کے متبنیٰ بیٹے امیہ نے آپ سے حسد رکھا اور ° اظہار فضیلت ° کی مروجہ رسم میں آپ سے شکست کھا کر دس سال تک شام میں جلاوطن رہا۔ امیہ سے بنی امیہ اور ہاشم سے بنی ہاشم کی بنیاد پڑی ۔ تاریخ اسلام پر ان کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔ بنی ہاشم کے ساتھ بنی امیہ کی عداوت نے بڑے المیوں اور دلدوز واقعات کو جنم دیا۔

جناب ہاشم کے چار بیٹے تھے ان میں حضرت عبدالمطلب نے بڑی شہرت و عظمت پائی ۔ آپ کا اصل نام شیبۃ الحمد تھا آپ کو سید البطحا ، کا خطاب ملا ۔ ° دنیوی اور قومی برتری کے علاوہ آپ کو یہ شرف بھی ملا کہ چشمہ زمزم آپ کی دعا اور کوشش سے پھر سے نمودار ہوا ۔ بہت سے غائب شدہ تبرکات پھر دستیاب ہوئے اور حجاج کی سہولت کے بہت سے کام انجام پائے۔ ° (۹) واقعۂ فیل آپ ہی کی سرداری مکہ کے عہد میں پیش آیا۔ ابرہہ سے آپ کا مکالمہ اور اس کے لشکر کی تباہی میں آپ کی قبولیت دعا کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ ° آپ کو یہ منفرد اعزاز بھی ملا کہ آپ نے اپنے پوتے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پرورش فرمائی اور آنحضرتؐ کی جلالت شان کے بارے میں پیش گوئی کی تھی ° (۱۰) تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو توحید و رسالت پر یقین تھا اور اللہ کے رسول کی معرفت حاصل تھی ۔ اپنی وفات کے وقت آپ نے حضرت ابو طالب (عمران) کو رسولؐ کی حفاظت و تربیت کا ذمہ دار قرار دیا جو حضرت ابو طالب کی پاکیزہ سیرت اور عظمت کردار کی بین دلیل ہے۔ حضرت عبدالمطلب کے دس بیٹوں میں حضرت ابو طالب

اور حمزہؓ کو تاریخی اہمیت حاصل ہوئی۔

حضرت عبدالمطلب کی وفات کے وقت آنحضرتؐ کا سن شریف فقط آٹھ سال تھا اور آپؐ جو پہلے ہی در یتیم تھے، کی ساری تربیت ونگہداشت کی مکمل ذمہ داری جناب ابو طالبؑ اور ان کی زوجہ محترمہ فاطمہ بنت اسدؑ کے کاندھوں پر آن پڑی۔ اللہ کے رسولؐ نے ان دونوں کی خدمات جلیلہ کا بار بار اعتراف کیا۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا کہ "اے رسول! تم یتیم اور بے سہارا تھے ہم نے تمہاری نگہداشت کی اور سہارا دیا۔" تربیت ونگہداشت تو حضرت ابو طالبؑ کر رہے تھے مگر اللہ نے ان کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا اور اللہ کسی بندے کے عمل کو اپنی طرف منسوب نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ بندہ پاکیزہ سیرت اور دین وحق کا حامل نہ ہو۔ سورہ المومن ۲۴۔۲۲ کی رو سے جناب ابو طالب اسی طرح سے مومن قریش ہیں جس طرح جناب حزقیل مومن آل فرعون تھے۔ آنحضرتؐ اور حضرت خدیجتہ الکبریٰؑ کے عقد نکاح کے وقت جو خطبہ آپ نے ارشاد فرمایا وہ آپ کی معرفت اللہ ورسولؐ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپؑ نے فرمایا "ہر تعریف اللہ کے لئے ہے جو عالمین کا رب ہے جس نے ہمیں نسل ابراہیمؑ اور ذریت اسمٰعیلؑ میں قرار دیا۔ ہمارے لئے ایک گھر بنایا جس کا حج کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے اس شہر میں جہاں ہم ہیں، ہمیں خلق کے قضایا کا طے کرنے والا حاکم بنایا۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اس ہستی (حضرت محمد مصطفیٰؐ) کی ایک عظیم الشان بلند منزل اور مقبول بارگاہ خدا بات ہے جو بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ (۱۱)

بنی ہاشم میں آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱، عام الفیل مطابق ۵۷۰ء میں ہوئی۔ سرولیم میور کے بقول۔ "آپؐ کی اس دنیا میں آمد کے وقت ایک آسمانی روشنی نے ملک عرب کے اطراف کو منور کردیا تھا۔ نومولود بچے نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر پکارا کہ "اللہ بڑا ہے"

کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے اور میں اس کا رسول ہوں۔" (۱۲) اس واقعہ کے باوجود یہ کہنا کہ آپ چالیس سال کی عمر میں نبی ہوئے، کج فہمی کی دلیل ہے۔ بظاہر آپؐ کی رسالت کی عمر فقط تئیس سال ہے مگر آپؐ تو اپنی حدیث کی روشنی میں اس وقت بھی نبی تھے جب کہ آدمؑ ابھی آب وخاک کے مابین تھے۔ نازاکبر آبادی کا شعر ہے۔

سوچو تو زمانے کا تعین نہیں ممکن
دیکھو تو بہت کم ہے تری عمر رسالت

قریش میں بنی ہاشم پہلے ہی صاحب جلالت تھے۔ رسول ہاشمی کی نبوت سے ان کے اعزاز میں بے حد اضافہ ہوگیا جس کو بعض دیگر قبائل بالخصوص بنوامیہ برداشت نہ کرسکے۔ انہوں نے تبلیغ دین کی راہ میں سنگین رکاوٹیں کھڑی کیں اور وفات رسولؐ سے دو سال قبل (فتح مکہ) تک جنگ وجدال کا سلسلہ بھی جاری رکھا، مگر رسولؐ کی حقانیت، اللہ کی نصرت اور حضرات ابوطالبؑ، حمزہؓ وعلی مرتضیٰؑ کی حمایت و فداکاریوں کے باعث ناکام رہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندان بنوامیہ اپنے حریف (ہاشم) کی بڑی فتح خیال کرتا تھا۔ اسی لئے نسب سے زیادہ اس قبیلے نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی۔" (۱۳)

بنی ہاشم اور ان کے اسلاف کا سلسلہ جناب قیدار سے حضرت ابوطالب تک نیابت انبیاءؑ کے ضمن میں تواتر کے ساتھ جاری رہا اور اسی گروہ حق سے امت مسلمہ کا تسلسل بھی برقرار رہا۔ سورہ جمعہ میں ارشاد ہوا کہ "ہم نے امیوں میں ان ہی میں سے ایک رسولؐ مبعوث کیا ہے جو آیات کی تلاوت کرتا، نفوس کو پاک کرتا اور علم وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ امیوں سے مراد مکہ کے پرانے باشندے ہیں کیوں کہ مکہ کو "ام القریٰ" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ انعام ۹۲ سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی نسبت سے اہل مکہ

امی کہلائے۔ امی کا مطلب جاہل ہرگز نہیں ہے ورنہ ایک جاہل علم و حکمت کی معلمی کے فرائض کیونکر انجام دے سکتا تھا۔ ان امیوں کا، جن میں رسولؐ مبعوث ہوئے مسلمان اور صاحب ایمان ہونا لازمی قرار پاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران ۱۶۴ میں ارشاد ہوا کہ "اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ہے کہ اس نے ان میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔" لہذا آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت ایک گروہ مومنین موجود ہونا چاہیئے جن میں سے رسولؐ مبعوث کیا گیا اور جس کو اللہ نے مومنین پر اپنا احسان قرار دیا۔ یہ واضح دلیل ہے کہ آباء واجداد رسول ہی وہ مومنین تھے جن میں سے رسول مبعوث ہوئے۔ سورہ قصص ۵ میں ارشاد ہوا کہ "ہمارا ارادہ ہے کہ ان پر احسان کریں جن کو زمین میں کمزور کر دیا گیا اور انہیں امام بنائیں اور اپنا وارث قرار دیں۔" تفسیر صافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ و حسنینؑ کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے فرمایا کہ "تم ہی ہو جو میرے بعد کمزور کر دیئے جاؤ گے اور یہ کہ تم ہی میرے بعد امام اور میرے وارث ہوگے۔" یہ آیات قرآنی اعلان کر رہی ہیں کہ بنی ہاشم میں ایک مخصوص جماعت انبیاء کی وراثت اور رسولؐ ہاشمی کی نیابت کی حقدار تھی۔ ان ہی کو آلؑ محمدؐ یا اہلبیتؑ کا مخصوص نام دیا گیا ہے۔

آل عمران اور خلافت و امامت الہٰیہ

سورہ آل عمران ۳۲۔۳۳ کی رو سے: "اللہ نے آدم کو، نوح کو، آل ابراہیم کو اور آل عمران کو عالمین میں منتخب کرلیا ہے جو ایک دوسرے کی نسل میں سے ہیں۔" ان آیات کے مطابق حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کا انتخاب انفرادی ہے جب کہ آل ابراہیم اور آل عمران کا انتخاب اجتماعی ہے۔ آل ابراہیمؑ کی اصطلاح حضرت ابراہیمؑ سے حضرت محمد مصطفیٰؐ تک تمام انبیاء کا احاطہ کرتی ہے۔ آل عمران کے مفہوم میں جو پیچیدگی پیدا ہوئی وہ حضرت

موسیٰ کے والد اور حضرت عیسیٰ کے نانا کے باعث ہوئی کہ دونوں کا نام عمران تھا۔ لیکن یہ دونوں رسول تو آل ابراہیم میں شامل ہیں اور ان کی امتوں کو یہود و نصاریٰ کے مخصوص نام سے پکارا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کی نسل میں نبی تو ہوئے مگر کوئی امام نہ ہوا جب کہ حضرت عیسیٰ کی ذریت ہی نہ تھی۔ لہذا آل عمران کا مصداق ان دونوں رسولوں کی ذریت ہو ہی نہیں سکتی یقیناً آل عمران سے مراد آل محمدؑ ہیں جو آل ابی طالبؑ بھی ہیں کہ حضرت ابو طالبؑ کا اسم گرامی عمران تھا۔ حضرت ابو طالب کے فرزند ارجمند اور افضل المرسلین کی بھتیجی بیٹی۔ علیؑ و فاطمہؑ علیہم السلام کی مشترکہ نسل کو آل محمدؑ ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ ہی آل ابی طالبؑ یعنی آل عمران بھی ہیں۔ اس کی دلیل درود شریف سے ملتی ہے کہ اس میں آل محمدؑ پر اسی طرح درود وسلام اور رحمت وبرکت کی بات کی گئی ہے جس طرح آل ابراہیم کے ضمن میں کی گئی تھی گویا یہ واضح کر دیا گیا کہ آل عمران کی اصطلاح کا مصداق آل محمدؑ ہیں جو آل ابی طالبؑ (عمران) کے مخصوص افراد ہیں اور یہ حضرات علیؑ وفاطمہؑ کی مشترک اولاد میں محدود ہیں۔ اس لئے آل عمران سے مراد حضرات علیؑ و فاطمہؑ کی مشترک ذریت میں وہ مخصوص افراد ہوں گے جو آیۂ تطہیر کے مطابق ہر نجاست اور برائی سے مبرا ہوں یعنی معصوم ہوں۔ نیز منصب امامت کے لئے شرک وظلم سے دوری لازمی قرار دی گئی ہے اور چونکہ آل محمدؑ ہر برائی اور نجاست سے پاک ہیں اس لئے شرک وظلم کا ان پر سایہ بھی نہیں پڑسکتا۔ سورہ بقرہ ۲۴۔ ۳۹ / ۲۲۴ اور سورہ لقمان ۲۰ کی رو سے کافر، مشرک اور گناہگار سب ظالم ہیں اور سورہ اعراف ۵ کے مطابق ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے لہذا کوئی لعنتی شخص اللہ کے اس عہدہ جلیلہ امامت کا اہل نہیں ہوسکتا۔ یہ ہی امام کے معصوم ہونے کی واضح دلیل فراہم کرتا ہے۔ کوئی غیر معصوم انسان خواہ وہ کتنا ہی متقی اور مومن ہو اس منصب الٰہی کا

متحمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں رسالتمآبؐ کے بزرگ اور پیش رو حضرات کا دامن کبھی بھی شرک اور ظلم سے آلودہ نہیں ہوا جیسا کہ سورہ ابراہیم ۳۵ ۔ ۴۱ کے مطابق ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ " میں نے اس بے آب وگیاہ ویرانے (سرزمین مکہ) میں تیرے محترم اور پاکیزہ گھر کے نزدیک اپنی بعض اولاد کو آباد کیا ہے۔ تو ہمیں شرک سے بچائے رکھ تاکہ ہم تیری نماز قائم رکھیں اور تیرے شکر گزار بندے بنے رہیں اور جو میری پیروی کرے بے شک وہ مجھ سے ہے۔ قیامت کے دن تو مجھے ، میری اولاد کو (جو حق پر ہوں) اور مومنین کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لینا۔ " لہذا جو لوگ نسل ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ میں دین ابراہیمی پر تھے وہ شرک سے دور تھے اور عبادت گذار اور شکر گذار بندے تھے۔ امالی میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ " حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا مجھ تک اور میرے بھائی علیؑ تک پہنچی کہ ہم نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ " ظلم سے نفرت خاندان رسالت کا طرہ امتیاز رہا ہے ۔ " حلف الفضول جو بعثت سے کافی عرصہ قبل قبائل عرب کے مابین ایک انتہائی شریفانہ اور منفرد عہد نامہ لکھا گیا تھا کہ ظالم کو ظلم سے روکیں گے اور مظلوم کی حمایت ودادرسی کریں گے۔ اس عہد نامہ کے روح رواں بنی ہاشم تھے۔ خود آنحضرتؐ نے بھی اس پر دستخط کئے تھے اور عہد جاہلیت کے فقط اس عہد نامہ کو باقی رکھا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی اس کی بنیاد پر کوئی مجھے پکارے تو میں لبیک کہوں گا۔ جناب زبیر بن عبدالمطلب اس کے داعی تھے۔ بنی امیہ نے اس عہد نامہ پر دستخط نہیں کئے تھے ۔ " (۴۳) علاوہ ازیں امامت وخلافت دراصل رسالت ونبوت کے مشن کی توسیع کا نام ہے اور رسالت رسول ہاشمیؐ پر رک رہی تھی جب کہ امامت کو قیامت تک جاری رہنا تھا۔ اس لئے ایک ایسے سلسلہ ہدایت کی ضرورت

تھی جو رسولؐ کے بعد کتاب خدا کی تعلیم و تفسیر سنت نبیؐ کی حفاظت اور شریعت محمدیؐ کی پاسبانی کے فرائض انجام دے سکے ۔ یہ ضرورت سلسلہ امامت وخلافت الہیہ ہی سے پوری ہو سکتی تھی جس کا اللہ نے اپنے خلیل (حضرت ابراہیمؑ) سے وعدہ بھی کیا تھا۔ اسکی تکمیل اس طرح سے ہوئی کہ اللہ کے دین اور اس کے رسولؐ پر حضرت ابو طالبؑ (عمران) حضرت فاطمہ بنت اسد اور ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؑ کے عظیم احسانات تھے جن کو اتارنے کا اللہ نے خاص اہتمام کیا کہ ان دونوں ہستیوں کے ممتاز ترین افراد یعنی علیؑ وفاطمہؑ کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا اور ان کی مشترک ذریت میں عہدہ امامت کو مختص کر دیا گیا۔ یہ دعائے ابراہیمی کی قبولیت بھی تھی اور وعدہ الہیٰ کی تکمیل بھی کہ "ہم اپنے مخلص بندوں کو زمین اور کتاب کا وارث بنائیں گے۔"

آیات قرآنی اور مستند احادیث رسولؐ اس استدلال کی تصدیق کرتی ہیں ۔ مثلاً سورہ المومنون ۴، ۔ ۴۷ میں تفاسیر صافی وقمی کی رو سے "صراط مستقیم" سے مراد حضرت علیؑ کی ولایت ہے۔ خود حضرت علیؑ کا قول ہے کہ اللہ نے اپنی معرفت کے لیئے ہمیں اپنا دروازہ، صراط مستقیم اور سبیل قرار دیا ہے۔ پس ہماری ولایت سے منحرف لوگ ہی سیدھی راہ سے ہٹ جانے والے ہیں۔ سورہ آل عمران ۶ میں "راسخون فی العلم" سے مراد آلؑ محمدؐ ہیں۔ سورہ صٰفٰت ۱۳ ر، سلامٌ علیٰ آلِ یٰسین کا مصداق آلؑ محمدؐ ہیں کیونکہ یٰسین آنحضرتؐ کا اسم گرامی ہے نیز سورہ یٰسین کے آغاز میں لفظ یٰسین آیا ہے جس کا مصداق حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ذات اقدس ہے۔ تفاسیر قمی وصافی میں امیرالمومنینؑ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آل یٰسین سے مراد آلؑ محمدؐ ہیں ۔ سورہ شعراء ۸۴ میں "لسان الصدق" کا مصداق حضرت علیؑ ہیں ۔ سورہ رعد ۴۳ میں "عندہ ام الکتاب" کو حضرت علیؑ نے اپنی سب سے

بڑی فضیلت قرار دیا ہے۔ سورہ آل عمران ۱۲ / ۱۵۳ میں " حبل الناس " اور " حبل اللہ " سے مراد حضرت علیؑ اور آل محمدؑ ہیں۔ سورہ اعراف ۴۴ - ۴۶ میں " رجال اللہ " سے مراد آئمہ اہلبیت اور " موذن " کا مصداق حضرت علیؑ ہیں۔ سورہ روم ۲۷ میں " المثل الاعلیٰ " کا مصداق حضرت علیؑ ہیں جیسا کہ " العیون " میں امام علی رضا سے منقول ہے۔ سورہ ہود ۱۷ میں **یتلوہ شاھد منہ** کے ضمن میں تفاسیر البیان وعیاشی کی رو سے وہ دلیل حضرت محمد مصطفیٰ اور گواہ حضرت علیؑ ہیں۔ سورہ تحریم ۱ - ۵ میں " صالح المومنین " سے مراد حضرت علیؑ ہیں جیسا کہ علامہ سیوطی نے " درمنثور " جلد ششم ۲۴۴ پر تحریر کیا ہے۔ سورہ انعام ۱۹ میں ہے " میرے بعد وہ ڈرائے جس کو یہ قرآن پہنچے۔ " اس سے مراد آئمہ اہلبیتؑ ہیں جیسا کہ تفاسیر مجمع البیان ، صافی ، شافی اور عیاشی میں درج ہے۔

مشہور و معتبر اور مستند احادیث رسولؐ آیات بالا کی تصدیق وتشریح کرتی ہیں مثلاً میں اور علیؑ ایک ہی نور سے خلق ہوئے۔ علیؑ دنیا وآخرت میں میرا بھائی اور میرا وصی ہے۔ میں شہر علم وحکمت ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ۔ علیؑ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ علیؑ کی جنگ میری جنگ اور علیؑ کی صلح میری صلح ہے۔ علیؑ حق کے ساتھ اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ علیؑ کی دوستی میری دوستی اور علی کی دشمنی میری دشمنی ہے۔ علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو موسیٰ سے ہارون کو تھی۔ میرے اہلبیتؑ کی مثال سفینہ نوح جیسی ہے۔ کتاب اللہ اور میرے اہلبیتؑ ایک دوسرے کے برابر کے ساتھی ہیں۔ دونوں سے تمسک نجات کی ضمانت ہے۔ میرا اجر رسالت فقط یہ ہے کہ میرے اقرباء سے مودت کرو۔

ان احادیث اور آیات کی روشنی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ آل محمدؐ یا اہلبیتؑ نیابت رسولؐ اور خلافت الٰہیہ کے حق دار نہ

تھے۔ یہ گروہ حق ہی ختمی مرتبت کا ورثہ دار تھا۔ ان میں سے پہلے حضرت علی مرتضیٰؑ اور آخری حجت خدا حضرت امام مہدی صاحب العصر والزمانؑ ہیں۔

حضرت علیؑ کی خلافت کے مخالفین

۱۸ ذوالحجہ ۱۰ھ کو حج آخر سے واپسی کے موقع پر غدیر خم کے مقام پر سورہ مائدہ ۶۷ کی رو سے رسول خدا کو خدا کا تاکیدی حکم ملا کہ "وہ پیغام پہنچا دو جس کا تمہیں حکم دیا جاچکا ہے اور اگر اب اس میں غفلت برتی تو گویا کار رسالت ہی انجام نہیں دیا اور یہ کہ اللہ مفسدوں کے شر سے تمہاری حفاظت کریگا۔" اس سے قبل سورہ الم نشرح ۱ ۔ ۸ میں ارشاد ہوا تھا کہ "کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا اور تیرا بوجھ ہلکا نہیں کردیا جس نے تیری پیٹھ توڑ ڈالی تھی ۔ پس جب تو (کار نبوت سے) فارغ ہوجائے تو (اپنا وصی) مقرر کردے اور اپنے پروردگار کے حضور (واپسی کی) رغبت کر ۔" تفسیر قمی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ "فانصب" کا مطلب ہے کہ جب تم اپنی نبوت پہنچانے سے فارغ ہوجاؤ تو علیؑ کو جانشین مقرر کردو اور اس بارے میں لوگوں کے ردعمل کو نہ دیکھو ۔" اس ضمن میں سورہ شعراء ۱۰ ۔ ۱۷ اور سورہ طٰہ ۲۴ ۔ ۴۳ کی جانب توجہ دلانا مناسب ہوگا کہ جب فرعون کو للکارنے کے حکم پر حضرت موسیٰؑ نے دربار الہیٰ میں دعا کی کہ "میرے سینے کو کشادہ کردے " میری زبان کی گرہ کو کھول دے ، میرے بازوؤں کو میرے بھائی ہارون کی مدد سے قوی کردے اور اس کو میرا وزیر اور میری رسالت میں شریک بنا دے ۔" تو قبولیت دعا کے نتیجے میں ارشاد ہوا کہ "ہم نے وہ سب کچھ دے دیا ہے جو تم نے مانگا ہے ۔ اب تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔" غور طلب ہے کہ رسولؑ تو اس وقت حضرت موسیٰؑ ہی تھے مگر خطاب الہیٰ میں حضرت ہارونؑ کو بھی رسول

کہا گیا کیونکہ آپ حضرت موسیٰؑ کے مقصد رسالت میں مددگار اور امور نبوت میں شریک کار تھے۔ اسی طرح حضرت محمد مصطفیٰؐ کی رسالت میں حضرت علیؑ المرتضیٰ مددگار و شریک تھے۔ لہٰذا حضرت علیؑ کی حیثیت کسی اعتبار سے بھی حضرت ہارونؑ سے کم تر نہیں ہو سکتی۔ غالباً یہ ہی مصلحت تھی کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کی اپنے ساتھ وہی نسبت دی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جناب ہارونؑ کو تھی۔ رسول مختلف اوقات میں حضرت علیؑ کی خلافت کے بارے میں ارشاد فرماتے رہتے تھے اور اصحاب رسول اچھی طرح واقف تھے کہ رسولؐ کے بعد علیؑ ہی جانشین رسولؐ ہوں گے لیکن ان میں سے ایک خاص گروہ پر یہ امر حق نہایت شاق تھا اور وہ طے کر چکا تھا کہ اللہ و رسولؐ کی منشا کو پورا نہ ہونے دیگا جیسا کہ سورہ مجادلہ ، میں " من نجوی ثلاثہ " میں ارشاد ہوا کہ " کوئی سرگوشی تین شخصوں میں نہیں ہوتی مگر اللہ انکا چوتھا ہوتا ہے " (اللہ جانتا ہے) ۔ تفاسیر قمی وصافی کے مطابق امام جعفر صادقؑ کے حوالے سے روایت ہے کہ یہ آیت منافقوں کے تحریری معاہدے کے بارے میں اتری تھی جنہوں نے عہد کیا تھا کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے بعد نبوت وخلافت کو ایک جگہ یعنی بنی ہاشم میں نہ رہنے دیں گے۔ ان میں فلاں فلاں اور ابو عبیدہ بن جراح شامل تھے۔ اسی آیت میں پانچ یا زائد افراد کے نام شامل سازش ہونے کا بھی ذکر ہے جن میں عبدالرحمن بن عوف ، سالم مولائے حذیفہ اور مغیرہ بن شعبہ کے نام بھی لئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ مخصوص گروہ اصحاب ہی آلؑ محمدؐ کا مخالف گروہ تھا۔ نیز آیات تطہیر ومودت کے سلسلے میں منافقوں کا رد عمل پہلے ہی سامنے آچکا تھا جب حضور اکرمؐ نے اہلبیتؑ اور اقربا کا تعارف کرواتے ہوئے اپنے ساتھ فقط علیؑ وفاطمہؑ اور حسنین علیہم السلام کے سوا کسی اور کو شامل نہ کیا تو بعض اصحاب نے رسولؐ کی صداقت ورسالت میں شک کیا تھا۔ " ان افراد اہلبیت میں ازواج رسول

شامل نہ تھیں جیسا کہ خود حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمیٰؓ نے اعتراف کیا تھا۔" (۱۵) اس ضمن میں شاہ عبدالعزیز نے فرمایا کہ "آیۂ مباہلہ کے بارے میں صحیح مسلم کی روایت ہے کہ پیغمبرؐ نے علی وفاطمہ اور حسنؑ و حسینؑ کو طلب فرمایا اور کہا کہ الہیٰ! یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔" (۱۶)

آیت "بلغ ما انزل" کے تیور ہی بتلا رہے تھے کہ پیغام کی نوعیت غیر معمولی تھی۔" اس سے قبل رسولؐ کو حکم مل چکا تھا کہ علیؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کردو لیکن آپؐ نے اس اعلان جانشینی کو کسی مناسب موقع و محل کے لئے اٹھا رکھا تھا۔" (۱۷) رسولؐ منافقوں اور مخالفوں کی طرف سے متفکر تھے جو تحریری معاہدہ کر چکے تھے اور کعبہ میں قسم کھا چکے تھے کہ علیؑ کی خلافت برپا نہ ہونے دیں گے۔ اس سلسلے میں سورہ بقرہ ۲۰۴ - ۲۰۵ میں واضح نشاندہی کر دی گئی تھی کہ "لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو رسول سے چکنی چپڑی باتیں بناتا ہے۔ اللہ کو اس پر گواہ ٹھہراتا ہے جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ دشمنوں میں سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ جب وہ حاکم ہوگا تو زمین میں بہت بھاگ دوڑ کرے گا تاکہ اس میں فساد برپا کردے، وہ خاص کھیتی اور خاص نسل کو ہلاک کرے گا۔ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا" سورہ نحل ۸۳ میں ارشاد ہوا کہ "وہ لوگ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں اور پھر اس کا انکار کرتے ہیں۔" تفاسیر قمی وصافی کے مطابق امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ "یہ نعمت ہم آئمہ اہلبیت ہیں"۔ اس ضمن میں آپؑ نے سورہ مائدہ ۵۵ - ۵۶ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "جب آیت انّما ولیکمُ ..... ھم راکعون نازل ہوئی تو کچھ لوگ (منافق) مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور انہوں نے عہد کیا کہ اگرچہ محمدؐ سچے ہیں مگر ہم یہ بات نہیں مانیں گے کیونکہ اس طرح تو ابو طالبؑ کا بیٹا (علیؑ) ہم پر حاکم ہوجائے گا۔"

بہرحال حکم ربی کی تعمیل کے لئے یہ جگہ اور موقع نہایت موزوں

تھا کہ ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد حجاج کا جم غفیر ہمراہ تھا اور غدیر خم سے مختلف سمتوں کے لئے راستے نکلتے تھے جہاں سے مجمع منتشر ہونا شروع ہوجاتا۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے یہاں قیام کا حکم دیا۔ خاص اہتمام فرمایا۔ خصوصی اذان "حئی علیٰ خیر العمل" دلوائی۔ پالان شتر کا منبر بنوایا۔ حضرت علیؑ کو قریب بٹھایا۔ خطبہ ارشاد فرمایا۔ دو گراں قدر چیزوں (قرآن واہلبیتؑ) سے تمسک کی تاکید کی۔ حاضرین سے اقرار لیا کہ آپ سب مسلمانوں کے مولا ہیں اور ان کی جانوں پر ان سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ پھر حضرت علیؑ کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے اعلان کیا کہ "جس طرح اللہ میرا مولا ہے اور میں تمہارا مولا ہوں اسی طرح یہ علیؑ بھی تمہارا مولا ہے۔" اس کے بعد دعا فرمائی کہ "اے اللہ! اس کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو علیؑ کا دشمن ہو۔" اللہ کی طرف سے جبرئیلؑ تہنیت الٰہی کے ساتھ آیت "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت الیکم نعمتی" لیکر حاضر ہوئے۔ رسولؐ نے ایک خاص خیمہ نصب کروایا جہاں دن بھر مسلمانوں اور امہات نے بیعت علیؑ کا عملی اقرار کیا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ "جو لوگ یہاں موجود ہیں ان کو چاہیئے کہ اس واقعہ کی اطلاع اپنے اپنے مقامات پر ان کو بھی دیں جو یہاں موجود نہیں" (۱۸)

اس واقعۂ عظیم کا تذکرہ دیگر تمام مستند تواریخ اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے اور غدیر خم کے اس اہم ترین اعلان اور واقعہ کی تصدیق کرنے والوں میں ۱۱۰ صحابہ، ۸۴ تابعین، ۳۵۵ علماء، ۲۵ مورخین، ۱۱ مفسرین قرآن اور ۲۷۰ ثقہ راویان حدیث بتلائے جاتے ہیں (۱۹) چنانچہ اس واقعہ کا انکار تو ممکن نہ ہوسکا البتہ مولا کے مفہوم میں اختلاف پیدا کرکے حضرت علیؑ کی خلافت وجانشینی کے اقرار سے فرار کی ایک صورت نکالنے کی کوشش ضرور کی گئی حالانکہ مولا کے مفہوم میں کوئی پیچیدگی نہ تھی اور سورہ

انعام ۶۲ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے لفظ "مولا" استعمال کیا ہے۔ شاہ حسن علی جائسی کا شعر ہے۔

عبث در معنیٔ من کنت مولا می روی ہر سو
علیؑ مولا بہ این معنی کہ پیغمبرؐ بود مولا

رسولؐ کے اعلان غدیر کے فوراً بعد ہی منافقوں کا رد عمل سامنے آگیا۔ جیسا کہ علامہ محمد بن سالم شافعی نے جامع صغیر عزیزی کی شرح جلد ۲ صفحہ ۲۳۶ پر درج کیا ہے کہ "جب آنحضرتؐ نے خطبہ غدیر میں "من کنت مولا فعلی مولا" ارشاد فرمایا تو بعض صحابہ نے کہا کہ کیا ہم پر کلمۂ شہادت کا ادا کرنا اور صلوٰۃ وزکوٰۃ کا پابند ہونا کافی نہیں ہے جواب ہم پر ابو طالبؑ کے بیٹے (علیؑ) کو بزرگی دی گئی ہے۔ کیا یہ امر اللہ کی طرف سے ہے یا آپؐ کی اپنی مرضی ہے۔" آنحضرتؐ نے جواباً فرمایا کہ "خدا کی قسم یہ امر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔" (۲۰) یاد رہے کہ غزوہ تبوک سے واپسی پر وادی عقبہ میں آنحضرتؐ کو قتل کر دینے کی نیت سے پندرہ منافقوں نے حملہ کیا تھا جن کو جناب حذیفہؓ نے پہچان لیا تھا لیکن آنحضرتؐ نے ان کو ناموں کے اظہار سے منع فرمایا تھا۔ "حضرت عمر اپنے عہد خلافت میں حضرت حذیفہ سے بار بار پوچھتے رہے کہ وہ (عمر) تو ان منافقوں میں شامل نہ تھے لیکن حضرت حذیفہ خاموش رہے۔" اس واقعہ کا تذکرہ عصر جدید کے پاکستانی سنت والجماعت کے دانشور اور عالم ڈاکٹر اسرار احمد نے بھی کیا ہے (۲۱) حضرت عمر کا بار بار پوچھنا اور حضرت حذیفہؓ کا خاموش رہنا بڑا معنی خیز ہے اور کسی مزید تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔ ابھی آنحضرتؐ مدینہ واپس ہی ہوئے تھے کہ ایک منافق (حارث بن نعمان فہری) نے مسجد نبوی میں آکر رسولؐ اللہ سے گستاخانہ انداز میں پوچھا کہ "اے محمدؐ! تم نے چلتے چلتے اپنے عم زاد کو ہم پر مسلط کردیا۔ کیا تمہاری مرضی سے ہوا یا یہ بھی اللہ کا حکم ہے۔" آنحضرتؐ نے

جواباً کہا کہ ”قسم ہے اللہ کی جس نے مجھے نبوت دی ہے یہ امر بھی اللہ کے حکم کے مطابق کیا ہے۔“ اس پر اس منافق نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرکے کہا کہ ”اے اللہ! اگر محمدؐ سچے ہیں تو مجھ پر آسمان سے عذاب نازل کر“ چنانچہ آسمان سے ایک نوکیلا پتھر گرا جو اس کے سر سے مقعد کے پار ہو گیا اور اسکی فوری موت واقع ہو گئی۔ یہ واقعہ قرآن حکیم نے محفوظ کر دیا۔ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ”مانگنے والے نے آسمان سے عذاب طلب کیا اور اللہ کا عذاب شدید ہے۔“ (۲۲) ان واقعات سے تین نکات واضح ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرتؐ حضرت علیؑ کی خلافت وجانشینی کا باضابطہ اعلان کر چکے تھے۔ دوم یہ کہ منافق حضرت علیؑ کی خلافت ماننے پر آمادہ نہ تھے اور فہری کے آسمان سے عذاب طلب کرنے کے معاملے سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس کو آنحضرتؐ کی صداقت رسالت پر اعتقاد نہ تھا۔ سوم یہ کہ حضرت علیؑ کی خلافت کے انعقاد میں مفاد پرست اصحاب کی جانب سے شدید مخالفت اور سنگین رکاوٹ کا اندیشہ تھا۔ لہذا حضورؐ نے جیش اسامہ کی تشکیل فرمائی۔ اس میں حضرت علیؑ کے سوا دیگر تمام نامور صحابہ کو شامل کر دیا اور لشکر کی روانگی کا فوری حکم دیدیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ علیل ہو گئے۔ اس لئے بعض اصحاب نے پہلے تو لشکر کی روانگی میں روڑے اٹکائے اور رسولؐ کے لعن طعن پر روانہ بھی ہوئے تو بھی لشکر کو مدینہ کے مضافات سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ایک مرحلہ پر جب آنحضرتؐ کی بیماری نے شدت پکڑلی تو حضرت عائشہؓ کے مسلسل رابطہ واطلاع پر حضرات شیخین خانۂ رسولؐ پر آن موجود ہوئے۔ یہ ہی وہ موقع تھا کہ رسولؐ نے ان کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ ”قلم دوات لاؤ۔ میں لکھ دوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔“ اس پر سخت ہنگامہ ہوا اور حضرت عمرؓ نے آنحضرتؐ کو تحریری ہدایت اور وصیت سے یہ کہہ کر روک دیا کہ ”ان پر ہذیان طاری ہے اور

ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے۔" (۲۳) آنحضرتؐ نے ناراض ہو کر ان سب کو اپنے حجرے سے نکال دیا۔

واضح رہے کہ قرآن کی رو سے صاحبان ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ "خبردار! کبھی رسولؐ کی آواز سے آواز بلند نہ کرنا ورنہ تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔" یہ رویہ اس حکم قرآنی کے بھی منافی تھا جس کی رو سے مومنوں کو حکم ہے کہ "جو رسولؐ دے، لے لو اور جس سے رسول روکے، رک جاؤ۔" رسالتمآبؐ کی زندگی کے آخری لمحات کے عینی شاہد فقط حضرت علیؑ تھے کہ آپؑ ہی کی آغوش میں آنحضرتؐ نے اس دنیا سے کوچ فرمایا۔" ان آخری لمحات میں آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے رازدارانہ گفتگو کی اور آنے والے حالات میں صبر کی تلقین فرمائی۔" (۲۴) اسی آخری گفتگو کے دوران آنحضرت نے "حضرت علیؑ سے وصیت کی تھی کہ جیش اسامہ کے ضمن میں اخراجات کے لئے وہ فلاں یہودی کے مقروض ہیں، اس قرضہ کو آپ (علیؑ) ادا کردیں۔" (۲۵) چونکہ یہ قرضہ سرکاری حیثیت میں لیا تھا اس لئے اس کی ادائیگی آنحضرت کے خلیفہ پر واجب تھی۔ لہذا یہ بھی حضرت علیؑ کے خلیفہ و وارث ہونے کی دلیل ہے نیز سورہ برات کی تبلیغ کے ضمن میں حضرت ابو بکرؓ کے استفسار پر حضور نے فرمایا تھا کہ "جبرئیل نے مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچایا ہے کہ تبلیغ کے فرائض میں خود ادا کروں یا وہ جو مجھ سے ہو۔ علیؑ میرا بھائی ہے میرا وارث ہے اور میرے اہلبیت اور میری امت میں میرا خلیفہ ہے" یہ واقعہ مستند تاریخوں مثلاً خلدون اور طبری اور کتب احادیث مثلاً بخاری جلد ۲ حبیب السیر جلد ۲ مسند امام حنبل جلد اول، طبقات ابن سعد جلد ۲، مستدرک حاکم جلد ۳ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ رسولؐ کی بیماری کے دوران حضرت ابو بکرؓ یا کسی اور ایسے شخص کی قیادت نماز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن کو جیش اسامہ میں شامل

کیا جاچکا تھا اور جو بظاہر مدینہ سے کوچ بھی کرچکا تھا۔" امامت نماز کے سلسلے میں تمام مختلف روایات کا تجزیہ کرنے سے یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام نمازوں کی قیادت خود آنحضرتؐ ہی نے فرمائی تھی۔" (۴۶) امامت نماز کی مختلف روایات کی اس اصلیت کا مطالعہ "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" جلد اول مصنفہ پروفیسر انصاری ۲۱۶۔۲۱۷ پر بھی کیا جاسکتا ہے۔

۲۸ صفر ۱۱ھ کو اللہ کا آخری رسولؐ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ حضرت علیؑ رنج و غم سے نڈھال تکفین و تدفین میں مشغول ہوگئے جب کہ بعض نامور اصحاب رسولؐ نے ثقیفہ بنی ساعدہ کا رخ کیا۔ جہاں خلافت کا معاملہ چند انصار میں موضوع بحث تھا۔ حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہ بن جراح نے گفتگو کا رخ بڑی ہوشیاری سے موڑتے ہوئے اور سیاسی انداز کو بروئے کار لا کر حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ ہونے کا اعلان کرایا۔ اگرچہ انصار حضرت علیؑ کی خلافت ہی پر مصر تھے۔ انصار کے رہنما جناب منذر بن ارقم اور جناب حباب بن منذر نے اپنی تقریروں میں حضرت علیؑ کے سوا کسی اور کی خلافت ماننے سے انکار کردیا تھا مگر ان کو یہ تاثر دیا گیا کہ علیؑ تو گھر کے دروازے بند کرکے گوشہ نشین ہوگئے ہیں اور خلافت میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس مرحلہ پر انصار اور مہاجرین کے ان خود ساختہ نمائندوں میں سخت تلخ کلامی ہوئی اور ایک دوسرے کو قتل کردینے تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ ان مہاجرین نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ "قبائل عرب قریش کے سوا کسی اور کی حاکمیت کو قبول نہیں کریں گے۔" حضرت عمرؓ نے یہ بھانپ کر کہ حضرت علیؑ کی خلافت کا قوی امکان پیدا ہوگیا ہے، فوراً حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ تھام کر آپ کی بیعت کرلی جس کی پیروی میں حسب منصوبہ دیگر افراد جماعت (ابوعبیدہ بن جراح، عبدالرحمن بن عوف اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہ نے بھی فوراً بیعت کرلی۔" ان حضرات کی بیعت ابوبکرؓ کے بعد بھی انصار

نے حضرت علیؑ کی خلافت پر اصرار جاری رکھا مگر شیخین کی جماعت نے اتنا شور مچایا کہ انصار کی آواز دب کر رہ گئی۔ (۲۷) جناب سعد بن عبادہ انصاری کو جو سخت علیل تھے، حضرت عمرؓ نے قتل کر دینا چاہا تو آپ نے کہا کہ "اگر مجھ میں کھڑے ہونے کی بھی سکت ہوتی تو تم سنتے کہ مدینہ کی گلی کوچوں میں شیر چنگھاڑ رہے ہیں اور تم اپنے اپنے سوراخوں میں چھپ گئے ہو خدا کی قسم ہم تمہیں ان لوگوں میں دوبارہ شامل کر دیتے جن کے درمیان تم مقتدی تھے نہ کہ قائد۔" جناب سعد کا آخری جملہ اعلان کر رہا ہے کہ اسلام سے قبل شیخینؓ کو قبائل عرب بالخصوص قریش میں کیا مقام حاصل تھا۔ بشیر بن سعد کی حضرت ابوبکر کی خلافت پر رضامندی پر جناب حباب بن منذر نے انصار سے کہا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری اولادیں ان مہاجروں کے دروازوں پر کھڑی تھوڑا سا پانی طلب کر رہی ہیں اور انہیں پانی سے محروم رکھا جا رہا ہے۔" اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ تمہیں اندیشہ ہے کہ ہم ایسا کریں گے۔ جواباً جناب منذر نے کہا کہ "تم سے نہ ہی مگر اس شخص سے سخت خطرہ ہے جو تمہارا جانشین ہوگا۔ وہ ہمارے لوگوں پر ظلم ڈھائے گا۔" جناب حباب بن منذر کی مستقبل بینی کسقدر سچ ثابت ہوئی کہ آنے والے واقعات نے اس کی تصدیق کر دی۔ جناب سعد بن عبادہ نے نہ کبھی حضرات ابوبکر و عمر کو خلیفہ تسلیم کیا نہ ان کے پیچھے نماز پڑھی حضرت عمر کی مسلسل دھمکیوں کے باعث مدینہ سے ہجرت کرنا پڑی اور اپنے بہت سے اہل قبیلہ کے ہمراہ شام میں بسنا پڑا جہاں ۱۵ھ میں آپ کو پراسرار طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ مدینہ کے انصار کو واقعہ حرہ (۶۳ھ) اور حجاج بن یوسف کے محاصرہ مدینہ (۷۳ھ) کے نتیجہ میں قتل عام اور مکمل تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح رسول اکرمؐ کا مدینہ ان کے انصار سے خالی ہو گیا۔ انصار کی حالت زار کا اندازہ ۵۸ھ میں معاویہ کی آمد مدینہ کے اس واقعہ سے کیا جاسکتا

ہے کہ جب انصار اس کے استقبال کو نہیں آئے اور اس کا سبب دریافت کیا تو کہا گیا کہ " انصار اتنی غربت میں بسر کر رہے ہیں کہ ان کے پاس سواری کے جانور بھی نہیں ہیں ۔ " جناب حباب بن منذر کی جو گفتگو حضرت ابو بکرؓ سے ہوئی اس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت گویا طے شدہ امر تھی ۔ سقیفہ میں حضرات شیخینؓ کی تقاریر کے بعد جناب عبدالرحمن بن عوف نے تقریر کی اور انصار سے کہا کہ " تمہاری فضیلتیں اپنی جگہ مگر تم میں کوئی بھی ابو بکرؓ ، عمرؓ اور علیؑ جیسا فرد نہیں ہے ۔ " اس پر جناب منذر بن ارقم نے کہا کہ " بے شک تم میں ایک ہی شخص ایسا ہے جس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو اور وہ شخص علیؑ ابن ابی طالب ہیں ۔ " (۲۸) یہ الفاظ کہ " بشرطیکہ وہ اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو ۔ " ثابت کرتے ہیں کہ انصار کو حضرت علیؑ کی خلافت سے عدم دلچسپی کا غلط تاثر دیا گیا تھا ۔ انصار کو حضرت علیؑ کی حمایت کی پاداش میں تینوں خلافتوں میں تمام جائز رعایتوں سے محروم رکھا گیا اور بنی ہاشم کی طرح یہ بھی حکومت کے زیر عتاب رہے ۔ یہ تاریخی حقیقت بھی کتنی دردناک اور عبرتناک ہے کہ " رسولؐ کے دفن میں فقط چند افراد شریک تھے ۔ حضرت علیؑ نے سات مرتبہ سقیفہ میں آدمی بھیجے مگر دیگر اصحاب نے پھر بھی شرکت نہ کی ۔ " (۲۹) بہرحال حضرت علیؑ نے اس انتخاب خلیفہ کو تسلیم نہیں کیا اور اس کو اپنے حق کا دانستہ غصب اور حکم اللہ و رسولؐ کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا ۔ اس ضمن میں آپ کے احساسات و خیالات کی عکاسی آپؑ کے مشہور خطبہ شقشقیہ سے ہوتی ہے ۔ بعض مستشرقین جن میں ایڈورڈ گبن نمایاں تھے نے واضح لکھا کہ " علیؑ ہر لحاظ سے مستحق خلافت تھے ۔ محمدؐ نے اپنی رسالت کے آغاز اور اختتام دونوں مواقع پر اس کا واضح اعلان بھی کر دیا تھا مگر محمدؐ کے بعض متعدد

اصحاب اس کے حق میں نہ تھے اور انہوں نے اپنے رسولؐ کے حکم کے برخلاف ابوبکرؓ کو پہلا خلیفہ بنالیا۔" (۳۰) پہلا موقع آغاز رسالت میں وہ تھا جب "دعوت ذوالعشیرہ میں چالیس اولاد عبدالمطلب کو خطاب کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کی واحد تائید ونصرت کے جواب میں آپؑ کو اپنا بھائی، وزیر، وصی اور خلیفہ قرار دیا تھا۔" (۳۱) دوسرا موقع غدیر خم میں عملاً خلافت حضرت علیؑ کے اعلان سے واضح ہوا جس کو اللہ تعالیٰ نے تکمیل دین اور اتمام نعمت سے تعبیر فرمایا۔ بہرکیف حضرت علیؑ نے نہ تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اور نہ بعد میں کسی بھی مرحلے پر۔ یہ کہنا کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات، جو رسولؐ کی وفات کے تقریباً نوے روز بعد ہوئی، سے دل برداشتہ ہو کر آپ نے بیعت کرلی تھی، تاریخی شواہد سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے اور باتوں کے علاوہ یہ حضرت علیؑ کے اصولی موقف کے بھی خلاف تھا۔ اگر واقعی حضرت علیؑ نے سابقہ خلفاء کی بیعت کرلی ہوتی تو تیسری خلافت کے وقت سیرت شیخینؓ کی شرط بھی قبول کرلیتے اور اس شرط کو مسترد کردینے پر عبدالرحمن بن عوف حضرت علیؑ سے کہہ سکتے تھے کہ بیعت کرلینے کے بعد ان کی سیرت کی پیروی سے انکار کیوں؟ لہذا یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت علیؑ نے پیش رو خلفاء کی بیعت نہیں کی تھی مسمی مورخ سیڈیلائٹ کے حوالے سے جسٹس امیر علی رقم طراز ہیں کہ "اگر شروع ہی سے خاندانی وراثت کا اصول حضرت علیؑ کے حق میں تسلیم کرلیا جاتا تو وہ تباہ کن دعوے سر نہ اٹھاتے جن کے باعث اسلام خون میں ڈوب گیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس وقت سب مسلمان حضرت علیؑ کی پاکیزہ اور عظیم الشان شخصیت کی یقیناً اطاعت کرلیتے۔" (۳۲)

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کرنے میں حضرت علیؑ کے ساتھ جلیل القدر اصحاب رسولؐ کی ایک جماعت بھی تھی جو حکومت مدینہ کے بالعموم

اور حضرت عمرؓ کے بالخصوص تمام دباؤ اور دھمکیوں کے باوجود حضرت علیؑ کے موقف کی حامی اور پیروکار رہی ۔ ان میں سلمان فارسی ، ابوذر غفاری ، عمار یاسر ، مقداد بن اسود ، ابو ایوب انصاری ، جابر بن عبداللہ انصاری ، بلال حبشی ، خالد بن شعبہ اموی ، خزیمہ بن ثابت ، عرفہ الازدی ، حذیفہ یمانی سعد بن عبادہ ، مالک بن نویرا ، طلحہ و زبیر جیسے اصحاب کبیر بھی شامل تھے ۔ ــــــ حضرت ابو بکر کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں حضرت عمرؓ نے حضرت سلمان فارسی سے پوچھا کہ " علیؑ اور بنی ہاشم کی خلافت ابو بکرؓ کی مخالفت تو قابل فہم ہے کہ یہ لوگ خود کو حقدار خلافت سمجھتے ہیں لیکن تم نے بیعت کیوں نہیں کی ۔ " تو حضرت سلمانؓ فارسی نے جواب دیا کہ " میں اہلبیت کا شیعہ ہوں ۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔ میں ان کا مخالف ہوں جو اہلبیت کے مخالف ہیں ۔ اس لئے کسی غیر کی بیعت نہیں کر سکتا " ۔ (۳۳) حضرت سلمانؓ فارسی کے جواب سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شیعیان اہلبیت کا وجود اس وقت بھی تھا ۔ یہ بعد کے کسی عہد کی پیداوار نہیں بلکہ عہد رسالت ہی میں " شیعیان محمدؐ " کا گروہ موجود تھا ۔ وفات رسولؐ کے بعد یہ گروہ حق ہی شیعیان علیؑ و اہلبیت کہلایا جیسا کہ مستدرک نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے ۔ یہیں سے امت محمدیؐ میں دو واضح اور مختلف الخیال گروہ ابھر کر سامنے آگئے ۔ ایک آلؑ محمدؐ یا اہلبیت کا مطیع تھا جب کہ دوسرا مخالفین آلؑ محمدؐ یا دشمنان اہلبیت سے وابستہ تھا ۔ حضرت علیؑ اور اہلبیت کو وارث رسولؐ تسلیم کرنے والے اور آئمہ اہلبیتؑ کو حق کا نشان ماننے والے شیعیان علیؑ کہلائے اور آج تک اسی نام سے مشہور اور معروف ہیں ۔

ثقیفہ سے کربلا تک

منافقوں کے حسب منصوبہ ثقیفہ میں خلافت رسولؐ کو بنی ہاشم اور

آلِ محمدؑ سے دور لیجانے کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا تھا۔ حضرت علیؑ اور محبان علیؑ سے زبردستی بیعت کا مطالبہ ورنہ قتل و جلا وطنی کی دھمکی کے واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت متنازعہ بھی تھی اور جبری بھی۔ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت عمومی کے سلسلے میں حضرت عمر کی تقریر لائق توجہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ہم نے مخصوص صورتحال میں ابو بکرؓ کی خلافت کا فوری اور ہنگامی فیصلہ کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ فیصلہ غلط تھا۔ جس کو بعد میں صحیح کر لیا گیا لیکن آئندہ کسی کو ایسے طرز عمل کی اجازت نہ ہوگی اور اگر ایسا کیا گیا تو نامزد ہونے والا اور نامزد کرنے والا دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔" (۳۴) دراصل یہ بھی آئندہ کی ایسی پیش بندی تھی جس کی رو سے بنی ہاشم کے لئے خلافت کو شجر ممنوعہ قرار دینا تھا۔

حضرت ابو بکرؓ نے وفات رسولؐ کے فوراً بعد کہا کہ "جو محمدؐ کی پرستش کرتے تھے جان لیں کہ محمدؐ مر گئے۔" سوال یہ ہے کہ کیا حیات رسولؐ میں کوئی ایسا گروہ مومنین موجود تھا اور اگر تھا تو آنحضرتؐ اس کو اس شرک عظیم سے کیوں نہیں روکتے تھے؟ اصل بات یہ تھی کہ حیات رسولؐ میں شیخین اور ان کی خاص جماعتکا پروپیگنڈہ تھا کہ آلِ محمد اور شیعیان محمدؐ یعنی جلیل القدر اصحاب رسولؐ احترام رسول میں غلو کرتے ہیں حالانکہ یہ احترام قرآنی احکام کے مطابق تھا۔ اس احترام رسولؐ کو پرستش قرار دیا گیا۔ چنانچہ ان کی پیروی میں رسولؐ کی حیثیت کو گھٹانے اور اپنا جیسا عام بشر ٹھہرانے کی مہم شدومد سے آج بھی جاری ہے۔ جبری بیعت کے لئے خانہ اہلبیت پر شیخین اور انکی مسلح جماعت کی یورش تاریخی مسلمات میں ہے یہاں تک کہ حضرت علیؑ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ "اے گروہ مہاجرین تم نے ثقیفہ میں جس دلیل کو اپنے حق میں حق خلافت قرار دیا، میں اسی کو تم پر لوٹاتا ہوں کہ میں اس لحاظ سے بھی تم سب میں افضل ہوں" (۳۵) اس

واقعہ کو ڈاکٹر طہ حسین مصری یوں بیان کرتے ہیں کہ "مسجد نبوی میں جب کہ بہت بڑی تعداد میں ہواخواہان خلافت جمع تھے۔ کچھ لوگوں نے آکر کہا کہ خانہ علیؑ و فاطمہؑ میں خلافت کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ یہ سنکر حضرات ابو بکرؓ و عمرؓ مع ہجوم کثیر کے مسجد سے اٹھ کر خانہ اہلبیتؑ پر گئے اور حملہ کر دیا۔" موصوف نے مزید لکھا کہ "حضرت علیؑ کو زبردستی مسجد لایا گیا اور مطالبہ بیعت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ بیعت تو تم میری کرو کہ دیگر اور تمام اوصاف کے علاوہ میں تم سے اس امر میں بھی بہتر ہوں جس کی بنیاد پر ثقیفہ میں تم نے خلافت پر قبضہ کیا ہے۔ اگر تم نے مجھے خلافت نہ لوٹائی تو ظلم صریح کے مرتکب ہوگے۔ یاد رکھو جب تک روئے زمین میں ہم (آلؑ محمدؐ) میں سے کوئی عالم کتاب، فقیہہ دین اور قرابت دار رسول موجود ہے کوئی اور خلیفہ نہیں بن سکتا۔" انکار بیعت پر حضرت عمرؓ نے قتل کی دھمکی دی جس پر آپؑ نے فرمایا کہ "کیا تم اللہ کے بندے اور اس کے رسول کے بھائی کو قتل کر دو گے۔" جواباً حضرت عمر نے کہا کہ "ہم تمہیں اللہ کا بندہ تو جانتے ہیں مگر رسول کا بھائی نہیں مانتے۔" اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ "ابن خطاب! میں جانتا ہوں کہ تم اس قدر گرمی اور تیزی کیوں دکھا رہے ہو۔ دراصل اس اونٹنی (خلافت) کا دودھ تم نے بھی پینا ہے۔" (۳۶)

حضرت علیؑ کے انکار بیعت پر حضرت عمرؓ کے رویہ کا ایک اور حوالہ ملاحظہ ہو نامور اور مستند مورخین نے لکھا کہ "حضرت علیؑ کے انکار بیعت پر شیخین کی مسلح جماعت (جو خانہ اہلبیتؑ پر حملہ آور ہوئی تھی) کی تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں اور انہوں نے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا چاہا کہ دفعتاً فاطمہ زہرا نمودار ہوئیں اور نہایت برہمی کے ساتھ فرمایا کہ "تم نے رسولؐ اللہ کی وفات پر ان کے جسد (میت) کو ہم پر چھوڑ دیا اور ہم سے مشورہ کئے بغیر اور ہمارے حقوق کا لحاظ کئے بغیر آپس میں خلافت کے بارے میں طے کر لیا۔۔۔

تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ ورنہ میں بالوں کو کھول کر اللہ سے فریاد کرتی ہوں ۔ پھر آپ نے آہ وزاری کرتے ہوئے اپنے پدر بزرگوار کو پکار کر فرمایا کہ "دیکھئے کتنی جلدی آپؐ کے بعض اصحاب نے آپ کے احکام کو بھلا دیا اور ہمارے ساتھ ظالمانہ روش اختیار کی" اس نے صورتحال کو اور بھی نازک بنا دیا تھا چنانچہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی جماعت کو حضرت علیؑ سے بیعت لئے بغیر واپس جانا پڑا ۔" (۳۷) خانہ فاطمہ زہرا کو نذر آتش کر دینے کی حضرت عمرؓ کی دھمکی فرضی نہ تھی بلکہ حقیقی تھی ۔ علامہ شبلی الفاروق صفحہ ۱۸۸ پر لکھتے ہیں کہ درایت کے اعتبار سے اس واقعہ سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ۔ حضرت عمرؓ کی تندی مزاج سے یہ حرکت بعید نہ تھی ۔" ان تمام حقائق کے باوجود اور مسلمہ واقعات کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ خلافت متفقہ تھی ، اکابر امت میں سنگین اختلافات نہ تھے ، کوئی گروہ بندی نہ تھی ، اصحاب کی ایک جماعت اور آلِ محمدؐ کے تعلقات خوشگوار تھے اور خلافت ثلاثہ رسولؐ کی نیابت اور خیروبرکت کے عہد سے عبارت تھی ، محل نظر بھی ہے اور لمحہ فکر یہ بھی ۔ ایسا رویہ تو عام دنیوی جمہوری حکومتیں بھی اپنے مخالفین سے روا نہیں رکھتیں جیسا کہ مدینہ کی اس اسلامی حکومت نے آلِ محمدؐ کے ساتھ روا رکھا ۔ بالکل ابتدائی ایام میں حضرت ابوبکرؓ کو مغیرہ بن شعبہ نے مشورہ دیا کہ جناب عباس ابن عبدالمطلب کو حضرت علیؑ سے توڑ کر خلافت کا جواز پیدا کرلیا جائے ۔ چنانچہ حضرات ابوبکرؓ ، عمرؓ ، ابوعبیدہ بن جراح اور مغیرہ بن شعبہ جناب عباس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خلافت میں حصہ پیش کیا اس پر جناب عباس نے فرمایا کہ " یہ قیاس غلط ہے کہ اللہ نے جانشینی رسولؐ کا معاملہ لوگوں پر چھوڑ دیا ہے ۔ تم نے رسولؐ سے قرابت کی بنیاد پر خلافت لی ہے تو ہمارے حقوق غصب کئے ہیں ۔ اگر خلافت میں وہ حصہ جو تم مجھے پیش کر رہے ہو تمہارا حق ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور اگر

مسلمانوں کا حصہ ہے تو تمہیں ان کی مرضی کے بغیر دینے کا حق نہیں ۔ اور اگر یہ ہمارا حق ہے تو ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ تم کچھ لوگوں کو پسند کرو اور کچھ کو نظر انداز کر دو ۔ تمہارا یہ گمان کہ رسولؐ تمہارا بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ ہمارا تھا تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ رسول درخت تھے جس کی ہم شاخیں ہیں جب کہ تم درخت کے نیچے اگے ہوئے خود رو پودے ہو ۔" (۳۸)

شیخین اور ان کی سیاست کی ایک ہی توجیہہ ہمارے فہم ناقص میں آتی ہے اور وہ یہ کہ یہ سب حضرات یقین محکم رکھتے تھے کہ حضرت علیؑ اپنے اعلیٰ کردار اور محبت اسلام کے باعث اپنی ذاتی وجوہ پر کبھی تلوار نہیں اٹھائیں گے۔ اس کا ثبوت آپ کے اس جواب سے مل گیا تھا جو آپنے ابوسفیان کی فوجی مدد کی پیشکش کے سلسلے میں دیا تھا کہ " تم اسلام کے ہمیشہ سے دشمن رہے ہو ، میں حصول اقتدار کے لئے تلوار نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ مسلح تصادم اسلام کی عہد طفلی ہی میں تباہی کا موجب ہوگا ۔" (۳۹) آپ کے بعض حامیوں نے بھی مسلح تصادم کا مشورہ دیا تھا جس کو آپ نے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ " مجھے رسولؐ اللہ خبر دے گئے ہیں کہ جس طرح موسیٰ کی امت نے ہارون کو چھوڑ دیا تھا اور بچھڑے کی پرستش سے روکنے پر انہیں قتل کی دھمکی دی تھی اسی طرح امت محمدی مجھے چھوڑ دے گی ۔ ایسی صورت میں مجھے ہارون کی طرح اپنی جان بچانے پر اکتفا کرنا ہوگا " (۴۰)

حضرت عمرؓ کے معاندانہ اقدام جن میں خانہ علیؑ و فاطمہؑ کو نذر آتش کرنے کی دھمکی بھی شامل تھی کے بارے میں علامہ شبلی کہتے ہیں کہ " عمر کی تنک مزاجی اور درشتی طبع سے یہ بعید نہ تھا تاہم ان کی علیؑ و اہلبیتؑ کے ساتھ زیادتیاں اس لحاظ سے جائز تھیں کہ ابوبکر کی خلافت کے استحکام اور بنی ہاشم کی ریشہ دوانیوں کے کچلنے کے لئے ضروری تھیں ورنہ خانہ جنگی سے مفاد اسلام کو ٹھیس لگتی " (۴۱) علامہ شبلی کا یہ دفاع شیخین کسی تبصرے کا محتاج

نہیں ہے ۔ حضرت علیؑ و فاطمہؑ کو تشدد کا نشانہ بنانا کسی اعتبار سے بھی جائز نہ تھا اور کوئی بھی توجیہہ پیش کر کے اس جرم کی سنگینی کو کم نہیں کیا جاسکتا ۔ اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مرتضیٰ حسین مولف " مطلع انوار " جو شیعہ علماء و فضلائے برصغیر کی تاریخ ہے ، لکھتے ہیں کہ " لوگوں نے حضرت علیؑ کی مشغولیت (تجہیز تکفین رسولؐ ؟) اور جلسہ (ثقیفہ) میں غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے میں کے ایک بزرگ (ابو بکرؓ) کو خلیفہ بنالیا اور اپنے مخالفین یعنی اہلبیتؑ کے لئے وہی سب کچھ کیا جو عموماً اقتدار میں آنے والی ہر پارٹی کیا کرتی ہے ۔ عوام حکومت کی قوت کا کچھ دیر تو مقابلہ کرتے ہیں مگر پھر تھوڑے سے مضبوط ارادے اور مستحکم نظریے کے افراد کے سوا لوگ خاموشی اختیار کر کے حکومت کے ہمنوا بن جاتے ہیں ۔ " تقریباً یہی کچھ مدینہ میں بھی اوائل ۱۱ ھ میں ہوا کہ چند جلیل القدر اصحاب رسول اور محبان آلِ محمدؐ کے سوا ، آلِ محمدؐ کے حامی اور طرفدار بہت کم رہ گئے تھے ۔

انکار بیعت کے بعد پہلا کام خلیفہ اول نے یہ کیا کہ رسولؐ کی ہبہ کردہ جائیداد کو حضرت فاطمہ زہرا سے چھین کر حکومت کی تحویل میں لے لیا فدک کا مقدمہ خود حضرت فاطمہؑ نے دربار خلافت میں داخل کیا تھا اور گواہوں میں حضرت علیؑ کے علاوہ جناب خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین اور ام ایمن کو پیش کیا تھا جو رسولؐ کی کنیز تھیں اور ورثہ میں حضرت فاطمہؑ کو ملی تھیں ۔ آپؑ نے متعدد آیات قرآنی سے اپنے دعوی وراثت کو ثابت بھی کیا لیکن جس کو " حضرت ابوبکر نے ایک ایسی حدیث رسولؐ کی آڑ لیکر مسترد کردیا جس کے وہ تنہا راوی تھے ۔ " یہ مقدمہ عجیب تھا کہ مدعی حضرت فاطمہ تھیں جن کی صداقت و طہارت کی گواہی قرآنی آیات مباہلہ و تطہیر دیتی ہیں اور مدعا علیہ خلیفہ اول تھے جن کو مقدمہ کا ایک فریق ہونے کے باعث فیصلہ صادر کرنے کا حق ہی نہ تھا ۔ اس ضمن میں جناب سیدۃ النسا العالمین

کا طویل خطبہ لائق توجہ ہے۔

• بہر حال حضرت فاطمہ زہرا بحد رنجیدہ اور ناراض ہوئیں اور اس کے بعد اپنے آخری لمحہ حیات تک نہ ان حضرات سے بات کی اور نہ ان کو اپنے جنازہ میں شرکت کی اجازت دی۔ • (۴۲) یاد رہے کہ مستند حدیث رسولؐ کے اعتبار سے • فاطمہ کی ناراضگی اللہ و رسولؐ کی ناراضگی ہے۔ • (۴۳) اپنے آخری ایام حیات میں حضرت ابوبکرؓ نے جن تین باتوں پر اظہار ندامت و تاسف کیا ان میں حضرت فاطمہ کی ناراضگی شامل تھی • (۴۴) فدک کے دعویٰ کو مسترد کرنا، خلافت کی نفی کے علاوہ حضرت علیؑ اور دوستداران علیؑ کو اقتصادی پریشانیوں میں مبتلا کرنے کا اقدام بھی تھا۔ حضرت مالک بن نویرا جو جلیل القدر صحابی رسولؐ اور محب اہلبیتؑ تھے، جب مدینہ آئے اور منبر رسولؐ پر حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا تو سخت دھچکہ لگا اور حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کرکے کہا کہ • ان ذمہ داریوں کا بوجھ مت اٹھاؤ جن کے تم اہل نہیں ہو۔ خلافت اسی کو سونپ دو جو اس کا حقدار ہے۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم نے اس مقام و منصب پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے جو اللہ اور رسولؐ نے کسی اور کے لئے مختص کیا تھا۔ کیا تم بھول گئے کہ تم نے غدیر خم میں علیؑ کو امیرالمومنین کہہ کر تہنیت پیش کی تھی۔ • حضرت ابوبکر نے حضرت مالک کو پٹوا کر مسجد سے نکلوا دیا اور • خالد بن ولید کو حکم دیا کہ مالک بن نویرا کے قبیلے پر فوج کشی کرکے ان کو قتل کردو اور عورتوں کو قیدی بنالو۔ • خالد نے فوج کشی کی اور دھوکہ دہی سے مالک اور ان کے بہت سے اہم ساتھیوں کو قتل کردیا جب کہ وہ سب نماز عشاء باجماعت ادا کررہے تھے۔ ان کے مال و اسباب کو لوٹ لیا اور مالک کی حسین و جمیل بیوہ سے زبردستی مباشرت کی۔ جب وہ مع قیدیوں کے اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ واپس ہوا تو روضہ رسولؐ کے سامنے قیدیوں میں سے

ایک محترم خاتون (خولہ بنت جعفر) نے فریاد کی اور خلیفہ اول سے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ "ہمارے ساتھ یہ ظلم ناروا محض اس لئے کیا گیا کہ ہم اہلبیتؑ کے محب ہیں۔" حضرت عمرؓ نے بھی خالد کی غیر انسانی اور غیر شرعی حرکات پر حد شرعی جاری کرنے کا مطالبہ کیا تھا لیکن حضرت ابو بکرؓ نے خالد کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ "اس نے میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔"

(۴۵) ان محترم خاتون (محترمہ خولہ بنت جعفر) سے حضرت علیؑ نے بعد کو عقد کر لیا تھا جن کے بطن سے جناب محمد حنفیہ تولد ہوئے تھے۔ جناب مالک بن نویرا پر فوج کشی کا بہانہ عدم ادائیگی زکوۃ کو بنایا گیا تھا۔ موصوف عہد رسولؐ میں وصولی زکوۃ اور اس کو مقامی حاجتمندوں میں تقسیم کرنے پر مامور تھے اور یہ ہی موقف انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کے مطالبہ زکوۃ پر اپنایا تھا اور زکوۃ کی رقم مدینہ ارسال کرنے پر راضی نہ تھے۔ جناب مالک بن نویرا کا استدلال درست تھا۔ صحیح بخاری باب الزکواۃ ۶ صفحہ ۴۵ پر درج ہے کہ "منہاج النبوت یہ ہی تھا کہ جس نے زکوۃ نکالی اور اپنے مستحق لوگوں (حقداروں) میں تقسیم کر دی اس نے واجب ادا کر دیا۔ زکوۃ کو مدینہ ارسال کرنا ضروری نہیں اور جس نے زکوۃ نکالی ہی نہیں وہ گناہگار ہوا لیکن واجب القتل نہیں۔" لہذا کسی اعتبار سے مالک بن نویرا اور ان کے اہل قبیلہ پر فوج کشی اور ان کے قتل و غارتگری کے اقدام حق بجانب نہ تھے۔ وہ جلیل القدر اصحاب رسول میں شامل تھے اور پکے مسلمان اور مومن تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت میں یہ کسی مومن اور صحابی رسول کا پہلا قتل تھا اور اس کا پس منظر خالصتاً سیاسی تھا۔ اسلامی قانون اور سنت رسولؐ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

فتح مکہ ۸ھ کے بعد کے حالات کی نزاکت اور حفاظت جان کی خاطر ابو سفیان اور اس کے خاندان (بنی امیہ) نے مجبوراً اسلام (مصلحۃ اسلام

قبول کیا تھا) کیا تھا۔ حضرت علیؑ نے اس کو اسلام کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے تعبیر کیا تھا۔ اس وقت بھی رسالت محمدیؐ اس کے حلق سے نہ اتری تھی فتح مکہ کے نتیجہ میں بنی امیہ کی سیاسی طاقت کا مکمل خاتمہ ہوگیا تھا مگر پہلی خلافت میں ابوسفیان کی پذیرائی کے باعث اس کے بڑے بیٹے یزید کو فوج کی سالاری اور شام کی حکومت دی گئی اور اس کے حامیوں کو جو صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے میں تمام ریاستی عہدے تقسیم کر دیئے۔ اس اقدام سے ان کو دوبارہ ابھرنے کا موقع مل گیا۔ (۴۶)

حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ نامزد کیا اور اس ضمن میں فقط دو افراد یعنی عبدالرحمن بن عوف اور عثمان بن عفان سے مشورہ کیا گیا جو ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار تھے اور جن کے قبیلے قبل اسلام ہی سے بنی ہاشم کے دشمن رہے تھے۔ خلیفہ دوم نے ابوسفیان کے دوسرے بیٹے معاویہ کو شام اور ملحقہ وسیع وزرخیز علاقوں کا حاکم اعلیٰ مقرر کردیا اور اس طرح مستقبل کی اموی بادشاہی کی بنیاد رکھ دی۔ "عمر فاروق اعظم" صفحہ ۳۵۷ پر محمد حسنین ہیکل نے تسلیم کیا ہے کہ "میں اس اثر کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو حضرت عمرؓ کے معاویہ کو تمام ممالک شام کا حاکم اعلیٰ بنانے سے ہوا اور اموی سلطنت کی داغ بیل پڑی۔" تیسری خلافت کو حضرت علیؑ اور بنی ہاشم سے دور رکھتے ہوئے اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے لئے راستہ ہموار کرنے کی خاطر "حضرت عمرؓ نے اپنی موت سے تین روز قبل ایک ایسی خلیفہ ساز کمیٹی تشکیل دی جس کے نامزد ارکان میں حضرت عثمانؓ کے رشتہ داروں اور حامیوں کی اکثریت تھی۔ اس چھ رکنی نامزد کمیٹی کا سربراہ جناب عبدالرحمن بن عوف کو مقرر کیا جو حضرت عثمانؓ کے بہنوئی تھے اور ان کو حق استرداد (ویٹو) بھی دے دیا۔ اس اہتمام پر اکتفا نہ کی بلکہ حکم صادر کیا کہ جو بھی منتخب خلیفہ سے اختلاف کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔" (۴۷) یہ

ساری پیش بندیاں حضرت علیؑ کے لئے کی گئی تھیں ۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے یہ تیسری کوشش تھی کہ خلافت بنی ہاشم میں نہ جانے پائے نتیجۃً خلافت بنی امیہ میں چلی گئی جن کے ہاتھوں منافقوں کے وہ عزائم پورے ہوئے جو شروع ہی سے وہ دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے اور جن کا اصل ہدف اہل بیتؑ ہی تھے ۔ جناب عباس ابن عبدالمطلب نے حضرت علیؑ کو مشورہ دیا تھا کہ اس شوریٰ میں شریک نہ ہوں مگر حضرت عمرؓ کی سیاسی حکمت عملی اور مخصوص ہدایات نے آپ کو مجبور کر دیا کہ شوریٰ میں شریک بھی ہوں اور اس کے فیصلے کو تسلیم بھی کریں ۔" (۴۸) جناب عبدالرحمن بن عوف نے دکھاوے کے انٹرویو لئے اور سیاسی حربہ کے طور پر سیرت شیخینؓ پر عمل پیرا ہونے کی شرط بھی رکھی جس کو حضرت علیؑ نے مسترد کر دیا اور سیرت شیخین کو تسلیم نہ کر کے آئندہ کے لئے ان کی سیرت پر عمل کے دروازے بند کر دیئے خلافت حسب منصوبہ حضرت عثمانؓ کے سپرد ہو گئی ۔ حضرت علیؑ نے پرزور احتجاج کیا مگر حالات کے تحت خاموشی اختیا فرمائی ۔ نامزد کمیٹی کے بیشتر ارکان عرب کے بڑے بڑے سرمایہ داروں میں شمار ہونے لگے تھے ۔ ان کا ذاتی اور گروہی مفاد اسی میں تھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ نہ بنتے ۔ مستند مورخوں کے بقول " حضرت عثمانؓ " عبدالرحمن بن عوف ، طلحہ و زبیر اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ ہم لاکھوں کی نقدی کے علاوہ بے اندازہ دولت و جائیداد کے مالک تھے ۔ (۴۹) یاد کیجئے حضرت علیؑ کا حکیمانہ قول کہ " میں نے دولت کی فراوانی نہیں دیکھی مگر اس کی تہہ میں ظلم اور تلف شدہ حقوق ۔ "

یہ صورتحال اسلام جیسے عدل و مساوات کے نظام میں محض اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ وفات رسولؐ کے بعد مخصوص مراعات یافتہ طبقہ اقتدار پر قابض ہو گیا تھا ۔ یہ اس نظام کی خرابی تھی جو آلؑ محمدؐ کو خارج کر کے قائم کیا گیا تھا

آلِ محمدؑ اور ان کے مخالفوں کے ضمن میں اس مکالمے کا مطالعہ مفید ہوگا جو جناب عبداللہ ابن عباس اور خلیفۂ دوم کے درمیان ہوا جس کو علامہ شبلی نے " الفاروق " میں اور علامہ ابن ابی الحدید نے " شرح نہج البلاغہ " میں تحریر کیا ہے ۔ علامہ شبلی کے رقم کردہ مکالمہ کا خلاصہ ہے کہ " حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ تمہیں تمہارے قبیلے نے اس لئے حکمرانی نہیں دی کہ لوگ نبوت اور خلافت کا ایک ہی خاندان میں اجتماع نہیں چاہتے تھے اور یہ کہ تم اور تمہارا چچازاد بھائی (علیؑ) ہمیں خلافت کا غاصب اور اہلبیت کا دشمن قرار دیتے ہو ۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے جواب دیا " یقیناً خلافت علیؑ کے بارے میں رسولؐ اللہ کے واضح اعلان کے باوجود تم نے خلافت ظلم کے ساتھ ہم سے چھینی ہے اور یہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں ہے رہا دشمنی کا معاملہ تو ابلیس نے آدم سے دشمنی رکھی تھی وہی دشمنی تم لوگوں نے بنی ہاشم سے روا رکھی ہے ۔ " (۵۰) علامہ ابن ابی الحدید نے مکالمے کے وہ اجزاء بھی لکھ دیئے ہیں جن کو علامہ شبلی نے عمداً نظر انداز کر دیا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ " عمرؓ نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے کہا کہ " رسولؐ اللہ تو علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے مگر میں نے ایسا کرنے سے روک دیا ۔ اللہ کا منشا پورا ہوا ، رسولؐ کی خواہش پوری نہ ہو سکی کہ علیؑ خلیفہ نہ بن سکے ۔ علیؑ کے معاملے میں رسولؐ اللہ حق (سچائی) سے ہٹ جاتے تھے وہ تو چاہتے تھے کہ علیؑ کو نامزد کر دیں لیکن میں نے مفاد اسلام میں یہ نہ ہونے دیا ۔ اگر علیؑ خلیفہ ہو جاتے تو سارا عرب بغاوت کر دیتا ۔ " (۵۱) اس مکالمے کے دونوں اجزاء سے کئی اہم نکات واضح ہوتے ہیں ۔ اول یہ کہ حضرت عمرؓ کو رسول اللہ سے زیادہ مفاد اسلام کا خیال تھا ۔ دوم یہ کہ حضرت علیؑ کی خلافت کی مخالفت منشائے الہیٰ تھا جس کا نمونہ اظہار حضرت عمرؓ تھے ۔ اللہ کی منشا اور رسولؐ کی منشا میں تصادم تھا جو عقلاً اور عقیدہ ناممکن بات تھی ۔ سوم یہ کہ قبائل

عرب کو نبوت و خلافت ایک ہی خاندان ۔ بنی ہاشم میں قابل قبول نہ تھی ۔ یہ شیخین کی خاص جماعت کا اپنا پروپیگنڈہ تھا ۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے تو قبائل عرب کو ایک ہی قبیلہ قریش میں یہ اجتماع کیسے گوارا ہوگیا ۔ خلافت رسولؐ کسی گروہ کی پسند یا ناپسند کا معاملہ نہ تھی ۔ یہ اللہ کا کار خصوصی تھا جس میں کسی نبی یا رسولؐ کی مرضی کو بھی دخل نہ تھا ۔ چہارم یہ کہ خلافت و جانشینی حضرت علیؑ کا اعلان عام رسولؐ کر چکے تھے جس کی بعد میں وفات رسولؐ کے وقت مخالفت کی گئی ۔ پنجم یہ کہ معاذ اللہ رسولؐ اللہ حضرت علیؑ کے معاملے میں غلو سے کام لیتے تھے اور حق سے ہٹ جاتے تھے ۔ یہ رسولؐ پر بڑا سنگین الزام ہے ۔ اگر خاتم النبینؐ اور اشرف المرسلینؐ جیسا نبی بھی حق سے ہٹ سکتا تھا اور کسی بھی معاملہ میں عدل کے راستہ کو ترک کر سکتا تو پھر مطلق پیروی رسولؐ کا قرآنی حکم عبث اور ناقابل فہم ہے ۔

خلافت علیؑ طے شدہ امر تھی جب ہی تو اس کی مخالفت میں معاہدہ عمل میں لایا گیا تھا جیسا کہ فرانسیسی مورخ ہنری لیمنز نے اتحاد ثلاثہ کے بارے میں لکھا کہ " ان ــــــ تینوں نے آپس میں معاہدہ کر لیا تھا کہ پہلا خلیفہ ابوبکرؓ کو بنائیں گے ۔ یہ تینوں گروہی سیاست میں مدینہ کے مرکز قیادت (بنی ہاشم) کے خلاف محاذ بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے ۔" (۵۲)

حضرت عثمانؓ کا دور اقتدار اقربا پروری ، بدعنوانیوں ، زیادتیوں کا بدترین زمانہ تھا ۔ خلافت و ملوکیت ، میں مولانا مودودی اور " ہسٹری آف سارا سین " میں سائمن اوکلے کے علاوہ درجنوں مؤرخوں اور سیرت نگاروں نے بے شمار سنگین واقعات کی تفصیل سے نشاندہی کی ہے ۔ ہم اختصار کی خاطر فقط تین واقعات پیش کرتے ہیں ۔

(۱) حکم اور مروان کو جلاوطنی سے واپس بلا کر کاروبار حکومت میں شریک کر لیا جب کہ ان کو اللہ کے رسولؐ نے سزا کے طور پر جلاوطن کیا تھا اور

دونوں سابقہ خلفاء نے اس فیصلہ رسولؐ کا احترام برقرار رکھا تھا۔ یہ دونوں حضرات خلیفۂ سوم کے قریبی رشتہ دار تھے۔

(۲) جلیل القدر اصحاب رسولؐ کے ساتھ نہایت سنگدلانہ رویہ اختیار کیا۔ حضرت عمارؓ یاسر کو خود بھی پیٹا اور اپنے غلام سے بھی پٹوایا۔ حضرت ابوذر غفاری کو حق گوئی کے جرم میں پہلے شام اور پھر ربذہ جلاوطن کیا اور ان کو شدید ذلت اور نہایت درجہ بدسلوکی کا نشانہ بنایا۔

(۳) بیت المال کو اپنے اور اپنے اعزاء کے لئے چراگاہ بنالیا۔ حکومتی عہدوں پر ایسے اموی رشتہ داروں کو مقرر کیا جو نااہل، بدعنوان اور ظالم تھے۔ ان کے خلاف جائز شکایات پر بھی شہریوں کی داد رسی نہ کی۔ مروان کو خلیفہ کا سیکرٹری بنا لیا جو خلیفہ کی مہر کا ناجائز استعمال کرتا تھا اور اسکی کوئی بازپرس نہ تھی۔ عہد عثمانی میں اسلامی معاشرے میں دولت کی انتہائی غیر مساوی تقسیم اور دیگر بدعنوانیوں کے باعث جو معاشرتی خرابیاں عروج پر تھیں انکا ذکر علامہ احمد امین مصری نے فجر الاسلام ۵۱۸ اور ڈاکٹر طٰہ حسین مصری نے الفتنہ الکبریٰ، جلد اول ۲۲۸ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی معروف کتاب خلافت و ملوکیت کے باب چہارم میں تفصیل سے کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ " دولت مندوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو عیش پرستی میں مبتلا تھا۔ طرب وشرب کی زندگی بسر کرتا تھا اور عورت وشراب سے لذت کوش تھا۔ حتیٰ کہ موسم حج بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔

حضرت عثمانؓ کے منہ پر کہا جانے لگا تھا کہ ان کے بعد خلافت معاویہ کو ملے گی اور اس پروپیگنڈے کی کوئی تردید بھی نہیں کی جاتی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ محاصرے کے دوران عثمانؓ کی طلب امداد پر بھی معاویہ نے کوئی توجہ نہ دی بلکہ نتیجہ کے منتظر رہے۔ عمرو بن العاص کو جب قتل عثمان کی اطلاع ملی تو کہا کہ " یہ تو میری ہی کوشش کا ثمر ہے۔" (۵۴)

ظاہر ہے کہ معاویہ خود خلیفہ بننا چاہتا تھا اور عمرو بن العاص اس کا مشیر خاص تھا۔ "طویل محاصرے کے دوران حضرت علیؑ نے اٹھارہ مرتبہ اصلاح احوال کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ مروان حضرت عثمانؓ پر حاوی ہو کر حضرت علیؑ کی مساعی کو ناکام بنا دیتا تھا۔ جس کی آپ نے حضرت عثمانؓ سے شکایت بھی کی لیکن بے سود۔" (۵۴) چنانچہ عامتہ الناس حضرت عثمان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ان سے بد عنوان عمال کی برطرفی یا استعفیٰ کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ محاصرین میں مصروعراق اور حجاز کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی۔ بالاخر حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے۔ معاویہ نے جو محاصرے کے دوران خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا، یہ سنتے ہی کہ حضرت علیؑ خلیفہ منتخب ہو گئے ہیں علم بغاوت بلند کر دیا اور خون عثمانؓ کا بہانہ بنا کر پہلے اور آخری باقاعدہ منتخب خلیفہ وقت کے مد مقابل آگیا۔ ڈاکٹر طہٰ حسین مصری کے بقول "معاویہ کو عثمانؓ نے خط لکھ کر مدد طلب کی تھی مگر دوسرے عمال کی طرح وہ بھی ٹال گئے اور منتظر رہے یہاں تک کہ عثمان قتل ہو گئے لیکن جیسے ہی عثمانؓ کی ہلاکت اور علیؑ کی خلافت کی خبر ملی، معاویہ انتقام کا بہانہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دراصل معاویہ کو عثمانؓ کے قصاص سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ علیؑ کی خلافت قبول نہ تھی۔" (۵۵) حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش میں خود ان کا اور ان کے عمال کی سرد مہری و بد عنوانی کا ہاتھ تھا لیکن بعض نام نہاد عالم اور دانشور اس کو سبائی فتنہ قرار دے کر تاریخی حقیقتوں کو جھٹلانے کی سعی کرتے ہیں۔ پاکستانی سنت والجماعت کے موجودہ عہد کے ایسے ہی ایک عالم ودانشور ڈاکٹر اسرار احمد نے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش کو عبداللہ ابن سباء کے حواریوں کا کارنامہ ٹھہرایا ہے۔ جنگ جمل کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "حضرت علیؑ اور حضرت عائشہ کے مابین گفت

وشنید سے خون عثمانؓ کے قصاص کا قضیہ طے ہونے والا تھا لیکن عین اس وقت عبداللہ ابن سبا۔ اور مالک اشتر رات کی تاریکی میں سازش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے کیمپ پر حملہ کرواتے ہیں جس سے باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اسی طرح صفین میں بھی مصالحانہ فضا پیدا ہو گئی تھی مگر سبائی سازشی گروہ نے اسے ناکام بنا دیا۔" (۵۶) ڈاکٹر صاحب نے کسی مستند حوالے کا ذکر تک نہ کیا اور واقعات کو بالکل توڑ موڑ کر پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ ثقہ اور نامور مؤرخوں نے کسی ایسی سازش کا ذکر تک نہیں کیا اور نہ کسی ایسی "مصالحانہ فضا" کا کوئی ہلکا سا تاثر ہی دیا۔ اس کے برعکس تمام جید علماء اور معتبر مؤرخوں نے جنگ ہائے جمل وصفین کے سلسلے میں خون عثمانؓ کے قصاص کی حیثیت اور باغیوں کے کردار پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ ومعاویہ کی فوج کشی کو سراسر ناجائز قرار دیا ہے۔ عبداللہ ابن سبا۔ اور اس کے سبائی گروہ کا ذکر بعد کے واقعات کو ایک خاص رخ دینے کے لئے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر طہ حسین مصری تو اس کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ مقدمہ ابن خلدون جلد ۲ میں علامہ ابن خلدون نے لکھا کہ "وہ (عبداللہ ابن سبا) کا کوئی حقیقی وجود نہ تھا۔ اس کو شیعوں کو بدنام کرنے کی غرض سے گھڑا گیا تھا۔" ڈاکٹر طہ حسین نے الفتنۃ الکبریٰ جلد اول ۱۳۲۰، مطبوعہ مصر (اردو ترجمہ مولانا محمد باقر شمس) کے مطابق "عبداللہ ابن سبا۔ قطعی فرضی اور من گھڑت چیز ہے۔ جب شیعوں اور دیگر فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے تو اس وقت اسے جنم دیا گیا۔ اس سے شیعوں کے دشمنوں کا مقصد یہ تھا کہ شیعوں کے اصول مذہب میں یہودی عنصر شامل کر دیا جائے۔" ان ثقہ بیانات کی روشنی میں عبداللہ ابن سبا۔ سے منسوب تمام داستانیں بھی فرضی اور لغو قرار پاتی ہیں۔

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد خواص و عوام کے تین روزہ مسلسل اصرار پر حضرت علیؑ نے ۱۸۔ ذی الحجہ ۳۵ ھ کو مسجد نبوی کے مجمع عام میں خلافت قبول کی تھی ۔ مشیت ایزدی کہیے یا حسن اتفاق کہ ۱۸۔ ذی الحجہ ۱۰ ھ ہی کو آنحضرتؐ نے باضابطہ اعلان خلافت فرمایا تھا۔ آپ کی بیعت ہر اعتبار سے مکمل تھی ۔ آپ پہلے خلیفہ تھے کہ جس کا انتخاب نامزدگی یا محدود شوریٰ سے نہیں ہوا تھا۔ پچھلی تینوں خلافتوں کے بارے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے پیشگی مشورہ یا بیعت کے بغیر ہوئی تھیں کہ "ابو بکرؓ کی خلافت تو چھینا جھپٹی کی بیعت کی بنیاد پر ہوئی تھی ۔ عمرؓ کی خلافت ابو بکر کی تحریری نامزدگی پر ہوئی تھی اور عثمان کو چھ رکنی کمیٹی کے نامزد سربراہ عبدالرحمن بن عوف نے نامزد کیا تھا موصوف کو حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا۔" (۵۷) خلیفہ بنتے ہی حضرت علیؑ نے ظالم اور بدعنوان عمال کو برطرف کر دیا جب کہ "آپؑ کو بعض افراد نے مشورہ دیا تھا کہ برطرفی کا عمل آہستہ آہستہ کیا جائے تا کہ کوئی فتنہ نہ اٹھ سکے لیکن آپؑ نے یہ کہہ کر یہ تجویز رد کر دی کہ علیؑ ایک دن کے لئے بھی اپنے کسی بدعنوان عامل حکومت کی بدعنوانی میں شریک ہونے کو تیار نہیں ۔" (۵۸) یہ آپ کے بے لچک رویہ اور اصولوں پر سختی سے قائم رہنے کی روشن مثال ہے۔

ابھی آپ کی خلافت کا آغاز ہی تھا کہ حضرت عائشہ نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ آپ اس وقت مکہ میں تھیں۔ آپ شروع ہی سے حضرت علیؑ کی سخت مخالف رہی تھیں۔ مروان ، طلحہ اور زبیر کی سازش سے ایک بڑا لشکر منظم کر کے آپ بصرہ میں جنگ جمل کی قیادت کے لئے میدان میں آگئیں ۔ یہ آپ کے منصب کے بھی خلاف تھا اور حکم قرآنی کے بھی منافی تھا جس میں رسولؐ کی بیویوں کو گھر میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورہ احزاب ۳۳

میں قرن فی بیوتکن کی تفسیر میں جناب عبداللہ ابن مسعود نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ "حضرت موسیٰؑ کے وصی جناب یوشع بن نون کے خلاف حضرت موسیٰؑ کی بیوی صفیرا بنت شعیب نے خروج کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کی وراثت کا دعویٰ کیا تھا۔ چنانچہ یوشع بن نون نے اس سے جنگ کی، اس کے حامیوں کو قتل کیا اور اسے قید کر کے حسن سلوک سے پیش آئے۔ پس ابوبکر کی بیٹی (عائشہ) بھی علیؑ سے جنگ کرے گی اور علیؑ اسی طرح پیش آئیں گے جس طرح یوشع بن نون پیش آئے تھے۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس آیت میں "الجاھلیة الاولی" سے مراد صفیرا بنت شعیب کا یہ واقعہ ہے۔" طبری اور بلاذری کے مطابق "ان تینوں باغیوں (حضرت عائشہ اور طلحہ وزبیر) کا نعرہ جنگ خون عثمانؓ کا بدلہ تھا حالانکہ ان تینوں نے عوام کو عثمان کے خلاف بغاوت اور قتل پر اکسایا تھا۔" حضرت علیؑ نے جنگ جمل میں بڑے تحمل اور احتیاط سے کام لیا۔ حضرت عائشہ کی مسلسل اشتعال انگیزیوں کے باوجود آپؑ نے اپنی فوج کو لڑائی سے روکے رکھا۔" جب بصرہ والوں (عائشہ کے فوجیوں) کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں تو حضرت علیؑ نے اپنے ایک نوجوان فوجی کو قرآن دے کر دونوں فوجوں کے درمیان بھیج دیا تاکہ بصرہ والوں کو قرآن کی طرف دعوت دی جائے لیکن عائشہ کے فوجیوں نے تیروں کی بارش کر کے اس نوجوان اور قرآن دونوں کو چھید ڈالا۔ جب وہ کوفی نوجوان قرآن کی طرف دعوت دیتا ہوا مار ڈالا گیا تو اس وقت علیؑ نے اپنی فوج سے کہا کہ اب جنگ جائز ہو گئی ہے۔" (۵۹) گھمسان کی لڑائی ہوئی اور دس ہزار سے زائد لوگ مارے گئے جس کا حضرت علیؑ کو بے حد قلق تھا۔ حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو کر جنگ کی قیادت کر رہی تھیں جب اس کی ٹانگیں کٹ گئیں تو حضرت عائشہ کی فوج میں بھگدڑ

بچ گئی ۔ جنگ جمل میں فوجی شکست کے بعد بھی حضرت عائشہ مدینہ واپسی پر راضی نہ ہوتی تھیں تب حضرت علیؑ نے امام حسنؑ کو ان کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ " اب مجبوراً میں وہی کرنے والا ہوں جس کا اختیار مجھے رسولؐ دے گئے ہیں ۔ " یہ سنتے ہی حضرت عائشہ مدینہ واپسی کے لئے فوراً تیار ہو گئیں ۔ وہ جانتی تھیں کہ " رسول اللہ نے حضرت علیؑ کو اختیار دیدیا تھا کہ وہ آپؐ کی جس بیوی کو چاہیں رسولؐ کی طرف سے طلاق دے سکتے تھے " (۶۰) خاتمہ جنگ کے بعد حضرت علیؑ نے باغیوں اور مخالفوں سمیت تمام اہل بصرہ کو عام معافی دیدی ۔ اس طرح فتح مکہ کی یاد تازہ کردی اور آنحضرتؐ کے کردار کو دہرا دیا ۔ حضرت علیؑ کے انتہائی شریفانہ ، فیاضانہ اور کریمانہ طرز عمل کے بارے میں ڈاکٹر طہ حسین مصری لکھتے ہیں " علیؑ نے تو (حسن سلوک کی) انتہائی حد یہ کی کہ بصرہ والے جتنا مال واسباب میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے ، اس سب کو اکٹھا کروا کے مسجد میں جمع کروایا اور اعلان عام کروایا کہ لوگ اپنا اپنا سامان پہچان کر لے جائیں ۔ " (۶۱)

ابھی آپؑ کو بمشکل جنگ جمل سے فراغت ہوئی تھی کہ معاویہ ابن ابی سفیان ایک بڑی فوج لے کر صفین میں آگیا اور دریا پر قبضہ کر کے حضرت علیؑ کی فوج پر پانی بند کردیا اس بندش آب کو توڑنے کے لئے حضرت علیؑ کی فوج کو تیغ زنی کرنی پڑی اور گھاٹ پر حضرت علیؑ کی فوج قابض ہو گئی لیکن معاویہ کے رویے کے برعکس حضرت علیؑ نے معاویہ کی فوج پر پانی بند نہیں کیا ۔ کئی دن اور رات شدید جھڑپیں ہوئیں ۔ " معاویہ کا مشیر عمرو بن العاص تھا جو چالاکی ومکاری میں معاویہ سے کم تھا نہ مکروفریب میں کمزور ۔ یہ حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانے والوں میں تھا " (۶۲) تقریباً نوے لڑائیاں ہوئیں جن میں معاویہ کے پینتالیس ہزار اور

حضرت علیؑ کے پچیس ہزار فوجی کام آئے تھے۔" (۶۳) اپنی متوقع شکست سے بچنے کے لئے معاویہ نے حسب منصوبہ قرآن نیزوں پر بلند کروا دیئے اور کتاب اللہ سے فیصلہ چاہا جب کہ جنگ سے قبل حضرت علیؑ ادھر بلا چکے تھے اور معاویہ مسترد کر چکا تھا۔ معاویہ کی مکروفریب کی سیاست سے آپؑ بخوبی واقف تھے۔ ڈاکٹر طہٰ حسین تسلیم کرتے ہیں کہ "علیؑ کی سیاست خالص دینی سیاست تھی جب کہ معاویہ کی سیاست خالص دنیوی سیاست تھی۔" (۶۴) چنانچہ آپؑ نے اپنے فوجیوں سے ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ "میں قرآن ناطق ہوں۔ میرا حکم مانو اور جنگ جاری رکھو تاکہ فتنہ کچل دیا جائے۔" مگر آپؑ کو آپؑ کی فوج میں معاویہ کے ایجنٹوں اور منافقوں نے لڑائی بند کرنے پر مجبور کردیا حالانکہ جناب مالک اشتر مکمل فتح کے بالکل نزدیک تھے۔ آپ کی مرضی کے خلاف حکمین مقرر ہوئے جن کا فیصلہ تھا کہ علیؑ و معاویہ دونوں کو برطرف کرکے نیا خلیفہ چن لیا جائے۔ یہ فیصلہ عجیب تھا کہ معاویہ جو ایک صوبہ کا باغی گورنر تھا اور حضرت علیؑ جو مسلمانوں کے منتخب خلیفہ تھے، دونوں کو ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کردیا گیا۔ جب کہ معاویہ نے اس وقت تک خلافت کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ جنگ ہائے جمل و صفین کے سلسلے میں باغیوں یعنی عائشہؓ و معاویہ اور طلحہ و زبیر کی حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت اور فوج کشی پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں کہ "یہ بغاوت و فوج کشی قطعی ناقابل فہم تھی کہ خون عثمانؓ کا مطالبہ عثمانؓ کی اولاد کرسکتی تھی نہ کہ یہ حضرات۔ کسی بھی قانون یا شریعت کی رو سے حکومت کی شکایات رفع کرنے میں مبینہ ناکامی پر لوگ حکومت کو غیر قانونی ٹھہرانے کے مجاز نہیں تھے۔ اگر علیؑ کے دشمن ان کو آئینی طور پر منتخب خلیفہ تسلیم نہیں کر رہے تھے تو پھر ان لوگوں کا علیؑ سے مطالبہ قصاص ہی

لغو وبے معنی تھا۔ معاویہ کی حیثیت آئینی طور پر اور بھی خراب تھی کہ وہ ایک صوبے کے گورنر تھے اور مرکز کے خلاف بغاوت یا فوج کشی کا ان کو حق نہ تھا۔ معاویہ کی عثمانؓ سے رشتہ داری ان کا ذاتی معاملہ تھی اس میں گورنری ملوث نہ تھی ۔ ان کا رویہ عہد جاہلیت کے قبائلی قوانین کی طرف واپسی تھا جس کی اسلام نے بیخ کنی کی تھی ۔ معاویہ کی ایک صوبائی گورنر کی حیثیت میں خلیفۂ وقت سے ، جس کو شام کے علاوہ تمام عالم اسلام تسلیم کرچکا تھا ، قصاص کا مطالبہ کرنے کا حق ہی نہ تھا۔ کسی صوبائی گورنر کی مرکزی حکومت سے بغاوت دراصل قبل اسلام کے قوانین کی تجدید تھی ۔" (۶۵) اس ضمن میں ڈاکٹر طٰہ حسین رقم طراز ہیں کہ " جتنا علیؑ ، معاویہ کے مقابلے میں حق پر تھے ، اتنا ہی طلحہ وزبیر اور عائشہ کے مقابلے میں بھی حق پر تھے کیونکہ طلحہ وزبیر کا فریضہ تھا کہ بیعت کے بعد خلوص نیت کا ثبوت دیتے اور عائشہؓ کو لازم تھا کہ زوجہ رسولؐ کی حیثیت میں دیگر ازواج کی طرح گھر میں بیٹھی رہتیں اور حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی مرتکب نہ ہوتیں۔ اگر انہیں علیؑ کی خلافت پسند نہ تھی تو علیؑ بھی اپنی خلافت منوانے پر مصر نہ تھے۔ جب علیؑ نے دوسرے منکرین بیعت سے کوئی تعرض نہیں کیا تو عائشہ کے خلاف کسی کاروائی کا سوال ہی نہ تھا اور ان کے اعزاز واحترام میں علیؑ کوئی کمی نہ کرتے جیسا کہ جنگ جمل کے بعد علیؑ کے حسن سلوک سے ثابت بھی ہوگیا۔" (۶۶) معاویہ کے بارے میں ڈاکٹر طٰہ حسین مصری مزید کہتے ہیں کہ " معاویہ کے لئے واحد راستہ یہ تھا کہ پہلے وہ علیؑ کی بیعت کرتے ، ان کی اطاعت قبول کرتے اور پھر خلیفۂ وقت سے قتل عثمانؓ میں ملوث لوگوں کے خلاف کاروائی کی درخواست کرتے۔" (۶۷)

بہرحال حضرت علیؑ نے حکمین کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا کہ حق اور

عدل پر مبنی نہ تھا۔ خود حکمین ایک دوسرے کو کاذب اور دغا باز کہہ رہے تھے۔ اسی کی کوکھ سے جنگ نہروان نے جنم لیا۔ حالانکہ خوارج کے تمام اعتراضات کا حضرت علیؑ نے مدلل جواب دے دیا تھا۔ اس جنگ سے قبل آپؑ نے ایک ایسا دعویٰ کیا تھا جو اس سے قبل یا اس کے بعد کسی فوجی سالار اعلیٰ نے نہیں کیا کہ "میری فوج کے نو سے زائد افرا جاں بحق نہ ہوں گے اور خوارج کے نو سے زائد بچ کر نہ جاسکیں گے۔" بعد جنگ گنتی کی گئی تو "آپ کے فقط سات فوجی کام آئے تھے جب کہ خوارج کے کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے اور صرف نو خارجی بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہوسکے تھے۔" (۶۸) اب آپ معاویہ پر ضرب کاری لگانا چاہتے تھے لیکن لوگ جنگ وجدال سے اکتا چکے تھے اور مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ لوگوں کی بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو اپنے خطبوں میں بار بار اس کا شکوہ کرنا پڑا۔ اس رویے سے آپؑ کو اتنی اذیت تھی کہ آپؑ اکثر فرماتے تھے کہ "اس بدبخت ترین امت کو اپنا کام انجام دینے میں کیوں تاخیر ہو رہی ہے۔ آپؑ اپنی ریش مقدس کو اپنے خون سر سے رنگین ہونے کا بار بار ذکر کرتے تھے۔" لوگوں کی جہاد سے عدم دلچسپی اور گریز اس اعتبار سے قابل فہم تھا کہ آپؑ کی تینوں بڑی لڑائیاں مسلمانوں کے باغی گروہوں کے ساتھ واقع ہوئیں چنانچہ آپؑ کے ساتھی لڑنے والوں کو نہ مال غنیمت ہاتھ لگتا تھا اور نہ غلام وکنیزیں۔ جبکہ لوگ ان چیزوں کے گذشتہ ربع صدی میں عادی ہو چکے تھے۔ تاہم بعض تاریخوں میں درج ہے کہ ایک بڑی فوج مرتب ہو گئی تھی۔ مولانا نجم الحسن کراروی لکھتے ہیں "آپؑ کو معاویہ کے خلاف لڑنے کے لئے ساٹھ ہزار کا لشکر مہیا ہوگیا تھا اور وہ شام کی طرف کوچ کرنے ہی والا تھا کہ سازش کے تحت ابن ملجم نے آپؑ کو شہید کردیا۔" (۶۹) اس فتنہ وفساد کے عہد میں آپؑ نے جن اصولوں پر عمل کیا وہ آپؑ ہی کا حصہ تھا، کسی اور کے

بس کی بات نہ تھی۔ خلافت جس کے بارے میں بعض منافقوں نے آپؑ پر حریص خلافت کا لغو الزام لگایا تھا وہ آپؑ کی نگاہ میں بے حد حقیر تھی۔ اپنی بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پیوند شدہ نعلین کی قدر وقیمت کا خلافت سے موازنہ کرتے ہوئے جناب عبداللہ ابن عباس کے سوال کے جواب میں آپؑ نے فرمایا کہ "اگر اس سے قیام حق وعدل کا مقصد وابستہ نہ ہوتا تو آپؑ اس کو ہرگز قبول نہ کرتے۔" صواعق محرقہ ۷۴ مطبوعہ مصر میں علامہ ابن حجر مکی نے درست فرمایا کہ "رسولؐ اللہ نے حضرت علیؑ سے کہا تھا کہ اے علیؑ! تم تاویل قرآن پر جنگ کرو گے جس طرح میں تنزیل قرآن پر لڑا ہوں۔" حضرت علیؑ کے عہد خلافت کی تینوں لڑائیاں اسی نوعیت کی تھیں۔ اہلسنت کے بڑے عالم شاہ ولی اللہ دہلوی حضرت علیؑ کی فضیلت کے قائل نظر آتے ہیں جیسا کہ سانحہ کربلا، ۲۶ مطبوعہ لاہور میں ڈاکٹر اسرار احمد کی تقریر محرم ۱۴۰۲ھ کے حوالے میں لکھا ہے کہ "اگر میری طبیعت کو اس کی آزادی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ حضرت علیؑ کی فضیلت (اصحاب ثلاثہ پر) کی قائل نظر آتی ہے مگر مجھے حکم ہوا ہے کہ ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ فاروق کی فضیلت کا اقرار کروں۔" یہ بات غور طلب ہے کہ موصوف کو یہ حکم کس نے دیا اور اس کا دینی یا منطقی جواز کیا ہے۔

عبدالرحمن ابن ملجم زہر میں بجھی ہوئی تلوار کو ہرا کر کوفہ کی گلیوں میں قتل علیؑ کے ارادے کا اعلان کرتا تھا اور لوگ حضرت علیؑ سے اسکے خلاف کاروائی کا مطالبہ کرتے تھے مگر آپؑ فرماتے تھے کہ جرم کے ارتکاب سے قبل کس قانون شریعت سے کاروائی کروں۔ بہرحال اس ملعون نے مسجد کوفہ میں ۱۹، رمضان ۴۰ھ کو نماز فجر کی پہلی رکعت کے سجدے میں زہر میں بجھی ہوئی تلوار کا وار کرکے آپؑ کا سراقدس دوپارہ کردیا۔ سر سے خون کا فوارہ جاری تھا اور آپ خاک مسجد کو زخم پر رکھتے ہوئے فرماتے تھے کہ

" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔" ۲۱ رمضان ۴۰ ھ کو اسلام اور انسانیت کے اس عظیم فرزند، میدان جنگ کے ناقابل شکست سپاہی، منبر سلونی کے خطیب، علم و حکمت کے بحر بیکراں اور رشد وہدایت کے مینارہ نور سے دنیا محروم ہو گئی۔

حضرت علیؑ کی حکومت کی بابت بہت سے مورخین اسکو ناکامی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن وہ یہ بین حقیقت قطعی نظرانداز کردیتے ہیں کہ جانشین رسولؐ اور ولی اللہ ہونے کی حیثیت سے حضرت علیؑ کے لئے وہ دنیوی سیاست کرنا ممکن ہی نہ تھا جو مکروفریب سے عبارت ہوتی ہے۔ ان کی سیاست یا حکومت کی کامیابی کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اس دور ابتلا میں نہ کسی اصول پر سودے بازی کی اور نہ وقتی مصلحتوں کے تحت کسی غلط کام یا اقدام کی حمایت کی۔ بلکہ ربع صدی میں جو سماجی، اخلاقی اور مذہبی خرابیاں جڑپکڑ چکی تھیں اور جس دنیوی سیاست نے دینی سیاست پر غلبہ حاصل کرلیا تھا ان کی اصلاح کی طرف آپؑ نے اپنی اس قوت کو صرف کیا جو مخالفین کی ریشہ دوانیوں، بغاوتوں اور لڑائیوں کے نذر ہو رہی تھی۔ علامہ سید محمد حسین طباطبائی نے اپنی مشہور کتاب " شیعی اسلام " (انگریزی ترجمہ سید حسین نصر شائع کردہ اسلامک ایجوکیشن سوسائٹی کراچی صفحات ۵۴ - ۵۵) میں اس سلسلے میں تحریر کیا ہے کہ " اگرچہ اپنی ۴ سال ۹ ماہ کی خلافت میں حضرت علیؑ ان تمام ہنگامہ خیز حالات کا مکمل خاتمہ تو نہ کرسکے جو عالم اسلام کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے تاہم وہ تین اہم اور بنیادی مقاصد کے حصول میں ضرور کامیاب رہے (۱) انہوں نے اپنی انتہائی سادہ، عادلانہ اور حق پرستانہ طرز زندگی سے لوگوں کو پیغمبرؐ اسلام کے طور طریقوں کی یاد تازہ کردی جب کہ آنحضرتؐ کی سنت حقیقی سے لوگ بہت دور ہو چکے تھے۔ (۲) نہایت تکلیف دہ اور نامساعد حالات کے باوجود حین

کے باعث آپؑ کا قیمتی وقت صرف ہوا ۔ آپؑ نے اپنے پیچھے الوہی سائنسی علوم اور اسلامی دانش وحکمت کا بیش بہا خزانہ چھوڑا۔ آپؑ نے گیارہ ہزار ایسے گرانقدر اقوال دیئے جو سماجی ، مذہبی اور تعقل پسندی کے اعتبار سے اپنی مثال آپؑ ہیں۔ انہوں نے عربی گرامر اور لٹریچر کی بنیاد فراہم کی ۔ وہ عالم اسلام میں پہلے شخص تھے جس نے فلسفۂ الہیات (mataphysics) کے سوالات کی چھان پھٹک کی اور ان کے جوابات بڑی علمی مہارت ، عرفان کامل اور استدلال کے ساتھ فراہم کئے۔ (۳) انہوں نے بڑی تعداد میں ایسے مسلمان دانشوروں کو تربیت دی جو معرفت اور تصوف کی اسلامی شاخوں کے موجد ٹھہرے (صوفیائے کرام کے تمام بڑے مکاتب فکر آپؑ ہی کو اپنا مرشداعظم تسلیم کرتے ہیں) اسلامی فقہ ، قانون اور تفسیر قرآن کے آفتاب ومہتاب جیسے صاحبان علم آپؑ ہی کے شاگردان خاص میں تھے۔"

واضح ہو کہ سابق خلفاء کے عہد میں فتوحات کے باعث " اشاعت اسلام کے عالمگیر دعوے " اور خود حضرت علیؑ کے عہد خلافت میں عمومی انتشار اور خانہ جنگی کو آپؑ کی " ناکام خلافت " قرار دینے والے معروضی حالات ، ربع صدی کی غلط پالیسیوں کے نتائج اور حضرت علیؑ کے حق وعدل پر سختی سے کاربند رہنے کی روش کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعدجب حضرت علیؑ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا تو آپؑ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ " اس بے مہار اونٹنی کو جدھر چاہو ہنکا دو " آپؑ کو اس وقت خلافت ملی جب مسلمانوں کی دینی ، اخلاقی اور معاشرتی زندگی اس حد تک بگڑ چکی تھی کہ اصلاح احوال کے لئے بڑی مستحکم اور دیرپا حکومت درکار تھی ۔ ذوالحجہ ۳۵ ھ میں مسلم معاشرے میں عقیدہ وعمل کے اعتبار سے کچھ بے دین تھے مگر حصول دولت واقتدار کے لئے دین کو ظاہری ڈھال بنائے ہوئے تھے ، کچھ ظالم وفاسق اور غدار وفتنہ پرداز تھے ، بڑی تعداد

میں مسلمان ظاہری یا پوشیدہ منافق تھے۔ بہت کم لوگ واقعی سچے مسلمان، دیندار اور حق پرست تھے۔ فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنا بھی حکمرانوں کی سیاسی حکمت عملی کا اہم عنصر تھا جس کے باعث اندرونی حالات بالخصوص اہلبیتؑ اور ان کے حامی جلیل القدر اصحاب رسولؐ کے خلاف ارباب اقتدار کے اقدامات سے بے بہرہ ولاتعلق رکھنا تھا اور حکومت کا مراعات یافتہ طبقہ پیدا کرنا تھا۔ اس کا ثبوت حضرت عثمان کے عہد میں عوامی شورش کو دبانے کی کوشش کے لئے فتح افریقہ کی مہم جوئی کا واقعہ ہے جس کی تجویز معاویہ اور مروان نے خلیفہ ثالث کو دی تھی جیسا کہ الامام والملوک میں علامہ طبری اور تاریخ کامل میں علامہ ابن اثیر نے خلافت عثمان کے بارے میں تحریر کیا ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ فتوحات کا اصل مقصد اشاعت اسلام نہ تھا بلکہ سیاسی تقاضا تھا۔ حضرت علیؑ نے سیاسی تقاضوں کے بجائے دینی ضروریات کو پیش نظر رکھا اور مشوروں کے برعکس نااہل اور بدعنوان عمال کی برطرفی میں ایک دن کی بھی تاخیر گوارا نہ کی کہ اس طرح ان کے اعمال بد کی ذمہ داری حضرت علیؑ پر بھی آجاتی۔ کسی شخص کے سوال پر کہ ابوبکرؓ وعمرؓ کے عہد میں تو حالات بہتر رہے لیکن آپ کے زمانے میں انتشار اور جنگ وجدال ہے تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ابوبکر وعمرؓ مجھ جیسے لوگوں پر حکومت کرتے تھے جب کہ میں تم جیسوں پر حاکم ہوں۔

یاد رکھیئے کہ اسلام اشاعت اسلام کے لئے خوں ریزی اور ملک گیری کا علمبردار نہیں ہے اسلام، علاقوں اور ملکوں کو مغلوب اور فتح کرنے کے بجائے دلوں کی تسخیر چاہتا ہے۔ جو تلوار سے کبھی ممکن نہیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر حسن اخلاق، حق پروری، عدل گستری اور انسانی اقدار کی عملداری کی ضرورت ہے اور یہ ہی وہ صفات تھیں جو حضرت علیؑ اور آپؑ کے خانوادے کا طرہ امتیاز تھیں۔ اگر حضرت علیؑ کا مختصر عہد خلافت (جو

مسلط کردہ جنگوں کی نذر ہوگیا) نہ ہوتا تو دنیا اسلامی اقدار کی روح سے ناآشنا، سنت رسولؐ کے اصل خدوخال سے ناواقف اور خلافت الٰہی و دنیوی ملوکیت کے امتیاز سے بے بہرہ رہ جاتی۔

حضرت علیؑ پر بے لچک رویہ کا الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ آپؑ نے حالات کے تحت حکمت عملی اختیار نہیں کی۔ اگر آپؑ مخالفین کو کچھ ڈھیل دیدیتے اور اپنی حکومت کے استحکام تک ان کی بداعمالیوں سے چشم پوشی اختیار کرلیتے تو آپ کو کچھ عرصہ فرصت و مہلت مل جاتی اور مخالفین کی کامیابی کے امکانات معدوم ہوجاتے۔ لیکن اس قسم کا استدلال کرنے والے حضرت علیؑ کے منصب کی نزاکتوں اور تقاضوں کا احساس ہی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر اگر آنحضرتؐ کفار قریش مکہ کی یہ پیشکش قبول کرلیتے کہ "آنحضرت اپنے پیغمبرانہ مشن کی تبلیغ کے ساتھ کفار کے خداؤں (بتوں) کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔" تو کفار کی اتنی شدید مخالفت سے بچ جاتے جس کے باعث شعب ابی طالبؑ میں تین سال کی محصوری اور پھر مکہ سے مدینہ کی ہجرت کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا تھا لیکن رسولؐ اللہ ایسا نہیں کرسکتے تھے کہ بنیادی اصول کا مسئلہ تھا۔ حضرت علیؑ نے خود کہا ہے کہ "میں معاویہ سے زیادہ سیاست سمجھتا ہوں مگر میرے پاؤں میں شریعت کی زنجیر پڑی ہوئی ہے۔" حضرت علیؑ کے غیر مصالحانہ اور بے لچک طرز عمل کی بابت ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲، مطبوعہ مصر میں لکھا ہے کہ "اگر علیؑ اپنے بعض ہمدردوں کی یہ بات مان لیتے اور وقتی طور پر عمال کی برطرفی سے گریز کرتے تو علیؑ کی خلافت تو کچھ عرصہ اور قائم رہتی مگر علیؑ، علیؑ نہ رہتے۔"

امام حسنؑ خلیفہ منتخب ہوگئے مگر معاویہ کی ریشہ دوانیوں، اپنی فوج کے منافق امراء کے رویہ اور خارجیوں کے مفسدانہ حرکات کے باعث آپ

نے حکومت چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور بعض شرائط پر معاویہ کو حکومت دیدی تاکہ کشت وخون رک جائے اور معاویہ کے قصاص خون عثمانؓ کی حقیقت بھی کھل جائے۔ آپؑ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ "میں نے چاہا تھا کہ حق وباطل کو جدا کردوں، تمہارے لئے دین حق کو بپا کردوں اور کتاب وسنت کو اصل صورت میں نافذ کردوں لیکن تم نے میرا ساتھ نہ دیا، میری مدد نہ کی۔ اگر تم میرے مددگار ہوتے تو میں بنی امیہ کو ہرگز حکومت نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد تم پر طرح طرح کے عذاب وارد ہوں گے۔" (۷۰) اس کے بعد آپؑ نے معاویہ کو لکھا کہ "میں چاہتا تھا کہ حق کو زندہ کروں اور باطل کو مٹا دوں مگر لوگوں نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اب میں چند شرائط پر صلح کرتا ہوں باوجودیکہ میں جانتا ہوں کہ تو ان کو پورا نہیں کرے گا۔" صلح نامہ پر دستخط ہوجانے کے بعد معاویہ نے اہل کوفہ سے خطاب میں کہا کہ "میں نے جنگ کتاب وسنت کے احکام نافذ کرنے کو نہیں کی تھی بلکہ تم پر حکومت کرنے کی غرض سے کی تھی۔ میں نے چند شرائط حسنؑ سے طے کی ہیں جو میرے پیروں تلے ہیں۔" (۷۱) معاویہ نے شیعیان علیؑ کے ساتھ جو ظالمانہ طرز عمل اختیار کیا اس کی جھلک تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۳۰ میں دیکھیئے کہ "عراق میں شیعیان علی پر جتنے مظالم کے پہاڑ توڑے گئے ان میں سب سے ہلکا ظلم یہ تھا کہ ان کو کوفہ وبصرہ سے جلاوطن کردیا جاتا تھا اور ان کی جگہ معاویہ کے طرفداروں کو لاکر بسایا جاتا تھا۔" صلح نامہ کی رو سے معاویہ کو پابند کتاب وسنت بنانے، حضرت علیؑ، آل علیؑ اور محبان علیؑ کے ساتھ شریفانہ سلوک روا رکھنے اور ولیعہدی کے معاملے میں معاویہ کو بے اختیار کردینے کی شرائط شامل تھیں۔ ولیعہدی کے معاملے میں معاویہ کو بے اختیار کردینا ہی ثابت کرتا ہے کہ امام حسنؑ نے حکومت دی تھی خلافت نہیں دی تھی۔ اگر خلافت دی ہوتی تو معاویہ کو اپنے جانشین

خلیفہ کو نامزد کرنے کا اختیار بھی ہوتا۔ حکومت سے دستبرداری اور صلح حسنؑ پر شعراء کرام کے سینکڑوں اشعار ادب کا حصہ ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

علامہ اقبال ؒ نے فرمایا:

آں یکے شمع شبستان حرم
حافظ جمعیت خیرالامم
تانشیند آتش پیکار وکیں
پشت پازد برسرتاج ونگیں

ناز اکبرآبادی نے کہا:

حکومت آج تک درد سری ہے
حسنؑ کے پاؤں کی ٹھوکر لگی ہے

بہر صورت یہ صلح یا جنگ بندی تھی بیعت نہ تھی۔ صلح حسنؑ اور جہاد حسینیؑ کے پس منظر میں حدیث رسولؐ بھی یاد رہے کہ "میرے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ امام ہیں چاہے بیٹھ جائیں یا کھڑے رہیں۔"

معاویہ نے اس صلح نامہ کا کیا حشر کیا، تاریخ کے صفحات اس کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ ۳۶ تا ۴۰ ھ معاویہ ایک باغی گورنر تھا مگر اس سے قبل ایک منصوبہ کے تحت پچیس سال کی طویل مدت میں شام اور اس کے ملحقہ علاقوں کا مطلق العنان بادشاہ بھی رہا تھا۔ وہ اسقدر طاقتور اور خودسر بنا دیا گیا تھا کہ "شاہانہ طمطراق سے حکومت کرتا تھا۔ مرکز کے احکامات کی پرواہ نہ کرتا تھا اور اپنے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ جیسا سخت گیر حاکم بھی اس سے تعرض نہیں کرتا تھا۔" (۷۲) حضرت علیؑ اور معاویہ کی سیرت وسیاست پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر طہٰ حسین مصری نے لکھا کہ "علیؑ خلافت کا نظم وانصرام کر رہے تھے اور معاویہ بادشاہت کا۔" (۷۳) دونوں

کے کردار کا موازنہ کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر موصوف نے تحریر کیا کہ "علیؑ ومعاویہ کی سیرت وسیاست میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ کم از کم جو بات معاویہ کے متعلق کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی سیرت ایک زیرک وچالاک اور مکار مرد عرب کی تھی اور دنیا ان کی ساری زندگی کا محور تھی اسکے برعکس علیؑ کو امانت داری اور وفائے عہد کا بڑا پاس تھا کہ دین میں کوئی دغا وفریب نہ ہونے پائے۔ وہ مکروفریب اور جاہلیت کی ہر بات سے بیزار تھے۔ حق ان کے سامنے روشن تھا اور وہ سیدھے اسی طرف چلے جا رہے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اسی راہ ہدایت کی طرف لے جا رہے تھے۔" (۷۴)
معاویہ کی کتابت وحی کی بابت بڑا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کو یہ اعزاز حاصل نہ تھا۔ علامہ عباس محمود العقاد مصری کے بیان کے مطابق "معاویہ کاتب وحی نہ تھا بلکہ ایک منشی (کلرک) کی حیثیت رکھتا تھا کہ صدقات وغیرہ کی تقسیم کے لئے حاجت مندوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور تھا۔ کسی بھی مستند مورخ نے اس کو کاتب وحی نہیں لکھا۔" (۷۵) معاویہ اور بنی امیہ کے بارے میں جس بات پر مورخین ومحدثین کی اکثریت متفق ہے وہ یہ ہے کہ انہیں دین، حق اور مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کا مقصد فقط دنیا تھی اور طرہ امتیاز بنی ہاشم سے عداوت وانتقام کی خواہش۔
مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ "خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور فتن وبدعات شروع ہوتا ہے اور خلافت کے بعد مستبد اور کاٹھنے والی بادشاہت کی بنیاد پڑتی ہے۔" (۷۶) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب احیائے دین کے صفحہ ۳۶ اور ۵۶ پر بنی امیہ کی حکومت کو ملک مخصوص ( ) TYRANT KINGDOM انقلاب معکوس بلکہ جاہلی انقلاب قرار دیا ہے
حافظ علی بہادر خان لکھتے ہیں کہ "ابوسفیان، معاویہ، مروان اور بنی امیہ کے اکثر ممتاز رہنما حضرات کا رویہ ایسا رہا کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے

کے بعد اسلام کو صرف اس قدر اپنایا جس حد تک وہ مال و دولت اور جاہ و حشمت کا ذریعہ بن سکتا تھا اور جس حد تک وہ بنی ہاشم سے انتقام لینے میں کارآمد ہو سکتا تھا۔" (۷۷) صواعق محرقہ ۳۳ پر علامہ ابن حجر مکی نے لکھا ہے کہ " مروان بن الحکم نے تسلیم کیا تھا کہ علیؑ سے بڑھ کر کوئی عثمانؓ کا حمایتی نہ تھا مگر ہم منبروں پر علیؑ کو اس لئے گالیاں دیتے ہیں کہ اس کے بغیر ہمارا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا۔" گویا حضرت علیؑ کی دشمنی ہی اموی سیاست کا تقاضہ بھی تھی اور محور بھی۔ " فجر الاسلام " میں علامہ احمد امین مصری لکھتے ہیں کہ " بنی امیہ نے خلافت کو اپنی لونڈی بنا لیا تھا۔"

خود حضرت علیؑ نے معاویہ اور اس کی اسلامی حیثیت کی بابت جو اظہار خیال فرمایا وہ تمام دیگر شہادتوں اور تاریخی صداقتوں پر مقدم اور بھاری ہے کیونکہ آپ شیعوں کے امام، معصوم اور اہلسنت کے خلیفۂ راشد تھے۔ آپ نے معاویہ کو جو خطوط لکھے ان سے آپ کی محکم رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ حکیم نبی احمد خان رامپوری کی مرتب کردہ کتاب " مکتوبات حضرت علیؑ (شائع کردہ چین اسلامک پبلشرز لاہور، طبع سوم جولائی ۱۹۷۶ء) میں شامل مکتوبات نمبر ۸، ۲۰، ۲۴، ۳۳، ۴۲، ۵۳، ۹۳ کا مطالعہ خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ ان خطوط کے بعض جملے کتاب مذکورہ سے ماخوذ یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

(الف) اپنے طویل مکتوب نمبر ۸ میں معاویہ کے خط کے جواب میں جس میں اس نے شیخینؓ کی فضیلت، قتل عثمانؓ اور آپ کی ہمسری کا دعویٰ کیا تھا۔ حضرت علیؑ نے تحریر فرمایا کہ " جب اللہ تعالیٰ فضیلت اسلامی اور خیر خواہی اللہ و رسولؐ کے مطابق لوگوں کو مراتب عطا کرے گا تو اس میں ہم اہلبیتؑ کا حصہ سب سے زیادہ ہوگا۔" قریش مکہ کے مقابلہ بنی ہاشم کا ذکر کرتے ہوئے آپؑ نے لکھا کہ " قریش میں سے جو لوگ ایمان لا چکے تھے وہ ان

مصائب سے قطعی محفوظ رہے جن میں ہم مبتلا تھے۔" شہدائے بدرواحد وموتہ کی بابت آپؑ نے فرمایا کہ "پھر نہ کوئی اور شخص میرے سننے میں آیا نہ دیکھنے میں آیا جو عبیدہ بن حارث ، حمزہ ، جعفر اور زید سے زیادہ اللہ و رسولؐ کی اطاعت میں مخلص ہو۔" حضرت علیؑ پر قتل عثمانؓ کے الزام کے بارے میں آپؑ نے لکھا کہ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس معاملے سے قطعی بے تعلق تھا۔" حضرت علیؑ پر معاویہ کے دعوی برتری کے جواب میں آپؑ نے فرمایا کہ "زمانے کی نیرنگی دیکھو کہ میرے مقابلے میں وہ آرہا ہے جو نہ میری طرح پیش رو ہے اور نہ اسے میری جیسی سبقت اسلامی حاصل ہے جو دراصل میرے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔"

(ب) اپنے مکتوب نمبر ۲۰ میں آپؑ نے معاویہ کے خط کے جواب میں فرمایا کہ "تم نے ذکر کیا ہے کہ تم اور ہم دست وبازو تھے تو بے شک ہم ایسے ہی تھے لیکن ہمارے اور تمہارے درمیان اس طرح تفریق ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسولؐ ہم میں سے مبعوث فرما دیا تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور تم نے اس کو نہیں مانا یعنی ہم مومن اور تم کافر رہے۔" معاویہ کے دعوی مہاجرت پر آپؑ نے فرمایا کہ "تمہارا گمان ہے کہ تم مہاجرین میں شامل ہو کر مجھ سے ملو گے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں میں مہاجرین ہیں ہی کہاں کیونکہ تم طلقاء میں ہو اور آنحضرتؐ کے قول کے مطابق ہجرت فتح مکہ کے وقت ختم ہو چکی تھی۔"

(ت) خط نمبر ۲۳ میں قتل عثمانؓ اور قاتلان عثمانؓ کی بابت معاویہ کے مکتوب کے جواب میں آپؑ نے لکھا کہ "پہلے تم میری بیعت کرو پھر قوم کو لے کر مجھ سے فیصلہ کروانے کو آؤ تو میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق تمہارا اور ان کا فیصلہ کردونگا۔ رہی وہ بات جس کا تم نے تہیہ کیا ہے (خون عثمانؓ کے قصاص کا) تو یہ اس فریب کی طرح ہے جو بچے کو دودھ

چھڑاتے وقت دیا جاتا ہے۔" معاویہ کے حق خلافت کے بارے میں آپؑ نے دوٹوک الفاظ میں تحریر فرمایا کہ "معاویہ دیکھو! تم طلقاء میں سے ہو جن کو نہ خلافت جائز ہے، نہ جو امام بن سکتے ہیں اور نہ جنہیں شوریٰ میں شرکت کا حق ہے۔" مکتوب نمبر ۳۳ میں آپؑ نے لکھا کہ "تمہارے کہنے کے مطابق ہم عبد مناف کی اولاد تو ضرور ہیں لیکن ہم اور تم میں زمین آسمان کا فرق ہے کیونکہ امیہ، ہاشم کے، حرب عبدالمطلب کے اور ابوسفیان، ابوطالب کے برابر نہ تھے۔ نیز مہاجرین اور طلقاء اور حامی حق اور غلط کار میں کوئی نسبت نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمیں تو نبوت کا شرف بھی حاصل ہے۔" اپنے مکتوب نمبر ۴۲ میں آپؑ نے محمد بن ابو بکر کے خط کے جواب میں ان کو لکھا کہ "میں نے فاجر ابن فاجر معاویہ اور فاجر ابن کافر عمرو بن العاص کے خطوط پڑھ لئے ہیں۔ دونوں عمل معصیت میں باہم متحد، حکومت میں ایک دوسرے کے موافق اور راشی و ناپسندیدہ ہیں۔"

(ج) مکتوب نمبر ۵۳ میں جنگ نہروان کے خاتمے پر اپنے بعض ساتھیوں کو آپؑ نے تحریر فرمایا کہ "جب آنحضرتؐ اس دار فانی سے تشریف لے گئے تو امارت و خلافت کے بارے میں مسلمانوں میں جھگڑے پڑ گئے۔ بخدا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عرب اسے مجھ سے کسی دوسری طرف منتقل کر دیں گے۔" حضرت عمرؓ کی تشکیل کردہ خلیفہ ساز کمیٹی کی بابت آپؑ نے لکھا کہ "عمرؓ کی وفات کے بعد مجھے امید تھی کہ اب خلافت کا واحد حقدار میں ہی ہوں گا لیکن عمرؓ نے شوریٰ بنا دی جس کا چھٹا رکن مجھے بھی رکھ دیا۔ اہل شوریٰ کو میری خلافت سے زیادہ ناپسندیدہ کسی کی حکومت نہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے میرے خلاف اتحاد کر لیا۔" اہل کوفہ کو آپؑ نے یاد دلایا کہ "تمہاری جنگ طلقاء اور ان کی اولاد سے ہے جو دین سے منحرف، اسلام کے دشمن اور فقط دنیا کے بندے ہیں۔ یاد رکھو کہ میری نافرمانی میں تم نہ

ہدایت پاسکو گے اور نہ متحد رہ سکو گے۔"

(د) مکتوب نمبر ۹۳ میں آپؑ نے معاویہ کو جوابی خط میں فرمایا کہ "تمہارے گمان میں اسلام میں فلاں فلاں شخص افضل ہے تو بھلا تم کیا جانو کہ برتر کون اور کم تر کون ہے۔ بھلا طلقاء اور انکی اولاد کو مہاجرین اولین میں امتیاز پیدا کرنے، ان کے درجات متعین کرنے اور ان کے طبقات مقرر کرنے کا کیا حق ہے۔" حضرت ابو بکرؓ کی جبری بیعت کا طعنہ دینے پر آپ نے معاویہ کو لکھا" تم نے تحریر کیا ہے کہ بیعت کے لئے مجھے اس طرح گھسیٹا گیا جیسے نکیل پڑے اونٹ کو تو خدا کی قسم تم مذمت کرنا چاہتے تھے لیکن مدح کر بیٹھے اور تم نے ہماری رسوائی چاہی تھی مگر خود رسوا ہوگئے۔"

معاویہ نے مسند حکومت پر قدم رکھتے ہی صلح نامہ حسنؑ کی خلاف ورزی شروع کردی ۔ آلِ محمدؑ اور محبان آلِ محمدؑ کو انتقام کا نشانہ بنالیا۔ ان کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ تیز کردیا۔ اپنی اور اپنے پیش رواموریوں اور اصحاب ثلاثہ بالخصوص عثمانؓ بن عفان کی جھوٹی تعریف وتوصیف کی من گھڑت حدیثوں پر انعام واکرام کی بارش کردی : سلطنت کے طول وعرض میں حضرت علیؑ پر سب وشتم کا سلسلہ پوری شدت سے جاری رکھااور لوگوں میں حضرت علیؑ اور آل علیؑ کی ایسی بھیانک تصویر پیش کی جس سے نفرت عام ہوجائے۔ دباؤ، دھونس، لالچ، قتل اور جلاوطنی کے تمام حربے بے دریغ استعمال کئے۔ اس طرح معاویہ نے ہر اعتبار سے عہد جاہلیت کی تمام قبیح رسوم کو زندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور ایک مطلق العنان دنیوی بادشاہ کی حیثیت اختیار کرلی ۔ طبری جلد ۶ نمبر ۹۳ کی رو سے " معاویہ نے صلح نامہ حسنؑ کی کسی شق پر عمل نہ کیا اور جتنی شرائط مذکور تھیں سب کی خلاف ورزی کی ۔ " اموی حکومت نے قرآن وسنت کی بھی کوئی پرواہ نہ کی یہاں تک کہ نماز تک میں تبدیلی کردی ۔ " حضرت علیؑ نماز میں " بسم اللہ " بلند

آواز سے کہتے تھے اور سجدے میں جاتے اور اٹھتے وقت تکبیر کہتے تھے لیکن بنی امیہ نے اس کی ممانعت کر دی اور اپنے دور اقتدار میں حضرت علیؑ کے آثار مٹانے کی بھرپور کوشش کی ۔ (۷۸) معاویہ جب حج کے بعد مدینہ آیا تو ایک جلیل القدر انصاری اور محب اہلبیتؑ جناب قیس بن سعد بن عبادہ کے ساتھ جو اس کی گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۔ جناب قیسؓ نے معاویہ کے باپ ابو سفیان اور اس کے خاندان کی اسلام اور اہلبیتؑ سے دشمنی کی کھل کر مذمت کی اور مناقب وفضائل حضرت علیؑ بیان فرمائے تو معاویہ بے حد جز بز ہوا اور حکم صادر کیا کہ مدینہ میں منادی کرا دی جائے کہ جو شخص فضائل علیؑ میں زبان کھولے گا اور علیؑ سے بیزاری (تبرا) کا اظہار نہیں کرے گا تو اس کا مال ضائع اور خون رائیگاں ہوگا۔ پھر دمشق واپس جا کر تمام عمال حکومت کو اسی قسم کا مراسلہ روانہ کیا اور ۔ واضح حکم دیا کہ علیؑ کے طرفداروں کی فہرست بناؤ اور ان کے نام بیت المال اور وظائف کے دفتر سے خارج کردو اور علیؑ کی محبت کا دم بھرنے والوں کو چن چن کر قتل کردو ۔ (۷۹)

امام حسنؑ قطعی خاموش اور سیاست سے لاتعلق زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ۔ معاویہ کو آپؑ کا بے ضرر وجود بھی زیادہ دیر تک برداشت نہ ہو سکا کیونکہ صلح نامہ کی ایک اہم شق (ولیعہدی) کے راستے میں آپؑ کی ذات حائل تھی ۔ ۵۰ھ / ۶۷۰ء میں آپؑ کو سازش کے تحت زہر دلوا کر شہید کروا دیا گیا۔ (۸۰) آپؑ کو امیر معاویہ کے گورنر مروان بن الحکم نے نانا کے پہلو میں دفن نہ ہونے دیا اور جنابؑ کی میت پر تیروں کی بارش کی لہذا جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسین اسی روش پر گامزن رہے جو امام حسنؑ متعین کر گئے تھے۔ شیعیان کوفہ کو آپؑ نے جوابی مکتوب لکھا جو ثابت کرتا ہے کہ آپؑ اور آپؑ کے بڑے بھائی (امام حسنؑ)

کے مابین کوئی اصولی اختلاف نہ تھا۔ آپؑ نے تحریر فرمایا کہ " ہم میں اور معاویہ میں معاہدہ ہو چکا ہے جس کا توڑنا میرے لئے مناسب نہیں ہے۔ معاویہ کے انتقال کے بعد دیکھا جائے گا۔ " (۸۱) صلح نامہ حسنؑ کی آخری سنگین خلاف ورزی معاویہ نے یہ کی کہ اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد نامزد کر دیا۔ معاویہ تو یہ چاہتا ہی تھا مگر اس خیال کو مہمیز مغیرہ بن شعبہ نے دی ۔ سانحہ کربلا ، مطبوعہ لاہور ، اشاعت اول ۱۹۸۳ ۔ صفحہ نمبر ۲۸ ۔ ۳۰ پر ڈاکٹر اسرار احمد کے حوالے سے لکھا ہے کہ " یہ بات (ولیعہدی یزید کا معاملہ) آپؑ کو مغیرہ بن شعبہ نے سجھائی تھی ۔ " اس کی وجہ بھی موصوف ہی کے الفاظ میں سن لیجئے کہ " اس وقت بحیثیت مجموعی امت کے حالات اس جمہوری اور شورائی مزاج کے متحمل نہیں رہے ہیں جو محمدؐ رسول اللہ نے پیدا فرمایا تھا۔ لہذا حالات کے پیش نظر ایک سیڑھی اتر کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ " اس اعتراف سے واضح ہوتا ہے کہ مزاج امت میں تبدیلی اور طریقۂ رسولؐ سے انحراف کس حد تک ہو چکا تھا۔ حالانکہ یہ تبدیلی اور انحرف تو خلافت اول ہی میں رونما ہو چکے تھے اس کا اعتراف خود حضرت ابو بکرؓ نے کیا ہے کہ " ایک موقع پر کچھ عیسائی حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور قرآن کی آیات سن کر ان عیسائیوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ کبھی یہ حال ہمارا بھی ہوا کرتا تھا۔۔۔۔یہاں تک کہ ہمارے دل سخت ہو گئے ۔ " ملاحظہ ہو سانحہ کربلا صفحہ نمبر ۳۵ طبع اول ، لاہور ۔ بہر حال یزید کی ولیعہدی کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر " ۵۸ ھ میں معاویہ اپنے لاؤ لشکر سمیت مدینہ میں آیا جہاں ننگی تلواروں کے سائے میں اس کا اعلان کیا اور مخالفین کو قتل کی دھمکیاں دیں۔ " (۸۳) " یزید کی ولیعہدی کی مخالفت حضرت عائشہؓ نے بھی کی تھی جن کو معاویہ کے گورنر مروان بن الحکم نے ایک خاص تقریب کے بہانے دارالامارہ میں مدعو کر کے زندہ دفن کروادیا۔ اس طرح حضرت

عائشہ کے بارے میں رسولؐ کی ایک پیشن گوئی پوری ہوئی ۔" (۸۲) اس واقعہ کی وضاحت تاریخ " روضتہ الاحباب " کی رو سے یہ ہے کہ اپنے مرض الموت کے دوران ایک دن رسولؐ اللہ نے حضرت عائشہ کے حجرہ کے پاس سے گذرتے ہوئے " ہائے میرا سرہائے میرا سر " کی کراہ سنی ۔ آپؐ حجرے میں داخل ہوئے اور فرمایا کہ " نہیں عائشہ! تمہیں نہیں بلکہ مجھے ہائے میرا سر کہہ کر چلانا چاہیئے ۔" پھر کچھ توقف کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ " اے عائشہ! کیا تم یہ پسند نہیں کرو گی کہ تم میرے سامنے مرجاؤ ، میں تمہیں کفنادوں ، تمہاری جنازہ پڑھ دوں اور تمہیں دفنادوں ۔" حضرت عائشہ رسولؐ کا مدعا نہ سمجھ سکیں ۔ رسولؐ کوئی بات بے مقصد اور بے موقع نہیں کہتے تھے ۔ " دراصل اس جملے میں حضرت عائشہ کے زندہ دفن کئے جانے کی پیش گوئی مضمر تھی ۔ جو سینتالیس سال بعد پوری ہوئی کہ محل کے گوھے میں آپ کو گرا کر اس کو پتھروں اور چونے سے پاٹ دیا گیا ۔" (۸۳) بعض مورخوں نے اس کی ذمہ داری معاویہ کے بجائے مروان پہ عائد کی ہے تاہم معاویہ نے اپنے گورنر کو کوئی سزا دی نہ باز پرس کی اس واقعہ سے انکار نہیں کیا گیا جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ ، جلد ۲ صفحہ ۶۶ ۔ ۶۷ ، مورخ نجیب آبادی نے تاریخ اسلام جلد ۲ صفحہ نمبر ۲۴ اور تاریخ حبیب السیر جلد اول صفحہ نمبر ۸۵ میں تحریر کیا ہے ۔ بہرکیف حضرت امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے صاف انکار کردیا ۔ جس پر معاویہ نے آپؑ کو سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی ۔ معاویہ کے مظالم اور صلح نامہ حسنؑ کی مسلسل خلاف ورزیوں کے سلسلے میں امام حسینؑ نے معاویہ کے تہدیدی مکتوب کے جواب میں ایک طویل اور مدلل خط لکھا جس میں دیگر باتوں کے علاوہ آپؑ نے تحریر فرمایا کہ " میں اپنی موجودہ خاموشی پر خوش نہیں ہوں اور تمہارے لئے اور تمہارے ہوا خواہوں کے لئے یہ کبھی کوئی سند نہیں بن سکتی امت محمدی میں کوئی فتنہ تمہاری

حکومت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امت کے مفاد اور رضائے الہیٰ میں ہوگا اگر میں تمہاری مزاحمت کروں۔" (۸۵)

۲۲ رجب ۶۰ھ کو معاویہ کی موت واقع ہوئی اور یزید تخت حکومت پر بیٹھ گیا۔ وہ فاسق اور فاجر تو تھا ہی، اب مطلق العنان حاکم بن کر نیابت رسولؐ اور خلافت محمدی کا دعویٰ دار بھی ہوگیا اور اس دعویٰ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ امام حسینؑ کی ذات اقدس تھی جو فرزند رسولؐ بھی تھے اور نمائندہ رسولؐ بھی۔ یزید نے حاکم مدینہ کو تحریری حکم دیا کہ "حسینؑ ابن علیؑ سے بیعت لو یا ان کا سر کاٹ کر بھیج دو۔" آپؑ کے لئے بیعت کسی صورت بھی قابل قبول نہ تھی۔ آپؑ کے پیش رو آئمہ (حضرات علیؑ و حسنؑ) نے پچھلے حکمرانوں کی بیعت نہیں کی تھی۔ ان کی خاموشی یا مفاد اسلام میں تعاون کو بیعت نہیں کہا جاسکتا۔ نمائندہ الہیٰ اور وصیٔ رسولؐ کی حیثیت میں یہ حضراتؑ کسی امتی کی بیعت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ امام حسینؑ اپنے انکار کے سنگین نتائج سے واقف تھے اور اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے وقت و مقام سے آگاہ تھے۔ ۲۸ رجب ۶۰ھ کو آپؑ نے مدینہ سے ہجرت فرمائی۔ آپؑ کے ہمراہ چند ہاشمی جوان اور خواتین و اطفال تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی خروج یا جنگ کے لئے اس تعداد اور اس قسم کے افراد کے ساتھ کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ علامہ اقبالؒ نے کہا۔

مدعائش سلطنت بودے اگر
خود نہ کردے باچنیں ساماں سفر

آپؑ مدینہ سے مکہ تشریف لائے۔ ۸ ذوالحجہ ۶۰ھ / اکتوبر ۶۸۰ء کو آپؑ نے مکہ چھوڑا کیونکہ حاجیوں کے بھیس میں قاتلوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ آپؑ نے حرمت کعبہ بچانے کے لئے حج کو عمرہ سے بدلا اور لوگوں کے لئے سوالیہ نشان بنا کر عراق کی طرف روانہ ہوگئے۔ امام حسینؑ کی مکہ سے

عراق کی طرف روانگی کی اطلاع پر یزید نے ابن زیاد کو لکھا کہ • جس کسی پر بھی مخالفت کا گمان ہو تو اس کو قید میں ڈال دو۔ • چنانچہ جیل خانے ایسے قیدیوں سے چھلکنے لگے۔ اس کا اعتراف خود ابن زیاد نے اس طرح کیا کہ • ایسا کوئی شخص (شیعیان علیؑ ہی نہیں بلکہ ہمدرد و طرفداران اہلبیتؑ) نہیں جس پر حکومت کی مخالفت (حسینی حمایت) کا گمان ہو مگر یہ کہ وہ قید میں ہے۔ اس طرح جن لوگوں پر ہلکا سا شبہ بھی حمایت و طرفداریٔ امامؑ کا تھا ان کو پابہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ الزام لغو ہے کہ شیعیان کوفہ نے بے وفائی کی اور قتل حسینؑ میں شریک ہوئے۔ • امامؑ کے جانثاران کربلا میں کم از کم چالیس شیعیان کوفہ تھے اور یہ وہ سب تھے جو خلقت کے دل و دماغ تصور کئے جاتے تھے۔ • (۸۶)

آپؑ کا یہ سفر وہ اہم سفر تھا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ دوران سفر آپؑ کو حضرت مسلم بن عقیلؑ کی شہادت کی خبر ملی جن کو آپؑ نے اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیجا تھا اس کے بعد حر کے لشکر کا سامنا ہوا جو لشکر سمیت شدت عطش سے جاں بلب تھا۔ مگر آپؑ کا راستہ روک کر کوفہ کی بجائے ایک بے آب و گیاہ میدان تک لیجانے پر مامور تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپؑ نے دشمنوں کی سیرابی کا حکم دیا۔ حر کی قیادت میں فوج یزیدی کا یہ دستہ امامؑ اور ان کی مختصر جماعت کو کربلا کے ریگستان تک لے آیا۔ کربلا میں ورود مسعود سے قبل آپؑ کو کوفہ کی صورت حال سے مکمل آگاہی ہو چکی تھی کہ • لوگوں کے دل تو آپؑ کے ساتھ ہیں مگر تلواریں آپؑ کے دشمنوں کے ساتھ • آپؑ نے اپنا ارادہ نہ بدلا اور فرمایا کہ • مجھے ناناؐ نے خواب میں ہدایت کی ہے کہ راہ حق میں اسی طرح چلتا رہوں۔ • (۸۷) محرم الحرام ۶۱ھ کی ۲ تاریخ کو کربلا کی سرزمین نے آپؑ کے قدم چومے۔ قبیلہ بنی اسد کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو جمع کر کے آپؑ نے اپنی شہادت کے بارے میں کچھ

وصیت فرمائی ۔ ایک قطعۂ زمین ان سے خرید ا اسمیں غالباً یہ مصلحت تھی کہ کوئی کوتاہ نظر یہ نہ کہہ سکے کہ غیروں کی زمین میں دفن ہوئے۔ بلکہ یہ تسلیم کرنا پڑے کہ اپنی ہی ملکیت میں قیام کرتے ہوئے آپؑ نے دفاعی جنگ لڑی تھی ۔ ۳ محرم کو آپؑ نے دریا کے کنارے سے اپنے خیام محض اس لئے ہٹا لئے تھے کہ اس بات کو وجہ جنگ قرار دے کر کربلا کی اصلیت کو چھپایا نہ جاسکے۔ ۷ محرم کو آپؑ کی مختصر جماعت پر پانی بند کر دیا گیا۔ ۹ محرم تک آپؑ دشمنوں کی کثرت افواج میں پوری طرح گھر گئے۔ آپؑ کے جاں نثاروں میں اٹھارہ بنی ہاشم سمیت بہتر یا کچھ زیادہ رفقائے شہادت تھے۔ تاریخ طبری جلد ۶ / الاخبار الطول صفحہ نمبر ۲۵۴ / ارشاد ۲۳۶ کے مطابق لشکر حسینی جس کو لشکر کہنا بھی درست نہیں ہے، میں ۳۲ سوار اور ۴۰ پیادے تھے اسی وجہ سے ۷۲ کی تعداد مشہور ہے جب کہ یہ تعداد سو سے زائد بھی بتائی جاتی ہے ۔ ان میں جناب حبیب ابن مظاہرؓ جیسا بوڑھا اور حضرت علی اصغرؑ جیسا شیر خوار مجاہد بھی تھا۔ اصحاب حسینیؑ میں اس عہد کے منتخب روزگار حضرات شامل تھے جو مختلف قبیلوں اور علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے انتخاب میں امامؑ نے اپنی بصیرت سے کام لیا اور اس قلیل جماعت حق کو عالمگیر رنگ وحیثیت دیدی تا کہ کوئی خیرہ چشم جہاد کربلا کو دو شہزادوں یا دو خاندانوں کی جنگ سے تعبیر نہ کرسکے۔ خود امامؑ نے اپنے ساتھیوں کو وہ آفاقی سند دی جو کسی نبی یا امام کے حامیوں کو نصیب نہ ہو سکی ۔ جناب نازش حیدری نے کہا۔

چلے تھے ساتھ بہتر نفوس لے کے مگر
جلال وقدس کی دنیا سمیٹ لائے حسینؑ

مدینے سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک سفر وقیام کی تمام منزلوں پر آپؑ لوگوں کو بالعموم اور اپنے ہمراہیوں کو بالخصوص اپنے مقصد سفر اور اس کے

تباہ کن انجام سے آگاہ کرتے رہے تاکہ کسی خوش فہمی میں لوگوں کی بڑی تعداد آپؑ کے ساتھ نہ ہوجائے۔ آپؑ چاہتے تھے کہ آپؑ کے ساتھ فقط وہ لوگ ہی رہ جائیں جو آپؑ کے مقصد سے مکمل ہم آہنگی رکھتے ہوں اور جن میں کربلا کے جھٹکوں کو جھیل جانے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہو۔ آپؑ کا مقصد کثرت افواج سے پورا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ آپؑ کو تاریخ آدم وعالم کی ایک انوکھی اور منفرد جنگ لڑنا تھی۔ حکومت کی زبردست مادی طاقت سے ٹکرانے اور اس کو پاش پاش کرنے کا واحد راستہ یہ ہی تھا کہ طاقت کا مقابلہ سیرت وکردار کی قوت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت اور صبر واستقامت کے بلند ترین معیار سے کیا جائے تاکہ عامۃ الناس کے مردہ ضمیر کو زندہ کیا جاسکے اور ان کے احساسات کو نئی زبان دیدی جائے جس کو جبر وجور حکومت نے چھین لیا تھا۔ یاد رہے کہ "ظلم وجور کی طاقتیں لوگوں کو اپنے شکنجے میں قید رکھنے کے لئے دو خاص حربے بروئے کار لاتی ہیں۔ ایک یہ کہ عوام سے قوت احساس کو سلب کرلیتی ہیں اور دوئم یہ کہ ان سے جرأت اظہار کو چھین لیتی ہیں۔ شام کی اموی حکومت نے ان ہی دونوں حربوں پر اپنی پوری طاقت صرف کردی تھی۔" لیکن امامؑ کی اعلیٰ حکمت عملی اور قربانیوں کے معیار نے حکومت جور کے یہ حربے بھی ناکام بنا دیئے اور لوگوں کے مردہ احساسات کو ایک نئی زندگی دے کر اظہار نفرت کے لئے قوت گویائی بھی عطا کر دی۔ جہاد کربلا سے امامؑ کا مقصد یہ تھا کہ "ایک دفعہ دنیا کے سامنے حقیقت کو پوری شدت اور قوت کے ساتھ پیش کردیں تاکہ یہ قطعی واضح ہوجائے کہ حکومت وبادشاہت اور ہے اور اسلامی تہذیب وتمدن اور اس کے اصول اور ہیں۔" (۸۸) آپؑ نے شب عاشور جو ایک رات کی مہلت لی تھی وہ بھی حکمت سے پر تھی۔ اپنے ساتھیوں کی آزمائش کے علاوہ فوج دشمن کو بھی موقع دینا چاہتے تھے کہ خوب غور کرلیں

تاکہ خون ناحق سے بچ سکیں۔ یہ مہلت اپنی جان بچانے کو نہ تھی بلکہ دشمنوں کو جہنم سے بچانے کی آخری کوشش تھی کہ بہرحال وہ نام نہاد مسلمان تھے۔ یہ مہلت مستقبل کے جانبدار مؤرخوں اور اقتدار پرستوں کی تحریری وفکری کج روی کو روکنے کی بھی حکمت تھی کہ کوئی ہمدرد بنی امیہ، آپؑ پر انگشت نمائی کرنے اور یزید کی طرفداری کرنے کے لائق ہی نہ رہے۔ صبح عاشور نمودار ہوئی۔ علامہ سیماب اکبرآبادی نے کہا۔

نیاز مشرب شبیرؑ کا ہے پاس فطرت کو
بغیر سجدہ مومن نہیں ہوتی سحر اب بھی

امامؑ اور امامؑ کی مختصر جماعت ابھی فریضۂ سحری سے پوری طرح فارغ بھی نہیں ہوئی تھی کہ فوج یزیدی کے سالار عمرو بن سعد بن ابی وقاص نے تیر چھوڑ کر آغاز جنگ کر دیا۔ امامؑ مظلوم میدان کارزار میں تشریف لائے اور فوج دشمن سے خطاب فرمایا۔ آپؑ نے اللہ و رسولؐ کے احکام یاد دلائے، اپنا مکمل تعارف کروایا، اپنی بے گناہی کا اقرار لیا اور حجت تمام کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تمہیں میرا وجود مملکت اسلامیہ میں گوارا نہیں ہے تو راستہ دیدو میں ہند چلا جاتا ہوں۔ جیسا کہ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی نے۔۔۔ کربل نگری میں ارشاد فرمایا کہ:

گردن پہ نہ لو خوں یہ سودا نہیں سستا
میں ہند چلا جاؤنگا دے دو مجھے رستا

امامؑ کے خطبہ کے جواب میں ادھر سے تیروں کی بارش ہوئی۔ باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ حرؑ ریاحی جو امامؑ کے مصلحانہ اور انتہائی شریفانہ طرز عمل کو اور فوج یزیدی کے ظالمانہ اور انسانیت سوز رویہ کو دیکھ رہا تھا، سخت نادم وپریشان تھا کیونکہ وہ امامؑ کو یہاں تک لانے کا ذمہ دار تھا۔ اس کا دل جماعت حسینی میں اور جسم فوج یزیدی میں تھا۔ وہ ظلمت سے نور کی طرف

آگیا۔ اس کے ساتھ اس کا بھائی، بیٹا، اور ملازم بھی تھے۔ یہ ہی حرؑ اصحاب حسینی میں اولین شہیدان حریت میں تھا۔ کربلا کے میدان میں آغاز جنگ سے قبل ہی یہ امامؑ کی پہلی اخلاقی فتح تھی۔ اصحاب و اعزا۔ نے بڑی بہادری سے جانیں قربان کیں اور یہ مختصر جماعت سرفروشاں صبح سے دوپہر تک جہاد کرتے ہوئے ابدی نیند سو گئی۔ آخر میں امامؑ مظلوم چھ ماہ کے علی اصغرؑ کو میدان میں لے آئے اور شیرخوار بچے کے لئے طلب آب فرمایا۔ یہ طلب آب نہ تھی بلکہ دشمنوں کے چہروں سے اسلام اور انسانیت دونوں کی مصنوعی نقاب کو تار تار کر دینے کی حکمت عملی تھی۔ عمر سعد کے حکم پر امامؑ کا کلام منقطع کر دیا گیا کہ حرملہ ملعون نے سہ پہلو تیر سے حلقوم معصوم کو نشانہ بنا لیا۔ پیاس سے سسکتا ہوا بچہ باپ کے ہاتھوں پر منقلب ہو گیا۔ امامؑ نے ذوالفقار سے چھوٹی سی قبر کھود کر بچے کو سپرد خاک کر دیا۔ اس عہد کے ممتاز شاعر جناب صبا اکبر آبادی نے اس صورتحال کو یوں مسدس کا لباس پہنا دیا۔

اس دم ہوا عجیب شہ کربلا کا حال
بچّے کا خون دیکھ کے آنے کو تھا جلال
کچھ دیر سوچتے رہے شبیرؑ خوش خصال
پھر خود سپرد خاک کیا اپنا نونہال

بے شیرؑ کی لحد نہیں یہ حد صبر ہے
تلوار سے کھدی ہے، سپاہی کی قبر ہے

اب امامؑ مظلوم تنہا تھے۔ عصر عاشور آپؑ نے وہ تاریخی جہاد کیا جس کی مثال رہتی دنیا تک نہیں مل سکے گی۔ بھوکے پیاسے، زخموں سے چور اور غموں سے نڈھال ستاون سالہ ہاشمی بہادر نے حضرت علیؑ کی شجاعت و جنگ کی یاد تازہ کر دی۔ آپؑ نے تین بڑے حملے کئے اور کثیر فوج دشمن کو پسپا

کردیا۔ "ارجعی" کی ندائے غیب آئی۔ لبیک کہہ کر آپؑ نے تلوار کو نیام میں رکھا نماز عصر کا ہنگام تھا۔ آپؑ پشت ذوالجناح پر نہ ٹھہر سکے۔ زمین گرم پر تشریف لائے۔ بھاگی ہوئی سپاہ پلٹ آئی۔ آپؑ پر ہر طرح کے حملے ہونے لگے۔ آپؑ سرپاک جھکائے ہوئے ذات بے نیاز سے محو راز و نیاز تھے۔ حضرت نجم آفندی اکبر آبادی نے اس وقت کی کیفیت یوں نظم فرمائی۔

حسینؑ خاک پہ بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

نہ جانے راز میں کیا کیا پیام آئے ہیں
درود کتنے مسافر کے نام آئے ہیں
فراز عرش سے لاکھوں سلام آئے ہیں

حسینؑ خاک پہ بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

کہاں حضورؑ کو فرصت جو کچھ ٹھہر جائیں
لگن لگی ہے کہ سجدے میں جلد تر جائیں
یہ وقت عصر ہے اکبرؔ سلام کر جائیں

حسینؑ خاک پہ بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

امام مظلومؑ نے اپنا سر نیاز سجدہ بے نیاز میں زمین کربلا پر رکھ دیا۔ یہ عبادت اور یہ سجدہ معمولی نہ تھا۔ تاریخ بشری میں ایسے سجدے کی اور وہ بھی ایسے عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے فرمایا۔

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درون پردہ صد رنگ کائنات
اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی* طرف

* امام سجدہ معبود ہی میں تھے کہ شمر لعین نے آپؑ کو پس گردن سے ذبح کردیا اور سراقدس کو نیزہ پر بلند کردیا۔ * (۸۹) امام حسینؑ کا سر تو کٹ گیا مگر باطل کے آگے جھک نہ سکا اور ساتھ ہی اموی حکومت واقتدار اور یزیدی ذہنیت وافکار کی شہ رگ بھی کٹ گئی۔ شہید کربلا بظاہر ہار کر بھی فاتح ٹھہرے اور شکست وفتح کا مفہوم ہی بدل ڈالا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

نقش الااللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

امام حسینؑ اور ان کے انصار شہید ہوگئے۔ * بیعت لو یا سر کاٹ کر بھیج دو * کا یزیدی حکم پورا ہوچکا۔ معاملہ یہاں ختم ہوجانا چاہیئے تھا مگر ایسا نہ ہوسکا۔ لاشوں کو پامال کرکے بے حرمتی کی گئی۔ خیام اہلبیتؑ کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ گویا وہ عمل جو پہلی خلافت میں خانہ علیؑ وفاطمہؑ کو جلا دینے کی دھمکی سے شروع ہوا تھا اب اس کی تکمیل کر دی گئی۔ خانوادہ رسالتؐ کی محترم خواتین کو دربدر پھرایا گیا اور قیدی بنا کر ابن زیاد اور یزید کے کوفہ ودمشق کے درباروں میں نہایت ذلت وخواری کے ساتھ لایا گیا۔ آلِ محمدؐ کا لٹا ہوا قافلہ پابہ زنجیر کوفہ اور کوفہ سے شام کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت آل رضا لکھنوی کے مرثیہ کا ایک بند ہے۔

قافلہ آلِ محمدؐ کا سوئے شام چلا
لے کے کچھ خون سے لکھے ہوئے پیغام چلا
روندتا پاؤں سے ہر گردش ایام چلا
ہاتھ بندھوائے پئے نصرت اسلام چلا

اک سفر ختم ہوا ایک سفر کرنا ہے
کربلا فتح ہوئی ، شام کو سر کرنا ہے

اہل حرم کی تشہیر خود تشہیر ظلم کا موجب بنی ۔ حضرت زینبؑ اور امام زین العابدینؑ کے خطبوں نے نام نہاد اسلامی حکومت کی اصلیت اور جور بے حد کی داستان خوں چکاں کو اجاگر کر دیا۔ کوفہ اور دمشق کے بھرے اور آراستہ درباروں میں صحابی رسولؐ اور سفیر روم نے ابن زیاد اور یزید پر لعنت کی ۔ یہ اسیران کربلا کی بڑی کامیابی تھی ۔ جس کی نظیر تاریخ شاید کبھی پیش نہ کر سکے۔ یہیں سے اس انقلاب کی داغ بیل پڑی جو بعد میں یزیدی اور اموی حکومت سے نفرت اور انتقام خون حسینؑ کی تحریک کی صورت میں نمودار ہوا ۔ اہلبیتؑ رسولؐ دمشق کے زندان میں عرصہ دراز تک مقید رہے۔ " جب ملک میں بے چینی کے آثار ظاہر ہونے لگے اور یزید کو اپنی زبردست سیاسی غلطی کا احساس تیز تر ہو گیا تو اب ان اسیروں کو رہائی ملی ان کے مطالبے پر ایک مکان خالی کروایا گیا جس میں دمشق کے مخصوص گھرانوں کی عورتوں نے امام مظلومؑ کا پرسا دیا اور تین روز تک شہداء کا ماتم برپا ہوا۔ " (۴۰) کم و بیش ایک سال کی پر صعوبت قید سے آزادی ملی مگر یہ رہائی بھی عجیب اور منفرد تھی کہ بے بس قیدیوں نے حاکم جور سے اپنی رہائی کی شرائط منوائیں۔ دمشق میں یزید کے دارالحکومت میں مجلس عزاء برپا کی گئی اور انقلاب فکر و نظر کی اساس رکھ دی گئی ۔ اس طرح مظلومیت نے انتہائے ظلم پر وہ فتح پائی جو تاریخ میں فقید المثال ہے۔ " اہلبیتؑ کو رہا کرتے وقت یزید

نے اپنا جرم چھپانے کی خاطر ابن مرجانہ (ابن زیاد) کو مورد الزام ٹھہرایا اور اس پر لعنت کی۔" (۹۱) یزید کا عذر ناقابل قبول تھا کیونکہ قتل حسینؑ اور اسیری اہلبیتؑ کا وہ خود ذمہ دار تھا۔ ابن زیاد تو شریک جرم تھا کہ اس نے تعمیل حکم کی تھی۔ اگر ایسا نہ تھا تو یزید نے اپنے اقتدار کے آخر (۶۴ھ) تک اس کو سزا کیوں نہیں دی اور گورنری پر کیوں برقرار رکھا۔ واقعہ کربلا کو زندہ رکھنے اور شہادت کے عظیم کارنامے کو اجاگر کرنے میں ان اسیران کربلا نے تاریخی کردار ادا کیا تھا۔ یہ مقصد شہادت کے محافظ تھے اور اسی مقصد کے لئے امامؑ نے انہیں ساتھ رکھا تھا۔ انہوں نے اموی حکومت کے تمام حربے اسی پر لوٹا دیئے اور اس کو اس طرح برہنہ کر دیا کہ کسی دفاع کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ امام حسینؑ کی فتح مبین کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپؑ کے پسماندگان (عورتوں اور بچوں) میں سے کسی نے بھی معذرت خواہانہ رویہ کا کبھی اظہار تک نہیں کیا اور خود یزید اپنے مطالبہ بیعت کو نہ دہرا سکا۔ کوفہ کے دربار میں جب ابن زیاد نے امام زین العابدینؑ کو قتل کرنا چاہا تو بیمار کربلا نے نہایت بے باکی اور جرأت سے فرمایا کہ "ابن زیاد! تو ابتک نہ سمجھ سکا کہ قتل ہونا ہماری عادت اور شہادت ہماری فضیلت ہے۔" (۹۲)

کربلا کی زیارت کرتا ہوا یہ کاروان اہلبیتؑ حضرت زینبؑ اور امام زین العابدینؑ کی سرکردگی میں مدینہ رسولؐ واپس ہوا۔ مگر اب یہ قافلہ لٹا ہوا۔ تباہ حال اور غموں سے چور چور تھا۔" حضرت ام کلثومؑ کے مرثیہ کا خلاصہ تھا کہ اے نانا کے مدینہ! ہماری واپسی کو قبول نہ کر کہ ہم سارے گھر کو لٹا کر خالی ہاتھ آئے ہیں۔" (۹۳) سورہ بقرہ ۸۳ - ۸۶ میں مسلمانوں کو اس عہد کی یاد دلائی گئی ہے جو ان سے بعض مخصوص ہستیوں کے بارے میں لیا گیا تھا جس کی انہوں نے سنگین خلاف ورزی کی۔ یہ میثاق واضح طور پر امام

حسینؑ اور ان کی اہلبیتؑ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جن کو جلاوطنی پر مجبور کیا گیا، قتل کیا گیا اور قیدورسوا کیا گیا۔ یزید ختم ہو گیا۔ اموی حکومت سیل فنا میں بہہ گئی لیکن امام حسینؑ، ان کے انصارؓ اور اہلبیتؑ کی محبت کے چراغ دلوں میں آج بھی روشن ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا:

شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تارما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

کربلا کے ۶۱ھ کے محرم سے ایک ایسے محرم کا آغاز ہوا جو ہر سال ایک نئی توانائی وتازگی اور ولولۂ عمل کا پیامبر بن کر آتا ہے۔ ذکر شہادت دراصل اسلام کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو حرارت ابدی کی ضمانت دیتا ہے۔ حسینؑ اور اسلام لازم وملزوم ہوگئے۔ محرم کے پہلے عشرہ کی بابت سورہ فجر میں صبح عاشور اور پہلے دس ایام محرم کی قسم کھائی گئی ہے۔ ان آیات کی تشریح میں امام فخرالدین رازی نے "تفسیر کبیر" جلد ۸ صفحہ ۵۵۸ اور علامہ قرطبی نے "الاجامع الاحکام القرآن" (تفسیر قرطبی) جلد ۲۰ صفحہ نمبر ۳۸ مطبوعہ مصر میں لکھا ہے کہ "فجر" سے مراد صبح عاشور ہے اور "لیالی عشر" سے مراد محرم کے پہلے دس روز ہیں۔ ان میں یوم عاشور کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ "واقعہ کربلا حق وباطل کے درمیان تاریخ بشری کا عظیم ترین سانحہ ہے۔ یہ امام حسینؑ اور یزید کی ذاتی دشمنی اور کشمکش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کشمکش میں اسلام کے بنیادی اصول نہایت واضح طور پر زد میں آگئے تھے۔ اگر امام حسینؑ بیعت کرلیتے تو اسلام کی انقلابی تحریک ختم ہوجاتی اور دین ہمیشہ کے لئے بادشاہت وحکومت کا تابع ہو کر رہ جاتا۔ جرمن مؤرخ ماربین نے اپنی کتاب "اسلامی سیاست" میں لکھا کہ "حسینی تحریک عبارت

ہے قوت ارادی سے ، عزت نفس سے اور طاقت ایمانی سے جس نے ظلم کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا اور ہنگامی فتح کے بجائے ایک ایسی لازوال فتح کو اپنا مقصود قرار دیا جس نے انسانیت کو مکمل تباہی سے بچالیا۔

کربلا کے بعد آئمہ اہلبیتؑ

۶۱ ھ ہی میں کربلا کے عظیم سانحہ کا رد عمل شروع ہوگیا۔ مدینہ میں یزید کے خلاف خروج کر کے انصار مدینہ نے جناب عبداللہ بن حنظلہ کی حکومت قائم کرلی ۔ کوفہ میں جناب سلیمان بن صرد خزاعی کی رہبری میں توابین کی تحریک چلی جو بڑھ کر "انتقام خون حسینؑ" کی صورت میں پھیل گئی ۔ کوفہ میں جناب مختار ثقفی نے اقتدار حاصل کرلیا۔ مکہ میں عبداللہ بن زبیر نے علم بغاوت بلند کر کے اپنی حکمرانی کی دوڑ شروع کردی ۔ "چنانچہ یزید کے حکم پر مسلم بن عقبہ کی سالاری میں مدینہ پر ۶۳ ھ میں فوج کشی کی گئی شدید قتل وغارتگری اور عصمت دری کا بازار گرم کیا گیا لاتعداد صحابی اور ہزاروں صحابی زادے اور جلیل القدر انصاری تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ اس کے بعد مکہ کا محاصرہ کیا گیا۔ کعبہ پر پتھراؤ ہوا اور آگ لگا دی گئی ۔ امام زین العابدین کے اہل خانہ کے سوا کسی کی عزت وآبرو محفوظ نہ رہی ۔ مسلمانان مدینہ سے یزید کی غلامی پر بیعت لی گئی جو عام بیعت سے قطعی الگ چیز تھی امام چہارمؑ اس بیعت سے مستثنیٰ رہے۔" (۹۴) بیعت سے یہ استثنیٰ براہ راست کربلا کا نتیجہ تھا۔ مسلم بن عقبہ نے ظلم وستم کے نت نئے طریقے ایجاد کئے اور ان کو محبان اہلبیتؑ پر خوب آزمایا۔ "ابن قتیبہ کی روایت کے مطابق اس نے مدینہ کے معززین اور انصار ومہاجرین میں سترہ سو افراد کو قتل کر دیا اور عامۃ الناس میں سے دس ہزار سے زائد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔" (۹۵)

عبدالملک بن مروان اموی نے حجاج بن یوسف جیسے شقی القلب کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا جس نے زبردست خونریزی کی۔ شہر مکہ پر منجنیق کے ذریعے گولہ باری کی اور کعبہ پر چھ ماہ تک سنگ باری کی۔ عبداللہ بن زبیر کو خانہ کعبہ میں ۷۲ھ میں ذبح کر دیا گیا۔ اسی سے بچنے کی خاطر امام حسینؑ نے مکہ سے سفر ہجرت اختیار کیا تھا۔

امام زین العابدینؑ اور ان کے جلیل القدر فرزند امام محمد باقرؑ جو ابھی کم سن تھے، کربلا میں آلؑ محمدؐ کے قتل عام اور اہلبیتؑ کی محترم خواتینؑ کی دربدری واسیری جیسے واقعات کے عینی شاہد تھے۔ لہذا سیاسی مدوجزر سے لاتعلق رہے اور خاموش تبلیغ حق اور پیام شہادت عظمیٰ کو عام کرنے میں مصروف رہے۔ اجتماعی نامساعد حالات میں یہ کام نہایت دشوار تھا بالخصوص جماعت مومنین کی شیرازہ بندی اور مکتب امامیہ کے فروغ کا کام بے حد مشکل تھا۔ صورتحال کی سنگینی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ "واقعات کربلا وحرہ کے بعد مدینہ میں فقط تین افراد واقعی مسلمان رہ گئے تھے باقی سب مرتد ہوگئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان ہی تین افراد کے ساتھ لوگ شامل ہوتے گئے اور تعداد بڑھتی گئی۔" (۹۶) اموی حکومت کی سنگدلانہ اور سخت انتقامی کاروائیوں کے باعث ایک وقت ایسا بھی گذرا کہ "مدینہ ومکہ کے اسلامی مرکز میں ایسے بیس افراد بھی نہ تھے جو اعلانیہ شیعہ ہونے کا اقرار کرسکتے۔" (۹۷) ایسے ماحول میں آئمہؑ کا کام ناقابل تصور حد تک دشوار تھا۔ ظالم حکمرانوں کی مسلسل کوششوں کے باوجود آپؑ کے نظریات کے اثرات کو پھیلنے سے نہ روکا جاسکا۔ امام مظلومؑ کی مجلس عزا برپا کرنے کی باقاعدہ اساس انہی آئمہؑ نے رکھی۔ یہ ان دونوں اماموںؑ کا بڑا کارنامہ تھا کیونکہ کربلا کے بعد قوت متحرکہ اور طاقت اجتماعی کے لئے کربلا کے دل دوز واقعات ہی کو سرچشمہ جدوجہد بنایا جاسکتا تھا۔ امام زین العابدینؑ نے سخت دشواریوں

کے باوجود اپنی مسلسل توجہات اسی طرف مرکوز رکھیں۔ آپ کسی تقریب مسرت میں اسی وقت شرکت فرماتے تھے جب مجلس عزا۔ برپا کرنے کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ آپؑ کی ایک زوجہ سندھ نژاد تھیں جن کے بطن سے جناب زید شہید تولد ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ رانا اودھے پور کو آپ کی ایک خالہ، جو نوشیرواں عادل کی پوتی اور آپؑ کی مادر گرامی حضرت شہر بانوؑ کی بہن تھیں کو آپؑ نے واقعات کربلا کے متعلق ایک خط بھی لکھا تھا۔ اس طرح ذکر شہادت عظمیٰ کی خوشبو سندھ اور راجپوتانہ کی فضاؤں میں بسنے لگی تھی ۔ امام زین العابدینؑ کی مدح میں مشہور عرب شاعر فرزدقؔ کا فی البدیہہ قصیدہ شہرت دوام رکھتا ہے۔ آپؑ کا اسم گرامی علیؑ بن الحسینؑ تھا اور طویل سجدوں اور زبردست عبادت کے باعث آپؑ کو "زین العابدینؑ" اور سید الساجدینؑ" کہا جاتا تھا۔" اہلسنت کے امام شہاب الدین زہری اور جناب سعد بن مسیب جو مدینہ کے بڑے فقیہ تھے آپ کے عقیدت مندوں میں تھے آپؑ کی دعاؤں کا مجموعہ "صحیفۂ کاملہ" تشنگان معرفت کی پیاس بجھانے کا بڑا سامان فراہم کرتا ہے۔ چونکہ سیاسی حالات سازگار نہ تھے اس لئے آپؑ نے اپنی دعاؤں کی زبان کو لوگوں کی ہدایت اور جماعت مومنین کی قیادت کا ذریعہ بنایا۔ آپؑ کو ولید نے ۹۵ ھ میں زہر سے شہید کروایا۔ آپؑ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپؑ کے بعد امام محمد باقرؑ آپؑ کے جانشین ہوئے۔ آپؑ نے فروغ علم اور مکتب امامیہ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ آپؑ نے شیعیت کے استحکام اور فقہ محمدیؐ کو عملی صورت دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ آپؑ کو علوم کا سینہ چیرنے والا (باقر) کہا گیا۔ آپؑ کو آنحضرتؐ نے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے توسط سے سلام کہلوایا تھا جو اس وقت تک زندہ رہے تھے۔ ہشام نے ۱۱۴ ھ میں آپؑ کو زہر سے شہید کروا دیا۔ آپؑ بھی جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان دونوں عظیم باپ بیٹوںؑ نے محمدؐ وآلِ محمدؐ کی اس درسگاہ کی باضابطہ اساس

رکھی جو حیات رسولؐ میں نمایاں ہونے لگی تھی اور جس نے ۱۱ ھ وفات رسولؐ کے بعد ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔

امام محمد باقرؑ کے جانشین امام جعفر صادقؑ ہوئے۔ آپؑ کے روحانی علمی اور حکیمانہ قیادت کو سب مانتے ہیں۔ آپؑ کی والدہ جناب قاسم بن محمد بن ابوبکر کی دختر تھیں۔ اس وجہ سے بھی دونوں فریقوں میں آپؑ کی اہمیت مسلم تھی ۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے مابین جنگ اقتدار کے باعث آپؑ کو سانس لینے کی مہلت مل گئی تھی جس کے نتیجہ میں آپؑ کو امام محمد باقرؑ کے کام کو آگے بڑھانے ، مدرسہ امامیہ اور فقہ محمدیؐ کو مضبوط بنیادیں مہیا کرنے اور جماعت مومنین کو پوری طرح منظم کرنے کا وقت میسر آگیا تھا۔ آپؑ کے درس علم و حکمت میں اس عہد کے علماء و فضلاء کی بڑی تعداد شریک ہوتی اور استفادہ کرتی تھی ۔ انہیں جناب نعمان بن ثابت (حضرت ابو حنیفہ) بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اعتراف کیا کہ "اگر میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی صحبت میں کچھ عرصہ نہ رہا ہوتا تو ہلاک ہو جاتا۔" علامہ شبلی نعمانی تسلیم کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کا علم لدنی تھا جب کہ دوسرے علماء کا علم اکتسابی تھا۔ موصوف کے الفاظ میں "ابن قتیبہ کا یہ کہنا کہ ابو حنیفہ امام جعفر صادقؑ کے ہمسر تھے، اس کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ حضرت ابو حنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہہ ہوں لیکن فضل و کمال میں امام جعفر صادقؑ سے انہیں کیا نسبت کہ تمام علوم اہلبیتؑ کے گھر سے نکلے ہیں۔" (۹۹) آپؑ کی تقریباً چونتیس سالہ امامت میں "چار ہزار سے زائد علماء و فضلاء نے آپؑ سے اکتساب علم کیا اور سارے عالم اسلام میں آپؑ کی تعلیمات اور افکار کو پھیلایا۔ ان میں جابر بن حیان بھی تھا جو کیمسٹری کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔" (۱۰۰) آپؑ کو ۱۴۸ ھ میں منصور نے زہر سے شہید کروا دیا۔ آپؑ بھی جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپؑ کی زندگی ہی میں آپؑ کے بڑے بیٹے جناب

اسمٰعیل نے وفات پائی تھی جن کو دفناتے وقت آپؑ نے عمائدین شہر کو گواہ بنایا تھا۔ غالباً یہ اسمٰعیلیوں کی طرف سے انتقال امامت کی بعد کی کوشش کی جانب اشارہ تھا۔ آپؑ کے جانشین امام موسیٰ کاظمؑ ہوئے۔ آپؑ نے کئی عباسی خلفاء کے ظلم وجور کا زمانہ دیکھا۔ علویوں کی تحریک سے گھبرا کر محض شبہ کی بنیاد پر آپؑ کو پریشان کیا گیا۔ ہارون الرشید کو آپؑ سے سخت حسد اور بغض تھا۔ اس نے آپؑ کو بغداد بلوا کر سخت نگرانی میں رکھا۔ آپؑ سے آپؑ کا ذریت رسولؐ میں ہونے کا ثبوت قرآنی طلب کیا تو آپؑ نے آیۂ مباہلہ کے علاوہ سورہ انعام کی آیات نمبر ۸۲ ـ ۸۸ کا حوالہ دیا جن کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کو آل ابراہیمؑ میں شمار کیا گیا ہے۔ آپؑ نے فرمایا اگر عیسیٰؑ اپنی ماں مریم کی نسبت سے آل ابراہیمؑ میں شامل ہو سکتے ہیں تو ہم حضرت فاطمہؑ زہرا کی نسبت سے آلِ محمدؐ یعنی اولاد رسولؐ کیوں نہیں ہو سکتے۔ ۱۷۹ھ میں ہارون الرشید مدینہ آیا اور قبر رسولؐ کے سامنے کھڑے ہو کر عمداً "ابن عم" کہ کر رسولؐ کو سلام کیا تو امام موسیٰ کاظمؑ نے جو اس وقت وہاں موجود تھے فوراً "یا جداہ" (میرے باپ) کہہ کر رسولؐ کو سلام کیا۔ اس پر خلیفہ برہم ہوا اور آپؑ کو قید کروا کر بغداد روانہ کر دیا جہاں قید ہی میں آپؑ کو ۱۸۳ھ میں زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔ آپؑ بغداد کے قریب کاظمین میں دفن ہوئے۔ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ آپؑ سائنس کی تحقیقات کے اولین مسلمان سائنس دانوں میں تھے جیسا کہ پروفیسر منور علی خان، ڈائریکٹر تعلیمات بہاولپور ڈویژن نے پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات کے ضمن میں ایک مجلس مذاکرہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا "عربی میں سائنس کو علم اور سائنس دانوں کو عالم کہتے ہیں۔ سرور کائناتؐ مدینۃ العلم تھے اور حضرت علیؑ، امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ جیسے علماء نے سائنسی تحقیقات کی ابتدا کی تھی۔ اس سلسلۂ فکر نے آگے چل کر جابر بن حیان، ذکریا رازی، ابن

الہشیم ، الکندی ، البیرونی ، الہاجز اور ابیطار جیسے سائنس دان پیدا کئے جو آج بھی جدید علوم سائنس کے محسن تسلیم کئے جاتے ہیں۔" (۴۱)

آپؑ کے وارث امام علی رضا ہوئے۔ خراسان اور حجاز میں علویوں کی بڑھتی ہوئی شورش کے پس منظر میں خالص سیاسی مصلحتوں کے تحت مامون الرشید نے ۲۰۱ ھ میں آپؑ کو ولیعہدی کی پیشکش کی اور آپؑ نے اس کو حالات کے تحت قبول کرلیا۔ مامون الرشید علویوں کی بغاوت کے ضمن میں ولیعہدی کے معاملے پر اچھی طرح غور کر چکا تھا۔ علامہ شبلی رقم طراز ہیں کہ "اس نے اپنے عباسی گروہ کے تینتیس ہزار افراد کو بلا کر ایک سال تک دارالحکومت میں مہمان رکھا اور ان میں سے ہر ایک کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا اور قطعی رائے قائم کرلی کہ ان میں سے کوئی بھی خلافت کا اہل نہیں۔ ۲۰۱ ھ میں اس نے دربار منعقد کر کے اعلان کر دیا کہ نہ تو آل عباس میں اور نہ ہی آل نبیؐ میں کوئی ایسا ہے جو خلافت کے استحقاق میں حضرت علی رضا کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔" (۴۲) یہ اعتراف حقیقت اپنی جگہ مگر دراصل یہ فقط سیاسی حکمت عملی ہی تھی کیونکہ علویوں کی شورش کا زور ٹوٹتے ہی مامون الرشید اپنے سابقہ حکمرانوں کی روش پر لوٹ آیا جو عباسیوں کا وتیرہ تھی مدینہ سے قبر رسولؐ سے آپؑ اسی طرح رخصت ہوئے جس طرح امام حسینؑ جدا ہوئے تھے۔ آپؑ کو مرو (خراسان) ایسے راستوں سے لایا گیا جو شاہراہ عام نہ تھے اور جو علویوں کی تحریک کی زد سے بھی دور تھے۔ "جب آپؑ کی سواری بادبہاری نیشاپور وارد ہوئی تو یہاں آپؑ کے استقبال کے لئے گویا پورا شہر امڈ آیا تھا۔ مجمع کثیر میں چوبیس ہزار تو فقط راویان حدیث تھے جن کی قیادت جید علمائے اہلسنت کر رہے تھے۔" علماء کے اصرار پر آپؑ نے ایک ایسی حدیث رسولؐ ارشاد فرمائی جس کے راوی آپؑ کے اجداد طاہرین تھے۔ آپؑ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اسلام ایک قلعہ ہے جو اس میں

داخل ہوا اس نے نجات پائی ۔" پھر آپؑ نے فرمایا کہ "لوگو! اس کے ساتھ کچھ شرائط بھی ہیں جن میں ایک شرط میں بھی ہوں ۔" بعد میں جب کسی نے اس حدیث کے بارے میں امام شافعی سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ "اس سے زیادہ ثقہ روایت اور کیا ہو سکتی ہے جس کے راوی خود آلِ محمدؐ ہیں، جن کے ناموں کو اگر پاگلوں پر دم کردیں تو ان کا پاگل پن رفع ہو جائے۔"

(۴۳) آپؑ نے پندرہ ہزار سے زائد نہایت مشکل اور نازک مسائل پر نہایت عالمانہ گفتگو فرمائی ہے۔ بہرحال مرو میں مامون الرشید نے بظاہر آپؑ کا پرتپاک استقبال کیا۔ آپؑ کی ولیعہدی کا سرکاری اعلان بھی کردیا۔ آپؑ کے نام کے سکے بھی جاری کردیئے جن کو شیعوں نے امام ضامن کی رسم کے ذریعہ شہرت دوام دیدی ۔ امام رضا کے حکم پر قالین کے شیروں کا مجسم ہو کر درباری منافق جادوگر کو نگل جانا اور پھر اپنی حالت اصلی میں واپس آجانا، نماز عید کی قیادت کے سلسلے میں آپؑ کی انفرادیت اور رسولؐ کے طریقۂ خاص کی شہرت پانا، قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم پر آپؑ کی علمی برتری کا چرچا ہونا، افکار آلِ محمدؐ کی اشاعت میں تیزی آجانا اور جماعت مومنین کا وسعت وعروج پانا جیسے معاملات سے متعصب ناصبی علماء وامراء دربار نے گھبرا کر آپؑ کے خلاف سازش کی اور مامون الرشید کے پیش کردہ انگور، جو زہر آلود تھے کے ذریعے آپؑ کو شہید کروا دیا۔ چند دانے ہی آپؑ نے کھائے تھے کہ طبیعت بگڑنے لگی ۔ آپؑ محفل شاہی سے اٹھنے لگے۔ جس پر مامون الرشید نے پوچھا کہ کہاں چلے تو آپؑ نے فرمایا کہ "جہاں تو نے مجھے بھیج دیا ہے۔"

(۴۴) امام رضا کی شہادت میں مامون الرشید پوری طرح ملوث تھا جس کا ثبوت اور باتوں کے علاوہ اس کا وہ خط بھی تھا جو اس نے اہل بغداد کو لکھا تھا کہ "ذوالریاستین اور حضرت علی رضا کی وفات نے اہل بغداد کی کل شکایات کا ازالہ کردیا ہے۔ اب کیا چیز ہے جس کی تم لوگ شکایت کرسکتے

ہو۔" (۴۵) ۱۷، صفر ۲۰۳ھ میں آپؑ کی شہادت واقع ہوئی۔ آپؑ سرزمین طوس میں دفن ہوئے۔ اس کو اب مشہد مقدس کہتے ہیں اور یہ مرجع عوام وخواص ہے۔ عالم اسلام میں الازہر یونیورسٹی کے بعد سب سے بڑی لائبریری یہاں ہے۔

امام رضاؑ کے وارث امام محمد تقی الجواد ہوئے۔ آپؑ کو بار بار مدینے سے بغداد بلوایا گیا اور آخرکار معتصم نے ۲۲۵ھ میں زہر سے شہید کردیا۔ آپؑ کو کرخ (نزد کاظمین) دفن کیا گیا جہاں شیعوں کی بڑی بستی تھی۔ آپؑ کے جانشین امام علی نقی ہوئے۔ آپؑ کو سامرہ میں متوکل نے قید رکھا اور شدید اذیتیں دیں۔ یہ عباسی بادشاہ، آلِ محمدؐ اور دوستدارانِ اہلبیتؑ کا سخت دشمن تھا۔ اس نے قبر امام حسینؑ کو منہدم کرانے کی کوشش کی تھی اس کے عہد میں سادات گروہ در گروہ قتل ہوئے اور بھاری تعداد میں ہجرتوں پر مجبور ہوئے۔ ۲۵۴ھ میں معتمد عباسی نے آپؑ کو زہر دلوا کر شہید کردیا۔ آپؑ سامرہ میں دفن ہوئے۔ آپؑ کے بعد امام حسن عسکریؑ سریرآرائے امامت ہوئے۔ آپؑ کی مختصر زندگی مسلسل قید تنہائی اور نظربندی میں گذری۔ عباسی خلیفہ ظہور مہدیؑ (ولادت امام مہدیؑ) سے خائف تھا اسی لئے آپؑ کو مسلسل قید میں رکھا تاکہ ولادت امام مہدیؑ ممکن نہ ہوسکے لیکن مشیت ایزدی پوری ہو کر رہی۔ آپؑ اپنی امامت کے شروع میں کچھ عرصہ کے لئے روپوش ہوگئے تھے کیونکہ آپؑ کو قتل کردینے کے منصوبے بنائے گئے تھے۔ مسلسل نظربندی اور اسیری کی صعوبتوں کے باعث آپؑ عین جوانی ہی میں ضعیف نظر آتے تھے۔ ہندوستان میں اوچھ (نزد بہاولپور) میں آپؑ کی تشریف آوری اور کچھ عرصہ قیام کے شواہد ملتے ہیں۔ " اوچھ کے علمی نوادر " صفحہ ۲۲۳ پر مسعود حسن شہاب لکھتے ہیں کہ " اوچھ شریف کی تاریخی کتابوں میں " اخبار الافاق " ایک چونکا دینے والی تاریخ ہے جس میں یہ روایت درج

ہے کہ اہلبیتؑ نبوت کے گیارہویں امام حضرت حسن عسکریؑ نے بخارا سے ترک سکونت کرکے ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا اور اوچھ کی سرزمین کو ان کا مسکن بننے کا شرف حاصل ہوا۔ "کلاہ گوشہ دہقان بہ آفتاب رسید" مصنف کے مطابق اس روایت کے تاریخی شواہد تو موجود نہیں تاہم یہ بات بڑی اہم اور قابل غور ہے کہ آخر اوچھ میں وہ کونسی خصوصیت تھی جس نے سادات کرام کے مقدس طائفے کو ہر دور میں اس طرف رخ کرنے پر مجبور کیا اور چوتھی صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک خانوادہ رسالت وامامت کے جلیل القدر حضرات کا تانتا بندھا رہا۔ متذکرہ بالا روایت سے اس کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے اور اوچھ کو اس واقعہ سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔" (۴۶) اس واقعہ کا تذکرہ بی بی سی لندن کے پروگرام "کتب خانہ" میں بھی کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ واقعہ اس لئے ممکن ہو سکتا ہے کہ اپنی امامت کے آغاز ۲۵۵ھ میں آپؑ کچھ عرصہ کے لئے روپوش ہوگئے تھے ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں آپؑ مدینے سے بخارا اور وہاں سے اوچھ تشریف لائے ہوں۔ آپؑ کو ۲۶۰ ہجری میں معتمد نے عین جوانی میں قید خانے میں زہر سے شہید کروادیا۔ آپؑ بھی سامرہ میں دفن ہوئے۔ آپؑ کی نماز جنازہ اس صغیر سنی میں اپنے چچا جناب جعفر کو ہٹا کر خود امام مہدیؑ نے پڑھائی تھی۔

آپؑ کے وارث وجانشین امام محمد مہدیؑ ہوئے۔ آپؑ کی عمر شریف فقط پانچ سال تھی لیکن حدیث رسولؐ کے مطابق "ہم سب محمدؐ ہیں" اور حضرت عیسیٰؑ کی مثال کہ "گہوارہ میں کتاب ونبوت ملی" اور حضرت یحییٰؑ کی طرح کم سنی میں حکمت ونبوت عطا ہوئی" تھی۔ اسی طرح آپؑ بھی اسی کم عمری میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ اللہ نے فرمایا تھا کہ "وہ اپنے نور کو مکمل کرکے رہے گا چاہے مجرموں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے" چنانچہ

آپؑ کی ولادت باسعادت ۱۵، شعبان ۲۵۵ ھ (بمطابق جولائی ۸۷۰ء) کے روز واقع ہوگئی جس کو خفیہ رکھا گیا۔ شیخ مفید اور علامہ طوسی کے مطابق آپؑ کی ولادت کے ساتھ ہی غیبت صغریٰ شروع ہوگئی تھی لیکن دیگر علماء کہتے ہیں کہ غیبت صغریٰ کا آغاز امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے ساتھ ہوا۔ غیبت صغریٰ ۳۲۹ ھ تک جاری رہی۔ اس دوران میں امام مہدیؑ کے چار نائب یا سفیر ہوئے۔ پہلے سفیر جناب ابو عمر عثمان بن سعید العمری تھے۔ دوسرے سفیر جناب ابوجعفر محمد بن عثمان العمری ہوئے۔ ان کی چالیس سالہ سفارت کا زمانہ بہت اہم تھا کہ امام حسن عسکری کی شہادت کے بعد درجنوں گروہ بندیوں کو ختم کرکے سب کو ایک نظریاتی ہم آہنگی کی لڑی میں پرو دیا۔ تیسرے سفیر جناب ابوالقاسم الحسین بن روح نوبختی تھے۔ چوتھے اور آخری سفیر جناب علی بن محمد السامری تھے جن کا انتقال ۳۲۹ ھ میں ہوا۔ آپ کی وفات اور اختتام سفارت کے ساتھ ہی غیبت کبریٰ کا آغاز ہوگیا۔ اسی سال جناب محمد بن یعقوب کلینی کی وفات ہوئی جن کی کتاب "اصول کافی" امام کی غیبت کبریٰ میں شیعی دنیا کی مذہبی اور فکری ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ امام مہدیؑ کے بارے میں امام اہلسنت علامہ ابن صباغ مالکی کہتے ہیں کہ "گیارہویں امام سوائے ایک فرزند محمد الحجہ المہدیؑ کے اور کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ حضرت (امام مہدیؑ) اپنے پدر بزرگوار کی رحلت کے وقت فقط پانچ برس کے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو حکمت کا معدن قرار دیا۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کی طرح کہ جن کو گہوارہ اور طفلی میں نبوت ملی تھی، آپؑ بھی بچپن میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ تمام انبیاءؑ اور پیشواؤں بالخصوص پیغمبر اسلامؐ نے صاحب السیف، القائم اور عبد صالح کہہ کر آپؑ کی توصیف کی ہے۔" (۴۷) بہرحال ۲۶۰ ھ سے تاحال آپؑ پردہ غیبت میں ہیں اور اسی عالم میں طالبان حق کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ غیبت کبریٰ میں

آپؑ کی حیات مقدسہ اللہ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ ہے۔ وہ جب تک چاہے اپنے کسی بندے کو زندہ وجوان رکھنے پر قادر ہے جیسا کہ سورۃ الصٰفٰت نمبر ۱۴۳۔ ۱۴۴ میں اللہ فرماتا ہے کہ "اگر یونسؑ تسبیح کرنے والوں میں نہ ہوتا تو ہم اس کو مچھلی کے شکم میں قیامت تک (زندہ) رکھتے۔" لہٰذا امام مہدیؑ کی جوان سالہ طویل زندگی پر تعجب کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ آپؑ کے ظہور کے بعد حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتارے جائیں گے، آپؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور آپؑ کے مددگاروں میں ہوں گے۔ سورہ ہود میں ارشاد ہوا کہ "ہم ان سے عذاب کو گنے ہوئے گروہ کے آنے تک روکے رکھیں گے۔" اس کی تفسیر میں تفاسیر عیاشی وصافی کی رو سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ اس "گنے ہوئے گروہ" سے مراد قائم آلؑ محمدؑ اور ان کے اصحاب ہیں جن کی تعداد بدری اصحابؓ رسولؐ جیسی یعنی ۳۱۳ ہوگی۔ آپؑ اللہ کے آخری رسولؐ کے نائب اور وارث ہیں۔ آپؑ کی منقبت میں مرزا غالب نے جو اشعار کہے تھے ان میں سے ایک شعر ہے۔

شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب
اے کہ غائب ز نظر مہر تو ایمان من است

یہ آخری رسولؐ کے حقیقی وارثوں اور حکومت الٰہیہ کے سچے منصب داروں کا نہایت مختصر تعارف تھا جو سطور بالا میں پیش کیا گیا۔ اگرچہ ان کی قیادت کی مجموعی مدت ڈھائی سو سال پر محیط تھی تاہم اپنی افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے تاریخ آدم وعالم کا وہ سنہری دور تھا جو قیامت تک تمام ادوار پر غالب وحاوی رہے گا۔ اگر تاریخ اسلام سے ان بزرگوں کے عہد کو خارج کردیا جائے تو پھر یہ اسلام کی بجائے فقط بادشاہوں اور حکمرانوں کی ذاتی اور خاندانی داستان ہوگی جو خون سے لتھڑی ہوئی بھی ہے اور قابل نفرت بھی۔ آئمہ اہلبیتؑ وہ عظیم افراد تھے جنھوں نے اپنے حسن عمل سے انسانیت کی لاج

رکھی اور ظلم وضلالت کے تیرہ وتار ماحول میں شرافت بشری کے چراغ روشن رکھے۔

آئمہؑ کے عظیم جہاد پر ایک نظر

۱۱ھ تا ۶۰ھ کی پچاس سالہ مدت میں پہلے تین آئمہؑ کبار کا زمانہ حیات تھا۔ حضرت علی مرتضیٰ، حسن مجتبیٰ اور حسین شہیدِ کربلا۔ ان تینوں کی سیرت و سیاست پر گذشتہ اوراق میں "ثقیفہ سے کربلا تک" کے عنوان کے تحت قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان تینوں کے رویہ اور طرز عمل میں بظاہر کچھ اختلاف سا نظر آتا ہے لیکن در حقیقت کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ تینوں کا مقصد اولیٰ ایک ہی تھا۔ رسولؐ کے وارث ہونے کے باعث رسولؐ کے مقصد سے ان کا مقصد الگ ہو ہی نہیں سکتا تھا اور رسولؐ کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام ہی تھا۔ آدمؑ سے خاتمؐ تک اللہ تعالیٰ نے ہدایت انسانی کا جو سلسلہ جاری رکھا وہ بھی اسی مقصد کے حصول کے لئے تھا۔ چونکہ انسانی معاشرے میں عدل کے بغیر امن وسلامتی ممکن نہیں اور عدل کا قیام اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہادیوں اور حاکموں کے بغیر ناممکن تھا لہٰذا رسولؐ کے بعد آلِ محمدؐ کی قیادت وخلافت ہی سے یہ مقصد پورا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؑ کے اعلان خلافت کو اللہ تعالیٰ نے اتمام نعمت قرار دیا تھا۔ حضرت علیؑ سے امام مہدیؑ تک سب کا ایک ہی مقصد اولیٰ تھا اور یہ سب اس مقصد کے حصول میں مکمل ہم آہنگی اور وحدت فکر کے حامل تھے۔ ۶۱ھ سے ۲۶۰ھ تک کی دو برسوں کی مدت میں آٹھ آئمہؑ اہلبیت کے پاکیزہ ادوار کا زمانہ تھا جس کا نہایت اختصار کے ساتھ "کربلا کے بعد آئمہ اہلبیت" کے زیر عنوان تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ تمام آئمہ ۱۱ھ سے ۲۶۰ھ تک مختلف ادوار میں مختلف حالات سے دوچار ہوئے تاہم ان کے افکار کی مرکزیت اور نظریاتی وحدت باقی رہی۔ ناز اکبر آبادی کا شعر ہے۔

گو مسئلے بھی ، عہد آئمہ بھی مختلف
لیکن سبھوں کی سوچ کا انداز ایک ہے

اس طرح کسی بڑی عالمگیر تحریک کے تین عناصر۔ مقصد، حصول مقصد کا راستہ اور شخصیات، میں ان حضرات کے نقوش قدم ایک دوسرے سے مکمل طور پر ملتے جلتے اور یکساں نظر آتے ہیں۔ اگر غور وفکر کے ساتھ گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو ان تمام بزرگوں کے افکار واعمال میں کوئی بنیادی فرق دکھائی نہیں دے گا۔ اس وضاحت کے پس منظر میں، اول سے گیارہویں امام تک کی عظیم جدوجہد کا جائزہ لینا چاہیئے۔

آئمہ کبار کا عظیم جہاد نہ فقط علمی وفقہی تھا اور نہ سیاسی طور پر جارحانہ و مسلح۔ ان کی فقید المثال جدوجہد انتہائی نامساعد حالات میں بحد دشوار تھی کیونکہ ان کو نہ تو غاصب حکومتوں سے مادی تصادم کی راہ اپنانی تھی اور نہ فقط بے عملی کی خاموش زندگی بسر کرنا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے کسی نے بھی کسی حاکم کی نہ بیعت کی اور نہ کسی حکومت کے خلاف کسی شورش یا تحریک میں عملی شرکت کی۔ جارحانہ رویہ اختیار کرنا تو ان کی فکر، مزاج اور مقصد سے متصادم ہوتا اور حامیان آلِ محمدؐ کے مختصر گروہ کے وجود کے لئے نقصان دہ بھی۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے تینوں پیشرو خلافتوں کے سیاسی معاملات میں "عملی تعاون سے گریز" اور "احتجاجی مگر پر امن علیحدگی" کی روش اختیار کی۔ جب خود بر سر اقتدار آئے تو فقط اس وقت تلوار اٹھائی جب مخالفین خود مسلح جارحیت کے مرتکب ہوگئے۔ آپ کو پانچ سالہ مختصر عہد خلافت میں تین بڑی لڑائیاں لڑنا پڑیں مگر سب دفاعی تھیں اور سب کا مقصد اولیٰ فتنہ وفساد کا خاتمہ اور حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔ امام حسنؑ نے جنگ بندی قبول کرلی اور حکومت کو معاویہ کے سپرد کردیا تاکہ غیر ضروری کشت وخون رک جائے اور باطل کے چہرے سے حق کا مصنوعی نقاب اتر

جائے۔ یہ روش بظاہر پسپائی تھی مگر حکیمانہ پسپائی تھی جیسی کہ صلح حدیبیہ میں آنحضرتؐ نے اپنائی تھی اور جس کو قرآن حکیم نے "فتح مبین" قرار دیا تھا۔ امام حسینؑ کی پیش قدمی اور عملی جہاد کی نوعیت قطعی الگ تھی۔ آپؑ کے لئے جنگ ممکن تھی نہ صلح کا امکان تھا۔ آپؑ نے حکومت کی دین بیزاری اور سنت رسولؐ سے انحراف کے خلاف اپنے خیالات کا کھل کر اظہار تو کیا لیکن کسی باغیانہ تحریک میں حصہ دار نہ بنے۔ آپؑ کو بالکل مجبور کر دیا گیا کہ بیعت کریں یا دردناک موت وتباہی قبول کریں۔ آپؑ کے لئے تیسرا کوئی راستہ ہی نہ چھوڑا گیا۔ حضرت علیؑ کے عہد کی لڑائیوں اور امام حسنؑ کی صلح کے نتائج آپؑ کے سامنے تھے لہذا آپؑ نے ایک انوکھی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا کہ حکومت کا مقابلہ کردار کی قوت سے اور ظلم کی شدت کا مقابلہ مظلومیت اور صبر واستقامت کے اعلیٰ معیار سے کیا جائے۔ آپؑ کا مقصد یزید کی بیعت سے انکار کی صورت میں حکومت الہیہ کی طرف واپسی اور اس کا قیام ہی تھا۔ اس لئے ان تینوں آئمہؑ کے طرز عمل میں کوئی بنیادی فرق اور تضاد نہ تھا۔ بعد کے آئمہ بھی اسی راہ پر گامزن رہے اور امام زین العابدینؑ سے امام حسن عسکریؑ تک سب کی جدوجہد کا ایک معین اور واضح رخ رہا۔ یہ سب تعلیمات محمدؐ وآل محمدؐ کے ذریعے تبدیلی قلوب واذہان کے اہتمام میں مشغول رہے اور ایک ایسی جماعت مومنین کے استحکام وفروغ میں کوشاں رہے جو ان کی قیادت کی دل وجان سے عقیدت مند ہو۔ اس کا مقصد بھی اسلامی معاشرے میں حکومت الہیہ کا قیام ہی تھا۔ ان تمام بزرگوں کی زندگیاں ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں اور ایک ہی راہ پر مسلسل گامزن رہی تھیں جیسا کہ اسلامی ایران کے عظیم دانشور اور آیت اللہ خمینیؒ کے جانشین علامہ سید علی خامنہ ای نے فرمایا کہ "دراصل ان تمام بزرگوں کی زندگی مجموعی طور پر ایک مسلسل اور طوفانی تحریک ہے جو ۱۱ھ سے شروع

ہوئی اور ڈھائی سو سال تک جاری رہ کر ۲۶۰ھ میں غیبت صغریٰ کے آغاز کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی ۔ یہ تمام ہستیاں ایک واحد کردار و شخصیت تصور کر لی جائیں کیونکہ ان سب کا مقصد اور حصول مقصد کا راستہ ایک ہی تھا۔ لہذا ہم ان سب کی زندگی کو ملا کر ایک ایسے انسان کی زندگی تصور کر لیں جس نے ڈھائی سو سال کی عمر پائی ہو اور ۱۱ھ سے ۲۶۰ھ تک ایک ہی راہ پر چلتا رہا ہو تو اس عظیم اور معصوم زندگی کا ہر عمل قابل فہم اور لائق توجیہہ ہو جائے گا۔" علامہ سید علی خامنہ ای نے مزید فرمایا کہ " جب ایسا انسان اپنی طویل مدت حیات طے کرے گا تو حتمی طور پر وقت اور حالات کے تحت مناسب حکمت عملی بھی اختیار کرے گا۔ ممکن ہے وہ کبھی تیزی کے ساتھ حرکت ضروری کجھے اور کبھی سست رفتاری میں مصلحت جانے اور کسی وقت حکیمانہ تقاضے کے تحت پسپائی بھی اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس کے علم و حکمت اور ہدف و مقصد کا علم رکھتے ہوں گے وہ اس کی عقب نشینی کو بھی پیش قدمی شمار کریں گے۔ اس نقطۂ نظر سے حضرت علیؑ کی زندگی امام حسنؑ کی زندگی کے ساتھ ، امام حسنؑ کی زندگی امام حسینؑ کی زندگی کے ساتھ اور امام حسینؑ کی زندگی دیگر آٹھ آئمہؑ کی زندگیوں کے ساتھ ۲۶۰ھ تک مسلسل اور مربوط تحریک کہی جا سکتی ہے۔ (۴۸) آئمہ اہلبیتؑ کی وحدت فکر و عمل پر یہ تبصرہ نہایت مختصر مگر بڑا جامع اور پر مغز ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی وفات ۱۱ھ سے غیبت صغریٰ ۲۶۰ھ تک آئمہ کی یہ ہی کوشش رہی کہ اسلامی معاشرے کی عملی تشکیل میں حکومت الہیٰ (خلافت علوی) قائم ہو جائے۔ پہلے تینوں آئمہؑ کے عہد میں یہ کوشش واضح نظر آتی ہے مگر کربلا کے بعد بالخصوص شہادت امام علی رضا کے بعد اسکا رخ مستقبل بعید کی جانب مڑ جاتا ہے۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ " اگر ہم کربلا کے بعد ۶۱ھ سے ۲۶۰ھ تک کی مدت کو تین مرحلوں میں تقسیم کر لیں تو آٹھوں آئمہؑ

کی جدوجہد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ پہلا مرحلہ ۶۱ ھ سے ۱۳۵ ھ تک کے زمانے پر محیط ہے جو یزید کی اموی حکومت سے لے کر منصور کی ابتدائی عباسی حکومت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں قیادت امام زین العابدینؑ ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے ہاتھوں میں تھی ۔ دوسرا مرحلہ ۱۳۵ھ سے ۲۰۳ تک امام جعفر صادقؑ کی امامت سے امام علی رضا کی شہادت تک کا زمانہ ہے۔ یہ عہد علمی وفکری فروغ میں بڑا اہم تھا۔ اسی عہد میں فقہ امامیہ کی تدوین کا اہم کام انجام پاتا ہے۔ جماعت مومنین پوری طرح منظم ہو کر وسیع ہوتی ہے اور تحریک آلؑ محمدؑ کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ حکومت کی تبدیلی اور سیاسی مدوجزر کے باعث شروع میں کچھ مشکلات پیش آتی ہیں تاہم رفتہ رفتہ تحریک نقطۂ عروج تک پہنچتی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ شہادت امام رضا سے اس میں پھر ٹھہراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ تیسرا مرحلہ ۲۰۳ھ مامون کے قیام بغداد سے امام حسن عسکریؑ کی شہادت ۲۶۰ھ تک کے دور پر پھیلا ہوا ہے۔ مامون کی خلافت کے ابتدائی سال آئمہؑ کی زندگی کے نہایت دشوار اور مصائب سے پر تھے۔ امام تقی الجواد سے امام حسن عسکریؑ تک آئمہؑ کی زندگیاں شدید تکالیف اور قید وبند میں گذریں۔ اسی زمانے میں شیعیت اور تعلیمات آلؑ محمدؑ کو زبردست ترقی اور عروج بھی ملا ۔ تاہم اب جدوجہد کا رخ مستقبل بعید کی طرف ہوگیا تھا کہ حکومت علویہ کی تمام کوششیں اب ظہور امام مہدیؑ تک ملتوی کرنا پڑیں ۔" (۴۹)

یہ پاکیزہ سیرت اور انسانیت نواز حضرات کن مایوس کن حالات اور تاریک ماحول میں اصلاح احوال کے لئے کوشاں رہے ، اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ حکومتوں کے مسلسل ظلم وتشدد ۔ رعب ووحشت ، رنگ رلیوں ، عشرت کوشیوں ، دادودہش اور دین وحق سے دوری اور بے اعتنائی کے رویوں نے اخلاق حسنہ سے گریز اور فسق وفجور سے رغبت کا ایک ایسا

عالم پیدا کردیا تھا کہ مکہ ومدینہ کے وحی وایمان کے مراکز، فحاشی وعریانی اور پستی اخلاق کے مراکز میں تبدیل ہوگئے تھے۔ ۶۱ھ تا ۶۳ھ کے کربلا وحرہ کے دل دوز واقعات کی حیرت زدگی اور سراسیمگی ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ حجاج بن یوسف کے ہاتھوں ۷۲ھ میں مکہ ومدینہ کی بے حرمتی، پامالی اور تاراجی نے خوف ودہشت میں اور اضافہ کردیا۔ لوگوں کے ذہنوں پر مایوسی اور دین بیزاری کے احساسات مسلط ہوگئے۔ فکری انحطاط کا یہ حال تھا کہ اسلام کے بنیادی تصورات بھی معرض بحث میں آگئے تھے اور بادشاہ کو خلیفۃ اللہ کا منصب دے کر نعوذ باللہ رسول اللہؐ سے برتر قرار دیا جانے لگا تھا جیسا کہ خالد بن ولید بن عبداللہ قسری کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کے زمانے میں لوگ حدیث رسولؐ کا مذاق اڑانے لگے تھے جیسا کہ بحارالانوار میں لکھا ہے۔ ۸۰ھ سے ۱۴۰ھ کے ساٹھ سالہ عرصہ میں مکہ ومدینہ جیسے مقدس مقامات گلوکاروں، سازندوں اور تعیش پسندوں کے مراکز بن گئے تھے۔ ذہنی پستی اور شہوت پرستی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیجئے کہ "مکہ میں عمر بن ربیعہ نامی شاعر جو فحش گوئی اور عریاں نگاری میں مشہور تھا کی موت پر سارے مکہ میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔ دیگر شعراء بھی جو اموی خلیفہ عبدالملک اور عباسی خلیفہ منصور کے ادوار کے مابین موجود تھے، فکری کج روی سے مبرا نہ تھے۔ وہ بھی خلیفہ کی ہجو لکھتے وقت اس کو خلیفۃ اللہ کے خطاب سے نوازتے تھے۔" (۱۰) مدینہ اور مکہ کے اسلامی مراکز میں بیس افراد بھی ایسے نہ تھے جن کو سچا مسلمان کہا جاسکتا اور جو آلؑ محمدؐ کے حامی اور پیروکار سمجھے جاسکتے جیسا کہ بحارالانوار میں تحریر ہے۔ اس اخلاق سوز اور تباہ حال معاشرے میں آئمہؑ کی جدوجہد کی دشواریوں کا اندازہ لگانا چاہئے۔ ایسے ماحول میں اخلاق حسنہ کی تعلیم اور اقدار حق کا فروغ بذات خود ایک معجزہ تھا۔ آئمہؑ کا جہاد بظاہر خاموش تبلیغ حق اور پرامن تحریک اصلاح تھی مگر

حقیقتاً اپنی جلو میں ایک عظیم ذہنی اور فکری انقلاب کی تمام توانائیاں لئے ہوئی تھی۔

اس لئے یہ دعویٰ نہایت وثوق سے کیا جاسکتا ہے کہ آئمہ کا ڈھائی سو سالہ جہاد کئی اعتبار سے تاریخ عالم میں منفرد اور بے مثل تھا کہ آپ میں سے کسی نے بھی نہ مسلح بغاوت کی، نہ کسی جارحیت کے مرتکب ہوئے، نہ جبروجور حکومت کی شدت و تسلسل سے گھبرائے اور نہ حق وصداقت کی راہ سے سرمو انحراف کیا۔ نہ کسی حاکم کی بیعت کرکے اس کو اسلامی حکومت کی سند دی اور نہ کسی سے تصادم مول لیا۔ اس طرح دنیا کی کسی بھی انقلابی تحریک میں جو غیر اخلاقی، لادینی، طاقت وجبر اور مکروفریب کے عناصر کار فرما ہوتے ہیں ان سے اپنے دامن کو ذرہ برابر بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہ امر عظیم ہر کس وناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ آلؑ محمدؐ اور اہلبیت رسالت کے وہ افراد ہی انجام دے سکتے تھے جو اسلامی انقلاب کی عظیم تحریک کے بانی حضرت محمد مصطفیٰؐ کی سیرت و کردار کی تجلیوں کے حامل، آپؐ کی نبوت کے آشنائے راز اور اس مقصد کے حصول کی راہ میں ہر حال اور ہر قیمت پر گامزن رہنے کی غیر معمولی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔

حوالہ جات

۱، ۲) قرآن مجید سورہ بقرہ آیات ۲۹ ۔ ۲۷
سورہ اعراف ۱۱ ۔ ۲۵ سورہ ص ۷۱ ۔ ۷۵
۳) تاریخ اسلام جلد اول مطبوعہ لاہور ۱۹۸۱ء علامہ سید علی نقی
۴) تا ۵) سورہ حجرہ، سورہ بقرہ سورہ ص
۶) تاریخ اسلام جلد اول ۔ علامہ سید علی نقی
۷) صواعق محرقہ طبع مصر ۱۳۲۳ھ، سر الجلیل شاہ عبدالعزیز ترجمہ ایوب قادری
۸) سیرت النبیؐ علامہ شبلی، طبقات ابن سعد جلد ۲
۹) تاریخ اسلام جلد ۲ مورخ نجیب آبادی
۱۰، ۱۱) سیرت ابن ہشام صفحہ نمبر ۱۱۸
۱۲) اعلام الوریٰ ۔ علامہ طبری / تاریخ اسلام جلد اول علامہ علی نقی
۱۳) سیرت النبیؐ جلد اول ۔ علامہ شبلی / طبقات ابن سعد جلد اول
۱۴) صحیح مسلم، ترمذی، ینابیع المودت
۱۵) فضائل صحابہ و اہلبیتؑ (عزیز الاقتباس ترجمہ ایوب قادری)
۱۶) دُرمنثور جلد ۲ علامہ سیوطی / اسباب النزول مطبوعہ مصر ۔ امام واحدی
۱۷) تاریخ طبری / صواعق محرقہ / مدارج النبوت / مشکاۃ
۱۸) تاریخ الشیعہ صفحہ نمبر ۴۳
۱۹) تاریخ احمدی / تفسیر ثعلبی

۲۰) صحیح بخاری / مدارج النبوت / مسند امام احمد حنبل / طبری / ابو الفدا
۲۱) سنن نسائی / تاریخ احمدی / مدارج النبوت
۲۲) اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول ۔ پروفیسر لطیف انصاری
۲۳) ابتدائی تاریخ شیعہ (انگریزی) صفدر حسین کراچی
۲۴) تاریخ طبری جلد اول شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی / یعقوبی جلد ۲ / الاستیعاب صفحہ نمبر ۳۳۰
۲۵) یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۳ ۔ ۲۴
۲۶) البلاغ المبین ۔ آغا سلطان مرزا
۲۷) تاریخ زوال سلطنت روم ۔ ایڈورڈ گبن
۲۸) سیرت ابن ہشام جلد اول / تاریخ طبری جلد اول / مستدرک جلد ۲ / یعقوبی جلد ۲
۲۹) اسپرٹ آف اسلام ۔ جسٹس امیر علی
۳۰) ابن ہشام / ابن سعد / شیخ مفید
۳۱) تاریخ سارا سین (انگریزی ۔ سائمن اوکلے
۳۲) ابو بکر صدیق ۔ ڈاکٹر طہ حسین مصری
۳۳) بلاذری جلد اول / طبری جلد اول / یعقوبی جلد ۲ / الامت و السیاست جلد اول / شرح نہج البلاغہ جلد ۲
۳۵) ابن قتیبہ ۔ خلاصۂ اقتباس از تاریخ اسلام کے جواہر پارے شائع کردہ ادرہ تمدن اسلام کراچی
۳۶، ۳۷) طبری جلد اول / بلاذری جلد ۲
۳۸) الفاروق ۔ علامہ شبلی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۰ء
۳۹) سیرت ابن ہشام جلد ۲ / جلد ۳ / مجالس المومنین ۔ علامہ قاضی نور اللہ شوستری

۴۰) محمدؐ کے وارث (انگریزی) مصنفہ واشنگٹن اروِنگ
۴۱) علامہ ابن اثیر / طبری
۴۲) بلاذری / طبری / عقد
۴۳) ابن خلدون / بلاذری / طبری
۴۴) الفاروق علامہ شبلی صفحہ نمبر ۱۹۹ ـ ۲۰۱ / طبری جلد ۱ صفحہ ۲۱۸ / ۲۷۱
۴۵) شرح نہج البلاغہ جلد ۲ علامہ ابن ابی الحدید
۴۶) فرانسیسی مورخ ہنری لیمنز ـ اتحاد ثلاثہ مطبوعہ سینٹ جوزف یونیورسٹی بیروت جلد ۴
۴۷) طبری جلد ۵
۴۸) خلافت و ملوکیت ـ علامہ مودودی
۴۹) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری ترجمہ مولانا محمد باقر شمس (علیؑ اور فرزندان علیؑ)
۵۰) کتابچہ سانحۂ کربلا ـ شائع کردہ انجمن خدام القرآن لاہور صفحہ نمبر ۲۱
۵۱) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ مولانا شمس صفحہ نمبر ۳۹
۵۲) مسعودی / طبری / دنیاوری
۵۳) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ / طبری جلد ۵
۵۴) تاریخ روضۃ الاحباب / تاریخ حبیب السیرؔ
۵۵) خلافت و ملوکیت ـ علامہ مودودی
۵۶) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری
۵۷) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ (علیؑ اور فرزندان علیؑ)
۵۸) ابتدائی تاریخ اسلام (انگریزی) صفدر حسین کراچی
۵۹) چودہ ستارے ـ مولانا نجم الحسن کراروی مطبوعہ لاہور
۶۰) جلاء العیون ـ علامہ مجلسی

۶۱) احسن المقال جلد اول (اردو)

۶۲) الفاروق ۔ علامہ شبلی

۶۳) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ (علیؑ اور فرزندان علیؑ) اردو ترجمہ صفحہ ۲۲۷

۶۴) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ (علیؑ اور فرزندان علیؑ) اردو ترجمہ صفحہ ۸۷

۶۵) شاہ شہیدان (اردوف ترجمہ ابوالشہداء) شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۲۔ صفحہ نمبر ۱۱۵

۶۶) حریت فی الاسلام صفحہ ۲۶ ۔ ۲۸ (مولانا ابوالکلام آزاد)

۶۷) خلافت معاویہ و یزید حافظ ۔ علی بہادر خان

۶۸) صحیح بخاری جلد اول / صحیح مسلم اول / تفسیر کبیر رازی جلد اول صفحہ ۱۷۷

۶۹) احسن المقال جلد اول

۷۰) مستدرک حاکم جلد اول / ارشاد نمبر ۲۰۶

۷۱) تاریخ طبری / تاریخ آعثم کوفی

۷۲) ہسٹری آف سارسین صفحہ نمبر ۱۷۵ سائمن اوکلے

۷۳) ابتدائی تاریخ اسلام (انگریزی صفحہ ۲۵۳ صفدر حسین شائع کردہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی / تاریخ اسلام کے جواہر پارے شائع کردہ ادارۂ تمدن اسلامی کراچی

۷۴) شہید انسانیت صفحہ نمبر ۱۲۸ ۔ ۱۳۱ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء

۷۵) شہید انسانیت صفحہ نمبر ۲۹۰ ۔ ۲۹۸ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء

۷۶) طبری / دنیاوری / شیخ مفید

۷۷) طبری / دنیاوری / شیخ مفید

۷۸) شہید انسانیت صفحہ نمبر ۲۵۲

۷۹) طبری / ابن اثیر / شیخ مفید

۸۰) مروج الذہب ۔ علامہ مسعودی
۸۱) شاہ شہیدان (اردو ترجمہ ابوالشہداء) علامہ العقاد مصری
۸۲) کششی کی رجال صفحہ نمبر ۱۲۳
۸۳) مجاوالانوار جلد ۶ علامہ مجلسی
۸۴) مسعودی / ابن سعد / ابن خلقان / کلینی
۸۵) سیرت نعمان ۔ علامہ شبلی صفحہ نمبر ۲۷
۸۶) المقریزی / یعقوبی / کلینی
۸۷) "یوروپ میں علم و ہنر کے چراغ اسلامی مراکز سے روشن کئے گئے" کے زیر عنوان مجلس مذاکرہ میں تقریر مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی ۱۷ جنوری ۱۹۸۵ء
۸۸) المامون ۔ حصہ اول ۔ علامہ شبلی
۸۹) صواعق محرقہ صفحہ نمبر ۱۳۲ ۔ ۱۳۳
۹۰) تاریخ آئمہ صفحہ نمبر ۴۷۶ / چودہ ستارے صفحہ نمبر ۳۹۰
۹۱) المامون ۔ حصہ اول صفحہ نمبر ۸۷ (علامہ شبلی)
۹۲) سہ ماہی رسالہ ازبیر بھاولپور / تاریخ الافاق / کتب خانہ مولوفہ رضا علی عابدی آف بی بی سی لندن مطبوعہ سعد پبلی کیشنز کراچی ۱۹۸۵ء
۹۳) الفصول المہمہ صفحہ نمبر ۱۹۱
۹۴) مجلہ توحید (اردو ایڈیشن) قم ۔ ایران شمارہ اگست ۱۹۸۷ء
۹۵) مجلہ توحید (اردو ایڈیشن) قم ۔ ایران شمارہ اگست ۱۹۸۷ء
۹۶) آغانی ۔ علامہ ابوالفرج اصفہانی

باب دوم

ہجرتوں کے سلسلے اور تشیع کا فروغ

(الف): ہجرتوں کے سلسلے

ہجرت کا مفہوم اور اہمیت ---- ہجرت کا لغوی مفہوم ترک وطن ہے۔ اسلامی تاریخ کے پس منظر میں ہجرت سے مراد رسولؐ اکرم حضرت محمدؐ مصطفیٰ کی مکہ سے مدینہ کو نقل مکانی ہے۔ عام طور پر وہ نقل مکانی جو کسی خاص مقصد کے لئے اور کسی انتخاب کردہ مقام کے واسطے کسی منصوبہ بندی کے تحت کی جائے ہجرت کہلاتی ہے۔ (۱) ہجرت اور فرار میں واضح فرق ہے۔ جان بچانے کی خاطر گھبراہٹ میں اپنا مرکز چھوڑ دینا فرار ہوتا ہے اور فرار اختیار کرنے والا یہ نہیں سوچتا کہ دوسروں پر کیا گذرے گی لیکن مقصد کی خاطر کسی مناسب مقام کی تلاش کرکے اپنی جگہ سے حرکت کرنا ہجرت ہوتی ہے۔ ہجرت کرنے والا اپنے پورے انتظام کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے فقط اپنی جان کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے مفاد اور اصول کے تحفظ کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس لئے فقط اپنی جان کا مسئلہ ہوتا تو رسول اکرمؐ کے لئے وہ موقع نہایت مناسب تھا جب مدینہ کے ستر سے زائد اوس وخزرج کے مسلمانوں کے وفد نے قرارداد ہجرت کے وقت آپؐ سے اپنی ہمراہی میں مدینہ کو روانگی کی استدعا کی تھی مگر آپؐ نے اس وقت یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ابھی حکم الہیٰ کا انتظار ہے۔ (۲) عام طور پر ہجرت رسولؐ کا باعث مشرکین مکہ کے قتل رسولؐ کے منصوبے کو سمجھا جاتا

ہے جب کہ واقعتاً ایسا نہیں ہے بلکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ مدینہ کو ہجرت کا فیصلہ بہت پہلے ہوچکا تھا اور قتل رسولؐ کا منصوبہ مشرکین نے کافی بعد میں بنایا تھا۔ مشرکین مکہ نے یہ منصوبہ اس وقت بنایا تھا جب انہیں مسلمانوں کی تقریباً ساری آبادی کی نقل مکانی کے بعد رسولؐ اوران کے اہل خانہ کے جلد بحفاظت نکل جانے کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا۔ گویا ہجرت اندیشہ قتل کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ سامان قتل ارادہ ہجرت کے باعث پیدا ہوا۔" (۳)

معاشرتی یا عمرانی نظام میں ہجرت یا نقل مکانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ فقط جغرافیائی اور سیاسی عوامل ہی کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ارتقائے تمدن کے لئے لازمی عنصر اور اہم سماجی فلسفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عصر حاضر کے ایرانی دانشور ڈاکٹر علی شریعتی کے الفاظ میں "تاریخ عالم میں ہجرت یا نقل مکانی ہمیشہ سے تہذیب وتمدن کی ترقی کا بنیادی اصول رہی ہے دنیا کی تمام ستائیس تہذیبیں جن سے تاریخ آشنا ہے، ہجرت ہی کے بطن سے پیدا ہوئیں کوئی بھی پرانی قوم اس وقت تک دقیانوسی ہی رہی جب تک اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور نئی سرزمین کی طرف ہجرت نہ کی۔ یہ عالمگیر اصول ہے جس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔" (۴)

رسول اکرمؐ کی ہجرت مدینہ تک ـــــــ تاریخ اسلام کے پہلے مہاجر حضرت ابراہیم بن تارخ تھے جو انبیاء میں بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ہی سے اسلام، مسلمان اور امت مسلمہ کے تصورات کی ابتدا ہوئی۔ آپ ہی رسولؐ امی وہاشمی کے جد امجد تھے۔ بابل (عراق) میں نمرود کے عہد میں آپ شرک کی ہر قسم کے خلاف نبرد آزما تھے۔ بتوں کی توڑ پھوڑ پر نمرود غضب ناک ہوا اور آپ کو منجنیق کے ذریعے ایک ایسی زبردست آگ میں جھونک دیا جس کی تپش دور دور تک محسوس ہوتی تھی مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت

وحکمت سے آگ گلزار ہو گئی اور آپؑ بالکل محفوظ رہے۔ جب یہاں کسی نے آپؑ کی تبلیغ حق کی طرف توجہ نہ کی تو مشیت ربانی کی رہنمائی میں آپؑ نے ارض فلسطین وشام کی طرف ہجرت کی۔ یہ داعئ اسلام کی پہلی ہجرت تھی۔ شام میں مدتوں قیام کے بعد حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمعیلؑ کی ولادت ہوئی تو حضرت سارہ کو حسد پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں آپ نے حضرت ہاجرہ اور شیر خوار حضرت اسمعیلؑ کو بے آب وگیاہ سرزمین مکہ میں لاکر بسا دیا۔ اس طرح حکمت الہٰی نے عالمگیر مرکز اسلامی کے قیام کا اہتمام کیا جہاں اللہ کا پاک گھر (بیت اللہ) بنا جو عالمین کی ہدایت کا سرچشمہ قرار پایا۔ اسی میں اہلبیتؑ کا مفہوم مضمر تھا کہ کوئی گھر ذریعہ ہدایت نہیں ہو سکتا جب تک اس کے مکین ہادی وراشد نہ ہوں۔ یہ رسولؐ امی کے مورث اعلیٰ (حضرت اسمعیلؑ) کی عالم شیر خواری میں ہجرت تھی جو غربت، بے سروسامانی، پیاس اور کسمپرسی سے عبارت تھی۔ آپؑ کی بدولت چشمۂ زمزم نمودار ہوا اور ویرانے میں بہار کی آمد کا سامان ہو گیا۔ قبیلۂ جرہم یہاں ٹھہرا اور مستقل آباد ہو گیا۔ یہ مکہ کی پہلی آبادی تھی۔ اسی قبیلے میں حضرت اسمعیلؑ پروان چڑھے اور آپؑ کی شادی ہوئی۔ اس قبیلے کی زبان عربی تھی جو آپؑ کی زبان قرار پائی۔ یہ ہی وہ امی ہیں جن میں حضرت اسمعیلؑ کی نسل سے ملت ابراہیمیؑ پر قائم رہنے والوں کو امت مسلمہ قرار دیا گیا۔ (۵) اسی امت مسلمہ میں آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰؐ مبعوث ہوئے۔ حضرت اسمعیلؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نبوتوں کی درمیانی مدت میں ایک گروہ حق موجود رہا جو حضرت ابراہیم کی ملت حنیفہ پر قائم تھا۔ یہ جماعت حق، جناب قیدار سے حضرت ابو طالبؑ (عمران) تک امت مسلمہ کا تسلسل بھی تھی اور وراثت انبیاءؑ کی امین بھی۔ اسی دیندار گروہ میں بنی ہاشم ہوئے جن میں آل ابی طالبؑ کے وہ افراد تھے جو آلِ محمدؐ کہلائے۔ انہیں سے سلسلۂ

امامت وخلافت چلا جو دراصل ختمی مرتبتؐ کی رسالت کبریٰ کے مشن کی توسیع تھا اور الہیٰ منصب ولایت وخلافت کا امانت دار بھی تھا۔ اسی عہدہ امامت پر فائز ہونے والے پہلے نبی ورسول حضرت ابراہیمؑ ہوئے۔ آپؑ کو یہ منصب جلیلہ ۰ ابتلائے عظیم ۰ میں کامیابی کے بعد اس وقت عطا ہوا تھا جبکہ آپؑ عہدہ نبوت ورسالت پر پہلے ہی فائز ہوچکے تھے۔ گویا منصب امامت کی اہمیت دیگر الہیٰ عہدوں سے فزوں تر تھی وگرنہ آخر میں اس کی عطا ترتیب معکوس ہوتی ۔ آنحضرتؐ کے بعد اس عہدہ جلیلہ پر حضرت علی مرتضیٰؑ فائز ہوئے اور پھر آپؑ اور حضرت فاطمہؑ کی مشترک ذریت سے دیگر گیارہ ائمہ اہلبیتؑ ہوئے جن کو نص قرآنی کی رو سے مکمل پاکیزگی کا اعزاز حاصل تھا یعنی وہ سب معصوم تھے۔

جب آنحضرتؐ کی رسالت کا عہد شروع ہوا تو مشرکین مکہ حضرت ابوطالبؑ کے دبدبہ وشجاعت کے باعث رسولؐ کو تو گزند نہ پہنچا سکے البتہ غریب وکمزور مسلمانوں کو انہوں نے نشانہ تشدد بنالیا۔ اس کے باعث حبشہ کی طرف مسلمانوں کو دو مرتبہ ہجرت کرنا پڑی جو بعثت کے بعد پانچویں اور ساتویں سال واقع ہوئیں۔ حبشہ کی دوسری ہجرت حضرت جعفر طیارؑ کی سرکردگی میں ہوئی تھی ۔ حبشہ کے عیسائی حکمران (نجاشی) نے ان ایک سو آٹھ (۱۰۸) مہاجرین کو عزت کے ساتھ پناہ دے دی تھی ۔ مشرکین مکہ نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو تحائف دے کر دربار نجاشی میں بھیجا اور ان مسلمانوں کے اخراج کی درخواست کی لیکن حضرت جعفر طیارؑ کی تقریر اور سورہ مریم کی تلاوت سے نجاشی اتنا متاثر ہوا کہ مشرکین مکہ کے ان نمائندوں کو ناکام لوٹنا پڑا۔ ۰ نجاشی نے آنحضرتؐ کی نبوت کا اقرار کیا اور خود کو آنحضرتؐ کے عہد میں موجود ہونے پر فخر کیا۔ ۰ (۹) تیسری ہجرت بعثت کے ساتویں سال ہی واقع ہوئی جب مشرکین مکہ نے بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا۔

"روسائے مشرکین نے تحریری معاہدہ کیا اور اس کو جوف کعبہ میں سربہ مہر کرکے آویزاں کردیا۔ حضرت ابو طالبؑ کی سربراہی میں بنی ہاشم بمع رسول اکرمؐ شعب ابی طالبؑ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے اور یکم محرم سے مشرکین نے محاصرہ شروع کردیا۔" (۷) یہ سب چالیس بنی ہاشم تھے جن سے ہر قسم کا سماجی اور معاشی رشتہ توڑ لیا گیا تھا اور ان پر آب ودانہ بند تھا۔ "نتیجہ یہ ہوا کہ کئی کئی دن تک یہ لوگ آب وغذا سے محروم رہتے تھے اور بھوک پیاس سے بچوں کے رونے اور بلبلانے کی آوازیں گھاٹی کے باہر تک سنائی دیتی تھیں۔" (۸) محصوری کے ان طویل تین برسوں میں گھاٹی کے باہر رہ جانے والے مسلمانوں کی بے حسی اور لاتعلقی حیرت وعبرت کا باعث ہی نہ تھی بلکہ تاریخ اسلام میں بہت سے سوالات اور ان کے جوابات کی نشاندہی کرتی ہے۔ حضرت علیؑ نے اپنے عہد خلافت میں معاویہ کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ "شعب ابی طالبؑ میں مشرکین کے مظالم ان (اہلبیتؑ) نے تنہا برداشت کئے جب کہ دوسرے اسلام لانے والے اپنے اپنے قبیلوں کی حمایت کے باعث محفوظ رہے۔ بنو تیم نے ابوبکر کی، بنی عدی نے عمر کی اور بنی امیہ نے عثمان کی حفاظت کی۔" (۹) مذکورہ معاہدہ مشرکین کو دیمک کے چاٹ جانے کے آنحضرتؐ کے انکشاف کو حق جان کر حضرت ابو طالبؑ روسائے مشرکین کے پاس گئے اور فرمایا کہ اگر محمدؐ سچے ثابت نہ ہوئے تو وہ محمدؐ کو مشرکین کے حوالے کرنے کو تیار ہوں گے۔ "چنانچہ تمام دستخط کنندگان کی موجودگی میں سربہ مہر معاہدہ کو کھولا گیا تو رسولؐ کی بات حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد یہ مقاطعہ ومحاصرہ ختم ہوا۔ یہ بعثت کا دسواں سال تھا۔" (۱۰) اس واقعہ سے دو اہم نکات واضح ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ یہ مقاطعہ ومحاصرہ فقط ان بنی ہاشم کا تھا جو حضرت ابو طالبؑ کی قیادت میں اسلام اور رسولؐ اسلام کے محافظ تھے کیونکہ شعب ابیطالبؑ سے باہر کے

مسلمانوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ دوم یہ کہ سارا جھگڑا ذات رسولؐ کی حمایت وحفاظت کا تھا جو حضرت ابو طالبؑ کسی قیمت پر ترک کرنے کو آمادہ نہ تھے ورنہ محصوری کی نوبت ہی نہ آتی۔ نیز حضرت ابو طالب معاہدہ مشرکین کی بابت آنحضرتؐ کے انکشاف کو اس درجہ حق اور سچ تصور کرتے تھے کہ غلط ثابت ہونے پر آپ نے آنحضرتؐ کو مشرکین کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کردی تھی۔ گویا آپؑ نے واضح کردیا تھا کہ آپؑ محض اپنے بھتیجے کی حمایت نہیں کر رہے تھے بلکہ حق وصداقت کے حامی تھے۔ جس کے حامل اور علمبردار حضرت محمد مصطفیؐ تھے۔ اس سارے معاملے میں حضرت ابو طالبؑ کے اللہ ورسولؐ پر گہرے ایمان و ایقان کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ یہ ہجرت مقامی تھی مگر اسلامی ہجرت کے دائرے میں آتی ہے کہ اللہ کے دین اور اس کے رسولؐ کی حمایت وحفاظت کے نتیجہ میں کرنی پڑی تھی۔ چوتھی ہجرت مکہ سے طائف کو واقع ہوئی۔ شعب ابی طالبؑ کی تین سالہ صعوبت نے حضرت ابو طالبؑ کی جسمانی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ ختم مقاطعہ کے کچھ عرصہ بعد ہی آپؑ نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ آپؑ کی عمر اسی برس سے زائد تھی۔ "آپؑ نے مرتے وقت اولاد عبدالمطلبؑ کو جمع کیا اور آنحضرتؐ کی پیروی ونصرت کی وصیت کی۔ وفات کی اطلاع پر آنحضرتؐ نے گریہ کیا، مشایعت جنازہ کی اور مغفرت کی دعا فرمائی۔" (۱۱) فقط یہ ایک واقعہ ہی حضرت ابو طلبؑ کے اسلام قبول نہ کرنے کے پروپیگنڈہ کی نفی کے لئے کافی ہے۔ ابھی محافظ اور مددگار چچا کا غم تازہ تھا کہ آنحضرتؐ کی رفیقۂ حیات ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ نے رحلت کی۔ "آپؐ نے اس سال کو "سال حزن" قرار دیا۔" (۱۲) حضرت ابو طالبؑ کا سایہ سر سے اٹھتے ہی مشرکین مکہ کی ہمتیں بڑھ گئیں اور آپؐ کی ایذا رسانی میں بےحد اضافہ ہوگیا تو حکم ربانی کے تحت آپؐ نے مدینہ کو ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔ یہ بعثت کا

تیرھواں سال تھا۔

حضرت ابو طالبؑ نے مرتے وقت آنحضرتؐ کو وصیت کی تھی کہ "اب تمہارا یہاں مکہ میں رہنا محال ہو جائے گا لہٰذا تم اپنے دادا (عبدالمطلبؑ کی ننھیال بنی نجار کے پاس یثرب (مدینہ) چلے جانا تاکہ محفوظ رہ سکو۔" (۱۳) مدینہ میں جو پہلے یثرب کہلاتا تھا مسلمانوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہاں کے دو اہم قبیلے ــــ اوس وخزرج کے سردار آنحضرتؐ کو یہاں آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ جب مشیت ایزدی کے تحت آپؐ نے مدینہ کو ہجرت کا فیصلہ کر لیا تو مسلمانوں کو خاموشی اور رازداری کے ساتھ آہستہ آہستہ کوچ کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن جس جتھے کو حضرت عمر کے ساتھ جانا تھا اس کی روانگی مخفی نہ رہ سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین مکہ چونک پڑے اور ان کو رسولؐ اللہ کے بحفاظت نکل جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ سرداران مشرکین نے آنحضرتؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا اور رات کو آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ آنحضرتؐ نے حکم ربانی کے مطابق حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر اپنی چادر اوڑھ کر اپنی جگہ لیٹ جانے کی پیشکش فرمائی تاکہ مشرکین مغالطہ میں رہیں اور آپؐ بحفاظت یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ حضرت علیؑ نے اس نہایت خطرناک پیشکش کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور سجدہ شکر ادا فرمایا۔ سورہ بقرہ نمبر ۲۰۷ نے اس واقعہ کو ابدی تاج عظمت پہنا دیا اور حضرت علیؑ کو عالم بشریت کا وہ واحد فرد قرار دیا جس نے اپنا نفس فروخت کر کے اللہ کی رضا خرید لی ــ یہ متفق علیہ ہے کہ یہ آیۂ المبارکہ حضرت علیؑ کی مدح میں اتری تھی"۔ (۱۴) "آپؐ ۱۲ ستمبر ۶۲۲ کو مکے سے نکلے تھے اور ۱۹ ستمبر ۶۲۲ کو وارد قبا ہوئے۔ (۱۵) تین دن بعد حضرت علیؑ ناموس رسالت کے ساتھ آپؐ سے قبا میں آن ملے۔ دوسرے ہی روز آپؐ قبا سے مدینہ کو روانہ ہو گئے۔ اجماع مورخین کے مطابق آپؐ نے ۱۲، ربیع الاول ۱۰، ہجری ۶۲۲

۔ کو سرزمین مدینہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ آپؐ نے حضرت ابوایوبؓ انصاری کے مکان پر عارضی قیام کیا۔ یہاں مسجد اور ملحقہ مکانات تعمیر کروائے۔ " اس تعمیر کے دوران آپؐ نے حضرت عمار یاسرؓ کے بارے میں پیشگوئی فرمائی تھی کہ ان کو باغی اور ظالم گروہ قتل کردے گا۔ " (۴۹) یہ باغی گروہ بنوامیہ قرار پایا جو بنی ہاشم اور آلِ محمدؐ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

مدینہ منورہ وحی وایمان کا مرکز بنا۔ یہاں اسلامی معاشرے کی بنیاد پڑی جس میں آلِ محمدؐ کو مرکزیت حاصل تھی۔ یہ آخری رسولؐ کی آخری آرامگاہ بھی قرار پایا۔ اس ہجرت نے اسلام کا بول بالا کردیا۔ ایک اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی اور ایک ایسی حکومت الہیہ کا تعارف ہوا جو حق وعدل اور مساوات کی عملداری سے انسانوں کو صراط مستقیم کی طرف بھی رہنمائی کرسکے اور انسانیت کی فلاح وبہبود کی ضامن بھی ہو۔

اصحابؓ رسولؐ، آئمہؑ اور اولاد آئمہؑ کی ہجرتیں۔۔۔۔۔ وفات رسولؐ سے غیبت صغریٰ (۱۱ھ تا ۲۶۰ھ) کی ڈھائی سو سالہ مدت میں آئمہؑ اہلبیت اور سادات ومحبان سادات کو جس اندوہناک سیاسی وسماجی اور اقتصادی ومعاشی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا اس کے نتیجہ میں ہجرتوں کے سلسلے کی ایک طویل داستان مرتب ہوئی۔ اس کا مفصل بیان ممکن نہیں ہے۔ فقط چند اہم واقعات ہجرت کی طرف اشارے کرنے پر اکتفا کی جا رہی ہے۔ وفات پیغمبرؐ کے بعد پہلی جبری ہجرت جناب سعد بن عبادہ انصاریؓ کی تھی جن کو اپنے بہت سے اہل قبیلہ کے ہمراہ خلافت اول کے ابتدائی عہد میں مدینہ سے شام کی طرف نقل مکانی کرنا پڑی۔ کیونکہ آپؓ حضرات ابوبکر وعمر کی مخالفت اور حضرت علیؑ کی حمایت کے " مجرم " تھے۔ دوسری جبری ہجرت حضرت ابوذر غفاریؓ کو شام و ربذہ کو کرنی پڑی کیونکہ خلیفہ سوم اور ان کا والیٔ شام، زمین وآسمان کے مابین سب سے زیادہ صادق انسان کی حق

گوئی کو برداشت نہ کرسکے۔ آپؓ کو بڑے جبر و تشدد کے ساتھ ربذہ میں جلاوطن کیا گیا تھا جہاں کسمپرسی میں آپؓ نے وفات پائی ۔ تیسری ہجرت خود امیرالمومنین حضرت علیؑ کو مدینہ سے کوفہ کو کرنا پڑی جب آپؑ نے اپنے عہد خلافت میں کوفہ کو دارالحکومت قرار دیا۔ چوتھی ہجرت بریدہ بن حسیب الاسلمیؓ کو جبراً کرنا پڑی ۔ آپؓ جلیل القدر صحابی رسولؐ اور محب اہل بیتؑ تھے۔ حضرت علیؑ پر سب و شتم کرنے سے انکار پر آپؓ کو اموی حکومت نے ۵۱ ھ میں جلاوطن کر دیا تھا۔ آپؓ مع پچاس ہزار اہل قبیلہ خراسان کے علاقے غور میں آن بسے تھے جہاں آل شنسب کی حکمرانی تھی جو حضرت علیؑ کے نمایاں شیعہ تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی صاحب نے اپنی کتاب تاریخ اثناء عشری شیعان ہند کی جلد اول ص ۷۷ پر تحریر کیا ہے ۔ پانچویں ہجرت امام حسینؑ اور آپؑ کے ہمرائیوں کی مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا کی طرف رجب اور ذی الحج ۶۰ ہجری میں واقع ہوئی ۔ چھٹی ہجرت بی بیاں پاک دامن کی کربلا سے ہند قدیم (لاہور) کو حکم امامؑ کے تحت ہوئی ۔ جب چھ محترم خواتین کچھ افراد کے ہمراہ ۶۱ ھ ہی میں وارد لاہور ہوئیں۔ اس کے بعد تو آئمہؑ ، سادات اور شیعان علیؑ کی جبری ہجرتوں کا ایک سلسلہ تھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ سے امام حسن عسکریؑ تک ، سب کو مدینہ سے سامرہ ، کاظمین ، بغداد اور خراسان (مشہد) کی طرف ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ نیز دیگر افراد سادات اور محبان اہلبیت کو دیگر بلاد اسلامیہ کے علاوہ قدیم ہند (برصغیر پاک وہند) کے سندھ وملتان کی طرف نقل مکانی کرنی پڑی ۔ یہ ہجرتیں ۵۸ ھ ، ۱۲۱ ھ ، ۱۳۵ ھ ، ۱۴۱ ھ ، ۱۹۹ ھ ، ۱۸۶ ھ ، ۲۰۰ ھ ، اور ۲۴۰ ھ سے ۲۹۰ ھ تک کے دوران واقع ہوئیں۔ جن کے باعث کوفہ ، بصرہ ، یمن ، خراسان ، سندھ وملتان ، پنجاب ، کشمیر ، شمالی علاقہ جات ہند اور مصر والمغرب کے علاقوں کی قسمت جاگ اٹھی ۔ ان ہجرت کرنے والوں میں جناب محمد عارف

علافی، جناب حمیم بن سامہ، حضرت عبداللہ الاشتر، امام حسنؑ کی اولاد میں سید زادے اور جناب عمر الاطرف یا عمر الاشرف بن امیر المومنین کی نسل میں بعض علوی نمایاں تھے۔ ۲۴۰ھ میں امام محمد تقی الجوادؑ کے فرزند جناب موسیٰ مبرقع نے مدینہ سے ہجرت کی اور کچھ عرصہ کوفہ وکاشان میں رہ کر ۲۵۶ھ میں قم میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور اپنے مکان مسکونہ میں ۲۹۶ھ میں دفن ہوئے۔ جہاں موصوف کا ایک عالی شان مقبرہ تعمیر ہوا ہے۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی اکثر اولاد نے ۲۹۶ھ کے بعد قم سے ہجرت کی اور مشہد مقدس کو آباد کیا۔ مشہد مقدس میں سادات رضوی کی یہ پہلی بستی تھی۔ (۱۷) ان ہی سادات رضوی میں میران سید محمد غازی رضوی مشہدی ہوئے جو آستانہ قدس رضویہ کے متولی خاندان کے چشم وچراغ اور شہرہ آفاق فوجی سالار بھی تھے۔ آپ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی سپاہ خاص کے کماندار تھے۔ آپ ہی بیانہ وآگرہ اور نواح کے سادات رضوی کے مورث اعلیٰ بھی ہیں۔

اولاد امیر المومنینؑ میں اٹھارہ فرزند تھے لیکن کربلا میں سادات کے قتل عام کے باعث فقط چند حضرات سے نسل باقی رہی۔ ان میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے علاوہ جناب محمد حنفیہ، جناب عمر الاطرف یا عمر اشرف اور حضرت ابوالفضل عباسؑ اہمیت کے حامل ہیں۔ جناب محمد حنفیہ کے چودہ بیٹوں میں سے فقط دو کے عقب باقی رہے یعنی جناب علی اور جناب جعفر سے۔ جناب جعفر کی نسل میں نقیبوں کا ایک سلسلہ چلا جو ”نقیب بنی محمد“ کہلائے۔ (۱۸) انہوں نے زیادہ تر ایران کی طرف ہجرت کی اور اصفہان وفارس میں آباد ہوئے۔ جناب عمر الاطرف کی نسل دو بیٹوں محمد بن عمر بن عمر الاطرف اور عبداللہ بن محمد بن عمر الاطرف سے چلی۔ مؤخر الذکر کی نسل میں جناب احمد بن عبداللہ ابویعلی نے طبرستان کی طرف ہجرت کی تھی اور

۲۵۰ھ میں یہاں علوی ریاست کی اساس رکھی تھی ۔ جناب عبداللہ بن جعفر بن محمد نے ہند کی طرف ہجرت کی اور ملتان میں سکونت اختیار کی اور یہاں اسمعیلی اقتدار کی راہ ہموار کی ۔ ان کی اولاد دراولاد بہت تھی جن میں ملوک ، نساب اور علماء گذرے ہیں۔ ان کا اسمعیلی عقیدہ سے تعلق تھا ، مقامی زبان بولتے تھے ، اشراف قریش سے ازدواجی رشتے قائم کئے اور اردو ریختہ کی بنیاد رکھی ۔ (۱۹) حضرت ابوالفضل عباسؑ بن امیرالمومنینؑ کی نسل کو بڑھاوا آپؑ کے دو بیٹوں سے ملا یعنی جناب عبید اللہ اور جناب حمزۃ الاکبر سے ۔ جناب عبیداللہ کی اولاد میں جناب ابراہیم جروقہ بہت نامور ہوئے۔ ان کے انیس فرزندوں میں جناب عبید اللہ بن علی بن ابراہیم جروقہ بڑے اہم تھے۔ آپ ہجرت کر کے مصر چلے گئے تھے ۔ آپ کے پاس جو اہم کتب تھیں ان میں "فقہ اہلبیتؑ" نامی ایک کتاب بھی تھی ۔ (۲۰) جناب حمزہ الاکبر کے فرزند جناب ابو محمد قاسم نے یمن کو ہجرت کی اور "بنی حمزہ" کے مورث قرار پائے۔ ان میں جناب ابویعلیٰ حمزہ بن قاسم بن علی بن حمزۃ الاکبر بڑے جلیل القدر ہوئے۔ آپ شیخ صدوقؒ کے والد جناب علی بن بابویہؒ کے ہم عصر تھے۔ ان ہی میں جناب عباس بن حسن بن عبیداللہ نے بغداد کو ہجرت کی تھی آپ عظیم خطیب تھے۔ آپ کی اولاد میں حضرت عبید اللہ بن حسن بن عبید اللہ ہوئے جو حرمین کے قاضی القضاۃ تھے۔ ان کی اولاد شام کے نزدیک طبریہ میں آباد ہو گئی تھی ۔ ان ہی میں جناب قاسم بن عبداللہ بن حسن بن عبیداللہ ہوئے جو امام حسن عسکریؑ کے مصاحبوں میں تھے۔ حضرت امام حسنؑ کی نسل فقط دو فرزندوں سے باقی رہی یعنی جناب زید بن حسن اور جناب حسن مثنیٰ سے۔ جناب زید بن حسن کی نسل میں اسمعیلیوں کے داعیٔ کبیر اور داعیٔ صغیر ہوئے جنہوں نے طبرستان میں حکومت قائم کی تھی ۔ (۲۱) جناب حسن بن حسن (حسن مثنیٰ) کے بیٹوں میں جناب عبداللہ ، جناب ابراہیم اور

جناب حسن مثلث ہوئے۔ جناب عبداللہ کے بڑے بیٹے جناب عبداللہ المحض ہوئے۔ ؁ جو نفس ذکیہ کہلائے۔ منصور عباسی نے بھاری تعداد میں سادات حسنی اور علویوں کو قتل کردیا تھا۔ چنانچہ ۱۴۵ھ میں جناب نفس ذکیہؒ کو تلوار اٹھانا پڑی ۔ ؁ امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے ان سید زادوں کے خروج کو جائز ٹھہرایا تھا اور لوگوں کو ان کی بیعت کرنے کا فتویٰ صادر کیا تھا ؁ (۲۲) جناب نفس ذکیہؒ کی شہادت کے بعد جناب ابراہیم بن عبداللہ المحضؒ نے جہاد کیا۔ مقام باخمری ، پر زبردست معرکہ ہوا مگر آپؒ شہید ہوگئے۔ جناب عبداللہ الاشتر بن نفس ذکیہ نے ہجرت کی اور ہند میں ہندوراجہ ؁ کچھ ؁ کی مملکت میں بس گئے تھے لیکن منصور عباسی کی فوج کشی کے نتیجہ میں شہید ہوگئے۔ جناب موسیٰ بن نفس ذکیہ کا لقب جون تھا۔ آپ کی نسل کو حجاز میں ؁ صالحون ؁ کہتے ہیں۔ ؁ جناب یحیٰی بن عبداللہ المحض کی نسل میں جناب محمد بن جعفر بن یحیٰی نے معرکہ فخ کے بعد المغرب کو ہجرت کی اور ۱۷۲ھ میں یہاں پہلی علوی حکومت کی بنیاد رکھی ؁ (۲۳) ۱۶۹ھ میں جناب حسین بن علی بن حسن مثلث کی قیادت میں سادات حسنی اور علویوں نے مل کر جہاد کیا۔ مقام ؁ فخ ؁ پر سخت معرکہ ہوا۔ کربلا کے بعد فخ کو سادات کی سب سے بڑی قتل گاہ کہا گیا ہے۔ ۱۸۶ھ اور ۲۰۰ھ کے دوران سادات اور علویوں نے کوفہ ، یمن اور بصرہ میں منظم جہاد کیا مگر ناکام رہے۔ ۲۰۱ھ میں سادات اور علویوں کی زبردست مزاحمت کے پس منظر میں خلیفہ مامون الرشید نے حضرت امام رضا کو مرو (خراسان) بلوالیا اور ایسی صورت حال پیدا کردی کہ آپؒ کو مامون کی تجویز قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ امام رضا کی متوقع شہادت کے پیش نظر ایک عظیم قافلہ مؤدت مدینہ سے خراسان کو روانہ ہوا جس میں بارہ ہزار سے زائد افراد شامل تھے۔ حکومت نے اس قافلہ کو قم کے نزدیک شہریار کے مقام پر روک دیا ، زبردست کشت وخون ہوا اور

زیادہ تر افراد شہید ہوگئے۔ ان میں محترمہ فاطمہ قم اور جناب ابراہیم بن امام رضا بھی شامل تھے۔ جو لوگ بچ رہے تھے وہ منتشر ہو کر ایران کے مختلف مقامات پر بس گئے۔ ۲۱۹ھ میں حکومت عباسی نے گروہ زطہ کے سترہ ہزار محبان اہلبیت کو جبراً کوفہ سے ہٹا کر سرحد روم کے نزدیک بسا دیا لیکن دھوکہ دیکر شب خون مارا اور سب کو تہ تیغ کر دیا اور الزام عیسائیوں پر رکھ دیا گیا جناب عبداللہ المحض کے ایک بھائی جناب داؤد بھی تھے۔ ان کی نسل میں جناب حسن بن سلیمان بن داؤد ہوئے جن سے ° آل طاؤس ° کا سلسلہ چلا۔ انہی میں جناب رضی الدین علی بن موسیٰ (جناب سید ابن طاؤس) ہوئے۔ جناب عبداللہ المحض کے ایک بھائی جناب ابوالحسن ابراہیم کی نسل میں جناب اسمٰعیل دیباج اور جناب محمد اصغر ہوئے۔ آخرالذکر کو منصور عباسی نے ستون میں زندہ چنوا دیا تھا۔

دیگر ہجرتیں

سادات، شیعیان علیؑ، علماء وصوفیاء نے جو ہجرتیں چوتھی صدی ہجری کے بعد ہند و سندھ کی طرف کیں ان کا مختصر بیان بھی خوف طوالت سے ممکن نہیں ہے۔ صرف اہم ترین ہجرتوں کی طرف فقط اشارے ہی کئے جا رہے ہیں۔ یہ تمام واقعات مقاتل الطالبین، احسن المقال، مجالس المومنین،

early muslims in the sobcontinent by k.s. lal

سرزمین ملتان اور دیگر کتب تاریخ سے ماخوذ ہیں۔

(۱) پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں ـــــ جناب شیخ اسمٰعیل بخاری نے جو سادات بخارا سے تعلق رکھتے تھے، ایران سے ہجرت کی اور لاہور تشریف لائے۔ جناب سید علی بن عثمان ہجویریؒ (داتا گنجش بخش) لاہور وارد ہوئے۔ اسمٰعیلی داعی جناب عبداللہ خزری یمن سے گجرات (مغربی ہند) آئے۔ جناب سید جمال الدینؒ (شاہ گردیز) ایران سے ملتان تشریف

لائے۔ سادات جعفری و رضوی ایران (شیراز اور مشہد) سے ہند وارد ہوئے اور بیانہ و نواح کی سادات کی بستیاں ظہور میں آئیں۔

(۲) چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں۔ الموت سے اسمعیلی داعی جناب نورالدین (نورستگر) گجرات (مغربی ہند) آئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے ایران سے لاہور اور دہلی میں قیام کے بعد اجمیر میں مستقل سکونت اختیار کی۔ عراق سے جناب بوعلی قلندرؒ نے نزد دہلی (پانی پت) میں قیام کیا۔ میر سید محمد رضوی غازی مشہدی (سادات رضویہ مشہدی) نے سلطان غوری کے لشکر کے ساتھ سرزمین بیانہ کو اپنا مستقر بنایا۔ فوجی سالار محمد بختیار خلجی کی فوجی مہمات کے سلسلے میں شیخ جلال الدین تبریزی نے بنگال میں قدم رنجہ فرمایا۔

(۳) ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں۔ جناب سلطان سخی سرور غزنہ سے ملتان وارد ہوئے۔ سید جلال الدین بخاریؒ نے اوچھ کو، شیخ نظام الدین اولیاؒ نے دھلی کو مرکز تبلیغ بنایا، جناب شمس تبریزؒ اور سید جلال الدین حیدرؒ سرخپوش سبزوار اور بخارا سے ملتان اور اوچھ تشریف لائے۔

(۴) آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں۔ میر سید علی ہمدانی مع سات سو سیدزادوں اور صوفیوں کے ایران سے کشمیر تشریف لائے۔ سید محمد گیسو دراز گجرات اور پونا ہوتے ہوئے گلبرگہ (دکن ہند) وارد ہوئے۔ میر سید محمد ہمدانی مع تین سو سید زادوں کے کشمیر میں آئے۔

(۵) نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں۔ میر شمس الدین عراقی نے اپنے بہت سے شاگردوں کے ساتھ کشمیر میں قدم رنجہ فرمایا۔ اسمعیلی مبلغ میر یوسف الدین اور پیر صدر الدین نے سندھ اور مغربی ہند میں قدم رکھا۔ سادات کنتوری نے نشاپور سے لکھنو میں سکونت اختیار کی سادات بیہقی نے مشہد مقدس سے دہلی کو عزت دی۔ شاہ نعمت اللہ اور علاء

الدولہ سمنانی کے شاگردوں اور اولاد نے ایران سے آکر دکنی ہند میں قدم رنجہ فرمایا۔ سید محمد سبزواری ایران سے کشمیر میں داخل ہوئے۔ سید فضل اللہ انجو اور ملا لطف الدین سبزواری دکن میں آئے۔ شاہ نعمت اللہ کے بیٹے اور پوتے میر نور اللہ اور میر خلیل اللہ نے دکنی ہند کو شرف بخشا۔ یوسف عادل شاہ ایران (قم) سے دکن میں وارد ہوئے۔ سید احمد هروی اور سید مصطفیٰ خاں اردستانی ایران سے دکن آئے۔ سلطان قلی قطب شاہ ہمدان سے گولکنڈہ تشریف لائے۔ شاہ چراغ نجف سے دکن وارد ہوئے اور مخدوم لعل شاہ کے مورث اعلیٰ سید علی زین العابدین نے ایران سے کشمیر کو ہجرت کی۔

(۶) دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں۔ حکیم فتح اللہ گیلانی، حکیم ہمام، حکیم سید علی، ملا محمد یزدی، میر مرتضیٰ، غزالی مشہدی، قاسم کاہی، علامہ شاہ فتح اللہ شیرازی اور حضرت قاضی نور اللہ شوستری نے مع فرزندان عالی قدر ایران سے ہجرت کی اور دکن و آگرہ کے شاہی درباروں کو عزت بخشی۔ خواجہ محمد گاوان، میر غیاث الدین شیرازی اور سعد الدین خان عرف شاہنواز خان ایران سے دکن تشریف لائے۔ ایران کے سادات خاوندیہ کے شاہ طاہر نے دکن کو رونق دی۔ مدینہ سے سید حسن، احمد نگر وارد ہوئے۔ ایران سے سادات گیلان کے میر مومن استرآبادی نے گولکنڈہ میں قدم رنجہ فرمایا اور ملا فضل اللہ شیرازی ایران سے دکن میں آئے۔

(۷) گیارہویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں۔ ایران سے امیر الامراء علی مردان خان ہند تشریف لائے اور کشمیر و لاہور کے گورنر مقرر ہوئے۔ سید راجو بخاری نے دکن میں زبردست دینی خدمات انجام دیں۔ ایران سے ایک بڑے شیعی تاجر آقا محمد مختار اور محسن نے ہگلی (کلکتہ) وارد ہوئے بہت بڑے ٹرسٹ کے بانی ٹھہرے۔ نیشاپور سے میر باقر لکھنؤ آئے اور ایران سے شیخ محمد بن علی طوسی دوبارہ دکن میں وارد ہوئے۔

ان اہم ترین ہجرتوں کے علاوہ سینکڑوں ہجرتیں اور بھی واقع ہوئیں
جو خفیہ تھیں جن کے ذکر سے تاریخ کا دامن خالی رہا کہ سیاسی حالات کا
تقاضہ نہ تھا۔ بعض سادات کی ایسی ہجرتیں بھی ہوئیں جن میں معجزانہ عنصر
نمایاں تھا۔ ایسی ہی ایک ہجرت عباسی حکمران متوکل کے عہد ظلم میں ہوئی
جس کا تذکرہ کتاب "بہارستان اعجاز" کے حوالے سے کتاب "انسان کامل"
انگریزی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء شائع کردہ پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ میں بڑی تفصیل
سے ملتا ہے۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۴۳ء - ۱۹۴۴ء میں
حکومت ہند کی طرف سے ایک سروے پارٹی غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ
سی پی میں ناگپور کے نزدیک جنگلات کا سروے کرنے کی غرض سے گئی تھی
جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی تینوں اہلکار شامل تھے۔ ان میں مولوی
احسان الحق بھی شامل تھے جو بڑے پڑھے لکھے اور ثقہ تھے۔ آپ عربی زبان کے
بھی عالم تھے۔ جنگلات کے سرے پر اس سروے پارٹی نے اپنا ڈیرہ ڈال دیا تھا۔
علی الصبح مولوی احسان الحق نے نزدیک کے چشمہ آب سے وضو کرکے نماز
پڑھی اور طلوع آفتاب کے بعد جنگل میں کچھ دور اندر تک سیر کیلئے چلے گئے۔
انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو کافی لمبی چوڑی تھی اور پرانی اینٹوں کی بنی
ہوئی تھی ۔ وہ حیران ہوئے کہ اس جنگل میں یہ دیوار کیسی اور کیوں ہے۔
وہ دیوار کے ساتھ چلتے رہے۔ دیوار دائرے کی صورت میں تھی مگر اس میں
کوئی دروازہ نہ تھا۔ البتہ ایک جانب فقط ایک کھڑکی تھی جو بند تھی ۔
مولوی صاحب ایک درخت کی آڑ میں کھڑکی کے نیچے بیٹھ گئے تھوڑی دیر بعد
کھڑکی کھلی اور ایک شخص نے جھانک کر دیکھا۔ وہ کرسی بچھا کر کھڑکی کے
ساتھ بیٹھ گیا اور قرآن حکیم کی تلاوت میں مشغول ہوگیا۔ وہ حلیہ ولباس سے
عربی النسل ادھیڑ عمر کا شخص نظر آیا۔ اسکا لہجہ بھی عربی تھا۔ مولوی صاحب
کھڑکی کے نیچے سے نمودار ہوئے تو اس شخص نے فوراً کھڑکی بند کرلی ۔ چونکہ

وہ شخص دیندار معلوم ہوتا تھا اس لئے مولوی صاحب نے عربی میں اس کو اس کے آباواجداد اور قرآن مجید کے واسطے دیئے تو اس نے کھڑکی کھول دی مولوی صاحب نے اس سے اس جگہ موجودگی سے متعلق سوالات کئے تو اس نے پوچھا کہ متوکل عباسی تو ہماری گفتگو نہیں سن رہا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ متوکل کو تو مرے ہوئے بھی گیارہ سو سال سے زائد مدت ہو گئی۔ اس شخص نے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے اور بغداد سے کتنی دور ہے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ بغداد تقریباً چار ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ اس نے پوچھا یہاں کا حاکم کون ہے اور کیسا ہے۔ مختصراً مولوی صاحب کے اصرار پر اس شخص نے اپنی روداد اس طرح بیان کی کہ متوکل عباسی کی حکومت جور کا زمانہ تھا۔ ہم سادات فاطمی بغداد کے نزدیک ایک موضع میں رہتے تھے ہماری تعداد تقریباً چار سو تھی۔ ایک شام متوکل کی فوج نے ہمیں نرغے میں لے کر کہا کہ ہم سب کو قتل کر دینے کا حکم ملا ہے۔ ہم نے بمشکل صبح تک کی مہلت لی اور رات بھر عبادت میں بسر کی۔ فجر سے ذرا پہلے ہم سب کی آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہوئے تو ہم نے خود کو اس مقام پر پایا۔ یہاں ہر قسم کی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے انتظامات ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں یہاں وارد ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے ہیں جب کہ تم (مولوی صاحب) کہتے ہو کہ سینکڑوں برس گزر گئے اور یہ کہ ہم بغداد سے بہت دور کسی اور ملک میں موجود ہیں۔ مولوی صاحب کے اصرار پر اس شخص نے روز ملاقات کی اجازت دیدی اس شرط کے ساتھ کہ کسی اور کو اس معاملہ سے باخبر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن مولوی صاحب سے نہ رہا گیا اور کیمپ میں واپس ہو کر دیگر افراد کو بھی یہ بات بتلادی دوسرے دن صبح جب مولوی احسان الحق مع دیگر افراد جماعت کے وہاں پہنچے تو دم بخود رہ گئے کہ وہاں وہ دیوار ہی نہ تھی اور سب کچھ خواب معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن مولوی صاحب کی اچھی شہرت اور

سیرت کے باعث سب نے مان لیا کہ جو کچھ مولوی صاحب نے بیان کیا تھا، واقعی سچ تھا ۔ ان حالات واقعات کے نتیجے میں حکومت کی پالیسی کے تحت محبان سادات کو زندہ رہنا محال ہوگیا چنانچہ ان کی بڑی تعداد کو ہند کے دور دراز علاقے (دکن اور بنگال) کی طرف ہجرت کرنا پڑی ۔ اس طرح درجنوں نئی بستیوں کا ظہور ہوا جس کے باعث شیعی افکار وعقائد کی زبردست اشاعت ہوئی اور شیعیت کو ہمہ گیر فروغ حاصل ہوا۔ اس سے عروج شیعیت کی وہ داستان مرتب ہوئی جو صدیوں پر محیط ہے اس کا اجمالی بیان درج ذیل ہے۔

(ب) شیعیت کا فروغ

۱۔ شیعیت اور اس کا ابتدائی زمانہ ------ دوست ، محب ، مددگار اور پیروکار کو شیعہ کہتے ہیں۔ ° اجتماعی مفہوم میں اس کو ایک جماعت بھی کہہ سکتے ہیں جو حضرت علیؑ کی مطیع وفرمانبردار ہو ° (۴۴) شیعیت یا تشیع کا مطلب شیعی عقائد اور اعمال کی بجا آوری ہے۔ دین اسلام کو اس کے ان تمام نظری اور عملی تقاضوں کے ساتھ تسلیم اور اختیار کرنا جو آلِ محمدؐ کی تعلیمات کے مطابق ہوں ، کو شیعیت کا نام دیا گیا ہے۔ نظری تقاضوں کو اصول دین اور عملی تقاضوں کو فروع دین کہا گیا ہے۔ ان میں توحید خالص ، عدل الہی ، رسالت وامامت اور منصوص من اللہ خلافت محمدیؐ اور قیامت کے نظریات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عقیدہ امامت ، شیعی اصول خمسہ میں دین کا ایک اہم رکن ہے ۔ یہ ہی وہ بنیادی نظریہ ہے جو شیعی مکتب فکر کو دیگر تمام اسلامی مکاتب فکر سے ممتاز اور الگ کرتا ہے۔ شیعی نقطۂ نظر سے امامت الہیہ نبوت کی طرح ایک اہم الہیٰ منصب ہے جو نص قرآنی " انی جاعلک ---- عہد الظالمین " کی رو سے کسی ظالم کو نہیں مل سکتا۔ یہ ہی عصمت امام کی روشن دلیل بھی ہے۔ شیعیت کے نخل طیبہ کی آبیاری خود

آنحضرتؐ کے ہاتھوں ہوئی تھی مگر ابھی یہ تناور درخت نہیں بنا تھا کہ آفتاب رسالتؐ کی زندگی بخش حرارت سے محروم ہوگیا۔ اس دعویٰ میں شیعوں کے ساتھ سواداعظم کے بہت سے علماء وفقہاء بھی شریک ہیں۔ امام احمد بن حنبل، علامہ سیوطی، علامہ ابن حجر مکی، امام نسائی اور علامہ ابن اثیر وغیرہ جنہوں نے جناب عبداللہ ابن عباس اور خود حضرت علیؑ سے احادیث نقل کی ہیں کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اے علی! تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے دن عزت پانے والوں میں ہوں گے۔" اسی فرمان رسولؐ کی روشنی میں اصحاب نبیؐ کا ایک گروہ حضرت علیؑ کا محب اور مطیع بن جاتا ہے اور آپؑ کو رسولؐ کا حقیقی وراث اور جانشین تسلیم کرلیتا ہے۔ ان شیعیان علیؑ کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ جناب شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء کے مطابق "ان میں اصحاب وتابعین کی اکثریت (تقریباً بارہ ہزار) ایسی تھی جنہوں نے جنگ ہائے جمل وصفین میں آپؑ کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ یہ سب شیعیان علیؑ تھے جو دراصل شیعیان محمدؐ ہی تھے۔" (۲۵)

تشیع یا شیعیت کوئی نئی چیز یا عقیدہ نہیں ہے یہ تو عہد رسولؐ میں بھی موجود تھی جیسا کہ قول رسولؐ سے ثابت ہے جس کا حوالہ مؤدت القرباء ص ۳۳ پر مذکور ہے۔ رسالت مآب کا قول محکم ہے کہ "میری امت میں میری شفاعت انہیں نصیب ہوگی جو میرے اہلبیتؑ کو دوست رکھتے ہوں گے اور وہی میرے شیعہ ہیں۔" (۲۶) چنانچہ حیات رسولؐ ہی میں مخصوص اصحابؓ رسولؐ کی جماعت کو شیعیان محمدؐ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ "اس طرح اصحاب نبیؐ کا ایک اہم گروہ جو شیعیان محمدؐ کہلاتے تھے دراصل وہی ابتدائی شیعیان علیؑ واہلبیتؑ بھی تھے۔" (۲۷) ان جلیل القدر اصحاب رسولؐ کے علاوہ

تابعین اور تبع تابعین میں شیعیان علیؑ کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے ان میں درج ذیل حضرات خصوصی منزلت کے حامل تھے۔ جناب اصباغ بن نباتہ، جناب کمیل بن زیاد، جناب مالک الاشتر، جناب میثم تمار، جناب محمد بن ابوبکر، جناب قیس بن سعد انصاری، جناب حجر بن عدی، جناب صعصعہ بن صوحان، جناب عثمان بن حنیف، جناب عمر بن لحمق الخزاعی، جناب سعید بن قیس ہمدانی، جناب سعید بن جبیر کوفی، جناب نعمان بن عجلان اور جناب قنبر جو حضرت علیؑ کے غلام خاص تھے۔ ان حضرات کے بارے میں امام اہلسنت علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ "ان میں انتہا پسند اور اعتدال پسند دونوں قسم کے اصحاب شامل ہیں مگر یہ سب دیندار، سچے اور پاکباز تھے۔ اگر ان میں سے انتہا پسندوں کی احادیث کو نظر انداز کر دیا جائے تو رسولؐ کی سنت کا بہت بڑا ذخیرہ برباد ہو جائے گا۔" (۲۸) جناب سمنانی کے مطابق "تابعین میں صاحبان علم کی بڑی تعداد شیعہ تھی" (۲۹) اس نظریاتی جماعت سے ایک گروہ صحابہ کو حسد پیدا ہو گیا تھا جن کے دین اور سیاست کا محور ہی اہلبیتؑ کو خلافت وحکومت سے دور رکھنا تھا۔ چنانچہ حیات رسولؐ ہی میں یہ دونوں مختلف الخیال گروہ موجود تھے۔ اہلبیتؑ کے مخالف گروہ میں شیخین کے علاوہ ابو عبیدہ بن جراح، عبدالرحمن بن عوف، مغیرہ بن شعبہ، سالم مولا بن ابی حزیفہ، خالد بن ولید اور سعد بن ابی وقاص حضرات نمایاں تھے۔ کتاب امام ابو حنفیہ مولفہ ابو زہرہ مصری کے مطابق حضرت علی کے حامیوں میں عمار یاسر، ابو ذر غفاری، سلمان فارسی، جابر بن عبداللہ انصاری۔ ابن ولی کعب، حذیفہ، ابو ایوب۔ سہل بن حنیف، عثمان بن حنیف، ابو الہیثم، عامر بن وائلہ، عباس بن عبدالمطلب اور ان کے بیٹے اور عام بنی ہاشم جو حضرت علی کو نبی اکرمؐ کے اختیار کردہ خلیفہ اور تمام صحابہ سے افضل سمجھتے تھے اجرا

میں زبیر کا بھی یہی خیال تھا امویوں میں بھی بعض افراد حضرت علیؑ کے حامی تھے ان دونوں جماعتوں میں نظریاتی کشمکش جاری رہی یہاں تک کہ تاریخی اعتبار سے حضرت علیؑ چوتھے خلیفہ ظاہر منتخب ہوگئے۔ اس سے پہلے تیسری خلافت کے موقع پر نظریاتی اختلافات کھل کر سامنے آگئے تھے جب نام نہاد شوریٰ کے سربراہ عبدالرحمن بن عوف نے حضرت علیؑ کو سیرت شیخین پر عمل کرنے کے عہد کو خلافت سے مشروط کیا تھا جس کو حضرت علیؑ نے قطعی مسترد کردیا تھا۔ اسی مقام سے دو الگ اور مختلف مکاتب فکر کی باضابطہ بنیاد پڑی ۔ " سیرت شیخین پر عمل کرنے سے حضرت علیؑ کا تاریخی انکار دراصل آلؑ محمدؐ کے ایک قطعی الگ اور ممتاز مکتب فکر اور درسگاہ امامیہ کا سنگ بنیاد تھا۔" (۴۰)

تاریخ اسلام میں حضرت علیؑ کی خلافت وہ واحد خلافت تھی جو نامزدگی یا محدود شوریٰ کے بجائے مسجد نبوی میں باقاعدہ جمہوری انتخاب کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی ۔ اس میں عوام نے بغیر کسی دباؤ کے بھرپور حصہ لیا تھا۔ لیکن کچھ حضرات کو یہ گوارا نہ ہوا۔ ان کی حضرت علیؑ اور اہلبیتؑ سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی ۔ ان مخالفین میں حضرت عائشہ، طلحہ، زبیر مروان اور معاویہ بن ابی سفیان نمایاں تھے۔ حضرت علیؑ کو حق وعدل سے گہری وابستگی اور اس ضمن میں آپؑ کے بے لچک طرز عمل کو وہ لوگ کیونکر برداشت کرسکتے تھے جو گذشتہ ربع صدی میں ناجائز مراعات کے عادی ہوچکے تھے اور عرب کے نہایت متمول اور مالداروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ لہذا ایک مخصوص مراعات یافتہ گروہ نے جو ارتکاز دولت کرکے لاکھوں کی جائیداد کا مالک بن گیا تھا آپؑ کے خلاف متحد ہوگیا اس کی قیادت معاویہ اور ان کے حامیوں نے سنبھال لی ۔ جنگ جمل کے سلسلے میں اہل بصرہ نے حضرت

عائشہ کا اور اہل کوفہ نے حضرت علیؑ کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت علیؑ کے ان کوفی طرفداروں کو شیعیان علیؑ کہا گیا جب کہ مذہبی اعتبار سے یہ لوگ شیعہ نہ تھے لیکن "شیعیان بنی امیہ" کے مقابلے میں یہ لوگ خود کو شیعیان علیؑ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔" (۴۱) دیگر مورخوں کے مطابق جنگ جمل میں حضرت علیؑ کی حامی جماعت اور فوج کو "جماعت علوی" اور مخالف جماعت وفوج کو "جماعت عثمانی" قرار دیا گیا تھا۔ جنگ صفین میں معاویہ کی جماعت اور فوج کو "شیعیان معاویہ و بنی امیہ" اور حضرت علیؑ کی فوج کو "شیعیان علیؑ واہلبیت" کا نام دیا گیا۔ مورخ اکبر خان نجیب آبادی رقم طراز ہے کہ "معاویہ نے مسند خلافت پر قدم رکھا تو اس وقت عالم اسلام میں عقائد واعمال کے لحاظ سے تین واضح گروہ موجود تھے۔ پہلا گروہ شیعیان علیؑ کا تھا، دوسرا گروہ شیعیان معاویہ کا تھا اور تیسرا گروہ خوارج کا تھا۔" (۴۲) اس کے بعد بھی شیعیان علیؑ تو ہر دور میں اسی نام سے پکارے جاتے رہے ہیں لیکن شیعیان معاویہ و بنی امیہ کو شاید دینی اور سیاسی ضرورت کے تحت "سنت والجماعت" کا مخصوص نام دے دیا گیا" (۴۳) غالباً یہ تبدیلی عظیم سانحہ کربلا اور المیہ حرہ اور انہدام کعبہ میں اموی حکمرانوں کے براہ راست ملوث ہونے کے نتیجہ میں بدنام ہونے کے باعث ضروری ہوگئی تھی

شیعیت کی تاریخ اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرح غربت ومظلومیت اور ایثار وہجرت سے عبارت ہے۔ حضرت علیؑ اور ان کے ساتھی شروع ہی سے حکومت مدینہ کی انتقامی سیاست کا نشانہ بنے رہے۔ آپؑ نے استحقاق اور شجاعت کے تقاضوں اور مواقع حاصل ہونے کے باوجود وحدت اسلامی کو برقرار رکھنے کی خاطر خاموشی اختیار فرمائی اور غیر جارحانہ احتجاج اور پرامن عدم تعاون کی روش اپنائی۔ سابقہ حکومتوں نے سیاسی حکمت عملی کے تحت فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور مسلسل جاری رکھا۔ اس کے باعث دولت

کی ریل پیل ہوگئی اور تمام وابستگان اقتدار کے وارے کے نیارے ہوگئے
ان میں بنی امیہ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ ایک منصوبے کے تحت
ابوسفیان کی اولاد کو اسلامی اقتدار میں اہم مقام دے دیا گیا۔ معاویہ بن ابی
سفیان کی شام و ملحقہ وسیع علاقوں کی محض گورنری نہ تھی بلکہ تقریباً مطلق
العنان بادشاہت تھی۔ اس کو اتنا مستحکم اور خودسر بنا دیا گیا تھا کہ مستقبل
میں حضرت علیؑ کی ممکنہ حکومت کے لئے مدمقابل اور مزاحم قوت ثابت
ہوسکے۔ جیسا کہ بعد کے واقعات نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔

۲۔ اموی اور عباسی حکومتوں میں شیعیت کو درپیش مشکلات و مصائب

معاویہ نے اپنے طویل دور اقتدار میں شہرت دی کہ "آنحضرتؐ نے
کوئی وارث نہیں چھوڑا اس لئے ہم (بنی امیہ) ہی ان کے وارث ہیں۔" اس
نے آلِ محمدؐ کے وجود کی نفی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کی محترم ہستیوں
پر کیچڑ اچھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ حضرت علیؑ پر سب و شتم کی رسم قبیح کی
بنا رکھی جو ساٹھ برس تک سنت رسولؐ کے نام پر جاری رہی۔ سادات اور
شیعیان علیؑ سخت عذاب میں مبتلا رہے۔ ان کی زندگی اور مال وعزت محفوظ نہ
تھے۔ جو سچا مسلمان حضرت علیؑ پر سب و شتم سے انکار کرتا اس کو سنت کا
مخالف قرار دے کر قتل کر دیا جاتا یا جلاوطن۔ چنانچہ نصف صدی میں شام
اور نواح شام میں ایک ایسی قوم پروان چڑھی جو ملوکیت ہی کو خلافت سمجھتی
تھی اور جو یا تو آلِ محمدؐ سے واقف ہی نہ تھی یا ان کے بارے میں نہایت
رکیک خیالات رکھتی تھی۔ ان امویوں کو دین حق سے کوئی واسطہ نہ تھا۔
" ان کی زندگی اور سیاست کا محور فقط دنیا تھی اور آلِ محمدؐ سے انتقام کی

خواہش۔" (۳۴) ان کے سرخیل کو رسالت اور وحی پر ایمان نہ تھا۔ یزید بن معاویہ اموی ذہنیت و فکر کا نمائندہ تھا۔ کربلا میں اپنی ظاہری فتح کے نشہ میں بھرے دربار میں اس کا مافی الضمیر زبان پر آگیا اور اس نے اعلان کیا کہ "میں نے پیغمبرؐ سے اپنے قرضے وصول کرلئے ہیں اور یہ کہ بنی ہاشم نے حکومت کے لئے ڈھونگ رچایا تھا نہ وحی آئی اور نہ فرشتہ نازل ہوا۔" (۳۵) معاویہ اور اس کے جانشینوں کا طویل عہد ظلم سادات اور محبان سادات کے لئے ایک خوفناک طولانی سیاہ رات تھا۔ حضرت علیؑ اور آلؑ محمدؐ کا نام لینا بھی جرم تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ جو علیؑ سے اظہار نفرت نہیں کرتا اس کے جان و مال کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ فرضی توصیف بنی امیہ و شیخین میں جعلی حدیثوں کے انبار لگوا دیئے گئے اور انعام و اکرام کی بارش کردی گئی جب کہ سچی احادیث رسولؐ کو بیان کرنے پر پابندی برقرار رکھی گئی۔" یہ جھوٹی حدیثیں مدرسوں میں طالب علموں کو قرآن کی طرح پڑھائی جاتی تھیں۔

(۳۶) صلح نامہ حسنؑ کی معاویہ نے کسی بھی شق پر عمل نہ کیا اور آخری سنگین خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے بیٹے یزید کو اپنا وارث خلافت نامزد کردیا۔ یہ اقدام سانحہ کربلا پر منتج ہوا جس کی ذمہ داری اموی حکومت کے لئے راہ ہموار کرنے والوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ظلم و استبداد کی شدت کا نتیجہ تھا کہ ہجرتوں کے سلسلے شروع ہوئے جو صدیوں تک جاری رہے اس طرح شیعیت کو نئے نئے علاقے اور مقامات میسر آئے اور فروغ تشیع کا قافلہ رواں دواں رہا۔

وفات رسولؐ کے فوراً بعد آلؑ محمدؐ کی مظلومیت کے دور کی ابتدا ہوگئی تھی اور جلیل القدر اصحابؓ رسولؐ کو جو شیعیان علیؑ تھے، سنگین مشکلات کا سامنا تھا۔ خلفائے ثلاثہ کے عہد میں جناب سعد بن عبادہ اور

حضرت ابوذر غفاری کی جلاوطنی کے نتیجے میں شام اور لبنان کے پہاڑی علاقوں میں شیعیت کا نفوذ ہوا۔ حضرت علیؑ کی خلافت میں کوفہ دارالحکومت بنا جس کے باعث عراق، ایران اور قدیم ہند کے دوردراز کے علاقوں میں محبت اہلبیتؑ کی خوشبو پھیلی۔ خراسان کا "شنسبی" حکمرانوں کا طبقہ حضرت علیؑ کا محب اور فرمانبردار تھا۔" آپؑ نے شنسب کو فرمان حکومت اور پرچم دیا تھا۔ ہر شنسبی حکمران آپؑ کی اور دیگر آئمہ کی محبت اور اطاعت کا عہد کرکے تخت حکومت پر بیٹھتا تھا۔" (۳۷) اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس دور میں بھی لوگ تمام آئمہ کرامؑ کے اسمائے پاک سے واقف تھے۔ قدیم غور کا یہ شنسبانی حکمران طبقہ ہی تھا جس کے حدود حکمرانی میں معاویہ کی رائج کردہ رسم تبرا پر عمل نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں ان ہی کی فوجی امداد کے بل بوتے پر ابو مسلم خراسانی نے اموی اقتدار کا خاتمہ کردیا تھا۔" سندھ میں مکران اور بلوچستان میں قلات وخضدار تک حضرت علیؑ کے عہد خلافت میں آپؑ کے محب اور فوجی سالار جناب حارث بن مرہ کی مہمات کے باعث ان علاقوں میں اسلام کے ساتھ شیعیت بھی داخل ہوگئی تھی۔ موصوف کی فوج میں "اشراف ومعتقدین" کی کافی تعداد تھی جن کی بدولت ان علاقوں کے جانوں نے قبول اسلام کے ساتھ حضرت علیؑ کی محبت واطاعت بھی قبول کرلی تھی۔" (۳۸) "۵۱ ہجری میں جناب بریدہ بن حسیب الاسلمی کی بمع پچاس ہزار اہل قبیلہ کوفہ سے جلا وطنی اور خراسان میں غور کے علاقے میں سکونت اختیار کرنے کے باعث یہاں کے لوگوں میں تشیع کے فروغ میں بڑی مدد ملی۔" (۳۹) المیہ کربلا کے فوراً بعد "بی بیاں پاک دامن" کا لاہور میں ورود اور قیام کے نتیجے میں بھی شیعیت کو بڑھاوا ملا۔" ان کی آمد سے آتش کدے بجھ گئے تھے اور اصنام منہ کے بل گر پڑے تھے جس کے باعث ہندوراجہ سخت

پریشان ہوا اور ان خواتین کو سزا دینی چاہی تو ان کی دعا پر زمین شق ہوئی اور ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔" (۴۰) ابتدائی اموی حکمران عبدالملک اور مروان کی سادات دشمن پالیسی میں شدت کے باعث بعض سادات اور علویوں نے مدینہ، کوفہ اور شام سے بہت دور ہندوسندھ کے ان علاقوں کی طرف ہجرت کی جہاں پہلے ہی سادات کی بستیاں وجود میں آچکی تھی۔ ان میں قدیم سندھ کا وہ وسیع علاقہ شامل تھا جہاں راجہ چچ اور اس کے بعد راجہ داھر حکمران تھا۔ اس کے حدود مملکت میں مسلمان حکمرانوں کے ستائے ہوئے سادات اور شیعوں کو عرت سے پناہ مل گئی تھی۔ راجہ داھر توحید پرست اور محب اہلبیت تھا۔ سائیں جی۔ ایم سید کی کتاب سدھو دیش اور مورخ اعجاز الحق قدوسی کے مطابق "اموی حکومت کے ابتدائی زمانے میں خراسان، غور اور دیگر مقامات پر بغاوتوں کو کچل دینے کے بعد بہت سے عراقی اور ایرانی جنہیں اموی حکومت نے "باغی" قرار دیا تھا، ترک وطن کر کے سندھ کے مکران میں پناہ لے لی تھی اس لئے سندھ کے راجہ داھر پر مسلمانوں کا حملہ ناگزیر تھا۔" (۴۱) اس طرح مکران میں بھی ایک شیعی آبادی قائم ہو چکی تھی غالباً ۱۴۱ ہجری میں جناب سید عبداللہ الاشتر بن جناب نفس ذکیہ اور ان کے چار سو ساتھیوں کی ہندوریاست کچھ میں آمد وسکونت کے باعث سادات کی ایک بستی کا ظہور تاریخی مسلمات میں سے ہے۔ جو فروغ تشیع کا یقیناً باعث ہوئی ہوگی بلکہ کئی چھوٹی چھوٹی بستیوں کا وجود عمل میں آیا ہوگا کیونکہ ۱۵۱ ھ میں عباسی حکومت کی "کچھ" پر فوج کشی کے نتیجے میں بچے کھچے سادات ومحبان سادات نے منتشر ہو کر سندھ وکچھ کے مختلف مقامات کو بسایا تھا۔" (۴۲) منصور عباسی کے عہد ظلم میں جب سادات کا قتل عام ہو رہا تھا تو ایک سید زادے جناب قاسم بن ابراہیم بن اسمعیل الدیباج بن حسن مثنیٰ بن امام

حسنؑ اور حضرت علیؑ کے غیر فاطمی اولاد میں جناب جعفر بن محمد بن عبیداللہ بن عمرالاطرف (عمرالاشرف) بن حضرت علیؑ مرتضیٰ ہجرت کر کے ملتان وبھاولپور کے نزدیک اوچھ اور خان میں بس گئے تھے۔

حضرت علیؑ کی ظاہری خلافت کے بعد امام جعفر صادقؑ کے عہد میں سندھ وملتان کے ساتھ عراق وخراسان اور حجاز کے روحانی رشتے قائم ہوئے اور مومنین کرام کے ایک دوسرے سے رابطے استوار ہوئے۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری میں سید زادے جناب سید حسن بن علی، جناب زید بن حسن اور جناب قاسم بن حسین کا ذکر ملتان میں ملتا ہے۔ امام موصوف کے سندھی نژاد شاگردوں میں جناب فرج سندھی، جناب ابان سندھی اور جناب خلاد سندھی نمایاں تھے جو ہند اور سندھ میں معروف تبلیغ رہے اور امامؑ کے افکار کی اشاعت میں خصوصی کردار ادا کیا۔" یہ لوگ امام جعفر صادقؑ کے حلقۂ درس کے تربیت یافتہ تھے اور ثقہ راویان حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔" (۴۳) غالباً اسی کا اثر تھا کہ بھارت میں آلؑ محمدؐ کے افکار کے اثرات قدیم عہد سے ملتے ہیں اور جتنا اسلام کو فروغ برصغیر میں ملا کسی اور علاقے میں نہ مل سکا۔ یہ اثرات حضرت علیؑ کے عہد خلافت سے شروع ہوگئے تھے۔ ان کو مہمیز واقعہ کربلا نے دی اور اس کی ہمہ گیر اشاعت میں سادات اور شیعیان علیؑ نے اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے ہند اور سندھ سادات کرام کی پناہ گاہ رہے ہیں اور اسلام وشیعیت کی تیز رفتار ترقی کا ذریعہ بھی۔ چنانچہ شیعیت کے ہمہ گیر فروغ سے گھبرا کر عباسی خلافت کے حامی ناصبیوں اور شیعی افکار واقتدار کے دشمن فوجی طالع آزماؤں نے خراسان و سندھ کو اپنی مہمات کا مرکز بنالیا۔ محمود غزنوی نے متعدد حملے کئے اور چوتھی صدی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں شیعی نقوش کو مٹانے کی

بھرپور کوشش کی۔ "اس کے نزدیک شیعہ ملحد تھے اور ان کی حکومت ملحدانہ تھی۔ اس نے ملتان کی شیعی / اسمٰعیلی حکومت کو تہس نہس کر ڈالا۔ شیعوں کو ملحد وقرامطی قرار دے کر ان کا قتل عام کیا اور اس قتل وغارتگری کو جہاد کا درجہ دیا گیا۔" (۴۴) خود عباسی دارالحکومت میں شیعی اثرات کا اس امر سے اظہار ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں بغداد میں "عید غدیر" منائی گئی اور عاشورہ محرم کا جلوس نکالا گیا جس میں لوگوں نے ماتمی لباس پہنا اور سینہ کوبی کی۔ ملتان اور سندھ فاطمی خلفاء کے زیر نگین ہونے کے باعث یہاں شیعی افکار کو پھیلنے کے مزید مواقع میسر آئے۔ مصر کے خلیفہ عزیز نے عزاداری امام حسینؑ کا سرکاری فرمان ۳۶۵ ھ میں جاری کیا۔ مؤرخ مقدسی نے لکھا ہے کہ "ملتان میں مصر کے فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا ہے، آبادی کا مسلک تشیع ہے اور اذان میں "حیَّ علیٰ خیر العمل" کے الفاظ ادا کئے جاتے ہیں جن کو اپنے عہد خلافت میں حضرت عمر نے منسوخ کر دیا تھا" (۴۵) مقدسی کے اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ "حیَّ علیٰ خیر العمل" کے الفاظ حضرت عمر کے عہد خلافت تک جزواذان تھے۔ ان حالات کا براہ راست منطقی نتیجہ تھا کہ امام حسینؑ کی عزاداری کو بھی بڑا استحکام ملا کیونکہ "تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اسمٰعیلی اور فاطمی خلفائے المغرب ومصر شیعہ تھے اور عزاداری میں گہری دلچسپی رکھتے تھے نیز ان کے ہند کے ہندو راجاؤں سے گہرے تعلقات تھے اور ابتدائی عباسی عہد کا حاکم سندھ عمر بن حفص سادات کا معتقد تھا جس کے باعث شیعیت کو سندھ میں اسی عہد سے استحکام مل چکا تھا۔" (۴۶) تاتاریوں کے حملہ بغداد سے قبل عباسی سلطنت کے ولی عہد کے ایما پر بغداد ونواح میں زبردست شیعہ کش فسادات ہوئے جن میں لاکھوں شیعوں کا قتل عام ہوا۔ "خراسان کی شیعی حکومت کو

ختم کرنے کے لئے عباسی خلیفہ نے چنگیز خان کو تحریری ترغیب دی تھی کیونکہ خوارزم شاہ کے خلاف فوجی کاروائی خلیفہ کے بس کی بات نہ تھی۔ (۴۷) ہلاکو خان نے ۶۵۶ ھ میں بغداد پر حملہ کیا جس کو شیعی وزیر علقمی اور اس دور کے سب سے بڑے دانشور وعالم خواجہ نصیر الدین طوسی کی سازش قرار دیا گیا۔ اگر علامہ طوسی نے منگول حملہ آور سے کوئی مفاہمت کرلی تھی تو کونسا جرم کیا تھا اس طرح انہوں نے شیعوں کے مزید قتل عام اور تباہی کی روک تھام کی تھی ۔ بعد کے حالات وواقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ موصوف کا مؤقف حق بجانب اور اسلام اور شیعیت کے مفاد ہی میں تھا۔ آپ کی فراست وحکمت کے باعث ایران خوفناک تباہی سے محفوظ رہا، ہلاکو خان کو اسلام کی طرف مائل ہونے کی ترغیب ملی، لوٹی ہوئی ہزاروں نایاب کتابوں کو بربادی سے بچا کر کتب خانہ میں محفوظ کردیا گیا، علماء وفضلاء کے وظیفے مقرر ہوئے، ان میں سنی علما بھی شامل تھے اور مراغہ میں ایک عظیم رسد گاہ قائم ہوئی ۔ آپ ہر دور کے لئے عظیم ترین مفکر ودانشور، سائنس داں اور علوم مروجہ کے بڑے ماہر تھے۔ (۴۸) علامہ طوسی کی رکھی ہوئی بنیاد پر بعد میں علامہ حلی نے عظیم عمارت تعمیر کی ۔ آپ نے علمی مباحث میں امامیہ افکار کی برتری ثابت کردی جس کے باعث منگول حکمران اولجا تیو خاں خواہندہ (خدا بندہ خاں) نے بھی طلاق کے مسئلہ میں فقہ جعفری کی عظمت تسلیم کر کے مذھب امامیہ اختیار کرلیا اور شیعہ ہوگیا جس کے باعث درباریوں اور امرائے سلطنت کی بڑی تعداد بھی مذہب امامیہ کی پیروکار بن گئی ۔ اور شیعیت کو فروغ نصیب ہوا اور شیعی رسوم بلا روک ٹوک ادا ہونے لگیں۔

ایران میں صفوی اقتدار کے باعث ایرانیوں کو صحیح معنوں میں اہلبیت نبوت اور حضرت علیؑ کے بارے میں حقائق کا علم ہوا جن کو صدیوں

سے مخفی رکھا گیا تھا یا مسخ کرکے پیش کیا گیا تھا۔ صفوی حکمرانوں نے ترکی کے بڑھتے ہوئے سنی اثرات سے بچا کر ایران کو ایک غالب شیعی ملک بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ (۴۹) یہ تاریخی صداقت ہے کہ صفوی حکمرانی سے قبل ایران پر سنی علماء وفضلاء کا غلبہ تھا لیکن اس کے بعد سے تاحال شیعی مفکروں اور عالموں کی گرفت رہی ہے۔ نویں صدی ہجری ہی میں ترکی سلطنت کے نام نہاد خلیفہ سلیم اول نے ایران پر یکایک حملہ کردیا تھا جس میں ستر ہزار شیعہ کام آئے تھے۔ (۵۰) تاہم وہ شیعی ایران یا شیعی افکار کا قلع قمع نہ کرسکا۔

۲۔ برصغیر پاک وہند میں شیعیت کا نفوذ وعروج

(الف) سندھ وپنجاب میں شیعیت: علامہ ابن اثیر اور علامہ بلاذری کے مطابق :۔ سندھ قدیم میں حضرت علیؓ کے عہد خلافت ہی میں شیعیت داخل ہوچکی تھی۔ (۵۱) اس عہد کا سندھ بڑے وسیع وعریض علاقوں پر مشتمل تھا اس کا دارالحکومت اروڑیا الور تھا جو موجودہ روہڑی کے نزدیک واقع تھا۔ اس زمانے میں بھی سندھ کے بعض علاقوں میں مسلمان اور شیعہ موجود تھے۔ خلیفۂ ثانی کے عہد میں سندھ وہند کے مقامات تھانہ (نزد بمبئی)، بروچ (نزد گجرات) اور دیبل (نزد ٹھٹھہ) پر تجارتی مفاد میں مسلمانوں کے حملے ہوچکے تھے۔ (۵۲) اس لئے زیادہ قرین فہم یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ سندھ پر محمد بن قاسم کی فوج کشی کی اصل وجہ مسلمانوں کی کشتیوں کو لوٹنا اور ان پر سوار مسلمانوں کو قیدی بنانا نہ تھی بلکہ راجہ داہر کا حکومت کے باغیوں

کی سرکوبی یا واپسی سے انکار تھا جیسا کہ حجاج بن یوسف کے خط بنام محمد بن قاسم سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ "باغیوں کو معافی دینے کی تمہاری روش حکومت کے مفاد کے خلاف ہے۔ تمہیں لازم ہے کہ ایسا رویہ اختیار کرو کہ سندھ میں "صحیح عقیدہ" کے سوا کوئی زندہ نہ رہے" (۵۳) صحیح عقیدہ سے مراد ناصبی عقیدہ ہی ہو سکتا تھا۔ لہذا راجہ داہر پر فوج کشی کا اصل محرک سادات اور شیعوں کا صفایا تھا۔ محمد بن قاسم کو بعض باغیوں کو فرار کا موقع دینے پر معزول کیا گیا اور ۹۶ ھ میں واسط کے اذیت خانے میں قید کرکے قتل کر دیا گیا۔

ملتان کی تباہی کے بعد بہت سے اسمٰعیلی سردار اور سادات نے زیریں سندھ کو ہجرت کی اور روہڑی سے ساحل دیبل تک سومریوں کا اقتدار قائم ہوا پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی ہجری کے وسط تک برقرار رہا غالباً اسی زمانے میں ٹھٹھہ ایک عظیم شہر وجود میں آیا تھا۔ "اس میں رضوی سادات کا ایک بہت بڑا محلہ واقع تھا۔" (۵۴)

ہند میں مسلم اقتدار کا اصل بانی سلطان شہاب الدین محمد غوری تھا۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں اس نے سندھ اور شمالی ہند پر مسلم اقتدار قائم کیا جس کے باعث سلاطین غلامان وخلجی کی حکمرانی شروع ہوئی "اس زمانے میں دہلی میں ایک "محلہ علویہ" آباد تھا اور ملک کے مختلف گوشوں میں شیعوں کی بستیاں تھیں" (۵۵) ساتویں صدی ہجری میں ایران وعراق وغیرہ سے بہت سے مسلمانوں نے ہند کا رخ کیا۔ ان میں سادات اور شیعہ بھی تھے جو علم وفن کے آفتاب ومہتاب تھے۔ بلبن کا دربار ان نامور مہاجرین سے بھر گیا تھا۔ "شمالی ہند میں علاء الدین خلجی کے عہد میں سادات کی متعدد بستیاں موجود تھیں ان میں پانی پت، بجنور، بلند شہر، بدایوں،

کرہ اودھ اور بیانہ کو بڑی فوقیت حاصل تھی ۔ (۵۶) واضح رہے کہ بیانہ میں ساوادت کی بستی یورش تاتار سے بہت قبل ۴۳۲ ھ میں وجود میں آچکی تھی ۔ اس کے نواح میں پہرسر اور ہیلک میں سادات کی بستیاں قائم ہو چکی تھیں ۔

(ب) کشمیر و شمالی علاقہ جات میں شیعیت

اس علاقے میں ارتقائے تشیع کے ضمن میں میر سید علی ہمدانی کا نام نامی ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان کے لئے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

سید السادات سالار عجم

دست او معیار تقدیر امم

آپ کے ہمراہ سات سو سید کشمیر میں وارد ہوئے تھے یہ ۱۳۷۲ عیسوی کی بات ہے۔ آپ زبردست عالم و مصنف تھے۔ آپ کے فرزند سید محمد ہمدانی کے ہمراہ بھی تین سو سید زادے آئے تھے۔ " انہوں نے ۳۷۰۰۰ ہندوؤں اور بدھوں کو مسلمان بنایا تھا۔ " (۶۳) ان سے قبل سید عبدالرحمن عرف بلبل شاہ مع ایک ہزار مسلمانوں کے ترکستان سے کشمیر آئے تھے۔ آپ کی مساعی سے دس ہزار مسلمان ہوگئے۔ ۱۴۸۰ء میں گیلان سے میر شمس الدین عراقی تشریف لائے جن کے ہمراہ بھی بہت سے مبلغ اور صوفی تھے۔ " آپ امام موسیٰ کاظمؑ کی نسل میں تھے اور نور بخشی سلسلہ تصوف سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی کوششوں سے بہت بڑی تعداد میں مقامی لوگ مسلمان اور شیعہ ہوگئے ۔ آپ کو کشمیر میں شیعیت کا بہت اہم اور مضبوط ستون مانا گیا ہے۔ " (۶۴) میر سید علی ہمدانی کے شاگرد رشید خواجہ اسحٰق قطلانی کے شاگرد سید محمد نور بخش ہوئے جو ادبیات و علوم سائنس میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور بڑے متقی بھی تھے ان کے فرزند شاہ قاسم فیض بخش نے کھل کر " علیؑ ولی اللہ "

کی تبلیغ کی ۔ سبزواری اور بیہقی سادات کی آمد نے شیعیت کے فروغ میں مزید مدد کی ۔ ۹۱۸ ھ میں مرزا حیدر طلقلات نے کشمیر میں سادات اور شیعوں کا زبردست قتل عام کروایا اور میر شمس الدین عراقی کی مشہور تصنیف • فقہ احوت • کو دربار اکبری کے سنی علماء سے فتویٰ حاصل کر کے نذر آتش کردیا۔ بہت سے لوگوں نے جان بچانے کی خاطر تقیہ اختیار کر لیا۔ • دولت حلب کے فرمان کے تحت مساجد میں آئمہ اثنا عشر کا خطبہ پھر پڑھا جانے لگا جب کہ اس سے قبل ان کا نام لینا بھی جرم تھا • (۵۹) ۱۵۸۵ عیسوی میں کشمیر پر فوج کشی کے لئے شہنشاہ اکبر نے بھگوان داس کو مقرر کیا۔ حملہ آور فوج کی رہنمائی مقامی سنی عالم شیخ یعقوب صرفی نے کی ۔ اکبر نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور یوسف شاہ کو قید کرلیا کشمیریوں نے اس کے بیٹے یعقوب شاہ کو حاکم بنالیا جس نے اذان میں • علیٔ ولی اللہ • کے الفاظ کو پھر شامل کرنے کا حکم دیا جس کو قاضی موسیٰ نے ماننے سے انکار کردیا • اس پر متعدد سنی علماء وفقہاء نے فتویٰ دیا کہ • علیٔ ولی اللہ • کہنے میں کوئی شرعی لغزش نہیں ہے۔ حضرت علیٔ فقط ولی ہی نہیں بلکہ اولیائے کرام کے بادشاہ ہیں • (۶۰) راجہ مان سنگھ کی موت عاشورہ محرم ۱۰۰۱ ہجری مطابق اکتوبر ۱۵۹۲ء کو ہوئی • اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی موت امام حسینؑ کی شہادت کے دن واقع ہوگی لہذا اس روز اس کی موت کا غم نہ منایا جائے۔ • (۶۱) شہنشاہ اکبر نے لاہور میں عدل گستری میں سنگین بدعنوانیوں کی شکایات کے ازالے کی غرض سے حضرت قاضی نوراللہ شوستری کو لاہور کا قاضی القضات (چیف جسٹس) مقرر کر دیا تھا اس نے موصوف کو کشمیر میں مالی بے قاعدگیوں کی تحقیقات کے لئے ۱۵۹۱ء میں مامور کیا۔ آپ نے اپنے مشاہدات رقم کرتے ہوئے لکھا کہ کشمیری فوج کے زیادہ تر سپاہی شیعہ ہیں ، سری نگر ، احسن آباد جدی بل کی اکثریت شیعہ ہے۔ بلتستان کے حاکم ، فوجی اور کاشتکار سب شیعہ

ہیں جب کہ لداخ میں غالی شیعوں کی اکثریت ہے۔ ان تمام علاقوں میں خطبہ جمعہ میں آئمہ اثنا عشر کا نام لیا جاتا ہے " (۶۲) میر سید علی ہمدانی اور میر شمس الدین عراقی نے کشمیر میں تشیع کی اتنی گہری اور مضبوط بنیاد رکھ دی تھی کہ بعد کی کوئی بھی مخالف طاقت اس کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

(پ) سلاطین مغلیہ کے عہد میں شیعیت : ایران کے شاہ اسمعیل صفوی نے ظہیر الدین بابر کو اور شاہ طہماسپ صفوی نے نصیر الدین ہمایوں کو فوجی مدد دی تھی جس کے نتیجے میں بابر نے افغانستان میں اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کیا اور بابر وہمایوں کو ہند میں مغل سلطنت کے قیام کا موقع ملا۔ بابر نے شاہ صفوی سے اقرار کیا تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ آئمہ اثنا عشر کے نام کا خطبہ پڑھوائے گا اور سکوں پر ان کے اسمائے پاک کندہ کروائے گا لیکن اس نے بدعہدی کی اور ماوراء النہر کے متعصب سنیوں کے دباؤ کے باعث وعدے سے منحرف ہوگیا۔ بابر کی غداری کے تحت ایرانیوں (قزلباشوں) کو جنگ غزدوان میں ازبکوں کے ہاتھوں سخت ہزیمت اٹھانا پڑی ۔ ملا بدایونی لکھتا ہے کہ " بابر نے رد شیعیت میں اور شاہ صفوی سے بیزاری کے ضمن میں کچھ اشعار پڑھے اور عین وقت جنگ اپنی فوج کو محاذ سے الگ کرلیا جس کے باعث قزلباشوں کا شدید جانی نقصان ہوا۔ " (۶۳) ۹۳۷ھ میں ہمایوں بادشاہ ہند بنا۔ اس پر صوفی سلسلہ شطاریہ کا گہرا اثر تھا اور وہ شیعی مخالف رجحان رکھتا تھا۔ ۹۴۷ھ میں اس نے شیر شاہ سوری سے شکست کھائی جو خود بھی متعصب سنی حکمران تھا " وہ (سوری) چاہتا تھا کہ وہ اور عثمانی ترک مل کر اور دونوں طرف سے حملہ کرکے ایران کی شیعی (صفوی) سلطنت کا خاتمہ کردیں " (۶۴) ہمایوں نے شیر شاہ سے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کرکے روضہ امام رضا پر مشہد میں حاضری دی اور شاہ

طہماسپ سے فوجی امداد حاصل کی۔ "خراسان سے ہمایوں نے چودہ ہزار بہادر سپاہیوں اور افسروں کو بھرتی کیا یہ سب سادات اور شیعہ تھے ان کا کمانڈر ابو حلیم زیدی کو مقرر کیا۔ اس کا نام ہاشمی رسالہ رکھا۔ اس رسالے نے ہمایوں کے دوبارہ حصول اقتدار میں فعال کردار ادا کیا تھا" (۶۵) اکبر اعظم کی آزاد روی کی پالیسی سے بہت قبل سید راجو بخاری کی شیعی افکار کی تبلیغ نے سندھ، بلوچستان اور ملتان کے علاقوں کو متاثر کیا تھا۔ آپ نے تقیہ کی مخالفت کی۔ ہمایوں نے آپ کا استقبال کرنا چاہا مگر متعصب سنی علمائے دربار (ملا عبداللہ سلطانپوری اور شیخ عبدالنبی) نے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ یہ اقدام سنی عقیدے کے استحکام اور نئی مغلیہ سلطنت کے حق میں نہ ہوگا کہ ایک رافضی کو عزت دی جائے۔" انہوں نے سنی عقیدے کو استحکام سلطنت سے مشروط کردیا جو اپنے طرز کے سنی عقیدے کے خلاف سخت انتقامی کاروائیاں کروانے کے عادی تھے۔" (۶۶) یہ دونوں سنی علمائے دربار (مخدوم الملک اور صدرالصدور) عہد اکبری میں متعصب ہونے کے علاوہ سازشی، دنیادار اور دولت پرست بھی تھے۔" کیونکہ جب بادشاہ اکبر اور بیرام خان کے تحت مغل افواج ہیمو سے لڑنے کو روانہ ہوئیں تو مخدوم الملک نے سکندر کو غدارانہ خطوط لکھے۔ اس کی ریشہ دوانیاں ثابت ہونے پر حاجی محمد خان سیستانی نے اس کو مقید کردیا اور اس سے اگلوا کر وہ سونے کی اینٹیں برآمد کرلیں جو اس نے مردے دفنانے کے بہانے صحن میں دفن کی ہوئی تھیں" (۶۷) بیرم خان کے اقتدار کے خاتمہ اور سنی علمائے دربار کے اثرورسوخ میں اضافے کے باوجود شیعوں کی آمد جاری رہی جس کو روکنے کے لئے اس نے شیعوں کے قتل وغارتگری کی مہم چلائی۔ ملا بدایونی لکھتا ہے کہ "مخدوم الملک کٹر سنی تھا اور مغل سلطنت میں سنی فقہ کے نفاذ میں سخت کوشاں تھا۔ اس کی جدوجہد نے بہت سے ملاحدہ اور رافضیوں کو جہنم کی طرف

ڈھکیل دیا" (۹۸) ۱۵۷۰ء میں میر حبش تربتی کو جو شیعی قاضی تھے ، ان دونوں سنی علماء نے بلا جواز اکبر کو ورغلا کر قتل کروادیا۔ کچھ عرصہ بعد جب مخدوم الملک کی صدرالصدور سے ناچاقی ہو گئی تو اس سازش کا بھانڈا پھوٹا۔ ملا بدایونی کے مطابق " مخدوم الملک نے انکشاف کیا کہ صدرالصدور ملا عبدالنبی نے قاضی میر حبش تربتی کو ناحق قتل کروایا تھا " (۹۹) شیخ مبارک اور یوالفضل وفیضی جیسے لوگ بھی ان کی متعصبانہ کاروائیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کیونکہ یہ حضرات مظلوموں اور بے گناہوں کے مددگار تھے۔ ان ملاؤں کے مذہبی عقیدے میں ہندو تو رہ سکتا تھا مگر محبان اہلبیت کو زندہ رہنے کا حق نہ تھا شہنشاہ اکبر جیسے آزاد خیال حکمران سے شروع میں انہوں نے لاتعداد شیعوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ لیکن ناحق خون رنگ لایا اور اکبر اعظم کی ذہنی تبدیلی کے باعث مذہبی پالیسی میں بھی تبدیلی آئی ۔ چنانچہ اس نے عام رواداری کے عملی نفاذ کے لئے جو بورڈ تشکیل دیا اس میں تین اہم شیعہ دانشور شامل تھے یعنی حکیم ابوالفتح گیلانی ، حکیم ہمام اور حکیم سید علی ــــــ یہ سب کھلے ہوئے شیعہ تھے۔ عہد اکبری میں شیعی علماء و فقہاء ، دانشوروں اور سائنس دانوں کا جمگھٹا لگ گیا تھا۔ ان میں حضرت قاضی نور اللہ شوستری اور علامہ فتح اللہ شیرازی ممتاز تھے۔ ۱۵۸۲ء میں عبدالعظیم نقشبندی کی وفات پر اکبر اعظم نے علامہ فتح اللہ شیرازی کو صدرالصدور کے منصب جلیلہ پر فائز کیا۔ آپ اس صدی کے سب سے بڑے دانشور ، سائنس دان ، انجینئر اور بلند پایہ عالم تھے۔ آپ دربار اکبری میں بڑی بے خوفی اور آزادی کے ساتھ اپنے شیعی عقائد اور نظریات پر عمل کرتے تھے۔ ملا بدایونی رقم طراز ہے کہ " فتح پور سیکری میں دیوان خاص میں کسی اور کو یہ جرأت نہ تھی کہ اپنے طرز پر عبادت کرسکے۔ فتح اللہ شیرازی وہ واحد فرد تھے جو اپنی عبادت امامیہ طریقے سے نہایت بے باکی سے باجماعت ادا کیا کرتے تھے "

(۷۰) آپ نے فولڈنگ توپ ایجاد کی تھی جو پہاڑوں پر ٹکڑے کر کے لے جائی جا سکتی تھی ۔ آپ نے ایسی بندوق بنائی تھی جو بیک وقت بارہ گولیاں داغ سکتی تھی ۔ آپ کے بارے میں اکبر اعظم نے کہا کہ " اگر فتح اللہ شیرازی فرنگیوں کے ہتھے چڑھ جائیں اور میں اپنا سارا خزانہ اس کی بازیابی میں دے دوں تو یہ سودا مہنگا نہ ہوگا ۔" ابوالفضل نے لکھا کہ " اگر علوم قدیم کی تمام مستند کتابیں معدوم ہوجائیں تو فتح اللہ شیرازی ان کو دوبارہ (حافظہ کی مدد سے) لکھ سکتے ہیں ۔" ملا بدایونی نے آپ کو فرشتہ تسلیم کیا اور فیضی نے آپ کی وفات پر مرثیہ کہا ۔" (۷۱) آپ کا تعلق سادات جعفری سے تھا پرگنہ بھوساور نزد متفرالخلافہ اکبر آباد جاگیر میں عطا ہوا آپ کے اخلاف بھوساور کے بعد آگرہ میں آباد ہوئے

ہند میں سارے اسلامی عہد کی اہم ترین اور قابل ترین شخصیت حضرت قاضی نور اللہ شوستری کی تھی ۔ آپ بہت بڑے فقیہہ ، عالم اور مصنف تھے ۔ آپ کو ہند (آگرہ) میں تشریف آوری کی دعوت حکیم ابوالفتح گیلانی اور علامہ فتح اللہ شیرازی نے دی تھی آپ کی پاکیزگیٔ سیرت اور علمی فراست سے متاثر ہو کر اکبر اعظم نے آپ کو لاہور کا چیف جسٹس مقرر کردیا تھا تاکہ وہاں عدل گستری کی حالت زار کو سنوارا جاسکے ۔" آپ نے اپنے دوران قیام آگرہ ، اکبر کی ذہنی تبدیلی کا بھی اہتمام فرمایا اور پہلی مرتبہ دربار میں سرکاری طور پر محفل میلاد النبیؐ منعقد کروائی ۔" (۷۲) آپ نے بادشاہ سے یہ بات منوالی تھی کہ ان کا فیصلہ اہلسنت کے چاروں فقیہوں میں سے کسی ایک کے مطابق ہوگا تاہم آپ کا ہر فیصلہ / فتویٰ فقہ اہلبیتؑ کے عین مطابق ہوتا تھا اور اس کی مطابقت چاروں مکاتب فکر میں سے کسی ایک سے بھی ہوتی تھی ۔ یہ آپ کی علم فقہ میں گہرائی کی دلیل تھا ۔ آپ اعلیٰ پائے کے شاعر ، ادیب اور محقق بھی تھے ۔ آپ نے ریاضی ، فلکیات اور طب

میں بھی کتابیں لکھیں۔ آپ کی مذہبی تصنیفات میں مشہور ترین " مجالس المومنین "، احقاق الحق اور مصائب النواصب تسلیم کی گئی ہیں۔ " مجالس المومنین نہ صرف ایک تاریخی خزانہ ہے بلکہ شیعی انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ " (۷۳) آپ کی علمی کاوشیں ہی آپ کی شہادت کا موجب بن گئیں کہ اب جہانگیر فرمانروائے ہند تھا جو خود بھی تنگ نظر تھا اور متعصب نقشبندی علمائے دربار کے نرغہ تنگ میں بھی گھرا ہوا تھا۔ سنی علماء وامرا نے سازش کرکے اور آپ کی بعض نگارشات کو توڑ موڑ کر آپ کی موت کا فتویٰ صادر کردیا اور جہانگیر سے توثیق حاصل کرکے آپ کو بڑی بیدردی کے ساتھ شہید کروا دیا۔ یہ ۱۶۱۰ء کا واقعہ ہے تاہم تحقیق جدید کے مطابق یہ حقیقت بھی ہے کہ اکبر اعظم نے قاضی صاحب کو علماء کو عطا کی گئی جاگیروں کے خاص استعمال کے مطلق تحقیقات کے لئے متعین کیا تھا۔ نتیجہ میں معلوم ہوا ان کی غالب ترین اکثریت ان کے ناجائز استعمال میں ملوث تھی (۷۴) حکومت کے جبر اور دھونس کے باوجود بعض ایرانی تاجروں اور جراٴتمند شیعیان آگرہ نے اس نابغۂ روزگار کو دفن کیا۔ " (۷۵) آپ شہید ثالث کہلاتے ہیں اور دیال باغ آگرہ کے قریب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ آپ کے مزار کی اولین تعمیر گورنر منصور موسوی نے ۱۱۸۸ھ میں کروائی تھی مومنین آگرہ و نواح کے تعاون سے پہرسر کے ڈپٹی کلکٹر سید علی نقی جعفری پہرسری نے ۱۲۹۰ھ میں ازسرنو تعمیر کرائی تھی ۔ اس کے بعد قابل ذکر اضافے سادات شاہگنج آگرہ کے سید محمد حسن بن میر ضامن علی نے کروائے (۷۶) آپ کا مزار مبارک شیعیان برصغیر کی عظیم زیارت گاہ ہے۔

(ج) دکنی ہند میں شیعیت

دکنی ہند میں ۱۳۴۷ء میں علاوالدین حسن بہمن شاہ نے بہمنی سلطنت کی اساس رکھی ۔ اس کے اجداد کا تعلق اصفہان سے تھا۔ بہمنی حکمرانوں نے

ایرانی ، ترکی اور عربی مسلمان سپاہیوں ، تاجروں اور دانشوروں کو یہاں آباد ہونے کی حوصلہ افزائی کی ۔ ان میں بہت سے شیعہ بھی تھے ۔یہاں شیعیت کا باضابطہ تعارف جناب فضل اللہ انجو سے ہوا جو سلطان محمد شاہ ثانی کے عہد میں شیراز سے آئے تھے ۔ ان کے توسط سے ایران سے شیعی دانشوروں اور علماء کی بڑی تعداد یہاں وارد ہوئی جس کے باعث دکن کے تعلیمی اداروں اور ثقافتی زندگی پر ایرانی اور فارسی کی چھاپ گہری ہو گئی ۔ (۷۷) سلطان تاج الدین فیروز شاہ کو ایران سے ہجرت کر کے آنے والے شیعی عالم ملا لطف الدین سبزواری نے شیعی نظریات کی طرف راغب کیا۔ سلطان ایران کے شاہ نعمت اللہ ولی سے بہت متاثر تھا جنہوں نے اس کو اپنی شاگردی کی پگڑی اور عصا بھیجے تھے۔ مورخ فرشتہ کے مطابق موصوف نے سلطان کو بارہ لڑیوں / کنگروں کا تاج بھی ارسال کیا تھا جو اثنا عشری شیعیت کی علامت تھا ۔ نعمت اللہی سلسلہ صوفیاء نے صفوی عہد کے ایران کو پرامن طور پر شیعی مملکت میں تبدیل کر دیا تاہم دکن میں یہ اجتماعی تبدیلی رونما نہ ہو سکی ۔ ۱۴۲۹ء میں سلطان احمد شاہ نے شیعی مسلک اختیار کیا ۔ بیدر میں اس کا مزار شیعیت کا کھلا اظہار ہے جس پر پنجتن پاک اور آئمہ اثنا عشر کے اسمائے پاک کندہ ہیں ۔ (۷۸) سلطان علاء الدین احمد ثانی کے عہد میں ایران سے خواجہ محمود گاواں یہاں تشریف لائے جو زبردست مدبر اور ذہین ترین فوجی کماندار تھے۔ علاء الدین کی وفات کے بعد آپ کو یہاں کی حکمرانی سنبھالنا پڑی انہوں نے دکھنیوں اور آفاقیوں (مقامی اور آبادکاروں) کے مابین طاقت کا توازن قائم رکھا۔ ان کے عہد میں بہمنی سلطنت اپنے عروج کو چھو رہی تھی ۔ اس نے بیدر میں کالج قائم کیا جو کتب خانہ ، تجربہ گاہ اور علم فلکیات کے آلات سے لیس تھا ۔ (۷۹) اس کے خلاف دکنیوں کی سازشیں ہوتی رہیں جن کے نتیجے میں اس کا زوال ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی عظیم بہمنی سلطنت کا

شیرازہ بکھر گیا اور اس کے بطن سے تین مملکتوں کا ظہور ہوا۔ یہ بیجا پور، گولکنڈہ اور احمد نگر تھیں۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ دکن کی یہ سلطنتیں اور ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی شیعی حکمرانی تقریباً ایک ہی عہد میں وجود میں آئیں۔ ان کے آپس کے تعلقات بڑے گہرے تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکھنی ہند میں مذہب شیعہ جڑ پکڑ گیا۔

بیجاپور ------ اس مملکت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا جو قم کی شیعی درسگاہ سے وابستگی رکھتا تھا۔ ۱۴۶۰ء میں وہ وارد دکن ہوا اور بہت جلد اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہو گیا۔ "اس نے سولہویں صدی کے بالکل آغاز پر اقتدار پر قابض ہوتے ہی شیعیت کو مملکت کا مذہب قرار دیدیا۔ نیز اذان میں "علیٰ ولی اللہ" اور خطبہ جمعہ میں آئمہ اثنا عشر کے ناموں کو شامل کر دیا۔ اس نے بیجاپور کو مسلم ممالک سے آنے والے دانشوروں اور فوجیوں کے لیئے جنت بنا دیا تھا۔" (۸۰) ابراہیم عادل شاہ نے حنفی فقہ کو نافذ کر دیا اور بہت بڑی تعداد میں غیر ملکی فوجیوں اور آفاقیوں کو برطرف کر دیا اور فارسی کی جگہ "ہنداوی" زبان کو جگہ دیدی۔ اس کے باوجود وہ مملکت تو کیا خود اپنے خاندان سے شیعیت کا خاتمہ نہ کر سکا۔ اس کا جانشین علی عادل شاہ کٹر شیعہ تھا۔ اس نے ہندو راجہ وجے نگر کے عزائم خاک میں ملا دیئے۔" اس نے جامع مساجد اور قلعوں کے علاوہ دو زبردست باغ بھی بنوائے جن کا نام باغ فدک اور باغ دوازدہ امام تھے۔" اس کے عہد میں شیعیت کا عروج ان شیعی مہاجر علماء فضلا کی بدولت ہوا جن کو میر غیاث الدین شیرازی اور شاہ فتح اللہ شیرازی نے خصوصی تربیت دی تھی۔ آخر الذکر کی دو سالہ معلمی نے افضال خان شیرازی کو عالم بنا دیا تھا جس نے اپنا ایک بڑا مدرسہ قائم کر لیا تھا۔" (۸۱) ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بہت سے شیعوں کو اعلیٰ عہدے دیئے ان میں مورخ فرشتہ کا سرپرست خواجہ سعد الدین عنایت اللہ تھا جو شاہنواز خان کے

نام سے مشہور ہوا۔ اس نے اپنی اعلیٰ انجینئرنگ کے باعث ایک نیا اور عظیم شہر " نورس پور " تعمیر کیا۔ اس نے شیعیت کے فروغ کے لئے ماحول کو مزید سازگار بنایا۔ " علی عادل شاہ ثانی نے باقاعدہ تشیع کی تعلیم پائی تھی ۔ اس نے سکوں پر " غلام حیدر صفدر " کے الفاظ کندہ کروائے تھے ۔ " (۸۲) ۱۶۳۶ء میں اورنگ زیب (جو اس وقت دکن میں مغل وائسرائے تھا) نے سلطان بیجاپور اور مغل شہنشاہ شاہجہاں کے مابین طے پایا جانے والا معاہدہ ۱۶۳۶ء کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیجاپور پر فوج کشی کردی اور بھاری رقوم اور مراعات حاصل کرکے وقتی طور پر جان بخشی کردی تاہم ۱۶۸۶ء میں " اپنے عہد شاہی میں اس نے شیعی ریاست کا خاتمہ کردیا اور مغل سلطنت میں ضم کرلیا۔ اس کے باعث بیجاپور کی خوشحالی معدوم ہوگئی ، اس کی فکری زندگی گہنا گئی اور محرم کے رسوم ورواج میں نمایاں کمی واقع ہوگئی ۔ " (۸۳)

احمد نگر ۔۔۔۔۔۔ ۱۴۹۰ء میں ملک احمد حسن باہری نے یہ آزاد مملکت قائم کی اور نظام شاہی خاندان کی بنیاد رکھی ۔ اس کے جانشین برہان نظام شاہ کے عہد میں ایران سے سادات خاوندیہ کے شاہ طاہر یہاں وارد ہوئے۔ آپ کی مساعی سے سلطان اور خاندان شاہی نے شیعی مسلک قبول کرلیا۔ مناظرہ میں سنی علماء کی شکست کے نتیجہ میں شیعیت کو ملک کا مذہب قرار دیدیا گیا انہوں نے یہاں مختلف مقامات سے شیعی دانشوروں کو اکٹھا کرلیا۔ غرباء اور مساکین کے طعام کے لئے ایک بہت بڑا لنگر خانہ قائم کیا گیا جس کا نام لنگر دوازدہ امام رکھا تھا۔ ۱۵۵۳ء میں حسین نظام شاہ نے آئمہ اثنا عشر کے ناموں کا خطبہ پڑھوایا۔ اس کے عہد میں شیعی دانشوروں کی کوششوں سے دکنی مسلم ریاستوں میں اتحاد فکر پیدا ہوا جس کے باعث خالی کوٹہ کے مقام پر شاندار فتح حاصل ہوئی ۔ مرتضی شاہ کے زمانے میں شیعیت کا فروغ دیدنی تھا۔ ۱۵۸۹ء میں برحان نظام شاہ ثانی حکمران ہوا۔ دکھنیوں اور حبشیوں نے

آفاقیوں کے قتل وغارتگری کی مہم چلائی اور سینکڑوں آبادکاروں کو ذبح کر ڈالا
ان حالات سے مغل شہنشاہ اکبر نے فائدہ اٹھاتے ہوئے برحان نظام شاہ
ثانی کو دوبارہ حصول اقتدار میں مدد دی اور مہدوی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔
تاہم آئندہ پچیس سال تک دکن میں حبشی حکومت وسیاست پر حاوی رہے۔
آخرکار ۱۶۳۶ء میں اس کو مغل شہنشاہ شاہجہاں نے مغل سلطنت میں ضم
کرلیا۔ • احمد نگر کے آخری چاروں حکمران شیعہ تھے لیکن اب یہاں امامیہ طرز
کی اذان اور خطبہ موقوف ہو چکا تھا۔ • (۸۴)

گولکنڈہ ----- قطب شاہی خاندان کے اقتدار کا بانی سلطان قلی تھا جو
ایران کے شیعی قبیلہ • قراقونولو • سے تعلق رکھتا تھا۔ سلطان شہاب الدین
محمود نے اس کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس کی فوجی کامیابیوں کے صلہ میں
اسکو امیر الامراء اور قطب الملک کے خطابات ملے۔ شاہ محمود کی وفات کے بعد
وہ خود حکمران بن گیا اور یوں قطب شاہی اقتدار کا بانی قرار پایا۔ اس نے
خطبے میں آئمہ اثنا عشر اور ایران کے صفوی فرمانروا کے نام پڑھوائے۔ اس
کے عہد میں بہت سے شیعی دانشور اور علماء ایران سے گولکنڈہ آئے۔ • اس
نے جو جامع مسجد تعمیر کروائی تھی اس کے بالا حصار دروازے پر شیعی کلمہ
مکمل طور پر کندہ تھا۔ جس میں علی ولی اللہ شامل تھا اس نے جو حیرت انگیز
حمام بنوائے تھے ان میں بالاحصار دروازے کے نزدیک شاہی حمام کے چوکور
چبوترے کے وسط سے پانی کی بارہ دھاریں نکلتی تھیں جو شیعی عقیدے کا
اظہار تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ بھی بنوایا تھا جس پر چہاردہ
معصومینؑ پر درود شریف کندہ تھی • (۸۵) اس کا جانشین جمشید ہوا جس کا
زمانہ شیعی افکار کے عروج کا عہد تھا۔ گولکنڈہ کے مشہور دروازوں کی تعمیر کی
فنی نگرانی میر مصطفیٰ اردستانی نے کی تھی جو بہت بڑے انجینئر تھے۔ • اس
کے کئی دروازے پر محمدؐ شہر علم ہیں اور علیؑ اس کا دروازہ ، اور ان کے اہلبیتؑ

جو علم نبوت اور اسلامی قیادت کے حامل ہیں ، کے اسمائے پاک کی برکت سے ، کے الفاظ کندہ تھے ۔ (۸۶) ۱۵۷۹ء میں اس کے سالار فوج میر شاہ تقی نے تمہ راجہ کے قلعہ ' کونا ڈویدو ' کو فتح کرنے میں اس وجہ سے کامیابی حاصل کی کہ اس نے حیدری اور حسینی توپوں سے گولہ باری کی تھی ۔ (۸۷) اس کے عہد میں ایران کے نامور شیعی علماء وفضلا نے گولکنڈہ کا رخ کیا اور شاہی کتب خانہ کو منتخب اور نایاب کتابوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کے مقبرہ کے گنبد پر بھی شیعی کلمہ کے علاوہ آنحضرتؐ کا یہ قول کندہ تھا کہ اے علیؑ ! تیرے شیعہ مرتے نہیں بلکہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ (۸۸) اس کے جانشین محمد قلی قطب شاہ نے نیا شہر ' بھاگ نگر ' بسایا تھا جو اب ' حیدر آباد دکن ' کہلاتا ہے۔ گولکنڈہ کی مغل شہنشاہ کے ہاتھوں تباہی وخاتمہ سے قبل قطب شاہی حکمرانوں نے ہندوستان میں شیعی فکر کی تاریخ کو ایک نیا رخ دیا اور دکن کی سماجی اور ثقافتی زندگی پر گہرے نقوش ثبت کئے اس کے روح رواں میر محمد مومن استرآبادی تھے جو گیلان سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ اس نے میر مومن کے مشورہ پر یہاں دریائے موسیٰ کے نزدیک ایک نیا شہر آباد کیا۔ اس کی تعمیر میں گنبدوں کے بجائے چہار مینار کی انفرادی خصوصیت تھی ۔ اس کے کلسوں پر علموں اور تعزیوں کو نمایاں حیثیت دی گئی تھی ۔ اس سے عزاداری میں شیعوں کی گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نے دہرے محرابوں کی ایک شاندار مسجد بھی بنوائی تھی جس سے پنجتن پاکؑ کی ہستیوں کا اظہار مقصود تھا۔ ۱۵۹۳ء میں گولکنڈہ میں ایک عظیم عاشور خانہ قائم ہوا جہاں ایام محرم میں مجالس عزاء منعقد ہوتی تھیں۔ سلطان قلی قطب شاہ نے قلعہ کے اندر بھی ایک عاشور خانہ بنوایا تھا جس میں ' حسینی علم ' نصب ہوتے تھے۔ ' حسینی علم کا کلس پنجہ کی شکل کا ہوتا تھا جس کے کناروں پر چہاردہ معصومینؑ کے اسمائے

گرامی لکھے ہوتے تھے۔ (۸۹) اس چہار مینار کی تعمیر سے قبل بھاگ نگر (حیدرآباد) میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور اس نے مضبوطی سے ڈیرے ڈال رکھے تھے اس سے نجات اس وقت ملی جب پورے شہر میں علم اور تابوت کا گشت کروایا گیا۔ (۹۰) میر مومن کی فنی مہارت کے باعث ایک عظیم قبرستان بنام "دائرہ" بھی تعمیر ہوا تھا۔ اس میں اسلامی ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے سادات، شیعوں اور صوفیوں کی ستر ہزار قبور تھیں جن میں عہد عالمگیری کا نامور دانشور نعمت خان عالی بھی تھا جو یہاں ۱۷۰۴ء میں دفن ہوا تھا۔ (۹۱) سلطان محمد قطب کا جانشین عبداللہ قطب شاہ ہوا۔ اورنگ زیب جو دکن میں مغل وائسرائے تھا، نے شاہجہاں کو اکسایا اور گولکنڈہ کی بے مثال خوشحالی اور دولت مندی کی طرف حرص و ہوس کے جذبات شاہی کو ابھارا تھا جس کا نتیجہ تھا کہ دولت و ثروت اور مبینہ رفض کے خلاف مغل افواج نے یکایک حملہ کر دیا حیدرآباد کو بری طرح لوٹا اور تباہ کیا گیا۔ یہ ۱۶۵۶ء کا واقعہ ہے اس وقت گولکنڈہ کو ایک ذیلی ریاست بنا دیا گیا تاہم اس کی مکمل تباہی اورنگزیب کے ہاتھوں ۱۶۸۷ء میں ہوئی۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مرزا فضل اللہ شیرازی نے ایک ہزار ایسی احادیث رسولؐ کی تدوین کی تھی جن سے شیعی افکار کی حقانیت ثابت ہوتی ہے۔ (۹۲) ۱۶۸۵ء میں ابوالحسن ناناشاہ کے عہد میں اورنگ زیب نے بیجاپور پر حملہ کر دیا اور ۱۶۸۷ء میں اس کا شیعی تشخص ختم کر کے اس کو مغل سلطنت میں ضم کر لیا۔ مغل سلطنت کے شیخ الاسلام نے جو سنی عالم تھے اورنگزیب کی بیجاپور اور گولکنڈہ پر فوج کشی کو غیر شرعی قرار دیا تھا۔ (۹۳) ابوالحسن ناناشاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اس کا انتقال ۱۷۰۰ء میں ہوا۔ وہ روحانی اقدار کا حامل تھا۔ اگرچہ فضول خرچ تھا تاہم اس کا خزانہ زر و جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ مغل فوج نے لوٹ مار کر کے جو دولت حاصل

کی وہ الگ تھی اور ناقابل تصور تھی۔" (۹۴) اس کے عہد میں کئی مرثیہ نگار موجود تھے یہ گولکنڈہ کا آخری شیعہ حکمران تھا۔

قطب شاہی اقتدار میں آبادی کے تمام طبقوں کے مابین ہم آہنگی اور دوستی تھی۔ اورنگزیب کی تنگ نظری نے دکن کی شیعی ریاستوں کا وجود ہی ختم نہیں کیا بلکہ دکن میں ہندو اور مرہٹہ قوت کا راستہ روکنے والی مسلم طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا جو آخر کار خود مغل سلطنت کے زوال اور تباہی کا باعث ثابت ہوئی۔ اس نے ۱۰۷۹ھ میں برہان پور کے جلوس تابوت پر پابندی لگا دی تھی جیسا کہ "منتخب اللباب" جلد ۲ میں لکھا ہے۔ اس نے مغل سلطنت کو مذہبی حکومت میں بدل دیا تھا۔ مولانا عبدالصمد صارم نے لکھا کہ "اورنگزیب کے تخت نشین ہوتے ہی اس گروہ (متعصب سنی علماء) نے حکومت میں موجود راجپوتوں اور شیعوں پر پوری طرح قابو پالیا۔ اورنگزیب کے فیصلوں میں اس گروہ کے نظریات جھلکتے تھے اس لئے ہندوؤں پر جزیہ لگا دیا گیا اور شیعوں کی طاقت کو توڑنے کی خصوصی مہم شروع کر دی گئی۔ نتیجتاً شیعہ مذہب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اس طرح اہل فکر مسلمانوں کی ایک جماعت کا امن و سکون چھین لیا گیا۔ اس کی سلطنت میں خدا کے بعض بندوں پر اس لئے بھروسہ نہ رہا کہ وہ ہندو اور شیعہ تھے۔" (۹۵) نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کا قول محکم ہے کہ "کوئی حکومت الحاد کی بنیاد پر تو قائم رہ سکتی ہے لیکن ظلم کی بنا پر برقرار نہیں رہ سکتی۔" اس لئے ۱۷۰۷ء کے بعد سے مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا اور ۱۸۵۷ء میں اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔ سادات ہیلک دیبانہ بھی اورنگزیب کی نگاہ عناد سے نہ بچ سکے تھے۔" ۱۷۰۵ء کے لگ بھگ اورنگزیب نے ان کے خلاف فوجی کاروائی کی تھی تاکہ تبدیلی عقیدہ پر مجبور کیا جاسکے۔ دونوں طرف کا بھاری جانی نقصان ہوا اسی اثناء میں مہاراجہ اودے پور اور جودھ پور نے

بغاوت کردی جس کے باعث یہاں کی مہم ادھوری رہ گئی تاہم رضوی سادات ہیلک دیبانہ نے نقل مکانی کا فیصلہ کرلیا اور شاگنج آگرہ و دیگر مقامات کو منتقل ہوگئے۔(۹۶) اس طرح شہزادہ گنج (شاہ گنج) آگرہ کے اس مرکز سادات کا ظہور ہوا جس نے تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

(۵) مغل سلطنت کا انحطاط اور شیعی ریاستیں

۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کا انتقال ہوا۔ اس کے عہد کی پچاس سالہ مدت کا تقریباً نصف حصہ دکن میں گذرا جہاں شیعی مملکتوں کے خلاف ہر قسم کی کاروائیاں کی گئیں۔ اس صورتحال کے باعث شمالی اور مشرقی ہندوستان میں مخالف قوتوں کو موقع مل گیا اور اقتدار پرستوں نے اپنی آزاد یا نیم آزاد ریاستوں کے قیام میں بڑی کامیابیاں حاصل کرلیں چنانچہ مغل سلطنت زوال، طوائف الملوکی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت دہلی پر بیٹھے مگر آپس کی خانہ جنگی، مذہبی تعصب اور نااہلی کے باعث عظیم سلطنت کے بخیئے ادھڑنے لگے یہاں تک کہ پچاس سالہ مدت کے اندر (اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک) میر محمد امین (سعادت خان) نے اودھ میں، نظام الملک (آصف جاہ) نے دکن میں، مرشد قلی خان، علی وردی خان نے بنگال وبہار میں آزاد و نیم آزاد مملکتوں کی بنیاد ڈالی۔ اسی صدی کی آخری دھائیوں میں حیدر علی نے میسور میں خود مختار ریاست قائم کرلی۔ حیدر علی کا جانشین سلطان فتح علی ٹیپو شہید تھا جس نے انگریزوں اور اس کے ہندوستانی اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے ان میں اکثر شیعہ تھے یا شیعی رجحان رکھتے تھے۔ ان کے عہد میں شیعیت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

بنگال میں ایرانی تاجر آقا محمد مختار نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے علی وردی خاں سے بہت سے پرگنوں میں زمین داری کے حقوق حاصل کئے اور خود بھی متعدد دیہات خریدے۔ موصوف نے المدینہ کربلا کا غم منانے کیلئے

زبردست بندوبست کیا اور بڑے بھاری اخراجات کے لئے بہت سے دیہات کی آمدنی وقف کردی ۔ ° (۹۷) حسینی دالان اور ہنگلی ٹرسٹ آئندہ چل کر قیام پاکستان کی بنیاد ثابت ہوا (۹۸) ۱۷۳۶ء میں نادر شاہ کے ایران پر قابض ہونے کی صورت میں بہت سے سادات اور شیعوں کو ایران سے ہجرت کرنا پڑی اور ملتان ، دہلی ، گجرات (مغربی ہند) ، اودھ اور بنگال کا رخ کرنا پڑا۔ کشمیر اور دہلی میں شیعوں کے خلاف سخت ہنگامہ آرائی ہوئی اور دہلی کے شیعی امراء کے خلاف بغاوت کے باعث صفدر جنگ کو اقتدار سے محروم ہو کر اودھ کا رخ کرنا پڑا۔ ° اس جنگ اقتدار کو اہلسنت کے علماء نے شیعوں کے خلاف جہاد قرار دیا تھا۔ ° (۹۹) جہاندار شاہ نے تخت دہلی پر قدم رکھتے ہی محرم کے جلوس علم پر پابندی لگا دی اور بہت سے شیعی امراء کو اعلیٰ عہدوں سے ہٹا دیا جو اودھ چلے گئے۔ شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو حملۂ دہلی کی تحریری دعوت دی تھی تاکہ دہلی اور نواح سے شیعوں کا مکمل صفایا ہوجائے۔ ۱۷۵۹ء میں اس نے پانچواں حملہ کیا اور ۱۷۶۱ء میں شمالی ہند میں مرہٹہ قوت کو توڑ دیا۔ ° مرہٹوں نے شجاع الدولہ (اودھ) کو تعاون کی پیشکش کی تھی لیکن آخرالذکر نے اسلامی اتحاد اور مسلم اقتدار کے مفاد کی خاطر اس کو ٹھکرا دیا تھا اور نجیب الدولہ (دھلی) کا ساتھ دیا تھا۔ ° (۱۰۰) اسی جنگ میں سورج مل جاٹ سادات آگرہ و نواح کے اثرات کے تحت مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ کر بھرتپور واپس ہوگیا پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد احمد شاہ ابدالی کی فوج نے ایک بار پھر دہلی کو تاراج کیا اور شجاع الدولہ کے ساتھ بھی تصادم اختیار کیا حالانکہ شجاع الدولہ مرہٹوں کا حمایتی نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے مطابق ° ابدالی کے حملے سے ایک سال قبل موصوف کے والد شاہ ولی اللہ نے پیشگوئی کی تھی کہ آئندہ سال دہلی میں کوئی رافضی (شیعہ) باقی نہیں رہے گا۔ ان کی پیشگوئی سچ ثابت ہوئی کہ احمد شاہ ابدالی نے ان سب کو ڈھ

ملیخ کر ڈالا۔ (۴۱) لہذا دہلی کی عمومی تباہی اور شیعوں کی غارتگری کی ذمہ داری شاہ ولی اللہ پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے ابدالی کو اس حملہ کی دعوت دی تھی۔ شرقی ہند میں علی وردی خان اور سراج الدولہ نے انگریزوں کو نکالنے کی بڑی جدوجہد کی لیکن ان کی مدد کو نہ احمد خان بنگش، نہ رحمت خان روہیلہ اور نہ نجیب الدولہ پہنچا۔ کیونکہ بنگال وبہار میں حقانیت اور قومی جنگ لڑنے والے شیعہ تھے۔ ۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کی مدد سے شاہ عالم ثانی دوبارہ تخت دہلی پر متمکن ہوا۔ اس کا وزیر مرزا نجف علی خان تھا جو عظیم شیعی جرنیل و منتظم تھا۔ اس نے اپنی سفارتکاری اور عسکری مہارت سے مرہٹوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اس نے رام گڑھ کو فتح کرکے اس کا نام حضرت علیؑ کے نام پر علی گڑھ رکھا جو آج تک اسی نام سے معروف ہے۔ اس نے جاٹوں اور مرہٹوں کو زبردست فوجی نقصانات پہنچائے۔ ۱۷۸۲ء میں اس کے انتقال سے مغل سلطنت کے دوبارہ ابھرنے کی امیدیں معدوم ہوگئیں۔ (۴۲) آگرہ میں اس کی نائب سلطنتی کے دوران شیعوں کو افغانی غلبے اور ظلم وستم سے نجات مل گئی تھی اور شیعیان آگرہ اپنی رسومات محرم کو پھر شدومد سے منانے لگے تھے۔ شاہ گنج آگرہ کی مجالس محرم میں وہ خود شریک ہوتا تھا اور اس کی طرف سے ایسے کارندے مقرر ہوتے تھے۔ جو دوران مجلس خندہ بیجا کرنے والوں کے دانت اکھاڑ دیتے تھے۔ (۴۳) شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور ان کے ہمنواؤں کی شیعہ دشمن روش اور جدوجہد کے باوجود تشیعیت کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ رک سکا۔ وہ شیعوں کو ہندوؤں جیسا ملحد وکافر قرار دیتے تھے اور ان سے کسی سماجی تعلق کے شدید مخالف تھے۔ تاہم اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک شیعی افکار کو اس قدر عروج ملا کہ میرٹھ، بلند شہر، بدایوں، سہارنپور اور دیوبند جیسے مقامات کے بہت سے سنی خاندانوں نے شیعی مسلک اختیار کرلیا تھا۔ یہ علاقے روہیلہ تسلط کے

تحت تھے اور تبدیلیٔ مذہب کرنے والے صدیقی، فاروقی اور عثمانی شیخ زادے ہی تھے۔ (۴۴)

اودھ کی شیعی مملکت کا اصل بانی میر محمد امین (سعادت خان) تھا۔ اس نے لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنا کر اودھ کی ہیئت ہی بدل ڈالی۔ اس نے سیدوں اور شیخ زادوں کو بتدریج آباد کرکے کئی نئی بستیاں اور شہر بسا دیئے اور بڑی تعداد میں سنیوں کو شیعی مسلک میں داخل کر دیا۔ اس طرح اودھ میں شیعی زمینداری اور آبادی وجود میں آگئی۔ (۴۵) اس نے فیض آباد کو مستقر بنایا۔ شجاع الدولہ نے اس کو ایک بڑا شیعی مرکز بنا دیا۔ یہ علاقہ پہلے ہی علم و فن کا ایسا مرکز بن گیا تھا کہ شاہجہاں بادشاہ نے اس کو شیراز کا ہم پلہ قرار دیا تھا۔ سعادت خان نے مقامی فوج تشکیل دی تھی جس میں سیدوں اور شیخوں کو مساوی عہدے دیئے۔ شجاع الدولہ نے فرخ آباد اور روہیلکھنڈ کو اودھ میں ضم کر لیا کیونکہ احمد خان بنگش اور رحمت خان نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شیعوں کے خلاف متعدد اقدامات کئے تھے۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دارالحکومت قرار دیا۔ لکھنؤ کا آصفیہ امام باڑہ اس کی عظیم یادگار ہے۔ اس کے وزیر حسن خان کی کوششوں کے باعث آصف الدولہ نے حاکم بغداد کو پانچ لاکھ روپیہ کی رقم ارسال کی تھی۔ تاکہ کوفہ سے نجف و کربلا تک نہر کھودی جاسکے۔ (۴۶) سعادت علی خان کے عہد کا اودھ خوشحال تھا۔ اس کے انتقال کے وقت شاہی خزانہ تقریباً چودہ ملین اسٹرلنگ کی مالیت کا موجود تھا۔ (۴۷) محرم کی مجالس عزاء اور رسومات غم بارہ محرم تک کے بجائے چہلم امام حسینؑ تک ہونے لگیں۔ ۱۸۱۹ء میں غازی الدین حیدر نے آزاد مملکت اودھ کا اعلان کر دیا۔ ناصر الدین حیدر نے لکھنؤ کالج، ہسپتال، تجربہ گاہ اور چھاپہ خانے بنوائے۔ ان سب حکمرانوں کے عہد میں بڑے امام باڑے تعمیر ہوئے جو فن

تعمیر کے اعلیٰ نمونے تھے۔ واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء میں حکمران ہوا جو شیعی اودھ کا آخری سلطان تھا۔ ۱۸۵۶ء میں نااہلی کا بے بنیاد الزام لگا کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ پر فوج کشی کردی اور تمام سابقہ معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اودھ کو ہڑپ کرلیا۔ واجد علی شاہ کو مٹیا برج (کلکتہ) میں جلاوطن کردیا گیا۔ اکثر مورخوں نے اسکی جو تصویر کشی کی ہے وہ قطعی تنگ نظری پر مبنی ہے اور حقیقت سے بہت دور بھی۔ " وہ اہل اور سمجھدار حکمران تھا اس کے عہد میں مالیہ کی وصولی اطمینان بخش تھی، مقامی صنعت وتجارت ترقی پذیر تھی اور لوگ مطمئن تھے۔" (۴۸) اس کی اہم ترین یادگار قیصر باغ اور امام باڑہ کا سمین ہیں۔

اودھ کے کسی بھی طبقے نے انگریزی حاکمیت کو قبول نہیں کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) سے قبل یہاں انگریز کے خلاف عام بغاوت برپا ہوگئی تھی۔ اس کی قیادت بیگم حضرت محل اور برجیس قدر نے کی تھی۔ نو ماہ کی شدید مزاحمت اور لڑائی کے بعد انگریز لکھنو پر قابض ہوسکا تھا۔ اودھ کے عوام اور فوج نے جس بہادری سے مقابلہ کیا اس کی تعریف خود انگریزی فوج کے جرنیل نے کی تھی۔ سرکولن کیمبل نے اعتراف کیا کہ " اس سے قبل ایسی بہادری اور جاں نثاری کا مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا" (۴۹) ایسی بہادری اور زبردست ایثار کے باوجود اودھ کو ہزیمت اٹھانا پڑی جس کی اصل وجہ مذہبی تعصب اور منافرت تھی جس کو ملا احمد اللہ نے ہوا دی تھی۔ مشہور سنی مورخ وعالم رئیس احمد جعفری ندوی نے لکھا کہ " غدر شروع ہوا تو فیض آباد جیل ٹوٹی اور مولانا احمد اللہ شاہ (جنہوں نے تعصب کی وجہ سے احمد علی کے بجائے خود کو احمد اللہ کہلوانا پسند کیا تھا) وارد لکھنو ہوئے۔ ملکہ حضرت محل نے ان کی پذیرائی کی ۔۔۔۔۔۔ اپنی رہائش گاہ پر وہ الگ دربار منعقد کرنے لگے۔ جنگ کی کمان بھی بڑی حد تک خود سنبھال لی۔ بیلی گارڈ

(ریزیڈنسی) پر حملے میں پیش پیش رہے۔ انگریزی سپاہ پسپا ہو رہی تھی اور مجاہدین کی فتح قریب تھی کہ بد قسمتی سے مولانا احمد اللہ شاہ اور ملکہ حضرت محل کے معتمد خاص ممو خان میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا جو دراصل اقتدار کی کشمکش پر مبنی تھا۔ لیکن بہت جلد یہ اختلاف شیعہ سنی تنازعہ میں بدل گیا یہاں تک کہ دونوں فریقوں میں جنگ چھڑ گئی اور سو سے زائد لوگ مارے گئے۔ سپاہیوں میں بھی بددلی پھیلی اور اودھ کی فوج تقسیم ہو گئی۔ ارباب اقتدار (مولانا احمد اللہ اور برجیس قدر) اپنی اپنی سوچنے لگے۔ یہ صورتحال انگریز کے حق میں گئی۔ " (۱۱۰) " ملا احمد اللہ شاہ نے فقط نفاق ہی کا تخم نہیں بویا بلکہ ہوس اقتدار میں اپنی بادشاہت کا بھی اعلان کر دیا۔ اودھ کے شہزادے سے بیعت بھی طلب کی جس کے باعث وہ ناراض ہو کر سندیلا چلا گیا۔ " (۱۱۱)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی دراصل اودھ پر ۱۸۵۶ء میں انگریزی فوج کشی سے شروع ہو گئی تھی۔ شمالی ہند میں مجاہدین آزادی اور انگریزی افواج کے مابین جو لڑائیاں واقع ہوئیں ان میں دو بڑی اہم اور فیصلہ کن جنگیں تھیں۔ ایک اودھ (لکھنو) میں اور دوسری آگرہ (شاہ گنج) میں۔ ان دونوں جنگوں میں شیعان اودھ اور سادات شاہ گنج آگرہ کا خصوصی کردار لائق توجہ ہے۔ جنگ شاہ گنج (آگرہ) کی خصوصیت یہ تھی کہ " انگریز فوج کو تین ماہ تک قلعہ آگرہ میں محصور ہو کر رہنا پڑا۔ اس جنگ کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ " اس کے نتیجے میں شاہ گنج کے اطراف کے ۵۶ محلے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئے۔ " جیسا کہ مرقع اکبر آباد مصنفہ سعید احمد مارہروی میں لکھا ہے اس جنگ کے ہیرو سادات شاہ گنج آگرہ کے سید محمد باقر عرف چندا زیدی، سید حسن رضا عرف بلندا، سید حسن علی، سید قادر علی اور سید مشرف علی تھے۔ اول الذکر دونوں کا تعلق خاندان سید گلزار علی ولد

حکمت علی سے تھا۔ درمیانی دونوں خاندان میر اکبر علی رسالدار (اکبر جام) کے افراد تھے اور آخر الذکر سید پورہ کے زیدی خاندان کے تھے جو شاہ گنج آگرہ میں آباد تھا۔ جنگ شاہ گنج آگرہ کا حوالہ متعدد تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان میں خدنگ غدر مصنفہ معین الدین حسن، محاربۂ عظیم مصنفہ کنہیالال، تاریخ آگرہ خان بہادر لطیف، اور سر آرتھر کانن ڈائل کا مشہور ناول "سائن آف فور ـــــ" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ فلپ وڈرف کی کتاب "وہ جنہوں نے انڈیا پر حکومت کی" جلد ۲ میں اس جنگ شاہ گنج آگرہ کی بابت لکھا ہے کہ "کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر بعض سچائیاں ایسی ہیں جن کا سو برس بعد بھی اظہار سیاسی مصلحتوں کے منافی ہے۔"

اودھ کے شیعی حکمران وسیع المشرب تھے۔ ان پر سنیوں کے خلاف اقدامات کا الزام قطعی بے وزن ہے۔ اگر انہوں نے شیعوں کو اپنے عقیدے پر عمل کرنے کی آزادی دی تھی تو سنیوں کی مذہبی تبلیغ میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ مجموعی طور پر سنیوں کے وظائف اور مالی امداد میں کوئی کمی نہیں کی تھی سنی علماء کی اشتعال انگیز تقاریر پر بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ "اودھ کے شیعی سلاطین کے عہد میں تمام اعلیٰ سرکاری عہدوں پر شیعی اور سنی عددی تناسب تقریباً مساوی تھا۔" (۱۱۹)

۳۔ انگریزی اقتدار سے قیام پاکستان تک کی تحاریک اور واقعات میں شیعی کردار

۱۸۵۷ء میں اپنی ہار اور انگریز کی جیت کے بعد مسلمانان ہند پر نہایت کڑا وقت پڑا۔ سینکڑوں مسلمانوں کو پھانسی دیدی گئی جن میں علماء فضلا اور دانشور شامل تھے۔ مسلمانوں کو باغی قرار دے کر ان کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط کرلیں گئیں اور ان کو اپنے حمایتیوں کو بخش دیا گیا۔

مسلمان حکمرانی سے غلامی کی سطح پر آگئے۔ انگریز نے ہندو نوازی کی پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں کے مفادات پر مسلسل ضرب لگانے کا رویہ اپنایا۔ مسلمان انتہائی کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ مسمانوں کی زبوں حالی کا اندازہ سرڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے اس جملے سے کیا جاسکتا ہے کہ " اب مسلمانوں کا تناسب پوری انتظامی مشنری میں 1/23 سے بھی کم ہے "(۱۱۷) یہ ۱۸۹۴ء کی بات تھی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بعض مسلمان دانشوروں نے رہنمائی کی ان میں بھی شیعی عنصر نمایاں تھا ان میں علامہ سید تفضل حسین ، مرزا ابو طالب اصفہانی ، میر محمد حسین ، مولانا نجم الدین علی خان اور سراج الدین علی موہانی بڑے ممتاز تھے۔ انہوں نے تنگ نظر اور رجعت پسند ملاؤں کے نظریات کو مسترد کرکے ایک ترقی پسند اور حقیقت شناس جماعت کی بنیاد رکھی جس کا مرکزی نکتہ مغربی تعلیم کا حصول اور برطانوی حکومت سے تعاون کا رویہ تھا جیسا کہ تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند ، جلد ۲ (انگریزی) میں درج ہے۔ کچھ عرصہ بعد یہی علی گڑھ تحریک قرار پائی ۔" اس کا دیوبند یا کسی اور مذہبی مرکز سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے روح رواں سر سید احمد خاں تھے۔ موصوف کو اس دور کے رجعت پرست سنی علماء نے کافر و ملحد اور واجب القتل قرار دیا تھا۔"(۱۱۵) مولانا حالی رقم طراز ہیں کہ " علمائے دیوبند نے سرسید کی شدید مخالفت کی اور علمائے حجاز سے فتویٰ حاصل کرکے آپ کو گردن زنی ٹھہرا دیا اور ان کے مدرسہ (علی گڑھ کالج) کو نیست و نابود کرنا مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔" (۱۱۶) علی گڑھ اور دیوبند دو قطعی مختلف مکاتب فکر تھے۔" یہ دونوں مخالف سمت میں بہنے والی دو نہریں تھیں ایک سے مسلم لیگ اور دوسری سے ہندو کانگریس سیراب ہوئی ۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کے حالات کے تحت علمائے دیوبند ہندوؤں کے ساتھ ایسے متحد ہوئے کہ پھر علیحدہ نہ ہوسکے۔ اپنے رجحانات میں ایک (دیوبند)

ہندستانی قومیت میں ضم ہوتا چلا گیا اور دوسرے (علی گڑھ) کا رخ مسلم علیحدگی پسندی کی طرف ہوگیا۔" (۱۱۷) علی گڑھ تحریک میں شیعوں کی شمولیت کی بنیادی وجہ اس کی غیر فرقہ وارانہ حیثیت ہی تھی ۔" یہ کوئی مذہبی تحریک نہ تھی اور نہ احیائے مذہب اسکا مطمع نظر تھا۔ اس کے باعث ہند میں مسلم قومیت کا آوازہ بلند ہوا۔ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ اور علاقائی اختلافات کے باوجود باہمی محبت اور قومی جذبے سے کام کرنے کا سبق ملا ۔" (۱۱۸) متعصب سنی علماء کا ایک گروہ سرسید کے خلاف صف آراء ہوگیا تاہم سرسید اور ان کے خاص شرکائے کار کی کامیاب سعی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ممکن ہو سکی ان میں شیعی زعماء نمایاں تھے۔ مؤرخ مرے ٹی ٹس لکھتا ہے کہ " سرسید کی بدولت ایک نئی صبح طلوع ہوئی ۔ یقیناً مسلمانان برصغیر آپ کے ہمیشہ مقروض رہیں گے کہ آپ کی سیاسی بصیرت نے ان کے لئے قومی راستہ متعین کردیا اور قومی شعور ابھار کر مسلمانوں کو وطن موعود پاکستان کی طرف رہنمائی کی ۔" (۱۱۹) سرسید کی علی گڑھ تحریک اور کالج کے سلسلے میں سادات شاہ گنج آگرہ کے میر تراب علی کا نام نامی نہایت نمایاں ہے۔ "آپ علیگڑھ کے فنڈ کمیٹی کے اہم رکن تھے اور آپ نے خطیر رقم کا نقد عطیہ دیا تھا آپ سرسید کے گہرے دوستوں میں تھے اور بجنور میں غدر کے وقت آپ تحصلدار تھے لیکن کسی مسلمان کو آپ نے نہ تو پھانسی کی سزا ہونے دی اور نہ کسی کی جائیداد ضبط ہونے دی " ۔ (۱۲۰) اس فنڈ کمیٹی کے چھ ارکان میں چار شیعہ تھے جن کا تعلق یوپی سے تھا۔ زبان کے جھگڑے میں انگریز کی ہندو نواز پالیسی کے باعث " اردو تحفظ جماعت " کا قیام عمل میں آیا اور بیسویں صدی عیسوی کے آغاز پر ایسے تین اہم مراکز قائم ہوئے جو علی گڑھ ، لکھنو اور لاہور تھے جن کے سربراہ شیعہ ہی تھے۔ صورتحال کی سنگینی نے مسلمان زعماء کو اپنی الگ سیاسی جماعت بنانے کی طرف راغب کیا اور

۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آگئی ۔ اس کے بانیوں میں مسلم لیگ کے اولین صدر، نائب صدر اور جنرل سیکرٹری تینوں شیعہ تھے۔ یہ سرسلطان محمد شاہ آغا خان اسمعیلی شیعہ، مہاراجہ محمد علی محمد خان آف محمود آباد اور میجر سید حسین بلگرامی تھے۔ (۱۲۱) ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی قائم ہو گئی جس کے قیام کی جدوجہد میں بھی شیعی توانائیاں ہی کام میں آئی تھیں۔ مہاراجہ محمود اباد کو پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ یہ صرف یونیورسٹی نہ تھی بلکہ مسلم نشاۃ ثانیہ کی نقیب تھی ۔ قائد اعظم نے اس کو اپنا اسلحہ خانہ قرار دیا تھا۔ تحریک پاکستان کی کامیابی میں بھی اس جامعہ کا بہت بڑا حصہ تھا۔ " اس کی ضد اور مقابلہ پر دہلی میں بعض قوم پرست (کانگریسی) مسلم زعماء نے جامعہ ملی قائم کی تھی جو بعد میں کانگریسی خیال مسلم طلباء واساتذہ کا مرکز بن گئی " (۱۲۲) علامہ اقبال کی دردمندانہ اپیل پر قائد اعظم محمد علی جناح نے لندن سے واپس اکر ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لی ۔ ۱۹۳۵ء میں وفاقی نظام متعارف ہو چکا تھا جو ہندوؤں کی عددی اکثریت کے حق میں تھا اس کو مسلم لیگ نے رد کر دیا۔ قائد اعظم نے اس کے رد میں بڑے وزنی دلائل دیئے تھے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد لاہور منظور ہوئی جو بعد میں قرارداد پاکستان کہلائی ۔ اس میں تقسیم ہند کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کو ہندو کانگریس اور برطانوی حکومت نے سنجیدگی سے نہ لیا اور مختلف اوقات میں مختلف اعتراضات کی زد پر رکھا۔ اس ضمن میں علامہ سید ابن حسن رضوی جارچوی کا قائد اعظم کے ساتھ مکالمہ لائق توجہ ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ " جب میں نے قائد اعظم سے ہندوؤں کے اعتراضات بیان کئے اور مطالبہ پاکستان پر گاندھی جی کا یہ قول بیان کیا کہ " کہیں مذہب بدلنے سے قوم بدلا کرتی ہے " تو آپ نے فرمایا کہ " میں نے ہندو ۔ مسلم مسئلہ کو گہرائی میں جا کر دیکھا اور قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ نظریات

اور عقائد کے بغیر لوگوں کی کوئی بھیڑ بھاڑ ایک قوم نہیں بن سکتی اس لئے ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ انگریز نہ مسلم لیگ کا حامی ہے اور نہ قیام پاکستان کے حق میں ہے کیونکہ انڈونیشیا سے مراکش تک ایک مربوط خطہ اس کے سیاسی مفاد کے تحت خلاف ہوگا۔" (۱۲۲) تقسیم ہند اور دو قومی نظریہ کی تجاویز ۱۹۴۰ء سے بہت قبل مسلم زعماء اور دیگر دانشوروں نے پیش کی تھیں۔" ۱۱۹۳ء میں سلطان محمد غوری نے پرتھوی راج سے جنگ ترائن کے موقع پر کیا تھا کہ سرہند، ملتان اور پنجاب کے علاقے میری عملداری میں اور باقی ماندہ ہندوستان تیری (پرتھوی راج) کے تحت الگ الگ مختص قرار دیدئے جائیں۔" (۱۲۳) یہ تقسیم ہند کی پہلی تجویز تھی جب کہ ابھی ہند میں مسلم اقتدار کا باضابطہ قیام بھی نہ ہوا تھا۔ اس کے کئی صدی بعد برطانوی پارلیمنٹ کے رکن جان برائٹ نے ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کو ایک برصغیر سے تعبیر کرتے ہوئے اس کو پانچ منطقوں میں تقسیم کرنے کی تجویز دی تھی کہ یہاں کئی قومیں آباد ہیں۔ علامہ اقبال کے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد میں شمالی مغربی ہند (موجودہ پاکستان) کو ایک الگ "مسلم ریاست" قرار دینے کی تجویز سے قبل بہت سے حضرات اس سلسلے میں اظہار خیال کرچکے تھے۔ تقسیم ہند کی بنیاد دو قومی نظریہ ہی تھا جس کی سرسید، جسٹس سید امیر علی اور مہاراجہ محمود آباد تبلیغ کرچکے تھے قائد اعظم نے اس کو بڑی مہارت سے اجاگر کیا۔" سرسید پہلے شخص تھے جنہوں نے کانگرس کے کھیل کو شروع ہی میں سمجھ لیا تھا اور اس کے اس دعویٰ کو رد کردیا تھا کہ کانگریس مسلمانان ہند کی نمائندگی کرتی ہے۔" (۱۲۵) مسلم لیگ کی مخالفت میں بہت سی مسلمان سیاسی اور مذہبی جماعتیں اور بڑے بڑے رہنما کانگریس کے ہمنوا تھے۔" ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ علامہ مشرقی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا عطا اللہ شاہ

بخاری اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نمایاں تھے۔" (۱۲۶) ۱۹۴۵ء کے عام انتخابات بڑے اہم اور فیصلہ کن ثابت ہوئے کہ مسلم لیگ نے ۹۸ فی صد ووٹ حاصل کر کے یہ دعویٰ منوالیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ برطانوی حکومت نے وزارتی مشن ہندوستان بھیجا جس نے طویل مذاکرات کے بعد مئی ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان پیش کیا جس میں قیام پاکستان کو رد کر دیا گیا اور گروپنگ اسکیم پر زور دیا گیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسکیم کو منظور کر لیا لیکن تھوڑے دن بعد ہی سے کانگریسی رہنماؤں نے اس کو سبوتاژ کرنے کی مہم چلائی اور اعلان کیا کہ وہ اس کو حرف آخر نہیں سمجھتے اور یہ کہ اس میں حسب منشا ترمیم کر لیں گے۔ لہٰذا مسلم لیگ نے اپنا سابقہ قبول کردہ منصوبہ واپس لے لیا اور مجلس دستور ساز میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ سیاسی بحران کے پیش نظر کانگریسی اور مسلم لیگی رہنماؤں کو دسمبر ۱۹۴۶ء میں لندن طلب کیا گیا۔ اپنی کانگریس نوازی کے باوجود برطانوی لیبر حکومت کو قائد اعظم کا موقف تسلیم کرنا پڑا۔ اوائل ۴۷ء میں کانگریسی لیڈروں کے ساتھ خفیہ پیغام رسانی کے نتیجہ میں یکایک وائسرائے لارڈ ویل کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مقرر کر دیا گیا یہ شخص نہرو کے قریبی دوستوں اور کانگریس کے ہمدردوں میں تھا۔ ۳ جون ۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا۔ جس کی منظوری کانگریس اور مسلم لیگ نے دی تھی لیکن ایک منصوبے کے تحت مسلم کش فسادات شروع کرا دیئے گئے اور اس طرح پرامن حصول پاکستان کو خون میں نہلا دیا گیا۔ اس میں وائسرائے پوری طرح ملوث تھا۔ تقسیم کا منصوبہ نہرو کی پیشگی منظوری کے بعد عمل میں لایا گیا۔ اس میں وی پی مینن نے اہم کردار ادا کیا جو کانگریس کا ایجنٹ تھا۔ اس نے انکشاف کیا "منصوبہ ثانی نے وہی شکل اختیار کی جو وہ سردار پٹیل سے تبادلہ خیال کے تحت طے کر چکا تھا۔" (۱۲۷) جولائی ۴۷ء میں

پارٹیشن کونسل قائم ہوئی جس نے ملازمین سے Option طلب کیا۔ ہندو پریس کے منفی پروپگنڈے کے توڑ کے لئے نامزد وزیر اعظم پاکستان (لیاقت علی خان) نے اخباری بیان کے ذریعے مسلم ملازمین سے پاکستان Opt کرنے کی اپیل کی اور یقین دلایا کہ ان کی ملازمت، شرائط ملازمت، حقوق شہریت اور جائیداد وغیرہ کا تحفظ کیا جائیگا۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد مملکت پاکستان کی پہلی مجلس دستور ساز میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم (جو گورنر جنرل بھی تھے اور مجلس دستور ساز کے صدر بھی) نے واضح اعلان کیا کہ نئی مملکت میں ہندو اور مسلمان سب برابر کے شہری حقوق کے حامل ہوں گے اور ریاست کو مذہب سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ (۴۸) ۱۵ اگست کی تقریر میں پاکستان طرز حکومت کے لئے اکبر اعظم کی مثال پیش کی گئی (۴۹) ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جو رمضان کی ۲۷ بھی تھی پاکستان کی آزاد ریاست دنیا کے سیاسی نقشہ پر ابھری۔ قائد اعظم اس کے پہلے گورنر جنرل اور لیاقت علی خان پہلے وزیر اعظم بنے۔ مملکت کا قیام بڑی بے سروسامانی میں ہوا تھا لیکن انتہائی ناساعد حالات میں بھارت سے Opt کرکے آنے والے سرکاری ملازمین نے بڑی لگن اور بے لوثی کے ساتھ خدمات انجام دیں اور مملکت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا۔ پاکستان میں داخل ہو کر بسنے والے مہاجرین کو قائد اعظم نے مملکت کا اثاثہ اور مہاجر ملازمین کو اس کا دماغ قرار دیا تھا۔ لیکن یہاں ان کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوا بلکہ ہنوز ہو رہا ہے اس کی دلخراش داستان کچھ اور ہے۔ گویا یہاں پاکستان بنانے والوں کی اولاد سے پاکستان کے قیام کا انتقام لیا جا رہا ہے۔ ویسا ہی انتقام جیسا بنی ہاشم اور اولاد علیؑ سے رسالت محمدیؐ کے استحکام اور غلبہ اسلام کے ضمن میں لیا گیا تھا۔ کہ فاتح مکہ کا خاندان مفتوح قوم کے افراد نظر آنے لگے تھے۔

حصول پاکستان مسلم لیگ کا کارنامہ ہے۔ جو قائد اعظم کی ولولہ

انگریز قیادت میں ممکن ہوا لیکن اب اس کا کریڈٹ وہ جماعتیں اور رہنما حاصل کرنے پر مصر ہیں جو نظریہ پاکستان، مسلم لیگ اور قائد اعظم کے سخت مخالف تھے۔ تحریک پاکستان میں شیعوں نے بھرپور حصہ لیا اور زبردست مالی مدد کی اور قیادت فراہم کی ۔ لیکن اب مخالفین پاکستان نے بانیان پاکستان کے مسلک پر ناروا حملے شروع کر دیئے ہیں تحریک پاکستان کی معتبر کتابیں مثلاً فاؤنڈیشن آف پاکستان شاہراہ پاکستان، حیات محمد علی جناح وغیرہ سب گواہ ہیں کہ تحریک پاکستان کا سارا مالی بوجھ راجہ محمود آباد، اصفہانی برادران اور سیٹھ محمد علی حبیب (حبیب بنیک والے) وغیرہ نے برداشت کیا۔ استحکام پاکستان میں آخرالذکر کا ناقابل فراموش مالیاتی احسان ہے۔ رئیس احمد جعفری ندوی نے لکھا ہے کہ "شیعوں نے من حیث القوم مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور حصول پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔" (۱۴۰) اس حقیقت سے کوئی کور چشم ہی انکار کر سکتا ہے کہ مسلم لیگ کی ساری جدوجہد سیاسی اور غیر مذہبی تھی اور اگر ایسا نہ تھا تو پھر مذہبی جماعتوں اور انکے رہنماؤں نے اس کی شدید مخالفت کیوں کی تھی ۔ اس لئے تحریک پاکستان کا رشتہ ماضی کے مذہبی رہنماؤں کی جدوجہد سے جوڑنا تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ تقسیم ہند سے قبل جو مذہبی پارٹیاں قائد اعظم کو کافر کہنے میں پیش پیش تھیں وہ قیام پاکستان کا بدلہ لینے میں لگ گئیں انہوں نے حالات سے فائدہ اٹھا کر قائد اعظم کے پاکستان پر خفیہ حملے شروع کر دیئے اور موقع ملتے ہی "قائد اعظم کے پاکستان کی سیاسی اساس کو ڈھا کر اپنی پسند کی مذہبی بنیاد فراہم کر دی ہے اس کو یہ حضرات نظریہ پاکستان کا نام دیتے ہیں۔" (۱۴۱) اس طرح انہوں نے قائد اعظم سے ۱۹۴۷ء کی اپنی شکست فاش کا بدلہ لے لیا ہے جیسا بعد رسالتمآب ابوسفیان اور اخلاف ابوسفیان نے کیا تھا۔

حوالہ جات

۱) تا ۳) تاریخ اسلام جلد اول صفحہ نمبر ۱۸۷ ۔ ۲۳ علامہ سید علی نقی
۴) اسلام کا عمرانی تصور (انگریزی خطبات ڈاکٹر علی شریعتی ۔ برکلے)
۵) تاریخ اسلام جلد اول علامہ سید علی نقی
۶) طبقات ابن سعد جلد اول ترجمہ صفحہ ۲۹۷ نفیس اکیڈمی کراچی طبع اول ۱۹۷۱ء
۷) اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول پروفیسر لطیف انصاری / سیرت النبیؐ جلد اول صفحہ نمبر ۴۲ پی اے ایف بک کلب کراچی
۸) طبقات ابن سعد جلد اول صفحہ نمبر ۱۷۱ ۔ ۱۷۶ / سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۳۹ / ۱۵۶ پی اے ایف بک کلب کراچی
۹) الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ ڈاکٹر طہٰ حسین مصری
۱۰) تا ۱۲) طبقات ابن سعد جلد اول صفحہ نمبر ۱۷۸ / سیرت النبیؐ جلد اول علامہ شبلی / اعلام الوریٰ علامہ طبری
۱۳) کتاب رسول اکرمؐ کا شانۂ نبوت میں ۔ علی اصغر چودھری مطبوعہ لاہور
۱۴) مدارج النبوتؐ / احیاء العلوم
۱۵) تاریخ مسلمانان عالم ۔ کے اے حمید
۱۶) صحیح بخاری جلد اول / صحیح مسلم جلد اول / سیرت ابن ہشام جلد اول
۱۷) لطائف اشرفی جلد اول ، اشرف جہانگیر سمنانی
۱۸) تا ۲۰) احسن المقال جلد اول (اردو ترجمہ)

۲۱) تا ۲۳) تاریخ اسلام جلد ۲ نجیب آبادی / احسن المقال جلد اول
۲۴) اسلام ان انڈیا اینڈ پاکستان ۔ مرے ٹی ٹس
۲۵) اصل اصول شیعہ
۲۶) منتخب کنزالعمال صفحہ نمبر ۹۲
۲۷) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند (انگریزی) جلد اول مطبوعہ آسٹریلیا ۔ ڈاکٹر اطہر عباس رضوی
۲۸) میزان الاعتدال / کتاب امام ابو حنیفہ از ابو زہرا مصری
۲۹) کتاب الانساب ۔ از سمنانی
۳۰) ابتداء و ترقئ شیعت (انگریزی) ڈاکٹر ایس ایم ایچ جعفری
۳۱) شہید انسانیت مطبوعہ لاہور
۳۲) تاریخ اسلام جلد ۲ نجیب آبادی
۳۳) کتاب اہل ذکر
۳۴) خلافت معاویہ و یزید ۔ حافظ علی بہادر خان
۳۵) تاریخ طبری جلد ۶ شہید انسانیت
۳۶) احسن المقال جلد اول
۳۷) فتوح البلدان / طبقات ناصری جلد ۱
۳۸) فتوح البلدان ۔ علامہ بلاذری
۳۹) مجالس المومنین ۔ علامہ قاضی نور اللہ شوستری
۴۰) ماہنامہ آئنہ لاہور شمارہ اگست ۱۹۶۱ء
۴۱) تاریخ سندھ ۔ قدوسی / تاریخ اسلام جلد ۲ نجیب آبادی
۴۲) تاریخ کامل / تاریخ سندھ معصومی / مقاتل الطالبین
۴۳) نزہت الخواطر ۔ عبدالحئ ندوی
۴۴) طبقات ناصری جلد اول / تاریخ یمینی

۴۵) احسان التقاسیم مطبوعہ لنڈن علامہ مقدسی

۴۶ ، ۴۷) تاریخ اسلام جلد ۲ ۔ نجیب آبادی

۴۸) ہمدرد ڈائجسٹ کراچی اکتوبر ۱۹۹۹ء مضمون کوثر چاندپوری

۴۹) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند (انگریزی) جلد ۲

۵۰) ہسٹری آف ترکی ۔ اسٹینلے لین پول

۵۱) تاریخ کامل / فتوح البلدان

۵۲) تاریخ سندھ ۔ قدوسی

۵۳) چچ نامہ (انگریزی) تاریخ سندھ قدوسی

۵۴) بی بی سی لندن کا خصوصی پروگرام ۔۔۔ شیر دریا جو ۸ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو نشر ہوا جس میں ڈاکٹر مبارک علی ٹھٹھوی کے حوالے سے سادات رضوی کے اس اہم محلے کا ذکر کیا گیا تھا۔

۵۵) مطلع انوار ۔ مولانا مرتضی حسین فاضل لکھنوی

۵۶) تاریخ فیروز شاہی ۔ مورخ برنی / رسالہ دانش اسلام آباد ۱۹۹۲ء

۵۷) کشمیر مسلمان کے تحت (انگریزی) مصنفہ پروفیسر محب الحسن

۵۸) کشمیر میں اشاعت اسلام ۔ سلیم خان گمی

۵۹) ۔ ۶۰) تاریخ کشمیر ۔ مورخ اعظمی

۶۱) بہارستان شاہی / اکبر نامہ

۶۲) مجالس المومنین ۔ علامہ شوستری

۶۳) ، ۶۴) منتخب التوارخ جلد اول ملا بدایونی

۶۵) لب التواریخ ۔ قاضی قزوینی / تاریخ کامل ۔ ابن اثیر

۶۶) مجالس المومنین ۔ علامہ شوستری

۶۷) منتخب التواریخ جلد اول ۔ بدایونی / اکبر نامہ / تذکرہ الواقعات

۶۸) منتخب التواریخ جلد سوم

۶۹) ، ۷۰) منتخب التواریخ جلد دوم بدایونی
۷۱) آئین اکبری / منتخب التواریخ جلد ۳ / مزار الشہدائے کشمیر۔ فوق
۷۲) تاریخ سیر المتاخرین
۷۳) تذکرہ مجید در احوال شہید / تجلیات فکر مطبوعہ محرم ۱۳۷۸ھ کراچی
۷۴) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند (انگریزی) جلد اول
۷۵) تاریخ سادات مومنین شاہ گنج آگرہ جلد ۲ قلمی مصنفہ داروغہ سید احترام علی رضوی
۷۶) تاریخ صوفیائے ہند مطبوعہ دہلی ۱۹۷۸ء
۷۷) سلطان بہمن شاہ کا مذہب ۔ از ہیگ
۷۸) کتاب محمود غازان (گاوان) از مورخ شیروانی
۷۹) ، ۸۰) تذکرۃ الملوک / ساطین السلاطین / تاریخ عادل شاہی
۸۱) تا ۸۳) تذکرہ الملوک / گلشن ابراہیمی / برہان المحاصر
۸۴) انشائے فیضی
۸۵) ، ۸۶) تاریخ محمد قطب شاہ / لینڈ مارک آف دکن
۸۷) تا ۸۹) تاریخ خاندان قطب شاہی / گلزار آصفی
۹۰) تاریخ حیدر آباد دکن مطبوعہ ادبی ٹرسٹ حیدر آباد ۱۹۷۸ء
۹۱) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند جلد ۲
۹۲) حدیقۃ السلاطین ۔ نظام الدین احمد
۹۳) حدیقۃ العالم ۔ از ابو تراب حیدر آباد دکن
۹۴) خاندان قطب شاہی کی تاریخ / شاہان مغلیہ کی مذہبی پالیسی از جے این سرکار
۹۵) کتاب مولانا عبید اللہ سندھی مطبوعہ لاہور ۱۹۹۱ء
۹۶) تاریخ بلدہ بیانہ / تجلیات فکر مطبعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ

۹۷) ، ۹۸) معاصر الامرا
۹۹) ، ۱۰۰) تاریخ عالمگیر جلد ۲ برٹش میوزیم / ملفوظات شاہ عبدالعزیز مطبوعہ میرٹھ ۱۸۵۷ء
۱۰۱) تفسیر المظہری جلد ۲ مطبوعہ دہلی
۱۰۲) مغل سلطنت کا زوال ۔ جے این سرکار
۱۰۳) تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ قلمی جلد ۲
۱۰۴) ملفوظات شاہ عبدالعزیز / تفسیر المظہری جلد ۲
۱۰۵) تاریخ سلاطین اودھ
۱۰۶) ، ۱۰۷) تاریخ شاہان اودھ / نزہت الخواطر / دی گارڈن آف انڈیا
۱۰۸) سوانحات سلاطین اودھ
۱۰۹) کنگ واجد علی شاہ آف اودھ جلد ۲ علی اظہر کراچی ۱۹۸۲ء
۱۱۰) واجد علی شاہ اور ان کا عہد مطبوعہ لاہور ۱۹۹۷ء
۱۱۱) لکھنو کا شاہی اسٹیج / عبدالحلیم شرر
۱۱۲) مرقع اکبرآباد سعید احمد مارہروی
۱۱۳) سوانحات سلاطین اودھ
۱۱۴) مسلمانان ہند مطبوعہ لندن ۱۸۶۸ء
۱۱۵) تحریک پاکستان اور قوم پرست مسلمان علما.
۱۱۶) حیات جاوید ۔ سر سید احمد خان
۱۱۷) دی ایولیوشن آف اسلامک کانسٹی ٹیوشن ۔ کمال احمد فاروقی
۱۱۸) رود کوثر ۔ شیخ محمد اکرام حنفی
۱۱۹) اسلام ہندوپاکستان میں (انگریزی) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۳ء
۱۲۰) تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار جلد ۲ مولفہ محمد وصی خان / بغاوت بجنور مولفہ سر سید احمد خان

۳۱) فاونڈیشن آف پاکستان ۔ شریف الدین پیرزادہ
۳۲) موج کوثر ۔ مولانا عبدالماجدؒ دریا بادی
۳۳) قائد اعظم کے ساتھ چند لمحات ۔ مضمون ماہنامہ الامیر کراچی بابت اکتوبر ۱۹۸۹ء (علامہ ابن حسن جارچوی)
۳۴) تاریخ فرشتہ مطبوعہ بمبئی جلد اول / فاونڈیشن آف پاکستان جلد ۲ صفحہ نمبر۱۵ فٹ نوٹ
۳۵) پاکستان منزل بہ منزل
۳۶) تاریخ مسلم لیگ / انڈیا ونز فریڈم / تحریک پاکستان اور قوم پرست (کانگریسی) مسلمان علماء
۳۷) پاکستان ۔ پرانا ملک نئی قوم (انگریزی)
۳۸) قائد اعظم کی تقاریر شائع کردہ حکومت پاکستان / روزنامہ ڈان کراچی مورخہ ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء
۳۹) قائد اعظم کی تقاریر شائع کردہ حکومت پاکستان / روزنامہ ڈان کراچی مورخہ ۱۵، اگست ۱۹۴۷ء
۴۰) حیات محمد علی جناح ۔۔۔ رئیس احمد جعفری ندوی
۴۱) جناح سے ضیاء تک (انگریزی) جسٹس محمد منیر

باب نمبر ۳

آگرہ اور نواح آگرہ میں سادات کی بستیاں

اس اصطلاح سے مراد سادات کی وہ تمام بستیاں اور آبادیاں ہیں جو مشرقی راجپوتانہ میں ریاست ہائے بھرتپور و دھولپور اور اضلاع متھرا و آگرہ میں واقع تھیں۔ ان بستیوں کے لئے جو فرامین شاہی عطا ہوئے ان میں صوبہ مستقر الخلافہ اکبر آباد (آگرہ) ہی تحریر ہے۔ آگرہ دور انگریزی میں بھی ایک عرصہ تک صوبہ رہا جس کے بعد ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (یوپی) موسوم ہوا اسی لئے اس وسیع علاقے کو ہم آگرہ و نواح آگرہ سے معنون کرتے اور اپنی عظیم برادری تصور کرتے ہیں۔ چونکہ نواح آگرہ یعنی مشرقی راجپوتانہ میں سادات کی یہ بستیاں صدیوں قبل وجود میں آئی تھیں اس لئے پہلے نواح آگرہ کی بستیوں کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔

راجپوتانہ / راجستھان

باب ۲ میں شیعیت کے فروغ کے زیر عنوان برصغیر میں سادات کی اہم بستیوں اور آبادیوں کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ مورخ ضیاء الدین برنی کے مطابق صحیح النسب سادات کی ان بستیوں میں بیانہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سادات کی اس بستی کو شمالی ہند میں اولین مرکز سادات شمار کیا گیا ہے بیانہ راجپوتانہ / راجستھان کی عسکری اور تجارتی شہ رگ کی حیثیت سے نہایت اہم مقام تھا۔ عہد قدیم سے راجپوتانہ ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن مشہور رہا ہے۔ یہ کبھی ایران کے نامور حکمران نوشیرواں عادل کی وسیع سلطنت میں شامل تھا۔ ساسانی فرمانرواؤں نے راجپوتوں کو راجستھان کے

مختلف علاقوں کی حکمرانی دیدی تھی ۔یہی راجپوتانہ کی وجہ تسمیہ ہوئی ۔ مورخ این ایم چاپیکر نے لکھا ہے کہ "پنجاب شہنشاہ دارا کی عظیم سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور ایرانی بادشاہوں کا اقتدار سندھ، کاٹھیاوار اور گجرات پر قائم تھا۔" (۲) ۲۲۶ عیسوی میں اردشیر نے ساسانی خاندان کی بنیاد رکھی تھی اور یزدگرد سوم اس کا آخری بادشاہ تھا جس نے ۶۳۲ عیسوی میں مسلمانوں سے شکست کھائی تھی ۔ مورخ مذکور کے مطابق "پائی کو لا کے تیسری صدی عیسوی کے پہلوی نقوش کی رو سے بہت سے ہندوستانی حکمرانوں نے جو ساسانی شہنشاہوں کے باج گزار تھے، شہنشاہ نارسی کی تاجپوشی میں خصوصی شرکت کی تھی ۔ شہنشاہ فیروز نے جو نوشیرواں عادل کا دادا تھا، ہند میں دوشہر تعمیر کروائے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں شہنشاہ بہرام گور نے قنوج کے مہاراجہ کی بیٹی سے شادی کی تھی ۔ ان کی نسل کو گردابلی راجپوت کہتے ہیں۔ اودے پور کے رانا حکمرانوں کے اجداد بھی ایرانی النسل اور ساسانیوں کی اولاد تھے۔ عہد ساسانی میں ایران کی ایک اہم بستی مغربی ہند میں موجود تھی ۔" (۳) یہ ہی وجہ تھی کہ اودے پور کے حکمراں خود کو نوشیرواں کی نسل سے منسوب کرتے تھے۔ نوشیرواں عادل کی ایک پوتی (ماہ بانو) رانا اودے پور کو بیاہی تھی جو چندر بھوگا کے نام سے معروف تھا۔ جیسا کہ قدیم تاریخ راجستھان

The Annals and Antiuities of Rajistan

میں کرنل جیمز ٹوڈ نے شری للتا پرشاد میرٹھی کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ پہلی صدی ہجری / ساتویں صدی عیسوی میں غالباً ۶۳ھ میں امام زین العابدینؑ نے المیہ کربلا کے بارے میں جو خط اپنی خالہ (ماہ بانو) کو لکھا تھا وہ اودے پور کے شاہی کتب خانے میں تقسیم ہند کے وقت تک موجود تھا۔ یہ مکتوب گرامی ہمارے ایک بزرگ سید آل سبطین رضوی نے خود ملاحظہ کیا

تھا جیسا کہ موصوف نے راقم السطور کو بتلایا تھا۔ امام چہارمؑ کی ایک زوجہ محترمہ بھی سندھی نژاد تھیں۔ فتح سندھ کے ضمن میں علامہ بلاذری کی فتوح البلدان علامہ ابن اثیر کی تاریخ کامل اور جارج زیدام مسیحی کی تاریخ تمدن اسلام میں درج ہے کہ " حضرت فضہؑ جو حضرت فاطمہ زہرا کی کنیز خاص تھیں ہند کے بادشاہ کی بیٹی تھیں۔ کتاب " نقوش راہ " مولفہ سید ہادی حسن مطبوعہ کراچی ۱۹۵۸ء کے مطابق ساسانی دور میں وادی سندھ عظیم ایرانی سلطنت کی باج گزار ریاست تھی ۔ بعض مورخین کی نگارشات کے مطابق سندھ کا برہمن آباد دراصل بہمن آباد تھا جس کی بنیاد ایرانی شہنشاہ بہمن دراز دست نے رکھی تھی ۔ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ سندھ اور ایران کے تعلقات قدیمی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سندھ کے ادب وزبان اور ثقافت وتمدن پہ ایران کی چھاپ نظر آتی ہے۔" اس طرح سندھ وراجپوتانہ بالعموم اور اودے پور بالخصوص ایرانی اثرات سے براہ راست متاثر رہا ہے۔ اسلام کے ابتدائی عہد ہی سے یہاں اسلام کا چرچا اور آلِ محمدؐ کا ذکر ہونا قرین فہم ہے کیونکہ راجپوتانہ قدیم خراسان کے نامور حکمران شنسب کے زیرنگیں تھا جس کو حضرت علیؑ نے پرچم اور فرمان حکمرانی عطا کیا تھا۔ شنسب اور اس کے جانشین آئمہ اہلبیتؑ کے محب اور مطیع تھے (۴) شاید اس علاقے (ہند قدیم) کے خانوادہ رسالت وامامت سے قریبی تعلق ہی تھا کہ امام حسینؑ نے میدان کربلا میں ہندوستان جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ (۵) ہند ہمیشہ سے سادات کرام کی پناہ گاہ اور مسلمان حکمرانوں کے ستائے ہوئے محبان اہلبیتؑ کے لئے جائے امن وامان رہا ہے۔ اسی لئے اسلامی ملکوں سے ترک سکونت کرنے والے سادات اور شیعیان علیؑ کا پہلی صدی ہجری سے صدیوں تک تانتا بندھا رہا ۔ جس قدر اسلام شیعیت اور خاص طور سے تعزیہ داری کو برصغیر میں فروغ حاصل ہوا کسی اور جگہ نہ ہوسکا۔

اسی راجپوتانہ میں متعدد آزاد و نیم آزاد مملکتیں واقع تھیں۔ ان میں اودے پور، جودھپور، بیکانیر، جیسلمیر، اور اجمیر کی راجپوت ریاستیں اہم اور قدیم تھیں۔ بعد میں ان ہی میں الور، جے پور، بھرتپور اور دھولپور کا اضافہ ہوا۔ امپریل گزٹ مرتبہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے مطابق ریاست بھرتپور راجپوتانہ کا حصہ تھی۔ ضلع آگرہ، ضلع متھرا اور ریاست بھرتپور کا درمیانی علاقہ برج بھاشا کا علاقہ کہلاتا تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کے عہد میں چورامن جاٹ نے موجودہ ریاست بھرتپور کے حکمران خاندان کی اساس رکھی۔ راجہ سورج مل نے اس کی علاقائی سرحدوں کو توسیع دی اور اسے جے پور، اجمیر اور الور کی حدود تک بڑھا دیا۔ ۱۷۹۵ء میں نواب نجف علی خاں نے ریاست کے گیارہ پرگنوں کی حکومت رنجیت سنگھ کو دیدی۔ مہاراجہ سندھیا نے مزید تین پرگنے عطا کردئے انگریزی اقتدار کے تحت گردونواح کے پانچ اضلاع انعام میں بخش دیئے گئے۔ اس طرح موجودہ ریاست بھرتپور وجود میں آگئی جس کے نتیجے میں سادات کی جاگیریں بھی اس کے دائرہ اختیار میں آگئیں۔ ۱۸۲۲ء سے ۱۹۴۵ء تک اکثر سادات کے تعلقات راجہ اور جاٹوں سے بڑی حد تک خوشگوار رہے۔ ۱۹۴۵ء کے عام انتخابات کے وقت سے تعلقات میں کشیدگی آگئی کیونکہ سادات کی غالب ترین اکثریت پاکستان کی حامی تھی۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں سردار بلدیو سنگھ کی صدارت میں ایک خصوصی کانفرنس کے نتیجے میں مسلمانوں کے قتل وغارتگری کا منصوبہ بنایا گیا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی اور قیام پاکستان کے ساتھ ہی کشت وخون کا بازار گرم کر دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء تک ریاست اور نواح میں واقع سادات کی تمام بستیاں اجڑ چکی تھیں جو لوگ بچ رہے تھے انہوں نے شاہ گنج آگرہ میں اپنے عزیزوں کے یہاں پناہ لی۔ نفسیاتی، سیاسی اور معاشی وجوہ کے باعث شاہ گنج آگرہ کی یہ عظیم بستی بھی تقریباً ویران ہو گئی اس لئے کہ خاص طور سے یہاں کے زیادہ تر افراد

ملازم پیشہ تھے لہذا انہوں نے پاکستان میں ملازمت کو ترجیح دی OPt کیا اور پاکستان آگئے۔ اس المناک صورت حال کا حوالہ جناب صبا اکبر آبادی نے اپنے مرثیہ " ہجرت " میں دیا ہے۔ قتل وغارتگری کی تفصیلات کے لئے ۳ جون ۱۹۴۷ء تا ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روزنامہ ڈان دہلی / کراچی کی اشاعتیں اور کتابچہ دی نیوناازیز مرتبہ وکیل اطہر حسین زیدی بھرتپوری میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

چونکہ متعلقہ سادات کی زیادہ تر بستیاں قبل از تقسیم ہند ریاست بھرتپور میں واقع تھیں اور کئی صدیوں قبل وجود میں آئی تھیں اس لئے ہم آگرہ کے بجائے نواح آگرہ سے اس تذکرہ کی ابتداء کرتے ہیں۔

ریاست بھرتپور

تقسیم برصغیر (۱۹۴۷ء) سے قبل مشرقی راجپوتانہ میں ۲۶۰۴۳ ، ۲۷۰۲۹ عرض البلد اور ۷۷۰۵۳ اور ۷۷۰۳۸ طول البلد کے درمیان ریاست بھرتپور واقع تھی۔ اس کے شمال میں گوڑگاؤں ، جنوب میں ریاست دھول پور اور ریاست قرولی ، مشرق میں ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے اضلاع متھرا اور آگرہ اور مغرب میں ریاست جے پور اور ریاست الور واقع تھیں۔ اس کی شمال سے جنوب تک لمبائی ۷۷ میل اور مشرق سے مغرب تک چوڑائی ۹۳ میل تھی۔ اس کا کل رقبہ ۱۹۷۴ مربع میل تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس کی آبادی ۶۴۵۵۴۰ نفوس پر مشتمل تھی جن میں مسلمانوں کی تعداد ۳۵۶۶۶ تھی۔ زیادہ تر علاقہ میدانی تھا لیکن کوئی قابل ذکر دریا نہ تھا۔ کچھ ندیاں تھیں کاشتکاری بارانی اور چاہی تھی۔ یہاں لائق ذکر معدنیات نہ تھیں البتہ یہاں کے سرخ

پتھر سے دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری کے شاہی محلات اور قلعہ تعمیر ہوئے۔ اسی پتھر سے اسی ریاست کے ایک اہم مقام ڈیگ کے قابل دید قلعہ اور محل بھی تعمیر ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے اوتار کرشن کی اس سرزمین کو برج اور یہاں کی زبان کو برج بھاشا قرار دیا گیا ہے۔ جس سے اردو نے جنم لیا۔ یہ ہندوستان کی اہم جاٹ ریاست تھی جہاں کی بیشتر آبادی شورہ پشت جاٹوں پر مشتمل تھی ۔ مورخ فرشتہ کے مطابق گجرات سے واپسی پر جاٹوں نے محمود غزنوی کے لشکر کو لوٹا اور بعد میں تیمور سے بھی ٹکر لی تھی ۔ ۱۵۲۶ء میں بابری افواج کو تنگ کیا۔ دور مغلیہ میں ان کے معاندانہ رویئے کی وجہ سے اکثر ان پر شاہی غیض و غضب نازل ہوا۔ (۶)

جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے کہ ناصبی الذہن اموی اور عباسی عہد میں

جب سرزمین حجاز میں خانوادہ رسالت پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا تو ان میں سے اکثر علوم محمدؐ وآلؑ محمدؐ کے خزینے کو سینے سے لگائے تبلیغ مذہب حقہ کا عزم بالجزم کئے اور اپنے جد اعلیٰ کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے مختلف علاقوں خصوصاً ایران کی طرف ہجرت کر کے آباد ہوتے رہے اور اس طرح دور دراز کے باشندوں کو صحیح معنوں میں اسلام سے روشناس کرایا۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو فاتحین ہند کی خواہش اور شوق تبلیغ میں شریک لشکر ہو کر وارد ہند ہونے لگے۔ سادات شاہ گنج آگرہ و نواح آگرہ کے اجداد نے جن کا شمار سلطنت غور و غزنی کے عمائدین اور سرداروں میں ہوتا تھا، غزنوی اور غوری لشکروں کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور بیانہ ہیلک و بہرسر اور قرب وجوار کے دیگر اہم مقامات کو فتح کرکے جاگیریں حاصل کیں اور بیانہ کو مستقر بنایا تاکہ راجپوتوں اور جاٹوں کی معاندانہ سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہوئے آگرہ و دہلی کو ان کی دستبرد

سے محفوظ رکھا جاسکے۔ مختلف ادوار میں مشرقی راجپوتانہ کے اس علاقے یعنی آگرہ ، متھرا اور ریاست ہائے بھرتپور و دھولپور میں سادات رضوی ، جعفری ، نقوی اور زیدی نے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ہیلک ، پہرسر ، رارہ ، بھساور ندبئی ، اول ، فتح پور سیکری ، نگر ، سیدپورہ ، آگھاپور ، باڑی اور بسئی وغیرہ میں ایک مربوط دفاعی نظام کے تحت اکثر بلند مقامات اور وسیع وعریض ٹیلوں پر قلعہ نما بستیاں آباد کیں اور اس طرح سادات عظام راجپوتانہ کی طرف سے مسلم سلطنت دہلی پر حملوں کی صورت میں سدراہ بنے رہے۔ جیسا کہ تحریر کیا گیا ۔ ۱۹۴۷ء تک ان بستیوں میں سے اکثر ریاست بھرتپور اور اس کے قریب وجوار میں واقع تھیں ، جہاں کے سادات ایک دوسرے سے رشتہ ازدواج سے منسلک تھے۔ لہذا اس ریاست کے قیام میں سادات عظام کے عمل دخل کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے۔

آخر عہد شاہجہانی میں اورنگ زیب کی باپ کے خلاف بغاوت ، بھائیوں کا قتل ، ناقص حکمت عملی ، مذہبی شدت پسندی اور قدامت پرست علماء کی بیجا مداخلت کی وجہ سے مغل سلطنت ٹوٹ پھوٹ رہی تھی ۔ اس طوائف الملوکی کے دور میں بھرتپور اور نواح کے جاٹ منظم ہونے لگے۔ اس ابھرتی ہوئی جاٹ قوت نے ضرورت محسوس کی کہ آزاد جاٹ ریاست کے قیام میں سادات عظام سے مدد لی جائے جو اس علاقے میں صدیوں سے اپنی مثالی شجاعت ، معاملہ فہمی ، خداداد ذہانت اور حسن اخلاق کی وجہ سے بالادستی قائم کئے ہوئے تھے ، چنانچہ عہد فرخ سیرؒ میں سادات کی حمایت اور سفارش کے نتیجے میں ریاست بھرتپور کا قیام عمل میں آگیا۔ اس دور میں آزاد ریاستوں کے قیام اور آپس کی لڑائیوں میں مذہب کا کوئی خاص دخل نہ تھا۔ راجپوت مغلوں کے شریک کار رہے ، مسلمان مسلمانوں سے برسرپیکار ہوئے۔ روہیلہ

شاہان اودھ سے ٹکرائے ۔ ایرانی ، تورانیوں سے اور پٹھان مغلوں سے اور جاٹ ، راجپوت اور مرہٹے آپس میں نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ دکن میں نظام اور حیدر علی کی رنجشیں ، نجیب الدولہ کے حامی و مددگار گوجروں کا طرز عمل اس صورت حال کے مظہر ہیں۔

ایک طویل مدت سے سادات کا اس علاقے کے سیاسی ، معاشی ، عسکری اور معاشرتی معاملات میں عمل دخل تھا اور راجپوتوں ، ٹھاکروں اور جاٹوں سے تعلقات تھے اسی لئے طوائف الملوکی کے اس دور میں وہ بھی اکثر معرکوں میں جاٹوں کے ساتھ فقید المثال شجاعت کے مظاہرے کرتے نظر آتے ہیں۔ اورنگ زیب کے بعد جاٹوں کے سردار چورامن نے چند قلعے تعمیر کئے اور ۱۷۲۲ء میں اس کے بھائی بدن سنگھ نے آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی ۔ بھرتپور کی اہمیت میں اضافہ ۱۷۳۰ء سے شروع ہوا جب سورج مل جاٹ نے دہلی کے وزیر غازی الدین مرہٹوں اور راجہ جے پور کی مشترکہ فوجی قوت کو شکست دی (۷) اس سے قبل مرہٹوں کی مالوہ اور گجرات کی فتح نے جاٹوں اور راجپوتوں کو متحد کر دیا تھا۔ بدن سنگھ کو آگرہ کے گورنر جے سنگھ (راجپوت نے "برج راجہ" کے خطاب سے نوازا تھا نیز سورج مل کو صفدر جنگ کی حمایت حاصل ہو گئی ۔ اس بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی میں ایرانی ، تورانی کشمکش شباب پر تھی ۔ تورانیوں کے حمایتی اور ایرانیوں کے مخالف پٹھانوں کے نمائندے نجیب الدولہ نے جو شاہ ولی اللہ کے زیر اثر تھا تورانیوں کی حمایت کی اور ، مشاہان اودھ کے مقابل آگیا ۔ ان معرکوں میں سورج مل نے شجاع الدولہ کی حمایت کی جو سادات عظام کے اثرات کا نتیجہ تھی ۔ یہ اسی حمایت کا سبب تھا کہ شیعہ دشمن نجیب الدولہ سلطنت اودھ کا بال بیکا نہ کر سکا (۸) جاٹوں کے ساتھ سادات نے بھی سورج مل کی جنگوں میں

نمایاں حصہ لیا اور اس کی کامیابی کا سبب بنے۔ مثلاً دہلی کی جانب متصل فیروز آباد، گوجہ گھاسیرہ کی لڑائی میں جو نجیب الدولہ کے حامی گوجروں سے لڑی گئی جس میں بلوچ، بدخشی، پٹھان اور میواتی گوجروں کے ساتھ تھے، ہیلک کے میران محمد پناہ رضوی نے شاندار فتح حاصل کی اس جنگ کے واقعات سوبھارام کبیشر چترویدی پنڈت کے ایک بزرگ سے نظم کرائے۔ ہندی کی اس نظم سے رضوی سادات ہیلک کی اہمیت اور جرأت وبہادری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ہندو پنڈت ان کی شجاعت کو اپنے مذہبی سورماؤں ارجن اور بھیم سے فزوں تر قرار دیتا ہے۔ اس نظم کا نام چتراولی ہے جس کے لئے راجہ نے پنڈت کو اس زمانہ میں چھتیس ہزار کی خطیر رقم انعام میں دی تھی۔

نظم چتراولی

اس نظم میں میر محمد پناہ رضوی (میر پناہی) میر اسحق، کرم علی، میر محب فیض محمد، ارشد میراں، غیاث الدین، میر بہادر، واحد جی، ہاشم میران واسع اور نور محمد الہ یار سادات ہیلک کے افراد کا تذکرہ ہے جنہوں نے فاتح خیبر علیؑ ولی کے نعروں کے ساتھ دشمن کو زیر کیا۔ (۹) سورج مل کے عہد میں اس علاقے کے سادات کا ریاستی معاملات میں اثرات کا اندازہ اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ سورج مل تیس ہزار کا لشکر لے کر دہلی تک گیا تاکہ احمد شاہ ابدالی کے مقابلے میں ہندوؤں کی اجتماعی قوت کا ساتھ دے سکے لیکن مرہٹوں کے ہاتھوں شعائر اسلامی کی بے حرمتی کو سادات برداشت نہ کرسکے جو پنج ہزاری اور ہفت ہزاری منصب دار تھے۔ مرہٹوں کی اس قبیح حرکت سے واضح ہوگیا تھا کہ یہ جنگ محض اقتدار کے لئے نہ تھی بلکہ مذہبی

بنیاد پر لڑی جائے گی اس لئے سادات نے نہ صرف علیحدگی اختیار کر لی بلکہ راجہ سورج مل کو میدان جنگ سے بھرتپور واپسی پر مجبور کر دیا۔ اس طرح مرہٹے ایک عظیم لشکر کی حمایت سے محروم ہو گئے جس کے باعث پانی پت کی تیسری تاریخ ساز جنگ میں احمد شاہ ابدالی کو شاندار فتح اور مرہٹوں کو عبرتناک شکست نصیب ہوئی ۔ مسلمانان ہند کے لئے یہ جنگ بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی جس کی بدولت وہ اپنی سیاسی اہمیت برقرار رکھ سکے ورنہ مرہٹوں کا اثر برصغیر کی شمال مغربی سرحدوں کو چھو رہا تھا ، سلطنت دہلی ان کے زیر اثر آچکی تھی ۔ اس لڑائی میں ان کی کامیابی انہیں کلکتہ سے پشاور تک کا مالک ومختار اور مسلمانوں کو اچھوت بنا دیتی ۔ اس جنگ میں ایک دوسرے کے رقیب شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ احمد شاہ ابدالی کی فتح میں برابر کے شریک تھے لیکن تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ اسلام کے نام پر شاہ ولی اللہ کی درخواست پر لڑی جانے والی اس لڑائی کے فاتح احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کے ساتھ مل کر دہلی میں شیعوں کی وہ قتل و غارت گری کی جو نادر شاہ کے قتل عام سے بڑھ گئی (۱۰) ابدالی نے مغل شہنشاہ محمد شاہ کی خوبصورت بیٹی سے جبری شادی رچائی (۱۱) شاہ عبدالعزیز نے اپنے ملفوظات میں تحریر فرمایا ہے کہ دہلی میں احمد شاہ ابدالی نے شیعوں کا قتل عام کیا (۱۲) اردو کے مشہور شاعر سودا نے اپنے اشعار میں تذکر کیا ہے (۱۳) میر تقی میر نے نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کی قتل وغارتگری کے نتیجہ میں دہلی کے اجڑ جانے کا بھرتپور کے پر امن ماحول سے موازنہ کیا ہے جہاں دہلی کے شہزادوں اور عمائدین نے پناہ لی تھی ۔ (۱۴)

ہندوستان میں اس طوائف الملوکی کے دوران راجہ سورج مل نے اپنی ریاست میں اضافے کئے اور آگرہ ، متھرا اور الور کے بعض علاقے بھی

ریاست بھرتپور میں شامل کر لئے۔ سورج مل کے بعد اس کے بھائی بھتیجوں کی رنجش کے دوران دہلی کے سپہ سالار اور وزیر اعظم مرزا نجف علی خان نے مستقرالخلافہ اکبر آباد (آگرہ) کے نواحی علاقے اپنے قبضے میں لے لئے اور بھرتپور کے جاٹوں پر بھی قابو پایا تاہم سادات کی سفارش پر کچھ حصہ واپس کر دیا۔ ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں سے جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا اس میں لارڈ لیک نے راجہ بھرتپور کے ایک رسالے کی خدمات کے صلے میں پانچ اضلاع کا اضافہ کر دیا لیکن بعد میں انگریزوں سے تعلقات خراب ہو گئے جس کے نتیجے میں لارڈ لیک نے ۱۸۰۵ء میں بھرتپور شہر پر حملہ کر دیا۔ یہ شہر آٹھ میل کی گردش میں تھا جس کے گرد بہت اونچی اور چوڑی دیوار (ڈنڈا) کے ساتھ نہر تھی اور شہر کے درمیان قلعہ کو بھی ایک گہری نہر گھیرے ہوئے تھی شہر اور قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ جنرل لیک کے مسلسل چار حملے ناکام ہو گئے۔ انگریزی افواج کو ۳۸۸ جانوں کے اتلاف اور ۱۸۹۴ء زخمیوں کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ ۱۸۲۶ء میں لارڈ کمبرمیر نے سرنگ لگا کر اس کے دفاعی حصار کو توڑ دیا اور ریاست بھرتپور کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ (۱۵)

گو اس جاٹ ریاست کے قیام میں مقامی سادات کی شجاعت، معاملہ فہمی اور دہلی کے سرداروں سے تعلقات کو بڑا دخل تھا۔ لیکن حکمراں نہ بن سکے کیونکہ علاقے کی غالب ترین اکثریت جاٹوں پر مشتمل تھی تاہم ریاستی معاملات میں شروع سے تقسیم ہند تک وہ مسلسل برابر کے شریک اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔

نظم چتراولی

سوبھا کی کتھنا سنو سورج مل بلوان
دل بل سے جیتین چلو گھا سیرہ استھان
رنتنر بھومی پہ چھائے کے دئی وپ دھمکائے
گھاسیرہ پرجا چڑھے بل شالی رسیائے
گڑھ گونڑے میں دیکھ کے فوجن کی لنگتار
مرجھائے دہلائے کے گوجر کے پرودا
خانزادے برودمی بنے پر کرتی کا پھیر
دل شترومیں مل گئے گھور کیا اندھیر
شیخ بیٹھ مدھورا پٹھان گوجر کے ست سنگ
دھنکاری دوشی بنے ڈاری رنگ میں بھنگ
پٹھان شترونا ٹھان کر پوڑ گئے مکھ موڑ
چنگورے کے جاٹ رے لڑے کھیت جی توڑ
ساجن بھوجن پائے کے یارن کے گن گائیں
دل گوجر میں بیٹھ کے میوملیدہ کھائیں
تلوریہ بلرام سنگھ گھات کرے ارتھات
سینا کی کنتی کبھے کرے نہ سانچی بات
گوجر سے سید لڑے ، لڑے جاٹ سے جاٹ
کھیری سے کھیری بھڑی ، بھڑے کاٹ سے کاٹ
میرے بھلے میراں بھلے ۔ بھلے سری مہاراج
نگ پاچھے ڈاریں نہیں کریں نہ کھوٹے کاج

گڑھ گھا سیو پر چڑھے میر پناہی جائے
بڑ گوجر بابا کریں بروشتی گائے
شترو رورے رات میں جب سگرے دل گئے پوڑ
کھانڈ الیکر پل پڑے گوکل رام جی گوڑ
محمد آبادی میر کو سب دیکھیں سنگرام
بگ چانے دھرتی پڑی شتروکرے پر نام
کچھ اہے پرتاب سنگھ میرن کیسں تنگ جائے
گڑھ گھا سیو کے بیچ بھنورا سا بھنائے
میر اسحاق وبائے کے جب ماریں تلوار
اک دل کے دو دل کریں اور کردیں کے دو چار
کرم علی کے کرودھ سے رنڑ بھومی تھرائے
میر محب کے بھاؤ کی ساکھ کہی ناجائے
فیض محمد سنگھ تھے سورج مل کے سنگ
بل ماریں دل بیچ میں سماں علی بجرنگ
ارشد میراں ڈٹ رہے دیکھو تن کے ٹھاٹ
علی ولی کہ کر اڑے جوکر دئے بارہ باٹ
گاج الدین کی سانگ سے نسکر ہوونجائے
رودیں جب بل مار کے دل بادل پھٹ جائے
جیس فتح سنگھ جا اڑے مانو سنگھ سمان
بڑ گوجر مرجھائے کے بھولے کھان اور پان
میر بہادر من چلا سو بے شتر بل کھائے
رنڑ چنڈی پڑی نس پھل بھجے گھا سیرے کے تال

ہر نارائن سید سنگھ اودے سنگھ بلوان
جا دل پہ یہ جھک پڑیں کھودیں نام و نشان
جب دل میران کو چلو جاٹن کے دل بیچ
بل شالی رنڑ میں اڑے رنڑ سے بھاگے نیچ
گج سنگھ ، شیوسنگھ ، برج سنگھ رامچندر ترلوک
جب کھانڈا لے کر اڑیں آئے کال بے روک
جتوں اور ککار ہے میر بڑے بلوان
ویرار جن اور بھیم کے ان نے کاٹے کان
بدن سنگھ سراٹ میں میرن کا اتے بھاؤ
دردی جن جل جل مریں کھائیں شتر وگھاؤ
سیر سنگھ بلرام سنگھ رتناہین گوھ پنکھ
رام سنگھ اور دلیپ سنگھ او ربلب سنگھ میں سنکھ
واحد جی سیتا پتی راجہ کے گنڑ گائیں
گدی کی لجیا رکھیں اور سترو مار بھگائیں
ہاشم میراں جب چلیں مغلن کے کرتوڑ
کرم ہین شترو گریں دھرتی سے سر پھوڑ
ندی ناؤ سنہیوگ ہے جاٹ میر کا میل
جاٹن کو دیپک دیے میر جو ڈالیں تیل
میر سہایک ہے رہے جیتو دیش اور راج
چیتا پڑی جوکٹ گئی مہر کری گر آج
شیو کرنا پر نیچ سے جاٹ راج گھبرائے
دربھ لوٹ پالن کرے اور جھوٹی سوگند کھائے

میر باندرا بن گئے پھل توڑیں اور کھائیں
گھاسڑے کی لوٹ ہو اور دل کے گن گائیں
واسع گھوڑا میر کے ہاتھ میں رن کی باگ
دل بادل پہ چھائے کے رکت سے کھیلے پھاگ
نور محمد میر کا سائینکال سنگرام
دیکھت رن چنڈی کرے جوڑ کے کر پرنام
الہ یار نے جا کے لئی سروہی تان
یودھا یدھ تیاگ کے چھوڑن لگے پران
میر جاٹ کے میل کا جاٹ راج میں رنگ
جیسے جھنگے میں رہے دامن چولی سنگ

جیسا کہ تحریر کیا گیا عہد مغلیہ میں سادات کی یہ تمام بستیاں، بیانہ، ہیلک، پہرسر، راوے، ندبئی، سید پورہ، بھساور، فتح پور سیکری نگر، باڑی، اول، مہابن، بھرتپور شہر اور شاہ گنج مستقر الخلافہ اکبرآباد کے علاقے میں واقع تھیں۔ اس لئے ان کو ہم آگرہ اور نواح آگرہ سے معنون کرتے ہیں جن کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے۔

بیانہ

ابن بطوطہ نے عہد سلطان محمد تغلق ماہ صفر ۷۴۳ ہجری بیانہ میں قیام کیا تھا۔ وہ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ بیانہ ایک بہت بڑا خوشنما شہر ہے۔ اس کے بازار بہت خوبصورت ہیں اور جامع مسجد بھی نادر الوجود ہے جس کی دیواریں اور چھت پتھر کے بنے ہوئے ہیں (۴) امپریل گزیٹر آف انڈیا جلد دوم ص ۲۱۸ کے مطابق ریاست بھرتپور کا شہر بیانہ دہلی سے بمبئی جانے والی ریلوے لائن پر تقریباً سو میل آگرہ سے جنوب مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر دو متوازی پہاڑیوں کے درمیان میدان میں واقع ہے۔ ۱۸۸۱ء میں اس کی آبادی ۸۱۵۸ نفوس پر مشتمل تھی جن میں ۱۸۸۱ء مسلمان تھے اسی شہر میں لاتعداد آثار قدیمہ اور پتھر سے بنی ہوئی بڑی بڑی خوبصورت حویلیاں تھیں اور پہاڑ پر محلات اور دیگر عمارات تھیں۔ جن میں سب سے نمایاں بھیم لاٹ تھی جو دور سے نظر آتی تھی۔ یہاں کا قلعہ ایک زمانے میں ہندوؤں کا اہم ترین قلعہ شمار ہوا ہے جو جدون حکمرانوں کا مرکز تھا۔ اس کو سلطان محمود غزنوی کے بھانجے سالار سید مسعود غازی نے ۴۰۲ء میں فتح کیا تھا۔ یہاں لاتعداد مسلمان شہداء کے مزارات ہیں۔ بیانہ مسلمانوں کی نظر میں بڑا

مقدس ہے اور مشہور ہے کہ اگر یہاں چند مسلمان اور شہید ہو کر دفن ہوگئے ہوتے تو یہ تقدس اور بزرگی میں مکہ پر فوقیت حاصل کرلیتا۔ ۱۰ (یہ ایک انگریز کی رائے ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ بیانہ میں تقریباً تین میل مسلسل قبرستان ہیں جن میں بے شمار پختہ قبریں ہیں) ۱۴۹۱ء میں فرشتہ نے بیانہ کو ایک اہم مقام بتایا ہے جو سکندر لودھی کے لئے ناقابل تسخیر ثابت ہوا۔ ۱۵۲۶ء میں شہنشاہ بابر نے اس کو ہندوستان کا اہم ترین قلعہ قرار دیا تھا۔ بابر نے اس سے کچھ فاصلے پر فتح پور سیکری کے قریب خانواہ میں رانا سانگا کو شکست دی تھی (۱۷) ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لاہوری نے اپنی تصنیف " بیانہ ایک تاریخی بستی " میں لکھا ہے کہ " بیانہ عام طور پر برٹش سرکار کے عہد میں ریاست بھرتپور کی ایک تحصیل شمار ہوتا ہے اور دریائے گمبھر کے بائیں کنارے پر واقع ہے جو دریائے بان گنگا کا معاون دریا ہے۔ یہ بھرتپور شہر سے تقریباً پچیس میل کی دوری پر جنوب مغرب میں ہے۔ عہد قدیم میں اس کا نام بانا یا باناسور بھی تھا۔ یہ شہر بی بی اینڈ سی آئی ریلوے لائن پر دہلی سے بمبئی کے راستے پر دہلی سے سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بیانہ عہد وسطیٰ سے آج تک اسی نام سے مشہور رہا ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ " بیانہ کسی زمانے میں بہت بڑا شہر تھا۔ یہاں ایک سنگی قلعہ ہے جس میں بے شمار بلند مکانات اور تہہ خانے ہیں۔ آج تک لوگوں کو یہاں جنگی آلات اور تانبے کے برتن دستیاب ہوتے ہیں۔ شہر میں ایک بلند مینار بھی ہے۔ آم خوش ذائقہ پیدا ہوتے ہیں اور بعض پھل وزن میں ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ شکر بہت سفید اور صاف تیار کی جاتی ہے۔ یہاں ایک کنواں ہے جس کے پانی میں شکر ملا کر کندورہ (نمیان) تیار کی جاتی ہیں جو دور دراز علاقوں تک بطور تحفہ لے جائی جاتی ہیں۔ نیل بھی بیانہ

میں بہت اچھا ہوتا ہے۔ بیانہ کی حنا بھی مشہور ہے ۔یہاں کی سرزمین بے شمار بزرگوں کا مدفن ہے۔" (۱۸) ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مورخ ضیاء الدین برنی کے حوالے سے بیانہ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ " اس مختصر کیفیت سے واضح ہے کہ بیانہ دہلی کی سلطنت اسلامی کے دائرہ اختیار میں شروع ہی میں آگیا تھا اور کئی سادات خاندان بھی یہاں آباد ہوگئے تھے۔ سادات میں جو امت مسلمہ کے بزرگوں میں سب سے زیادہ معظم ہیں سادات بیانہ وبدایوں بہت معزز تسلیم کئے جاتے ہیں اور ہر ایک صحیح النسب اور ذاتی کمالات کے لحاظ سے بے مثل ، دیندار اور متقی تھا۔" (۱۹) بیانہ کا تفصیلی ذکر طبقات ناصری میں ملتا ہے۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہمراہ قطب الدین ایبک کے اس علاقے پر حملہ کیا تھا اور راجہ کنورپال کو شکست دی تھی جس نے تھان گڑھ میں پناہ لی تھی ۔(۲۰)

کتاب عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی مصنفہ پروفیسر این این لا مترجمہ اخلاق حسین زبیری ،بار تحریر کیا ہے کہ بیانہ کے سید اپنے علمی شغف کے لئے مشہور تھے جو دہلی میں اس دور میں بڑی تعداد میں موجود تھے اور ان میں سے بعض برنی کی رائے میں بخارا ، سمرقند ، بغداد ، قاہرہ ، دمشق ، اصفہان یا تبریز کے فاضل ترین بزرگوں سے بھی علمی میدان میں سبقت لے گئے تھے۔ ان بہت سے علماء اور فلسفیوں میں سے جو بادشاہ کی سرپرستی کے بغیر کامیاب زندگی گزار رہے تھے چند مشاہیر کے نام گنوائے جاسکتے ہیں ۔ وہ یہ تھے ۔ سید تاج الدین سید رکن الدین ، سید مغیث الدین اور ان کے بھائی سید منتخب الدین ۔ یہ سب اپنی علمی برتری اور پرہیزگاری کے لئے مشہور تھے۔ (۲۱)

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اپنی کتاب میں لاتعداد قبروں کے کتبوں کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ " متذکرہ بالا قبروں سے

تصدیق ہوتی ہے کہ بیانہ میں سادات کے خاندان ابتدا ہی سے آباد ہو گئے تھے۔" (۲۲) ضیاالدین برنی نے لکھا ہے کہ" سلطان علاالدین خلجی کے عہد میں برگزیدہ حضرات میں قاضی سید مغیث الدین کے باعث بیانہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جب سلطان نے دیکھا کہ افواج کو مہم ورنگل دکن پر ارسال کیا گیا تھا اور وہ تمام تلنگانہ کے محاصرے میں معروف تھیں نیز کئی فتوحات بھی حاصل ہو چکی تھیں مگر سلطان تک باقاعدہ اطلاعات نہیں پہنچ رہی تھیں تو سلطان نے ملک قرابیگ اور قاضی سید مغیث الدین (بیانہ) کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس بھیجا کہ ان سے جاکر عرض کریں کہ لشکر اسلامی کی خبر نہ آنے کے باعث میرا دل فکر مند ہے۔ آپ کو اسلام کا غم مجھ سے زیادہ ہے اگر نور باطن کے ذریعے لشکر اسلامی کا کچھ حال آپ پر ظاہر ہو تو کوئی اچھی خبر میرے پاس بھی بھیج دیں۔ شیخ نے بادشاہ کی فتح ونصرت کا ذکر کیا۔ ملک قرابیگ اور قاضی سید مغیث الدین (بیانہ) بے حد خوش ہوئے اور شیخ کا شکریہ ادا کرکے سلطان کے پاس واپس آئے۔ جو کچھ شیخ سے سنا تھا سلطان کے سامنے عرض کردیا۔" (۲۳) ڈاکٹر چغتائی کتبات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ" اس کے علاوہ بیانہ سے مندرجہ ذیل ٹوٹا ہوا گنبد ملا جس کے چند الفاظ میں نے نقل کرلئے تھے جو یوں تھے۔ بسم اللہ۔ اخ اشہد، رسول اللہ، اہتمام امیر ۔۔۔۔ ابن امیر ۔۔۔۔ ولوالدین والجمیع المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات۔" (۲۴) ظاہر ہے کہ یہ کتبہ کسی امیر ابن امیر سے متعلق تھا جس کے درمیانی حصے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ الفاظ مومنین ومومنات اور مسلمین ومسلمات سے واضح ہوتا ہے کہ امیر ابن امیر کا تعلق شیعی مسلک سے تھا۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں بیانہ اور اس کے نواح میں شیعیت ابتدا سے تھی جو دیگر علاقوں کے مومنین کی طرح شاہان اودھ کے اثرات یا دادودہش اور علمائے لکھنو کی

تبلیغ کا نتیجہ نہ تھی ۔ نیز یہ امر اس حقیقت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ " بیانہ کی قدیم ترین مسجد کے گنبد کے اندرونی نقش ونگار سے ولائے مولا علیؑ کا برملا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ شش پہلو نام علیؑ ایک دائرے میں آٹھ جگہ نقش ہے۔ " (۲۵) اس لئے عام طور سے یہ تاثر کہ عہد مغلیہ تک سادات ومومنین نے تقیہ اختیار کیا بڑی حد تک درست ہے لیکن آگرہ اور اس کے نواح کے سادات شروع ہی سے اعلانیہ شیعہ تھے کیونکہ اس علاقے سے متعلق ایک بطل جلیل علامہ سید فتح اللہ شیرازی مثل اعظم اکبر کے دربار خاص میں بلا جھجک ہاتھ کھول کر امامیہ طرز سے نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ ملا بدایونی جیسے متعصب سنی مورخ نے موصوف کی مدح سرائی کی ہے اور آپ کی شیعیت کا تذکرہ کیا ہے اور اس دور میں بھی اسی علاقے کے سادات خواہ کسی ماحول سے ہوں برملا اپنے عقیدہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ " اس عہد علائی کے صحیح النسب سادات بیانہ کے وجود کی برکت سے بیانہ ہمیشہ مشرف رہا اور اب بھی ہے۔ علائی کے پورے دور میں ان سادات میں سے تین شخصیتوں کا تخت سلطانی کی طرف سے قاضی ممالک کے عہدہ پر اور ایک کا نائب قاضی ممالک کے عہدے پر تقرر ہوا۔ ان سادات بیانہ کی اولاد و انساب میں بہت بڑی تعداد آج بھی بیانہ میں موجود ہے۔ " (۲۶) ان حقائق سے اس علاقے کے صحیح النسب سادات کی عظمت اور علمی برتری کا واضح اظہار ہوتا ہے۔

نویں صدی ہجری میں بیانہ پر اوحدی خاندان حکمران رہا۔ شیر شاہ سوری نے یہاں اپنی خاص فوج رکھی تھی جو سادات پر مشتمل تھی ۔ اس میں پانچ سو توپچی تھے۔ جس زمانے میں حاکم بیانہ خواص خاں تھا اس وقت یہاں سید محمد مہدی کا خاص مسکن تھا اور یہ حالت ۹۵۵ھ تک رہی ۔ ان کے بعد

جب ہمایوں دوبارہ اقتدار پر قابض ہوا تو بیانہ مغل حکمرانی کے تحت آگیا اور ۹۶۳ ھ میں یہ اکبر اعظم کے تحت الگ صوبہ قرار پایا۔ حکیم سید علی رضا جعفری بیانوی نے تاریخ بلدہ بیانہ میں تحریر کیا ہے کہ اورنگ زیب نے سادات بیانہ کو تبدیلی عقیدہ پر مجبور کرنے کی غرض سے فوج کشی کی جس میں طرفین کے لاتعداد افراد مارے گئے۔ ابھی یہ لڑائی جاری تھی کہ مہاراجگان اودھے پور اور جودھپور نے مغلوں سے بغاوت کردی لہذا اورنگ زیب کو ادھر متوجہ ہونا پڑا اور یہ مہم ادھوری رہ گئی۔ تاہم اکثر سادات نے ہیلک، پہرسر اور دیگر قریبی بستیوں کی طرف نقل مکانی کی جہاں پہلے سے ان کے ہم نسب افراد اپنی جاگیروں پر موجود تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ بعض نے روہڑی، بکھر اور سندھ کے دیگر مقامات کی طرف ہجرت کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجار نے بھی بیانہ کی دولت وثروت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس دور میں یہ نیل کی تجارت کا بڑا مرکز تھا۔" (۲۷)

مغلوں کے زوال کے بعد بیانہ پر جاٹوں کا قبضہ ہوگیا۔یہاں تک کہ جب انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو بیانہ جاٹ ریاست بھرتپور کے تحت آگیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں سادات کے چند گھرانے رہ گئے تھے وہ بھی ہندوؤں کے حملوں کے نتیجہ میں شاہ گنج آگرہ اپنے عزیزوں کے یہاں منتقل ہوگئے۔ آخری دور کے معروف حضرات میں نثار حسین نثار بیانوی اور سید طاہر حسین تھے۔ آخر الذکر نے کراچی میں طاہر نیوز ایجنسی قائم کی جو کچھ عرصہ قبل تک کراچی کی سب سے بڑی نیوز پیپر ایجنسی تھی کرنل مجتبیٰ جعفری جو بیانہ کا روایتی جلوس ذوالجناح نکالتے تھے کیولری گراؤنڈ لاہور میں آباد ہیں۔

ہیلک

قصبہ ہیلک بھرتپور شہر سے دس میل کے فاصلہ پر جانب مغرب ، کمھیر سے تقریباً چار میل جانب جنوب اور بیانہ سے ۲۵ میل جانب شمال آگرہ سے باندی کوئی جانے والی ریلوے لائن پر دامن کوہ میں واقع ہے اور اسی نام سے ریلوے اسٹیشن ہے۔ آئین اکبری کے مطابق دور اکبری میں یہ مستقرالخلافہ اکبرآباد (آگرہ) کے ایک پرگنہ کا صدر مقام اور سرکاری افواج کا مستقر تھا۔ ۵۷۰ ہجری بمطابق ۱۱۷۵ء میں سلطان معزالدین عرف شہاب الدین محمد غوری غزنہ وغور کا حکمران ہوا۔ اس دور میں امام علی رضا علیہ السلام کے مزار پرانوار واقع مشہد مقدس کے متولی میران سید محمد غازی رضوی نے جو سادات رضوی ہیلک کے مورث اعلیٰ تھے نقابت کی ذمہ داری جناب حمزہ بن امام موسیٰ کاظمؑ کے اخلاف کے سپرد کی اور اپنے ہم نسب سادات عظام کے ساتھ لشکر غوری میں شرکت فرمائی ۔ سلطان محمد غوری نے سادات کرام کی بڑی قدر ومنزلت کی اور عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز کیا۔ میران سید محمد غازی رضوی مشہدی اور ان کے ساتھیوں نے مختلف فتوحات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ آپ سپہ سالار سپاہ غور ہوئے۔ ۵۹۳ ہجری میں نمایاں کارکردگی کے باعث میران سید محمد غازی مشہدی کو سلطان غوری نے غازی اور شہزادہ کے خطابات سے نوازا۔" اس وقت ہیلک علاقہ " ہر " کے نام سے مشرقی راجپوتانہ کی بڑی حکومت تھی ۔ اجمیر وغیرہ اس کے صوبے تھے " (۲۹) ہیلک جادون راجپوتوں کا گڑھ اور صدر مقام تھا جو ایک بڑا اور خوبصورت شہر تھا۔ جہاں دو سو دوکانیں تو فقط ٹھٹیروں (برتن بنانے والوں) کی تھیں۔ اس علاقے کی خلقت جادون راجہ ہیراسنگھ کے مظالم سے سخت پریشان تھی ۔ لہذا میران سید محمد غازی رضوی المشہدی داد رسی کے لئے اپنے لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوئے اور جٹ جادوں راجپوتوں کے اس مضبوط مرکز

کو فتح کرکے بیانہ واپس ہوئے۔ سلطان غوری نے بطور انعام اس علاقے کا دروبست بھی بطور معافی اور بسوہ داری نیز ہندوستان کے رواج کے بموجب چودھراہٹ کا حق میران موصوف کو دیدیا۔ علاوہ ازیں ۸۴ مواضعات پر مشتمل جاگیر بھی عطا کی ۔ سادات نے اس کا نام محمد آباد رکھا لیکن یہ عرف عام میں ہیلک ہی مشہور رہا۔ ۵۹۳ ھ میں سلطان غوری نے یہ فرمان بھی جاری کیا کہ وقت مراسلت میران سید محمد غازی رضوی مشہدی کو غازی اور انساب میران کو شہزادے کے لقب سے مخاطب کیا جائے۔ آپ کا انتقال ۱۲۳۶ عیسوی میں ہوا آپ کا مزار کوٹ پگھارا (بیانہ) میں زیارت گاہ عوام ہے۔ آپ کے اخلاف کی بود و باش دامن کوہ میں بیانہ میں جانب شمال رہی ہیلک اور متعلقہ مواضعات ان کے تصرف میں رہے۔ محمد غوری اور قطب الدین ایبک کے بعد مغل دور تک بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عہد اکبری میں بندوبست کی صورت میں سادات ہیلک نے اصل فرمان کو محافظ خانہ شاہی میں جمع کیا اور تجدید فرمان ربیع الاول ۹۸۳ ھ میں ۲۱ جلوس کو پیش گاہ سلطان سے جاری ہوا جو حاجی سید ابراہیم بن سید فضیل نے حاصل کیا۔ اس کے بعد ۱۱۳۲ ھ میں ساری جاگیر چار حصوں میں تقسیم ہوگئی ۔ سید رکن الدین عرف ڈوکر کے اخلاف سے تھوک ڈوکر ، سید فرید کے انساب سے تھوک فرید ، سید فضیل کی اولاد سے تھوک فضیل اور سید رکن الدین حسن میر کا خانوادہ تھوک میر کہلایا۔ اس طرح ہیلک کے سادات رضوی مختلف ادوار میں بیانہ وہیلک میں بود و باش اختیار کرتے ہوئے اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے۔ جن کی تفصیلات فرامین اور دستاویزات کی نقول میں دی ہوئی ہیں لیکن اورنگ زیب کے عہد آخر میں سادات بیانہ کی اکثریت نے نقل مکانی کی اورنگ زیب کے بعد طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ اخلاف میران سید محمد غازی رضوی مجتمع ہو کر ۱۱۸۶ ھ بمطابق ۱۷۷۲ء تک ہیلک میں بالادستی سے

آباد اور اپنے علاقوں پر متصرف رہے اور جیسا کہ تحریر کیا گیا کہ ریاست
بھرتپور کے قیام میں جاٹوں اور ٹھاکروں سے تعاون بھی کیا نیز ان کے دوش
بدوش نبرد آزمائی بھی کی لیکن راجہ سورج مل کے قتل کے بعد جاٹوں کے
علاقے میں بھی افراتفری ہوئی اور اس کے خاندان میں جنگ وجدل تک
نوبت پہنچی ۔اس دوران مرزا نجف علی خان کو اس علاقے پر بالادستی حاصل
ہوگئی تاہم سورج مل کی بیوہ کشوری بائی کو برقرار رکھا گیا جب وہ تیرتھ کیلئے
نقارہ ونشان اور دھونسے (ایک قسم کا باجا) کے ساتھ ہیلک کے قریب سے
گزری تو سادات عظام کو یہ انداز ناگوار گزرا کہ رانی اس طرح دھونس کے
ساتھ ان کے علاقے سے گزرے ۔ لہٰذا وہ مزاحم ہوئے۔ اس مزاحمت میں
طرفین سے کافی لوگ کام آئے۔ شہید ہونے والوں میں سید ظفر علیؒ بھی تھے
جن کی بارات چڑھنے والی تھی ۔آپ نے مثالی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور سرتن
سے جدا ہوجانے کے باوجود کافی دیر تک آپ کی تلوار چلتی رہی ۔ رانی کی
فوج حواس باختہ ہو کر فرار پر مجبور ہوئی ۔ موصوف شہید ہوگئے۔ آپ کا مزار
زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ اس واقعہ کے بعد سادات رضوی میں یہ رسم
ہو گئی کہ شادی کے موقع پر آپ کی سینک بھروائی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ دلائی
جاتی ہے۔ مہارانی کشوری نے سادات کے اس رویہ کی شکایت امیرالامرا مرزا
نجف علی خاں سے کی جو اس وقت مستقر الخلافہ اکبر آباد (آگرہ) میں مغل
وائسرائے تھے اور جاٹوں کا علاقہ ان کے زیر اثر آچکا تھا۔ رانی سے ان کے
تعلقات بھی تھے لہٰذا سیاسی مصلحتوں کے تحت طے پایا کہ جو خاندان اس
جنگ میں پیش پیش تھے انہیں قرب وجوار میں جاگیریں دے کر یہاں سے
منتقل کردیا جائے اس لئے چند خانوادوں کے علاوہ جنہوں نے قرابتداری کی
نسبت سے پہر سر منتقل ہونا مناسب سمجھا۔ اکثر فتح پور سیکری آگئے ان میں
کچھ نے وہاں بودوباش اختیار کرلی اور زیادہ تر اپنے عزیز سید حبیب اللہ کی

حاصل کردہ جاگیر نزد اکبر آباد (آگرہ) میں آکر بس گئے جو شاہ گنج کے نام سے مشہور ہوا۔ جہاں سادات کے ان خانوادوں نے لاتعداد نابغۂ روزگار پیدا کئے۔ اس نقل مکانی میں معدودے چند خاندان الہ آباد، پٹنہ، فرخ آباد اور کلکتہ تک جاکر آباد ہوئے۔° کلکتہ میں ہیلک نامی محلہ سادات ہیلک کی اس ہجرت کا بین ثبوت ہے۔° (۳۰) جو چند خاندان ہیلک ہی میں آباد رہے ان میں سے بھی اکثر بدلے ہوئے حالات، تلاش معاش، تعلیمی ضروریات اور شہرت پسندی کی وجہ سے شہر بھرتپور اور آگرہ منتقل ہوتے رہے اور ان کے اجداد کی پختہ اور سنگین حویلیاں کھنڈرات میں تبدیل ہوگئیں۔ تقسیم ہند کے وقت یہاں چند حضرات ہی باقی رہ گئے تھے۔ سید سجاد حسین صاحب رضوی جج اور سید الطاف علی صاحب رضوی رسالدار آخری دور تک ہیلک سے مربوط رہے۔ اول الذکر کے چار صاحب زادے سید علی اوسط انسپکٹر پولیس سید شبیر حسین، سید آغا سلطان سپرنٹنڈنٹ پولیس جو قائد اعظم پولیس میڈل سے نوازے گئے اور سید اصغر حسین تحصیلدار جو کراچی میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں شہرت رکھتے تھے پاکستان آگئے آخر الذکر (سید الطاف علی رسالدار) کے اخلاف میں سید آل احمد، سید آل رسول، سید غلام رسول اور سید زوار احمد کراچی اور خیرپور میں آباد ہوئے۔ سید آل مقبول بن سید آل رسول کراچی میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہیں۔ سید وسیم احمد بن سید آل احمد شپنگ کمپنی میں ریڈیو آفیسر ہیں۔ اور سید غلام رسول کے صاحبزادے سیمن کمپنی میں انجینئر ہیں

پہار سر

بھرتپور شہر سے ۳ میل کے فاصلہ پر سڑک جے پور کے قریب ایک میل کچے راستے پر واقع ہے۔ اس سے چھ میل کی دوری پر ندبئی ہے جو آگرہ باندی کوئی ریلوے لائن کا ایک اسٹیشن ہے۔ بموجب فرامین شاہی اس کا

رقبہ دو ہزار شش صد بیگہ اور پیمائش حال کے مطابق تین ہزار سات سو ساون بیگہ پختہ یا پندرہ سو ایکڑ ہے۔(۳۱)

سادات پہرسر کے مورث اعلیٰ سید عبداللہ قلندر شیرازی تھے جن کا سلسلہ نسب ۹ واسطوں سے حضرت امام جعفر صادقؑ سے ملتا ہے۔ عہد محمود غزنوی میں خواجہ ابوبکر قندہاری کے ساتھ بیانہ میں آمد سے متعلق تاریخی اختلاف پر تحصیلدار سید ظہیر الحسن رضوی البیکلی ثم پہرسری اور سید منظور احمد جعفری پہرسری مولف گلدستہ سادات قصبہ جات بھرتپور نے بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ جب عہد غزنوی میں ابوبکر قندہاری کا لشکر ۴۲۱ء میں بیانہ سے جانب شمال تقریباً ۱۹ میل کے فاصلہ پر پہنچا تو راجہ بجے پال کی ایک گڑھی ملی جو مضبوطی کے اعتبار سے لوہا گڑھی مشہور تھی راجہ بجے پال کے عامل نے مزاحمت کی اور جنگ ہوئی غزنوی فوج نے اس کو ایک پہر میں سر کرلیا اس لئے اس مقام کا نام پہرسر ہوا۔ سید عبداللہ قلندر بن سید احمد جعفری شیرازی بھی اس لشکر میں شامل تھے جنہوں نے فتح بیانہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس لئے بعد فتح یہ سالم موضع انہی کو برائے مدد معاش بارگاہ سلطانی سے معافی میں عطا ہوا۔ یہ زرخیز علاقہ ہے جہاں آبپاشی کے لئے تقریباً ۲۹ پختہ کنویں اور تیس باغیچے تھے۔ ایک باغ نواب سید محمد حسین کا بہت مشہور تھا۔ جس میں ہر قسم کے بوٹے اور پھل دار درخت تھے نیز سرخ پتھر اور سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا تخت اور خوبصورت دروازہ تھا۔ جس کے ایک گوشے میں سنگ مرمر کی مسجد تھی۔ یہاں کی مساجد، امام باڑوں، مسافرخانوں، کنوؤں اور حویلیوں کی تفصیلات سید ظہیر الحسن رضوی مرحوم اور سید منظور احمد جعفری مرحوم نے اپنی کتابوں میں شرح وبسط کے ساتھ تحریر کی ہیں دربار اکبری سے ۹ ربیع الاول ۹۸۳ ہجری کو جاری ہونے والے فرمان نیز دیگر فرامین کی نقول بھی اپنی

کتابوں میں درج کی ہیں۔ حکیم سید علی رضا بیانوی نے تاریخ بلدہ بیانہ میں پہر سر کے محلہ علائی پاڑہ میں واقعہ مسجد کے کتبہ کی درج ذیل عبارت نقل کی ہے۔

"ایں مسجد بناکردہ امید وار رحمت پروردگار سید حسن محمد شیرازی عہد خداوند عالم فیروز شاہ درموضع پہر سر تاریخ ۷۸۳ ہجری۔" اگرچہ بنیادی طور پر پہر سر سادات جعفری کا مسکن تھا لیکن ہیلک سے کچھ رضوی خاندان نقل مکانی کرکے قرابتداری کی نسبت سے یہاں آباد ہوگئے تھے۔ یہاں کے رضوی اور جعفری خانوادوں نے مختلف ادوار میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور ریاست بھرتپور نیز برصغیر کے دیگر مقامات خاص طور سے سی پی (مدھیہ پردیش) راجپوتانہ کی ریاستوں اور یوپی (اتر پردیش) نیز ریاست بلرام پور میں مناصب جلیلہ پر فائز رہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں فاضل مشہدی کی کتاب "یہ باتیں ہیں جب کی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کی سرگزشت مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء کا اقتباس درج کیا جائے۔ موصوف جو غالباً ۱۹۲۷ء میں پہر سر تشریف لے گئے تھے، لکھتے ہیں۔" آگرہ سے باہر شاہ مرداں ایک متبرک مقام ہے۔ علامہ قاضی سید نوراللہ شوستری کا مزار مقدس یہیں ہے۔ اکثر قبروں پر رئیس پہر سر لکھا ہوا دیکھا تو ہمیں پہر سر دیکھنے کا شوق ہوا۔ آگرہ سے بھرتپور اور بھرتپور سے ۱۴ میل کے فاصلے پر یہ سادات کی بستی واقع ہے۔ یہ مقام ایک پہر میں سر ہوا تھا اس لئے یہ نام ہوا۔ آبادی ۱۵۴۰ ہے جس میں دس مسجدیں اور امام باڑے، باغ اور باغیچے بکثرت، ایک مسافر خانہ ۲۵ پختہ حویلیاں، چار سو پختہ مکانات، ساٹھ دوکانیں، بیس چوپال نظر آئے۔ کچھ مکانات باہر کی طرف تھے جو سادات کی رعایا کے لئے تھے۔ سادات سب کے سب تقریباً

جعفری شاخ کے تھے۔ تھوڑے سے رضوی سادات بھی ایک حصے میں رہتے تھے۔ مستورات پردے اور مذہبی رسوم کی پابندی کرتی تھیں۔یہاں کے لوگ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ہمیں ان گھرانوں سے پرانی قلمی کتابوں کی تلاش کا خیال تھا۔ سادات بہت متواضع ، شائستہ طبع اور مہمان نوازی کے خاص آداب رکھتے تھے۔ ان میں ہم جلد گھل مل گئے۔ امام باڑوں اور مسجدوں کی سیر کی ۔ تاریخی روایات معلوم کیں۔ ان کے مورث اعلیٰ محمود غزنوی کے ایک جرنیل ابو بکر قندھاری کے ہمراہ یہاں آئے تھے اور معافی میں جاگیر حاصل کی تھی جو انہی کے نام سے چلی آرہی ہے۔ اب ان سادات کی اکثریت کراچی میں سقیم الحالی میں بسر کر رہی ہے۔ پہرسر میں چند روز بڑے لطف سے گزرے ہم نے وہ میدان بھی دیکھے جہاں مسلمان سیدزادوں کی ہندؤں سے لڑائیاں ہوئی تھیں۔ ان مقامات کے ساتھ عجیب عجیب قصے منسوب تھے۔ سادات میں ایسے صاف باطن بھی گزرے ہیں جنہوں نے روحانی تصرف سے بعض جگہوں کی ہیئت ہی بدل ڈالی ۔*

مختلف ادوار میں سید عبداللہ قلندر کے اخلاف اپنے مستقربیانہ سے پہرسر آکر آباد ہوتے رہے۔ اس طرح سید جلال الدین کے نام پر جلال پاڑہ سید علاالدین کے نام پر علائی پاڑہ اور سید عبدالصمد کے نام پر ڈیڑھ پیٹی کے محلے ظہور میں آئے۔ اس کے علاوہ ایک سرکش جاٹ کے نام پر ادھیا پاڑہ نام کا محلہ بھی تھا۔

تقسیم ہند کے وقت ۱۹۴۷ء میں اس قصبہ پرجاٹوں کا زبردست حملہ ہوا اور سخت قتل وغارتگری کے نتیجے میں نقل مکانی ہوئی ۔ ندبئ ریلوے اسٹیشن کے قریب اس قصبہ سے متعلق سادات کے قافلے کے ۴۴ افراد شہید ہوگئے۔ اس دور میں یہاں سید آل رضا رضوی جج کی شخصیت نمایاں تھی ۔

فتح پور سیکری

انگریز مورخ رالف فچ نے جو لندن سے ۱۵۸۵ء میں ہندوستان آیا تھا، تحریر کیا ہے کہ "آگرہ فتح پور سیکری دونوں شہر لندن سے بڑے ہیں۔ دونوں کے درمیان ۲۳ میل لمبی سڑک دوکانوں سے بھری ہوئی تھی اور جہاں سے وہاں تک ایک ہی شہر کا سلسلہ معلوم دیتا تھا۔ ہر طرف ریشمی کپڑا، عقیق، ہیرے اور موتی فروخت ہو رہے تھے۔ امراء سونے چاندی کے کام والے ریشمی پردوں سے ڈھکی ہوئی دوپہیوں والی خوبصورت گھوڑا گاڑیوں پر گزر رہے تھے اور گھوڑے بھی تمام دنیا کے گھوڑوں سے بہتر" (۲۷) جرنیلی سڑک کے مصنف سید رضا علی عابدی آف بی بی سی لندن کے بقول "فتح پور سیکری دیکھنے کی جا ہے۔" (۲۸) جہاں شہنشاہ اکبر کے تعمیر کردہ لاتعداد شاہی محلات مسجدیں، خانقاہیں مدرسے، حمام، باولیاں ہیں قابل دید عمارتوں میں شیخ سلیم چشتی کی درگاہ سیپ سے بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے ساتھ جو پہاڑی پر بنی ہے وہ جامع مسجد ہے جس کا بلند دروازہ پلیٹ فارم (چبوترے) سے جو خود دس میٹر اونچا ہے، اکتالیس میٹر بلند ہے۔ اکبر اعظم کا ایک سو گیارہ میٹر لمبا دیوان عام، دیوان خاص (ایک کھمبا)، پنج محل، مریم زمانی، جودھا بائی ابوالفضل فیضی اور بیربل کے محلات، آنکھ مچولی (خزانہ) توپ خانہ، دفتر خانہ ٹکسال اور ہرن مینار ہیں۔" (۲۹) "مغل اعظم نے فتح پور سیکری میں پہاڑی پر ایک بڑا جامعہ تعمیر کیا، اس شان کا جامعہ شاید ہی کسی سیاح نے کسی دیگر جگہ دیکھا ہو۔" (۳۰) آج بھی جو سیاح تاج محل دیکھنے جاتے ہیں وہ فتح پور سیکری ضرور جاتے ہیں۔ حکومت ہند کے لئے یہ زرمبادلہ کمانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

شہنشاہ اکبر کے بعد اس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ امتداد زمانے سے اب اس کی حیثیت ایک قصبہ جیسی رہ گئی ہے۔ جہاں پولیس تھانہ، تحصیل

کے دفاتر اور اسکول ہیں۔ آج بھی یہاں تقریباً ایک میل لمبا بازار ہے اس کی شہر پناہ (دیوار شہر) گیارہ کلومیٹر پر محیط ہے۔ یہاں ہیلک کے تھوک میر کے رضوی سادات آباد تھے۔ لیکن زیادہ تر آگرہ اور دیگر مقامات کو منتقل ہو چکے تھے۔ تقسیم برصغیر سے قبل یہاں کی نمایاں شخصیت سید منظور الحسن رضوی مشہدی کی تھی جو ایک عرصہ سے شاہ گنج آگرہ میں مقیم تھے۔ ان کے نامور صاحب زادے سید محمود الحسن رضوی ڈائریکٹر افرادی قوت وتربیت وسکریٹری پروفیشنل ٹریننگ بورڈ محکمہ محنت سندھ کے علاوہ سید علی حیدر رضوی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ سندھ اور سید امیر اعظم رضوی ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان کا تعلق بھی اسی خانوادے سے ہے۔ فتح پور سیکری میں زیر دامن کوہ • نگر • نامی ایک اور بستی ہے جس میں ہیلک رارے اور سید پورہ سے متعلق سادات کے کچھ خاندان آباد تھے۔ جن میں سے اکثر ہجرت کر کے کراچی میں بس گئے ہیں۔

ندبئی

ریاست بھرتپور کی تحصیل ندبئی کا صدر مقام جو بھرتپور شہر سے جانب مغرب آگرہ، باندی کوئی ریلوے لائن پر واقع ہے یہاں ریلوے اسٹیشن کے علاوہ پولیس تھانہ، ڈاکخانہ اور تحصیل کے دفاتر تھے۔ یہ قصبہ بھی مٹی اور اینٹوں کے بہت بڑے ٹیلے پہ واقع تھا۔ اس کو بھی سپاہ غور نے فتح کیا تھا یہاں اس سپاہ کے سالار آصف خان غوری کا مقبرہ بھی ہے جس کا گنبد دور سے نظر آتا ہے۔ یہاں زیدی سادات آباد تھے جو نقل مکانی کر کے شاہ گنج آگرہ میں آکر بس گئے تھے۔ اس خانوادے میں سید زوار حسین زیدی کورٹ انسپکٹر کی شخصیت نمایاں تھی۔ جو خاندان دوسرے علاقوں کی طرف منتقل ہوئے۔ ان میں خان بہادر سید اعجاز علی کا خاندان مشہور ہے۔ موصوف انگریزی عہد میں کلکٹر اور ریاست خیرپور پاکستان میں وزیر اعظم

رہے۔ آپ کے صاحبزادگان سید اعظم علی اور سید معظم علی بھی پاکستان میں اعلیٰ ترین عہدوں پر ممتاز ہوئے۔

بھساور

ریاست بھرتپور میں تحصیل ویر کا یہ قصبہ بھرتپور سے جے پور کی طرف جانے والی سڑک پر ویر سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر بیانہ سے دس میل اور بھرتپور شہر سے جانب جنوب ۲۶ میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہاں تھانہ کسٹم چوکی اور مویشی خانہ تھا۔* یہ قصبہ عہد مغلیہ میں مسلمانوں کی اہم بستی تھی دربار اکبری کے ملا عبدالقادر بدایونی اسی بستی سے نکل کر دربار اکبری تک پہنچے۔ (۳۱) بھساور اور اس کے نواحی دیہاتوں کا علاقہ علامہ سید فتح اللہ شیرازی کو جو سادات بھساور کے مورث اعلیٰ تھے، اکبر اعظم سے جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید اولاد علی جعفری یہاں سے ترک سکونت کر کے بیانہ میں آن بسے تھے۔ جن کے ایک بیٹے سید افتخار علی بیانہ سے آگرہ تشریف لائے اور کٹرہ حاجی حسن کو آباد کیا۔ ان ہی میں خان بہادر سید ابو محمد ہوئے جو یوپی میں کلکٹر رہے اور صوبائی پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے۔ ان ہی میں سید آل عبا جعفری ہوئے جو یادگار نور کے مولف تھے۔ اسی خانوادے کے سید ناظم حسین حضرت قاضی نور اللہ شوستری کے مزار پرانوار واقع دیال باغ آگرہ کے متولی تھے اور کراچی میں آغا سید قمر حسنین مرحوم تھے جو اکثر شیعی شعرائے کراچی کے ضربی و سرپرست جانی پہچانی شخصیت تھے۔

رارہ

تحصیل کمہیر ریاست بھرتپور کا یہ قصبہ بھرتپور شہر سے شمال مشرق کی طرف آٹھ میل کے فاصلہ پر ریاست کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں پولیس تھانہ، کسٹم چوکی اور پرائمری اسکول تھے۔ یہاں مہاراجگان ریاست کا بنایا ہوا

ایک خوبصورت اور وسیع باغ تھا۔ اس کی چہار دیواروں پر نقش ونگار بنے ہوئے تھے سرخ پتھر اور اینٹوں سے بنا ہوا ایک بڑا تالاب بھی تھا جو رانی کے نام سے موسوم تھا۔ اسی نسبت سے اس قصبے کے ریلوے اسٹیشن کا نام رانی کنڈ رارہ پڑگیا۔ یہاں سالار سید محمد غازی مشہدی کے اخلاف میں سید محمد یحییٰ رضوی المشہدی کے انساب آباد تھے۔ ابتداء میں اس خاندان کو فتح پور سیکری کے قریب چریاری میں جاگیر عطا ہوئی تھی لیکن فتح پور سیکری میں محلات اکبری کی تعمیر کے باعث یہ خانوادہ رارہ منتقل ہوگیا جہاں اکبر اعظم نے اس خانوادہ کو نعم البدل میں جاگیر دی تھی۔ یہ قصبہ ایک وسیع وعریض اور بلند ٹیلے پر آباد ہے جو کبھی ایک مضبوط قلعہ رہا ہوگا۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد اور اس سے ملحق ایک امام باڑہ تھا۔ یہاں ایک سنگین مقبرہ ہے جو دادے پیر کے نام سے مشہور ہے۔ بزرگ مدفون سید داہ حسین تھے جن کا سلسلہ نسب سادات ہیلک سے ملتا ہے۔ یہ مزار مسلمانوں اور ہندؤں سب کے لئے یکساں قابل احترام اور مرجع خلائق ہے۔ اس قصبے سے بارات روانہ ہونے سے قبل جاٹوں کی یہ رسم تھی کہ وہ اس مزار پر جاکر ڈھوک دیتا (سجدہ ریز ہوتا) اور مزار کی مٹی کا تلک لگاتا۔ ان بزرگ کی یہ کرامت تھی کہ اس قصبے کے حدود میں کسی بھی قسم کا نشہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور اگر کسی نے آزمایا تو اس کی موت واقع ہوگئی۔ یہاں اور بھی کئی قدیم پختہ قبریں تھیں۔ مسلمانوں کے دور حکمرانی میں متھرا کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے اس قصبے کو دفاعی اہمیت حاصل تھی جس کی نشان دہی یہاں قلعہ کے پڑاؤ (لشکروں کی قیام گاہ) سے ہوتی ہے۔ یہاں کے سادات قرب وجوار کی ریاستوں اور اضلاع میں وقیع خدمات انجام دیتے رہے۔ لیکن بدلے ہوئے حالات اور شہری زندگی کی کشش میں زیادہ تر خاندان شہر بھرتپور اور شاہ گنج آگرہ منتقل ہوتے رہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت سادات کے دو خانوادے

اپنے اجداد کے ورثے کے محافظ باقی رہ گئے تھے۔ آخری عہد میں اس قصبے کی نمایاں شخصیات میں سید آل حسن وکیل بھرتپور اور سید محمد تقی صوبے دار تھے۔ اول الذکر کے تین صاحب زادے پاکستان تشریف لے آئے۔ پیر الٰہی بخش کالونی کے بانی اور قائد اعظم کی تجہیز و تدفین کے منتظم سید محمود الحسن رضوی (میجر حسن) ، سید مقصود الحسن رضوی کلفٹن ایکوریم (مچھلی گھر) کراچی کے بانی اور سید معصوم الحسن رضوی آخر الذکر سید محمد تقی صوبیدار کے اولاد نرینہ نہ تھی ان کے نواسے سید محمود الحسن رضوی ابن ماسٹر سید منظور الحسن رضوی شہید اور کراچی میں فرسٹ کلاس آنرری مجسٹریٹ بھی رہے ہیں نیز پاکستان میں ملت جعفریہ کے دل و دماغ کا درجہ رکھتے تھے۔

دھولپور۔ باڑی

دریائے چنبل کے کنارے دہلی ۔ بمبئی ریلوے لائن پر آگرہ اور گوالیار کے درمیان سابق ریاست دھولپور کا صدر مقام ہے۔یہاں سے تین میل کے فاصلے پر ۱۶۸۵ء میں اورنگ زیب کے بیٹوں اعظم اور معظم نے تخت و تاج کے لئے اس کے نزدیک بارہٹہ میں جنگ لڑی ۔یہاں کا مشہور قلعہ شیر گڑھ تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے۔ جس کو شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء میں دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ مقامی منصب دار نے شاہجہان کے لئے ایک محل بنوایا۔ جو اب کھنڈر بن چکا ہے۔یہاں کے محلات سرخ پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ باڑی اس ریاست کا قدیم قصبہ ہے۔ سید راجو بخاری کا مزار یہیں واقع ہے جو زیارت گاہ عام ہے۔یہاں کا قلعہ فیروز شاہ نے ۱۲۸۶ء میں تعمیر کروایا تھا۔یہاں پھنڈ ایک پرانا تالاب ہے جس کو ہندو متبرک سمجھتے ہیں۔ آبپاشی کے لئے رام ساگر بنوایا گیا اس کے قریب ہی شکار گاہ ہے۔ باڑی کے قریب ہی سادات کی ایک اور چھوٹی سی بستی ہے جو بسئی کے نام سے موسوم ہے۔ دھولپور باڑی اور بسئی کے سادات و مومنین کا تعلق سادات ہیلک اور پہر سر

سے ہے اور وہ رشتہ ازدواج میں پہر سر و شاہ گنج سے مربوط رہے ہیں۔ یہاں کے زیادہ تر سادات شاہ گنج آگرہ میں آکر بس گئے تھے۔ عہد آخر کے لوگوں میں سید محمود الحسن رضوی چیف انجینئر واہ سیمنٹ فیکٹری نمایاں تھے۔ آپ کا خاندان سٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں آباد ہے۔ موصوف کے سب بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

سیدپورہ۔ محل۔ آگھاپور

ہمایوں کے دور میں سید ابو حلیم زیدی آگرہ واجمیر کے راستے میں واقع ایک اہم قلعہ اجیں (ریاست بھرتپور) کے قلعہ دار تھے۔ وہیں آپ کا پختہ مزار بھی ہے۔ موصوف ہاشمی رسالہ کے سالار تھے جس کو ہمایوں نے مشہد مقدس سے بھرتی کیا تھا۔ آپ کو دربار شاہی سے جاگیر ملی تھی جہاں آپ کے انساب آباد و متصرف رہے۔ اس کا نام سیدپور رکھا تھا۔ سادات نقوی کے بزرگ حکیم سید عبداللہ بخاری کے لئے طبی خدمات کے صلے میں شہنشاہ اکبر نے سیدپورہ کے نزدیک ایک محل تعمیر کروایا۔ سیدپورہ اور محل بھرتپور شہر سے جانب جنوب دس میل کے فاصلے پر باناندی کے کنارے واقع ہیں۔ یہاں سے بھرتپور کی طرف سات میل کے فاصلے پر سادات جعفری کی ایک اور بستی (آغاپور) تھی لیکن عرصہ ہوا وہاں کے سادات سیدپورہ میں ضم ہوگئے۔ تقسیم برصغیر تک ان تینوں بستیوں کے زیادہ تر خاندان شہر بھرتپور اور شاہ گنج آگرہ میں آکر بس چکے تھے۔ معدودے چند باقی رہ گئے تھے اس بستی سے متعلق سید اظہر حسین زیدی وکیل سید حیدر رضا جعفری سابق پرنسل پولیس ٹریننگ کالج مراد آباد (یوپی) اور ڈاکٹر سید منظور حسین جعفری نمایاں تھے۔ ان حضرات نے بھی سیدپورہ کی سکونت ترک کرکے شہر بھرتپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

اول

شہر بھرتپور سے جانب شمال مشرق دس میل کے فاصلے پر اور قصبہ رارہ سے چار میل کے فاصلے پر جانب شمال مشرق ضلع متھرا کا ایک مشہور قصبہ تھا جو بہت بڑے ٹیلے پر آباد تھا۔ حالانکہ یہاں نہ پختہ سڑک تھی اور نہ ریلوے اسٹیشن تھا لیکن پولیس تھانہ اور ڈاک خانہ وغیرہ تھے یہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی۔ اس میں زیادہ تر قصاب اور شیخ بستے تھے۔ البتہ سادات نقوی کے کچھ خاندان تھے جو زمیندار اور ملازم پیشہ تھے۔ چند خانوادے سادات رارہ کے بھی منتقل ہو کر یہاں بس گئے تھے۔ سادات اس قصبے کے جانب مغرب آباد تھے۔ یہ الگ حصہ سید باڑہ کے نام سے موسوم تھا۔ تقسیم ہند سے قبل اس قصبے کے دو بھائی سید حیدر حسین نقوی اور سید جعفر حسین نقوی نمایاں تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اول الذکر حیدر آباد سندھ میں آباد ہوئے ان کے فرزند سید صفدر حسین نقوی کراچی میں مرکزی حکومت کے اسٹیٹ آفیسر رہے اور سید مظہر حسین نقوی پاکستان بحریہ میں کمانڈر کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔ آخر الذکر (سید جعفر حسین نقوی) کے چار صاحب زادگان سید ناصر حسین نقوی، سید صابر حسین نقوی، سید محمد یونس نقوی اور سید محمد احمد نقوی ہوئے۔ میجر سید محمد یونس نقوی پاکستان میں ملٹری اکاونٹنٹ جنرل اور وزارت دفاع کے فنانشل ایڈوائزر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ موصوف نے شاہ گنج آگرہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ ایک ممتاز ذاکر بھی تھے اور ایام عزاء میں مجالس سے خطاب کیا کرتے تھے۔

مہابن

ضلع متھرا میں برج کے علاقے کی ایک اہم اور قدیم بستی تھی جو دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر متھرا سے جانب مشرق چھ میل کے فاصلے پر پختہ سڑک پر واقع تھی۔ افواج غزنی وغوری نے اس کو فتح کیا۔ ۱۰۱۷ء میں

فتح کانجر کے موقع پر سلطان شمس الدین التمش کی افواج کا یہاں اجتماع ہوا۔ ۱۵۲۶ء میں شہنشاہ بابر نے اپنی تزک میں اس قصبے کا ذکر کیا ہے۔ آئین اکبری میں اسے مستقر الخلافہ اکبر آباد کا ایک پرگنہ تحریر کیا گیا ہے۔ ۱۶۳۴ء میں یہ شاہجہان کی شکارگاہ رہی۔ یہاں مٹی اور اینٹوں کا ایک بہت بڑا ٹیلہ ہے جو کبھی ایک مضبوط قلعہ رہا ہوگا۔ یہ ہندوؤں کا ایک متبرک مقام ہے۔ جہاں ہندوؤں کے اوتار کرشن جی کے بچپن کی بہت سی یادگاریں ہیں۔ قریب ہی گوکل ہے جہاں وشنو کرشن کے روپ میں ظاہر ہوئے تھے۔ یہاں اورنگ زیب کی تعمیر کردہ ۸۰ ستونوں کی ایک خوبصورت مسجد ہے۔ اسی قصبے کو اخلاف سالار سید محمد غازی میں سے میران سید محمد یحییٰ رضوی المشہدی نے فتح کیا اور ان کے انساب جاگیریں حاصل کر کے یہاں آباد ہوئے اور ہندوؤں کے اس اہم علاقے میں بالادستی کے ساتھ قائم رہے۔ انگریزی عہد حکمرانی میں بھی عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔ یہاں کے بھی اکثر افراد قرابتداری، شہریت پسندی اور تعلیمی ضروریات کے تحت شاہ گنج آگرہ میں منتقل ہوگئے۔ تقسیم ہند کے وقت فقط چند خاندان ہی یہاں باقی رہ گئے تھے۔ آخری دور میں خان بہادر چودھری سید نظیر الحسن رضوی فوق اسپیشل مجسٹریٹ المیزان کے نامور مصنف کے خانوادے کے افراد نمایاں تھے۔

ضلع متھرا میں اول اور مہابن سے قریب "عوشنہ" نامی ایک اور سادات کی بستی تھی، اس میں چند خاندان ہی آباد تھے۔

شہر بھرتپور

یہ ریاست بھرتپور کا صدر مقام ہے۔ اس کے گرد شہر پناہ بلند اور اتنی چوڑی تھی کہ کئی شہسوار اس پر گھوڑے دوڑا سکتے تھے۔ اس پر توپیں بھی نصب تھیں اور مختلف راستوں پر مضبوط دروازے تھے۔ شہر پناہ کے ساتھ ساتھ خاصی گہری نہر تھی۔ اسی طرح شہر کے اندر قلعہ کے اطراف بھی گہری

نہر تھی - یہ ہی وجہ تھی کہ یہ شہر انگریزوں کے لئے دردسر بنا رہا اور بمشکل سب سے آخر میں فتح ہوسکا- بھرتپور کا قلعہ انگریزوں سے ایسا لڑا کہ کچھ بیان میں نہیں آتا اور مدت تک لڑ کر کس طرح بچ رہا یہ دھیان میں نہیں آتا کیونکہ انگریز لوگ جس طرف لڑنے جاتے ہیں ادھر سے منہ نہیں موڑتے ـــــــ راجہ رنجیت سنگھ جاٹ کہ مالک بھرتپور کا تھا اس میں کچھ وصف تو نہ تھا مگر یہ تو نمود رکھتا تھا کہ رعیت کو اپنے سے خوشنود رکھتا۔ جیسا کہ کتاب سعادت یار خاں رنگین ص ۶۸ ماخوذ از تحریک آزادی میں اردو ادب کا حصہ ص ۲۸۲) پر تحریر ہے اس قلعہ اور شہر پناہ کو راجہ سورج مل کے باپ بدن سنگھ نے تعمیر کروایا تھا اور ہندوؤں کے اوتار بھرت کے نام پر آباد کیا تھا۔یہاں بڑے شہروں جیسی سہولتیں یعنی اسپتال، اسکول، کالج ڈاکخانہ ٹیلی فون، بجلی اور ریلوے اسٹیشن مہیا تھیں۔ سڑکیں ڈامر اور پتھر کی تھیں۔ زیادہ تر آبادی اہل ہنود کی تھی ـ مسلمانوں کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی ـ یہاں لچھمن جی اور گنگامندر مشہور تھے۔ دہلی کی جامع مسجد کے نمونے پر ایک وسیع وعریض جامع مسجد بھی تھی ـیہاں سالانہ ایک بڑی نمائش بھی لگتی تھی جس میں دور دراز کے دوکاندار انواع واقسام کا سامان فروخت کرتے تھے اسی کے ساتھ مویشیوں کا میلہ اور دستکاری، پھلوں، سبزیوں اور اجناس کی نمائش کا اہتمام بھی ہوتا تھا اور انعامات بھی دیئے جاتے تھے۔ یہ نمائش شہر سے باہر ایک بڑے میدان میں دسہرہ کے تہوار کے موقع پر ہوتی تھی اس میں مختلف کھیل کود اور کرتب کے مظاہرے بھی ہوتے تھے اور ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوتا تھا ـ جس میں قرب وجوار کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ قلعہ کے گرد نہر میں روہو مچھلی بکثرت پائی جاتی تھی جو یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر لاتعداد خوانچہ فروش فروخت کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے پاکستان میں کوٹری ریلوے اسٹیشن پر پلا مچھلی بکتی ہے۔

بیانہ ، ہیلک ، پہرسر ، رارہ ، سید پورہ کے اکثر سادات نے ریاست کے اس صدر مقام بھرتپور شہر میں رہائش اختیار کرلی تھی ۔ سادات کی درج بالا قدیم بستیوں کے خاندانوں کے علاوہ شہر بھرتپور میں بعض سادات ومومنین بہ سلسلہ ملازمت بھی آکر آباد ہوئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان خانوادوں سے متعلق مرزا غضنفر حسین عروج فرزند حسن زیدی فیض بھرتپوری ، اقبال کاظمی جیسی مرثیہ نگاری میں معروف شخصیتیں ہجرت کرکے پاکستان آئیں اور کراچی میں آباد ہوگئیں۔

آگرہ (اکبر آباد)

حضرت نظیر اکبر آبادی نے آگرہ کے متعلق تحریر کیا

رکھتا ہے گو قدیم سے بنیاد آگرہ
اکبر کے نام سے ہوا آباد آگرہ
شداد زر لگا نہ بناتا بہشت کو
گر جانتا کہ ہوئے گا آباد آگرہ

حضرت نجم آفندی اکبر آبادی نے اکبر آباد (آگرہ) کے بارے میں جو مسدس لکھا تھا اس کے دو بند درج ذیل ہیں۔

اے مرے پیارے وطن اے آگرہ اے ارض تاج
دور افتادوں سے کیوں ملنے لگا تیرا مزاج
ہے گل فردوس کی خوشبو تری محفل میں آج
ذرہ ذرہ ہے شعاع حسن سے روشن مزاج
جنت ارضی ہے اب جنت سے پیوستہ ہے تو
تاج والے جنتی پھولوں کا گلدستہ ہے تو

تیری ہستی ہے جہاں میں مطمع اہل نگاہ
ہے تری اک اک عمارت تیری عظمت کی گواہ
محو راحت ہیں زمیں پر تیری شاہ کج کلاہ
تیرا دامن ہے شہید راہ حق کی خواب گاہ

دنیوی عزت ملی اکبر سے شاہنشاہ سے
دین میں اعزاز خلوت گاہ نور اللہ سے

سرزمین تاج اور مرقد نوراللہ شوستری آگرہ (اکبر آباد) ایشیا کا خوبصورت، قدیمی اور مشہور شہر ہے۔ جدید آگرہ دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر واقع ہے جب کہ پرانا شہر دریا کے مشرقی ساحل پر آباد تھا۔ آگرہ ہندی لفظ "اگر" سے نکلا ہے جس کا مطلب کان نمک ہے۔ کیونکہ کسی زمانے میں یہاں بھاپ سے نمک تیار ہوتا تھا۔ (۳۱) سنسکرت میں لفظ آگو کے معنی پہلے یا اول کے ہوتے ہیں۔ یہ کرشن جی کی گوپیوں کے راستے کا پہلا مقام تھا اس لئے آگو اور اگر سے آگرہ ہوگیا۔ (۳۲) فرانسیسی سیاح کے مطابق آگرہ دریائے جمنا کے بڑے موڑ پر واقع ہے جس کا تذکرہ مہابھارت میں اگریانا کے نام سے ملتا ہے جس کے معنی جنت کے ہیں۔ (۳) ہندو زور دے کر کہتے ہیں کہ راجہ کنش کے عہد میں جس کا صدر مقام متھرا تھا، آگرہ موجود تھا جہاں ایک مضبوط قلعہ بھی تھا جس میں راجہ مجرموں کو قید رکھتا تھا۔ (۳۴) خان بہادر لطیف کے مطابق آگرہ ہندوستان کا قدیم اور اہم شہر ہے جو زبردست راجہ جراج کی راج دھانی رہا ہے۔ اس زمانے کی یادگار کنس کہار کا نالہ آج بھی موجود ہے۔ (۳۵) غزنوی کی فوجوں نے اس کو اس بری طرح روندا کہ اس کے بعد یہ عظیم شہر غیر معروف قصبہ ہو کر رہ گیا۔ (۳۶) بہلول لودھی کے زمانے میں یہ پھر ابھرا اور ایک شہر کی حیثیت اختیار کرگیا

اور ہندوستان کے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ میں ایک اہم مقام ثابت ہوا۔
(۳۷) بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ لودھی بادشاہوں کے آگرہ کو
دارالحکومت قرار دینے سے قبل بھی یہ ایک اہم اور بڑا شہر تھا۔ (۳۸) ۱۵۰۱ء
میں سکندر لودھی نے اسے بیانہ کے گورنر سے چھین کر اپنے قبضے میں لے
لیا۔ ۱۵۰۵ء کے زبردست زلزلے کی تباہی کے بعد سکندر لودھی نے اس کی
عمارات کی از سر نو تعمیر کی، باغات لگوائے اور اپنی علم دوستی کے باعث آگرہ
کو علم و فن کے اعتبار سے بغداد و شیراز کا ہم پلہ بنادیا۔ (۳۹) سکندر لودھی
کے عہد میں علمائے ہند نیز عرب، ایران اور بخارا سے آنے والے علماء کو
شاہی مراعات اور امداد کے ذریعے جدید پایۂ تخت آگرہ میں سکونت اختیار
کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ (۴۰) اس نے سکندرہ کے قریب بارہ دری
محل تعمیر کروایا جو اس کے نام سے موسوم ہوا۔ شہنشاہ بابر نے دریائے جمنا
کے مشرقی کنارے پہ ایک خوبصورت باغ بنوایا جس کے نزدیک ایک مسجد
کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر بابر کے بیٹے ہمایوں نے کی تھی۔
( ) اکبر اعظم نے ابتدائی دور حکومت میں آگرہ میں قیام کیا لیکن اس کا
دارالخلافہ ۱۵۷۰ء تا ۱۵۸۵ء فتح پور سیکری میں رہا۔ کچھ عرصہ قیام لاہور کے بعد
۱۵۹۹ء میں وہ آگرہ واپس آیا جہاں ۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔ آگرہ کے قلعے
میں اس کی بنوائی ہوئی عمارتیں جنوب مشرق میں واقع ہیں۔ جہانگیر نے
۱۶۱۸ء میں آگرہ سے کوچ کیا اور واپس نہ آسکا۔ عہد اکبری میں آگرہ نے ایک
مرکز تعلیم کی حیثیت سے بہت ترقی کی عہد جہانگیری کے دور میں یہ ہی
صورت حال رہی تزک جہانگیری میں آگرہ کے متعلق یہ بیان درج ہے کہ
آگرہ کے باشندے دستکاری اور فنون کے اکتساب میں نیز تلاش علم میں
بہت محنت کرتے ہیں۔ ہر مذہب و ملت کے متعدد اساتذہ نے اس شہر میں

سکونت اختیار کرلی ہے۔(۳۱) شاہجہان ۱۶۳۲ء تا ۱۶۳۷ء آگرہ میں رہا اور اپنے دادا کے نام پر اس شہر کا نام اکبرآباد رکھا جو عام نہ ہوسکا۔ اس نے قلعہ آگرہ کی توسیع کی اور محلات بنوائے۔ قریب ہی تاج محل جیسا مقبرہ تعمیر کروایا۔ ۱۶۳۰ء سے ۱۶۵۰ء کے درمیان اس نے دہلی میں جامع مسجد اور دیگر عمارات بنوائیں۔ قبل اس کے کہ وہ دہلی منتقل ہوتا اپنے بیٹے اورنگ زیب کے ہاتھوں ۱۶۵۸ء میں تخت وتاج سے محروم ہونا پڑا اور سات سال تک سرکاری قیدی کی حیثیت میں زندگی گزارنا پڑی ۔ اورنگ زیب کے عہد زندگی ہی میں آگرہ انتظامی خلفشار کا شکار ہوا اور بعد میں مسلمان لشکریوں ، نادر شاہ ، جاٹوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں اس کی بار بار تباہی اور بربادی ہوئی ۔ (۳۲) ۱۷۶۴ء میں اس پر بھرتپور کے راجہ سورج مل جاٹ نے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ۱۷۷۰ء میں مرہٹوں نے قبضہ کرلیا تاہم جاٹوں نے پھر اسے واپس لے لیا۔ لیکن نواب نجف علی خاں نے انہیں مار بھگایا۔ ۱۷۸۲ء میں مرزا نجف علی خاں نے وفات پائی اس کی موت شیعیان ہند کے لئے بالعموم اور شیعیان آگرہ وبھرتپور کے لئے بالخصوص ناقابل تلافی نقصان ثابت ہوئی نیز مغل سلطنت کے دوبارہ ابھرنے کی امید بھی معدوم ہوگئی ۔ (۳۳) ۱۷۸۴ء میں جب محمد بیگ ہمدانی کا گورنر تھا۔ مہاراجہ سندھیا نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے اسے مرہٹوں کے کمانڈر ہیسنگ کو شکست دے کر فتح کرلیا۔ اس عسکری کامیابی میں سادات شاہ گنج آگرہ کے میر اکبر علی رسالدار کی جنگی مہارت اور شجاعت کا بڑا دخل تھا۔ (۳۴) ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۹ء تک یہ شہر اس وقت کے شمال مغربی صوبہ کا صدر مقام رہا۔ ۱۸۷۷ء میں یہ لفٹیننٹ گورنر کے تحت ہوگیا۔ ۱۹۰۲ء سے یہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے نام سے موسوم رہا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد اس صوبے کا نام اترپردیش ہوگیا۔

آگرہ و نواح آگرہ کو برصغیر میں ہمیشہ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے قرب وجوار میں کئی اہم لڑائیاں لڑی گئیں جن میں ہندوستان کی حاکیت کے فیصلے ہوئے۔ ۱۱۹۴ء میں سلطان محمد غوری اور راجہ قنوج کے مابین موضع چندروار فیروز آباد میں جنگ ہوئی۔ ۱۴۰۰ء میں حسین شرقی اور بہلول لودھی میں یہاں معرکہ ہوا۔ ۱۴۲۹ء میں راجپوتوں سے مبارک شاہ اور سکندر لودھی کی تحصیل باہ میں جنگ ہوئی۔ ۱۵۲۶ء میں بابر اور رانا سانگا کے مابین خانواہ نزد فتح پور سیکری کے مقام پر جنگ ہوئی۔ ۱۶۵۷ء میں سموگڑھ تحصیل فتح آباد کے مقام پر لڑائی ہوئی اور اورنگ زیب کو اقتدار ملا۔ ۱۷۰۷ء میں کھیراگڑھ تحصیل میں موضع جاجھ کے مقام پہ شہزادہ اعظم اور معظم میں لڑائی ہوئی (۳۵) ۱۷۱۹ء میں جنگ شاہ پور واقع ہوئی جس میں شکست کے نتیجہ میں سید برادران کی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔ ۱۷۲۲ء میں برہان الملک سعادت خان کے نائب کے قتل کے سلسلے میں جاٹوں کے خلاف فوج کشی ہوئی اور ۱۷۶۵ء میں راجہ سورج مل مارا گیا۔

آگرہ شہر کے بارے میں اکبر نامہ میں علامی ابوالفضل کا بیان ہے کہ دریائے جمنا وسط شہر میں پانچ کوس (دس میل) تک بہتا ہے اس کے دونوں طرف امرائے حکومت اور اہلکاران سلطنت کے عالیشان مکانات اور دفاتر ہیں جس کی خوبی اور نفاست تعمیر ناقابل بیان ہے۔ تزک جہانگیری کے مطابق آگرہ بہت بڑا شہر ہے لوگوں نے چار چار منزلہ مکانات بنوائے ہوئے ہیں شہر کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ کوئی شخص کسی گلی کوچے سے آسانی سے نہیں گزر سکتا۔ (۳۶) آگرہ شہر کو ایڈورڈ ٹیری نے نہایت مالدار اور متمول شہر قرار دیا۔ مآثر الامرا جلد اول کی رو سے آگرہ اپنی وسعت اور کثرت آبادی کے لحاظ سے بغداد پر فوقیت رکھتا ہے۔ ملا عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ

کے مطابق آگرہ شہر زمین کی مانند فراخ اور آسمان کی طرح وسیع ہے۔ لوگ شریف اور وضع دار ہیں اور ہنرمند وباکمال بھی ۔ انگریزوں نے یہاں شمالی ہند میں سب سے پہلے ۱۸۱۸ء میں کالج قائم کیا جو مرہٹوں کی تعمیر کردہ عمارت میں آگرہ کالج کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ آگرہ یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی شمار ہوئی ۔ جس سے مغربی یوپی کے اضلاع اور راجپوتانہ کے تمام کالجوں کا الحاق تھا۔ شہر میں کئی کالج ، لاتعداد مدرسے اور قدم قدم پہ پارک ، کھیل کے میدان اور باغات ہیں جن میں تاج گارڈن بہت مشہور تھا۔ تقسیم ہند کے وقت اس شہر کی آبادی تقریباً تین لاکھ تھی ۔

محکمۂ سیاحت ہند کے مطابق آگرہ میں تاج محل کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

آگرہ فورٹ اور فتح پور سیکری کے بارے میں اکبر اعظم کے عہد حکومت کے طمطراق کا ذکر کرنے کے بعد مزید تحریر کیا گیا ہے۔

Agra has all this and has Taj also.

نورجہاں کے باپ مرزا غیاث کے مقبرہ اعتماد الدولہ اور اکبر اعظم کے مقبرہ سکندرہ کے علاوہ یہاں ابوالفضل ، فیضی اور ان کی ہمشیرہ لاڈلی بیگم بھی مدفون ہیں اور چینی کا ایک روضہ بھی مشہور ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں دیال باغ کے نزدیک شہید ثالث حضرت قاضی سید نور اللہ شوستری کا مزار مقدس ہے۔ جو مرجع خلائق ہے جہاں سالانہ عظیم اجتماعات اور مجالس عزاء میں برصغیر کے ہزاروں شیعیان علیؑ شریک ہوتے ہیں۔ ان میں نامور علما و خطیب ذکر معصومین کرتے ہیں۔ اس مزار پرانوار کے احاطے میں آگرہ ونواح آگرہ کے بے شمار سادات و مومنین بھی دفن ہیں۔ برج کے اس علاقے نے گیسوئے اردو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آگرہ شہر میر

تقی میر، نظیر اکبر آبادی، غالب، بزم آفندی، نجم آفندی، سیماب اکبر آبادی، رعنا اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی نیز و دیگر لاتعداد معروف شعرائے اردو کا مولد و مسکن رہا ہے۔

مختصراً یہ کہ آگرہ (اکبر آباد) علم و ادب اور عرفان و معرفت کی قندیلیں روشن کرنے والی متعدد ہستیوں کا مسکن رہا ہے۔ ان حضرات سے نہ صرف علم و ادب کی مجلسوں کو روشنی ملی بلکہ تصوف و عرفان کی محفلیں بھی جگمگاتی رہیں۔ انہوں نے اپنی محنت و مشقت، جستجو و تلاش اور کوشش و کاوش سے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن سے آج بھی اہل علم و ہنر استفادہ کرتے اور کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔

شاہ گنج آگرہ

شاہ گنج عظیم تہذیبی شہر آگرہ کا وہ مشہور و مخصوص محلہ ہے جسے اس شہر کی آبرو کہنا مناسب ہوگا۔ یہ رضوی سادات ہیلک (بیانہ) کے ایک فرزند سید حبیب اللہ نے ۱۶۷۱ء میں جاگیر حاصل کرکے بسایا تھا۔ آپ نے ایک قلعہ نما محل تعمیر کروایا جس میں دیوان خانہ، نوبت خانہ، اصطبل اور شتر خانہ، وغیرہ تھے جو بڑی حویلی کہلائی۔ یہ روایت عام ہے کہ ہیلک کے سادات عہد غوری سے شہزادے کہلاتے تھے اسی نسبت سے اس نئی بستی کا نام شہزادہ گنج رکھا گیا جو شاہ گنج مشہور ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محلہ سادات کی بستی ہونے کی وجہ سے شاہ گنج کہلایا ہو۔ یا یہ کہ مغل عہد میں یہاں شاہی بازار ہو۔ اس لئے یہ شاہ گنج کے نام سے موسوم ہوا۔ بہر طور ۱۷۷۲ء میں رانی بھرتپور سے لڑجانے والے سادات بھی قرب و جوار میں زمینداریاں حاصل کرکے یہاں آباد ہوگئے۔ شاہان سلف کے دور میں قرب و جوار کی متذکرہ

سادات کی دیگر بستیوں کے افراد بھی بعد میں شہریت پسندی، تعلیمی سہولتوں اور تلاش معاش کی خاطر اس ترقی پذیر محلے میں آکر آباد ہوتے رہے۔ اس طرح یہ محلہ نواح آگرہ کے سادات عظام کا مرکز بن گیا۔ یہاں کے رہنے والوں نے مختلف ادوار میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں کارناموں کی وجہ سے اس محلہ کی عزت اور وقار میں مسلسل اضافہ کیا۔ شروع میں جیسا کہ میر اکبر علی رسالدار کے ایک نوشتہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہاں کے سادات ابتداء میں ہیلکی لکھتے رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ نسبت کم ہوتی گئی شاہ گنج ہیلک کا نعم البدل ثابت ہوا اور یہاں بسنے والوں کی شناخت بن گیا۔

شہر آگرہ کا یہ محلہ جامع مسجد اور قلعہ سے جانب مغرب تقریباً دو میل کے فاصلے پر آگرہ۔ فتح پور سیکری سڑک پر واقع ہے۔ جواسی محلے کی ایک

نمایاں سیاسی و قانونی شخصیت سید آل نبی کے نام سے آج تک موسوم ہے۔ اس بستی کو پرانے شہر سے تعلیمی ادارے، کھیل کے میدان اور باغ باغیچے علیحدہ کئے ہوئے تھے۔ اس لئے شہری آلودگی سے پاک صاف اور ستھری آبادی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد اس کے اطراف کے میدان اور افتادہ حصے بھی آباد ہو چکے ہیں۔ شاہ گنج کے شمال میں کرکٹ ہاکی وغیرہ کے میدان، لال ڈگی، مینا بازار، جے پور ہاؤس، لوہامنڈی اور گوکل پورہ واقع ہیں۔ جنوب میں بھرتپور اور فتح پور سیکری جانے والی سڑکیں اور ریلوے لائنیں، خواجہ کی سرائے (کربلا) اور کینٹ اسٹیشن واقع ہیں۔ مشرق میں دہلی۔ بمبئی ریلوے لائن، نارمل مڈل، ہائی، اسکول، ٹریننگ کالج، پولیس لائن اور تحصیل کے دفاتر تھے۔ مغرب میں بھوگی پورہ شمرو کا باغ، سادات کی زمینداری (بھونڈا گاؤں) اور کھریا تھے جہاں جنگ عظیم ثانی میں جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا

ہوائی اڈہ قائم ہوا تھا۔

اس آبادی کے تمام تر مکانات پختہ اور اکثر چھوٹی اینٹ اور سرخ پتھر سے بنی ہوئی سنگین حویلیاں تھیں۔یہاں بیشتر دو منزلہ اور سہ منزلہ مکانات تھے جن میں محراب نما دروازے اور دالانوں کے علاوہ ڈیوڑھیاں اور چوکیاں بھی تھیں۔ جو امارت واقتدار کی مظہر تھیں۔ بعض مکان ایسے بھی تھے جن کے طویل وعریض مردانہ حصے میں بارہ دری بھی تھیں جن میں ان کے متعدد مکین کچہریاں اور عدالتیں بھی لگاتے تھے۔ چند برٹش انداز کی کوٹھیاں بھی تھیں یہاں ایک کوٹھی بھی تھی جو شمرو سے خریدی گئی تھی ۔ یہ قلعہ نما مکان "ڈیوڑھیوں" کے نام سے موسوم تھا جہاں کبھی فرانسیسی جنرل رہتا تھا۔ محلے کی تمام سڑکیں ڈامر کی تھیں اور اندرونی گلیاں پتھر کے بڑے بڑے چوکوں کی بنی ہوئی تھیں۔ محلے میں داخلے کے لئے پانچ راستے تھے یہ چلی پاڑہ گھٹولی پاڑہ ، نئی بستی ، بڑی حویلی ، چھوٹی حویلی ، روئی منڈی نامی ذیلی محلوں میں تقسیم تھا۔ برصغیر کے بڑے شہروں میں آگرہ کا یہ وہ واحد محلہ تھا۔ جہاں سینکڑوں گھرانوں پر مشتمل ساری آبادی اثنا عشری شیعوں اور سادات کی تھی ۔ جو ایک دوسرے سے قرابتداری کے رشتے سے مربوط تھے۔ اس لئے وہاں کسی غیر کا گزر ممکن نہ تھا۔یہاں کے رہنے والے عام طور پر آسودہ حال تھے جیسا کہ مارچ ۱۹۱۳ء کے اردو ماہنامہ شیعہ (کھجوا بہار) نے جلد ۱۱ میں تحریر کیا ہے کہ "خدا کے فضل سے جس قدر تعداد متمول اور رئیس مومنین کی اس شہر آگرہ خصوصاً محلہ شاہ گنج میں آباد ہے وہ کسی اور شہر میں کم نظر آئے گی ۔" یہاں کے زیادہ تر باشندے ملازمت پیشہ تھے یا زمیندار البتہ تجارت پیشہ کم تھے۔ مالکان مکانات اگر تبادلوں کی صورت میں شہر سے باہر جاتے تو ان کے مکانات یا تو خالی رہتے یا اپنے ہی افراد کو کرائے پر دیتے۔یہاں کی

یہ بھی روایت تھی کہ غیر افراد ، سرکاری اہلکار مثلاً پولیس وغیرہ تو درکنار خوانچہ والے اور ترکاری کے ٹھیلے والے بھی بغیر اجازت محلے کے اندر پھیری نہیں لگا سکتے تھے۔ اس محلے کے درمیان میں دو چوک تھے جہاں دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجد میر اکبر علی رسالدار کی بنوائی ہوئی جسے تقسیم برصغیر کے بعد حال ہی میں سید ہمت رضا رضوی اور سید محمد یونس جعفری کی نگرانی میں دوبارہ تعمیر کرایا گیا دوسری مسجد میر نیاز علی وقف کی ہے۔ جہاں مستورات کے لے بھی ایک زنانی مسجد تھی اس محلے میں یوں تو متعدد امام باڑے تھے لیکن چھوٹا امام باڑہ قدیم ، بڑا امام باڑہ وقف میر نیاز علی عزاخانہ وقف سید ضامن علی بہت کشادہ اور مشہور تھے۔ عزاخانہ میں بہت بڑی لائبریری بھی تھی جس کا شمار ہندوستان کے بڑے کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ جس میں بڑی تعداد میں عربی وفارسی کی نادر کتب اور مخطوطات محفوظ ہیں۔ اس عزاخانے میں راقم الحروف (مولفہ کتاب) نے طلباء کی تعلیمی سہولت کے لئے رات کے وقت مفت ایک کوچنگ سینٹر بھی قائم کیا تھا۔ بچوں کے لئے ایک مکتب تھا جہاں دینی تعلیم دی جاتی تھی ۔ لڑکوں ، کے لئے ایک پرائمری اسکول قائم تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ نزدیک ہی گورنمنٹ ہائی اسکول اور ٹیچرز ٹریننگ کالج کے علاوہ چند فرلانگ کے فاصلے پر آگرہ کالج اور سینٹ جانس کالج واقع تھے جو یہاں فروغ تعلیم کا سبب بنے۔ یہاں کے مردوں میں خواندگی کا تناسب تقریباً سو فیصد تھا اکثر خواتین بھی خانگی اور دینی تعلیم سے بہرہ مند تھیں۔

شاہ گنج میں دو بازار تھے۔ ایک چھوٹا اور ایک بڑا ۔ بڑے بازار کے قریب سالانہ سالار سید مسعود غازی کی " چھڑیوں " کا میلہ لگتا تھا جو گرد و نواح میں بہت مشہور تھا۔ دور اکبری میں شہنشاہ اکبر بھی اس میلے میں شریک ہوا

کرتا تھا۔ (۴۹) قریب ہی نرچلے کا میدان تھا جہاں سالانہ پتنگ بازی کے مقابلے ہوتے تھے۔ جس میں لوگ بھاری تعداد میں اطراف آگرہ سے بھی شرکت کرتے تھے۔۔ یہ محلہ ہر اعتبار سے خود کفیل تھا۔ بجلی اور نل کے پانی کی سہولتیں ، برساتی اور گندے پانی کے نکاس کا مناسب انتظام نیز صفائی ستھرائی کا معقول بندوبست تھا۔

شاہ گنج کے مومنین کی بھاری اکثریت مذہب سے واقف ، صوم وصلوٰۃ کی عادی اور عبادار تھی ۔ خواتین سختی سے پردہ اور دیگر مذہبی رسومات کی پابند تھیں۔ ان کی سواری کے لئے پردہ پڑے ہوئے ٹھیلے استعمال ہوتے تھے کیونکہ ڈولیوں کا رواج تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مرد عام طور سے یوپی کے اشرافیہ لباس میں ملبوس نظر آتے۔ عہد مغلیہ میں کرتا انگرکھا ، جامہ پٹکا ، چوڑی دار پاجامہ ، صافہ اور سلیم شاہی جوتی اور صاحبان ثروت زربفت ، کمخواب اور ریشمی کپڑے استعمال کرتے تھے۔ انگریزی حکمرانی کے عہد میں شیروانی ، ڈھیلا پاجامہ اور ٹوپی پہنتے جب کہ بعض حضرات کوٹ پتلون اور ہیٹ میں بھی دکھلائی دیتے۔ یہاں کے سادات کو آگرہ شہر میں " میر صاحب " کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ان کی اپنی ایک شناخت تھی کہ نہ جاننے والے بھی ان کے نستعلیق انداز ، لب ولہجہ اور حلیئے سے پہچان لیتے کہ یہ شاہ گنج کے میر صاحب ہیں۔ اس بستی کے نوجوانوں کی بڑی تعداد ہاکی اور کرکٹ کے نمایاں کھلاڑیوں کی تھی جو آل انڈیا مقابلوں میں شریک ہوتے رہے۔

اس بستی میں چونکہ سب ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے اس لئے امیر وغریب کا امتیاز بھی نسبتاً کم تھا۔ اکثر اعلیٰ عہدوں پر فائز اہل شاہ گنج رخصت گزارنے کو یہاں آتے تو ان کا انداز بھی عوامی ہوتا۔ اس طرح بہت کم ہی لوگ احساس برتری یا کمتری کا شکار ہوتے۔ آگرہ ونواح آگرہ کے سادات کی اس

نمائندہ بستی کے افراد نے مذہبی، قومی، ملی اور سیاسی تحریکوں بالخصوص جنگ آزادی، تحریک پاکستان اور فروغ عزاء میں اپنی تعداد اور استعداد سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر معیاری اور نمایاں خدمات انجام دیں جس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی ۔ شاہ گنج آگرہ کی اجتماعی زندگی اور خاندانی روایات نیز ۱۸۱۸ء میں آگرہ کالج کے قیام اور اسکے بعد سرسید احمد خان سے قریبی روابط اور علی گڑھ کالج ویونیورسٹی سے تعاون کی وجہ سے علمی برتری نے یہاں کے سادات کو اعلیٰ مناصب و مراتب تک پہنچانے میں مدد دی ۔ ۲۸ نومبر ۱۹۳۶ء کو جب مہاراجہ بھرتپور کو سادات کی طرف سے جناب سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی نے یاد داشت پیش کی تو حسب ذیل خطاب یافتگاں، اعلیٰ سرکاری افسران اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کی فقط ریاست بھرتپور سے متعلق بستیوں کی تعداد شمار کی گئی تھی اس سے آگرہ و نواح آگرہ کے سادات عظام کی حشمت و عظمت اور حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایم بی ای	ایک،
خان بہادر	پانچ
خان صاحب	پانچ

اس زمانے میں ایسے نامور اور ممتاز افراد کی تعداد کم از کم سات گنا زیادہ ہوگی

سیشن جج	دو
کلکٹر (DC)	دو
ڈپٹی کلکٹر ۔	پانچ
دیوان اسٹیٹس ۔	تین
سب آرڈینیٹ جج ۔	ایک

منصف۔	دو
نان گزیٹڈ افسران مثلاً تھانیدار وغیرہ۔	پچھتر
میٹرک۔	اسی
ایم اے۔	بارہ
ایم بی بی ایس ڈاکٹر۔	دو
انٹرمیڈیٹ۔	اسی
تحصیلدار۔	دس
نائب تحصیلدار۔	بارہ
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس	دو
سول سرجن	ایک
پروفیسرز	پانچ
سرکل پولیس انسپکٹر	چھ
ہیلتھ آفیسر	ایک
وٹرنری آفیسر	ایک
کنزرویٹر فاریسٹ	ایک
گریجویٹس	بیالیس
ایل ایل بی	بارہ
بی ٹی	دو
وکیل	چھ

واضح رہے کہ یہ ۱۹۳۹ء کے وہ اعداد و شمار ہیں جو اس وقت معلوم ہوسکے اور جو یادداشت میں درج ہوئے۔ اس میں بہت سے ایسے حضرات کے بارے میں معلومات شامل نہ ہوسکیں جو دور دراز کے علاقوں میں مقیم اور

برسر عمل تھے۔ نیز شاہ گنج آگرہ کے سادات کے ذکر سے خالی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے دور میں اس قدر تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، خطاب یافتہ اور اعلیٰ عہدیدار شاید ہی کسی علاقے کے سادات میں مل سکیں۔

شاہ گنج آگرہ میں آباد خاندانوں کی طویل فہرست ہے جن کے اجمالی ذکر کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی اس لئے ہم فقط ان چند خانوادوں کا بیان ذیل میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو یہاں کے اولین آبادکار تھے یا اپنی اہمیت کے اعتبار سے ذکر خاص کے مستحق تھے۔ جیسا کہ داروغہ سید احترام علی رضوی نے اپنی تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ میں تحریر کیا ہے۔

سادات شاہ گنج آگرہ کا حسب نسب

معزالملک میران سید محمد غازی مشہدی بن میران سید ابو محمد مصطفیٰ رضوی برصغیر میں رضوی سادات بیانہ، ہیلک و شاہ گنج آگرہ کے مورث اعلیٰ تھے آپ کا سلسلہ نسب امام ہشتم حضرت علی الرضا علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ آپ کے قریبی رشتے کے ایک بھائی سید حسین مشہدی خنگ سوار تھے جنہیں اجمیر کا علاقہ تفویض ہوا اور خواجہ معین الدین چشتی کو آپ کی حمایت حاصل ہوئی۔ ان کا مزار اجمیر میں تارا گڑھی پر واقع ہے جہاں آج تک سید الشہداء امام حسینؑ کی عزاداری کا سلسلہ جاری ہے۔ کچھ روایات میں سلطان محمود غزنوی کے بھانجے سالار سید مسعود غازی کو بھی آپ کا قریبی رشتہ دار بتایا ہے۔

میران سید محمد غازی رضوی مشہدی جناب سید موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی الجواد بن امام علی رضا کی نسل میں تھے۔ امام رضا کی تعداد اولاد کے بارے میں اختلاف ہے کچھ علمائے انساب نے پانچ، کچھ نے چھ، کچھ نے آٹھ اور بعض نے فقط ایک ہی فرزند تحریر کیا ہے۔ تذکرۃ السادات مولفہ شیخ احمد

بن محمود ، منبع الانساب مصنفہ معین الحق ، کنز الانساب مرتبہ عطا حسین عبدالرزاق اور دیگر کتابوں مثلاً تذکرۃ الائمہ ، ریاض الشہادۃ ، روضۃ الشہداء حدیقۃ الشیعہ میں پانچ بیٹے لکھے ہیں یعنی امام محمد تقی الجوادؑ ، جناب سید حسن ، جناب سید علی ، جناب سید ابراہیم اور جناب سید جعفر - ان پانچوں سے عقب بھی تسلیم کئے گئے ہیں - بحر الانساب مولفہ ابو مخنف بن لوط ، کنزالانساب مصنفہ علامہ اجل سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور کتاب الانساب مرتبہ علامہ قدسی کے مطابق آپ کے آٹھ فرزند تھے یعنی مندرجہ بالا پانچ کے علاوہ جناب سید ہادی ، جناب سید یعقوب اور جناب سید فضل بھی امام ہشتم کے صاحبزادوں میں تھے - ان سب سے عقب بھی باقی رہے اور ان کے پوتوں پرپوتوں کی تفصیل بھی دی گئی ہے - تاریخ آئمہ مولفہ آقائے سید علی حیدر مجوہ میں چھ بیٹوں کے نام دیئے گئے ہیں - تاہم اس کتاب کی طبع جدید شائع کردہ کتب خانہ شاہ نجف لاہور ۳۹۷ پر امام علی رضا کے چھ فرزندوں کا تذکرہ ہے لیکن نام نہیں دیئے گئے - مختلف علمائے انساب کے تذکروں میں دیئے ہوئے ناموں میں امام محمد تقی الجوادؑ ، جناب سید حسن ، جناب سید علی ، جناب سید ابراہیم اور جناب سید جعفر کے اسمائے گرامی مشترک ہیں - علامہ سید سلیمان ندوی جناب سید حسن ہی کی اولاد میں بتلائے جاتے ہیں جیسا کہ تذکرہ سلیمان مولفہ غلام محمد مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۷۵ پر درج ہے - خواجہ بختیار کاکی کا سلسلہ نسب جناب سید جعفر بن امام رضا سے ملتا ہے ، خواجہ معین الدین چشتی جناب سید ابراہیم بن امام رضا کی نسل میں تھے جیسا کہ بوستان اخیار مولفہ سعید احمد مارہروی حدیقۃ الاولیاء مرتبہ غلام سرور تذکرۃ الواصلین مولفہ غلام دستگیر خاں اور گلزار شمس تبریز مصنفہ شجاع الملک میں تحریر ہے - اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام علی رضا کی اولاد نرینہ ایک سے یقیناً زیادہ تھی - واضح رہے کہ عام طور پر شیعیان علی میں تین آئمہ معصومین کی زیارت پڑھنے کا دستور رہا ہے - (۱) امام حسینؑ (۲) امام علی رضا (۳) امام زمانہؑ - امام علی رضا کی زیارت میں آپ کی کنیت ابوالحسن ہے اس

لئے امام رضا کے دوسرے فرزند یعنی جناب سید حسن تو یقیناً تھے۔ لہذا یہ بحث کہ امام رضا کے فقط ایک بیٹے تھے، قطعی لاحاصل ہے۔

امام محمد تقی الجواد کی اولاد نرینہ میں اختلاف تعداد ہے۔ کچھ مورخین و نساب نے آپ کے دو بیٹے اور کچھ نے چار فرزند بتلائے ہیں تاہم امام علی نقی اور جناب سید موسیٰ مبرقع پر سب کا اتفاق ہے۔ جناب سید موسیٰ مبرقع کے دو بیٹے جناب سید احمد اور جناب سید محمد تولد ہوئے۔ بعض مورخین نے ایک اور بیٹے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جن کا نام سید عمران بتلایا ہے۔ مشہد مقدس میں ان کی اولاد کو "سادات اخوئی" کہا گیا جیسا کہ کتاب بحرالانساب میں درج ہے۔ جناب سید محمد بن جناب سید موسیٰ مبرقع کو بھی بعض نساب نے منقطع النسل قرار دیا ہے لیکن علامہ دینوری کے مطابق آپ صاحب اولاد تھے اور مشہد مقدس کے "بنی خشاب" ان ہی سے اپنا سلسلہ نسب جوڑتے ہیں لیکن کتاب عمدة الطالب فی انساب آل ابی طالب طبع اول طبع لکھنو ۱۸۱ اور طبع جدید نجف اشرف ۱۹۸۸ء صفحات ۲۰۱ ۔ ۲۰۲ کی تحریر کے مطابق نسل بنی خشاب کو باطل قرار دیا گیا ہے۔

جناب سید احمد (سید احمد کبیر) بن جناب سید موسیٰ مبرقع پر سب مورخین اور نسابین متفق ہیں۔ موصوف کوفہ سے قم تشریف لائے۔ آپ کے عقب میں ایک فرزند سید محمد اعرج زرین کمر ہوئے۔ کمسنی میں آپ کے پائے مبارک کو کچھ صدمہ پہنچا تھا۔ جس کے باعث آپ کا لقب اعرج ہوگیا۔ آپ کی کمر کا پٹکہ زرو جواہرات سے مزین تھا اس لئے آپ زرین کمر بھی مشہور ہوئے۔ موصوف نہایت حسین وجمیل، صاحب علم وفضل اور حامل کمالات وصفات حسنہ تھے۔ آپ کے دشمن بھی آپ کی عظمت اور پاکیزہ سیرت کے مداح تھے۔ معتمد عباسی کے عہد ظلم میں ۳ ربیع الاول ۳۱۵ ہجری مطابق ۹ مئی ۹۲۷ء کو وفات پائی ۔ آپ کے صاحبزادے جناب سید احمد نقیب قم کی ولادت ماہ شوال ۳۱۱ ہجری میں ہوئی تھی ۔ موصوف بھی بڑے صاحب علم وحکمت اور محدث وفقیہ تھے۔ آپ نے ۱۵ صفر ۳۵۸ ہجری مطابق ۸ جنوری

۴۹۹ . کو قم میں رحلت کی ۔ آپ کے چار فرزند ہوئے یعنی سید موسیٰ ، سید ابوالقاسم علی ، ابو علی سید محمد اور ابو محمد سید حسن ۔ جناب سید موسیٰ کے تین بیٹے ہوئے۔ سید عبداللہ جعفر ، سید ابوالفتح اور سید احمد ۔ جناب سید عبداللہ جعفر کے سید روح اللہ اور ان کے ابوالفضائل سید بقا اللہ تولد ہوئے۔ ان کے بیٹے سید ابو محمد محسن ، ان کے بیٹے سید ابراہیم ، ان کے بیٹے سید محمد عباس ، ان کے بیٹے سید ابوالقاسم ، ان کے فرزند ابو محمد سید مصطفیٰ ہوئے۔ آخرالذکر کے عظیم المرتبت صاحبزادے معزالملک میران سید محمد غازی رضوی مشہدی ہوئے۔ ان کے فرزند میراں سید حسن ، ان کے بیٹے میران سید بدرالدین ، ان کے بیٹے میران سید رکن الدین ، ان کے بیٹے میران سید باقر ، ان کے بیٹے میران سید عبدالمعالی ، ان کے بیٹے میران سید صدر الدین ، ان کے بیٹے میران سید بہاالدین ، ان کے بیٹے میران سید مرتضیٰ ان کے بیٹے سید محمد تقی ، ان کے بیٹے میراں سید مصطفیٰ ثانی ، ان کے بیٹے میران سید محمد غازی ہوئے۔ آخرالذکر کے دس بیٹوں میں میران سید محمد دولت اور میران سید ثنااللہ نمایاں تھے باقی بیٹوں کی اولاد دوسرے مقامات پر منتقل ہو گئی ۔ میران سید محمد دولت کے فرزند میران سید عبداللہ ہوئے جن کے بیٹے میران سید مصطفیٰ ثالث کے دو فرزند سید داہ حسین اور سید علی بزرگ ہوئے۔ سید داہ حسین شہید کا مزار رارہ میں دادا پیر کے نام سے مرجع خلائق ہے۔ میران سید علی بزرگ کے دو بیٹے میران سید نواز علی اور میران سید محمد یحییٰ ہوئے۔ آخرالذکر کے اخلاف قصبہ رارہ ریاست بھرتپور اور مہابن ضلع متھرا میں آباد تھے۔ سید نواز علی کے تین صاحبزادے میران ، سید فرید ، میران سید فضیل اور میران سید حسن میر ہوئے جن کے ناموں سے تین تھوک (خاندان) تھوک فرید ، تھوک فضیل اور تھوک میر مشہور ہوئے۔ میران سید محمد غازی ثانی کے دوسرے فرزند میران سید ثنا اللہ کے بیٹے میران سید فتح اللہ ، ان کے بیٹے سید محمد چاند ، ان کے بیٹے سید رکن الدین ڈوکر ہوئے۔ آخرالذکر ہی سے تھوک ڈوکر کا سلسلہ چلا۔

میر سید فضیل بن سید نواز علی کے صاحبزادے حاجی سید ابراہیم نے سلطان محمد غوری کے فرمان ۵۹۳ ہجری کی اکبر اعظم سے ۹ ربیع الاول ۹۸۳ ہجری کو تجدید کروائی تھی جس میں واضح طور پر اخلاف معزالملک میران سید محمد غازی مشہدی کو شہزادگان تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ربیع الاول ۱۱۳۲ ہجری میں جاٹ ریاست بھرتپور کے دوران ہیلک کی عظیم جائیداد بڑی حد تک قطع و برید کر کے سید فرید، سید فضیل، سید میر اور سید رکن الدین ڈوکر کے ورثا میں منقسم ہو گئی۔ ابنائے فرید الدین میں سے ایک بزرگ سید حبیب اللہ ۱۱۴۲ کے لگ بھگ جاگیر حاصل کر کے شاہ گنج آگرہ میں مرکز سادات کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ جہاں بعد میں ہیلک اور نواح آگرہ کی دیگر بستیوں کے سادات نے آباد ہو کر اس بستی کو ترقی کے بام و عروج تک پہنچایا جس کا ذکر آئندہ ابواب میں کیا جائے گا۔

شجروں کی ترتیب و تدوین :۔ مستقرالخلافہ اکبر آباد کی نواحی ریاست بھرتپور ۱۸۲۳ء میں انگریزوں نے فتح کی، ۱۸۵۵ میں ریاست کی زینداریوں کا از سر نو بندوبست ہوا۔ اس وقت سید غلام حسین جعفری نائب افسر بندوبست تھے۔ جو بعد میں اکھے گوڑہ کے تحصیل دار مقرر ہوئے اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ زینداریوں کے بندوبست میں شجروں کی جانچ پڑتال ضروری ہوتی ہے۔ تاکہ زینداری کی عادلانہ تقسیم ہو سکے۔ لہذا موصوف نے سرکاری ریکارڈ سے اس علاقے کے سادات کے شجرے محفوظ کرنے کی سعی بلیغ کی۔ شیر شاہ سوری سے قبل برصغیر میں زینداری کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ تھا جس کو مغل اعظم شہنشاہ اکبر نے باقاعدگی دی۔ اکبر اعظم ہی سے حاجی سید ابراہیم بن سید فضیل رضوی المشہدی نے ۹ ربیع الاول ۹۸۳ ہجری مطابق ۲۱ جلوس شاہی ہیلک اور پہرسر کی جاگیر کی اسناد حاصل کیں۔ اسی لئے دور اکبری کے سادات عظام سے آج تک کی نسلوں میں کوئی واضح اختلاف

نہیں ہے۔ ڈپٹی کلکٹر سید غلام حسین جعفری کے شجرہ نسب کو ان کے خلف اکبر سید محمد عرف منجوجی نے حکیم مولوی سید ضامن علی رضوی کے تعاون وشراکت سے مرتب کیا۔ یہ سرمایہ ان کے انتقال کے بعد سید محمد ابوتراب جعفری کو ملاجن سے سید موسیٰ رضا رضوی شاد بھرتپوری نے حاصل کرلیا۔ اس کی نقل تحصیلدار سید ظہیر الحسن رضوی بھرتپوری کو ملی جو ان کے فرزند سید آصف رضا مرحوم کے پاس رہی ۔ شاد بھرتپوری مرحوم کا مرتب کردہ نسب نامہ ان کے بھتیجے سید محسن رضا رضوی کی تحویل میں ہے۔ ایک کرسی نامہ سید وصیت علی جعفری تحصیلدار مرحوم نے مرتب کیا جو شجرہ طوبیٰ اور باغ سادات کے نام سے معنون ہوا۔ یہ ان کے خلف الرشید سید عبداللہ جعفری کو ملاجو ان کے ایک پوتے سید مصطفیٰ حسین جعفری سرکل انسپکٹر سی پی (انڈیا) تک پہنچا۔ اس نسب نامے کی ایک نقل تحصیلدار سید شمس الحسن جعفری بن خان بہادر سید امداد علی جعفری مرحوم اور ایک مسودہ مرتبہ سید حبیب احمد مرحوم بن سید مصطفیٰ حسین مرحوم سے جو افواج بھرتپور میں ایڈجوانٹ تھے ، سید موسیٰ رضا رضوی شاد بھرتپوری کو دستیاب ہوا۔ ان نسب ناموں کی بنیاد پر شاد بھرتپوری تحصیلدار سید ظہیر الحسن رضوی اور سید منظور احمد جعفری مرحومین نے متذکرہ بستیوں کے سادات کے شجروں کو مرتب کیا۔ آخر الذکر نے کراچی ، حیدرآباد اور دیگر علاقوں میں آباد برادری کے افراد سے ملاقات کرکے نسب ناموں کو مکمل کیا۔ موصوف کے نسب ناموں کی خصوصیت وانفرادیت یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہوسکا گزشتہ دس بارہ نسلوں کی متذکرہ شخصیتوں کے تذکرے کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ان کی شادیاں کہاں اور کن خاندانوں میں ہوئیں اور ان خاندانوں کا نسب نامہ کن صفحات پر درج ہے اور ان کے بیٹے اور بیٹیوں کے رشتے کہاں اور

کن خانوادوں میں قائم ہوئے۔ اور ان کا شجرہ کس صفحہ پر درج ہے اس
انداز میں ترتیب شدہ نسب نامہ شاید ہی کسی دوسرے سادات کے پاس ہو۔
متذکرہ بستیوں کے نسب نامے موصوف کے برادر نسبتی ماسٹر سید منظور
الحسن رضوی شہید کے نامور فرزند سید محمود الحسن رضوی کی تحویل میں ہیں۔
ایک نسب نامہ، فتح پور سیکری کے حکیم سید انوار حسین رضوی (تھوک میر)
نے ترتیب دیا جو ان کے بھائی سید کرار حسین عرف ظفر مہدی مرحوم کے
پاس تھا۔ ایک نسب نامہ عزاخانہ شاہ گنج آگرہ میں سنگ مرمر کی تختی پر میر
ضامن علی رضوی بن سید ہمت علی رضوی نے کندہ کروایا تھا۔ ایک نسب
نامہ ہیلک کے سید الطاف علی رسالدار (تھوک ڈوکر) نے مرتب کیا جو سید
آل رسول رضوی (خیرپور سندھ) کی تحویل میں ہے۔ ایک شجرہ نسب ماسٹر
سید حسن جعفری عرف مولوی بدا نے ترتیب دیا جو ان کے پوتے سید نصرت
جعفری کے پاس ہے۔ ایک نسب نامہ سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر (تھوک
فرید) نے مرتب کیا جو ان کے پرپوتے سید شجاعت حسین رضوی بن داروغہ
سید علمدار حسین کی تحویل میں ہے۔ ایک شجرہ نسب سید فضل رسول
رضوی (تھوک فضیل) نے اپنی کتاب ہفت بند زہرا میں تحریر کیا ہے۔
ایک کرسی نامہ سید زوار حسین عرف بدھا نے ترتیب دیا جس کے ساتھ حکیم
سید علی رضا بیانوی کی تاریخ بلدہ بیانہ قلمی کا کچھ حصہ بھی نقل کیا ہے جو ان
کے ایک پوتے سید مردان علی شاہ سابق کونسلر گلبہار (گولیمار) (مقیم حال
امریکہ) کے پاس ہے۔ ایک نسب نامہ سید عزیز الحسن بن سید قادر علی رضوی
(تھوک ڈوکر ۔ اکبر جام) نے مرتب کیا جو ان کے ایک پوتے میجر سید علی
سعید رضوی (لاہور) کی تحویل میں ہے۔ ان سب نسب ناموں کی نقول سید
حسن مشیر رضوی ابن سید علی اوسط رضوی کے پاس محفوظ ہیں۔

ان تمام نسبناموں میں دور اکبری سے عہد حاضر تک کی نسلوں کے سلسلے میں بین اختلاف نہیں ہے البتہ کہیں کہیں ناموں مثلاً حسن کی جگہ حسین، تقی کے بجائے نقی، فضیل کی جگہ فضائل جیسے الفاظ کی املا کا اختلاف ضرور پایا جاتا ہے۔ جس سے کوئی اہم یا بنیادی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح دور اکبری سے عہد سلطان محمد غوری اور دور سلطان غوری سے امام علی رضا کے عہد کے درمیان گو نام ملتے جلتے ہیں۔ مگر ترتیب مختلف ہو گئی جو نسب کی کڑیوں کے ناموں کے آگے یا پیچھے اور کنیت یا عرفیت تحریر کرنے کے باعث ہوئی ہے۔ اگر کسی ایک نسب نامے میں بعض اسماء چھوٹ گئے ہیں تو دوسرے نسب نامے میں وہ شامل ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سادات عظام میں دستور رہا ہے کہ وہ اپنے اجداد کے ناموں پر اپنے اخلاف کے نام رکھتے رہے ہیں جس کے باعث نسب نامہ مرتب کرنے والوں کو اشتباہ ہوا اور ایک ہی جیسے اسما کی وجہ سے اکثر شجروں میں درمیان کے کچھ نام نظر انداز ہوگئے یا دوسرے سلسلوں سے ملا دیئے گئے۔ مثلاً تحصیلدار سید ظہیر الحسن رضوی نے اول تو سادات ہیلک کا سلسلہ نسب بلاواسطہ امام علی رضا کے فرزند جناب سید ابراہیم سے ملا دیا ہے نیز سید فضیل رسول صاحب رضوی نے بھی اپنی معروف کتاب ہفت ہند زہرہ میں اپنا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم بن امام علی الرضا سے ملایا ہے اور خود کو میران محمد غازی مشہدی سے جو ۵۹۲ میں وارد ہند ہوئے چار صدیوں میں ملایا ہے جبکہ میراں محمد غازی اور موصوف کے درمیان میں آٹھ صدیوں کا فصل ہے۔ جو قرین قیاس نہیں جب کہ اس علاقے کے دیگر تمام نسابین نے یہ سلسلہ امام محمد تقی الجوادؑ بن امام علی رضا کے فرزند جناب سید موسیٰ مبرقع تک پہنچایا ہے۔ موصوف نے امام علی رضا سے معزالملک سالار سید محمد غازی

رضوی مشہدی تک تیرہ نسلیں لکھی ہیں۔ عزاخانہ شاہ گنج آگرہ میں کندہ شجرہ نسب کی رو سے سادات بیانہ و ہیلک جو سادات شاہ گنج آگرہ کے اسلاف تھے کو جناب سید موسیٰ مبرقع کے اخلاف میں تحریر کیا ہے اور امام علی رضا سے سالار سید محمد غازی مشہدی تک سترہ نسلیں دکھلائی ہیں۔ اسی طرح سید الطاف علی رضوی رسالدار، سید شجاعت حسین رضوی ڈپٹی کلکٹر، سید زوار حسین عرف بدھا نے بھی جناب سید موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی الجواد بن امام علی رضا ہی سے سادات ہیلک کا سلسلہ نسب شروع کیا ہے اور سالار سید محمد غازی تک اٹھارہ نسلیں تحریر کی ہیں۔ سید منظور احمد جعفری نے بھی سادات ہیلک کے سلسلہ نسب کو امام محمد تقی الجواد سے ابتدا کی ہے لیکن سالار سید محمد غازی تک اکیس نسلیں شمار کی ہیں۔ حکیم سید انوار حسین رضوی نے بھی سادات ہیلک کا سلسلہ نسب جناب سید موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی الجوادؑ پر منتج کیا ہے اور آپ نے سالار سید محمد غازی تک بارہ نسلیں دکھلائی ہیں۔ سید عزیز الحسن رضوی (اکبرجام) نے بھی امام محمد تقی الجوادؑ سے سالار سید محمد غازی تک بارہ نسلیں ہی تحریر کی ہیں۔ اس طرح امام محمد تقی الجواد سے سالار سید محمد غازی تک بارہ نسلوں کا ہونا قابل فہم ہے کیونکہ امام نہم سے سالار محمد غازی تک تقریباً چار صدیوں کا وقفہ گزرا ہے اور عام طور سے ایک صدی میں تقریباً تین نسلوں کا اوسط تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ نسب صحیح معلوم دیتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت علیؑ کی ولادت سے امام حسن عسکریؑ کی شہادت تک تقریباً ۲۸۲ سال کی مدت کے دوران دس پاکیزہ نسلیں گزری ہیں اس اعتبار سے بھی ایک صدی میں تقریباً ۳ ہی نسلوں کا اوسط آتا ہے۔

اجماع مورخین ونسابین ہے کہ ہیلک کے سادات رضوی جناب سید

موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی الجوادؑ بن امام علی رضا علیہ السلام کی ذریت میں ہیں نہ کہ جناب سید ابراہیم بن امام علی رضا کی اولاد میں جیسا کہ سید ظہیر الحسن رضوی تحصیلدار اور سید موسیٰ رضا رضوی شاد نے اپنے نسب ناموں میں تحریر کیا ہے۔ نیز ان ہر دو حضرات نے سالار سید محمد غازی سے حاجی سید ابراہیم بن سید فضیل تک جنہوں نے عہد اکبری میں فرمان کی تجدید کروائی تھی، فقط تین تا پانچ افراد کے نام لکھے ہیں جبکہ سالار سید محمد غازی مشہدی ۵۴۳ ہجری میں وارد ہند ہوئے تھے اور حاجی سید ابراہیم بن سید فضیل نے ۹۸۳ ہجری میں اکبر اعظم سے تجدیدی فرمان حاصل کیا۔ اس لئے چار صدیوں میں مختلف تھوکوں (خاندانوں) میں تین تا پانچ نسلوں کا شمار قطعی ناقابل فہم ہے۔ دیگر نسابوں سے بھی ناموں کی تکرار کے باعث کچھ کڑیاں غائب اور نام حذف ہوگئے جب کہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ امام علی رضا سے سالار میران سید محمد غازی مشہدی (۵۴۳ھ) تک پندرہ نسلیں گزری ہیں اور میران سالار سید محمد غازی سے حاجی سید ابراہیم بن سید فضیل (۹۸۳ھ) تک بارہ نسلیں شمار ہوتی ہیں۔ نسابین کی اکثریت نے ان چودہ نسلوں کے بعض افراد کے ناموں کو سالار سید محمد غازی مشہدی اور جناب سید موسیٰ مبرقع کے درمیان لکھ کر ان کو ۱۴ کے بجائے یا تو اکیس نسلوں تک پہنچا دیا ہے یا جزی تعداد کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لئے کہ چار صدیوں کے دوران (۲۰۱ھ تا ۵۴۳ھ) چودہ نسلوں کا ہونا درست ہے۔ اسی طرح دور اکبری کے سید فضیل، سید رکن الدین عرف ڈوکر سید میر اور سید فرید الدین تقریباً ہمعصر تھے۔ یعنی سید رکن الدین ڈوکر ۹۸۳ھ میں موجود تھے جب تجدیدی فرمان حاصل کیا گیا۔ سید رکن الدین ڈوکر سے میر اکبر علی رسالدار تک ۱۲۰۰ھ میں حیات تھے، تقریباً دو سو سال میں سات نسلوں کی موجودگی، نسلوں کے اوسط فی صد تین سے مطابقت رکھتی ہے۔ میر اکبر علی رسالدار

سے موجودہ نسل یعنی گوہر مہدی بن سید افتخار رضا رضوی تک (۱۲۳۴ تا ۱۴۲۱ھ) دو سو برس کی مدت میں سات نسلیں ہی ہوتی ہیں اور یہ اوسط صحیح اور مسلّمہ ہے۔ اگر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے آج تک کی نسلوں کا شمار کیا جائے تو سادات رضوی بیانہ، ہیلک وشاہ گنج آگرہ کے چاروں تھوکوں (خاندانوں) میں چودہ صدیوں میں ۴۲ تا ۴۸ نسلیں ہوتی ہیں۔ یہ اوسط بھی ایک صدی میں تقریباً تین نسلوں ہی کا بنتا ہے جو مسلّمہ اصول پر پورا اترتا ہے۔ اس لئے ہمارا مرتب کردہ نسب نامہ ہر اعتبار سے صحیح مستند اور معتبر ہے۔

آگرہ ونواح آگرہ (بیانہ، ہیلک اور شاہ گنج آگرہ) کے سادات کے نسب ناموں کی تدوین میں متذکرہ بزرگوں نے بڑی کاوشیں کی ہیں جو لائق صد ستائش ہیں خاص طور پر فتح پور سیکری کے حکیم سید انوار حسین رضوی نے جو خصوصی توجہ دی اس کے باعث بہت سے اشتباہات رفع ہوگئے اور خامیوں کو دور کرنے میں بڑی مدد ملی نیز رضوی سادات رارہ وسہاین کا سلسلہ انساب جس میں متعدد کڑیاں غائب تھیں، وہ بھی معلوم ہوگئیں اور ان کا سلسلہ بھی جناب سید یحییٰ بن میران سید بزرگ کے توسط سے سادات ہیلک کے جد امجد معزالملک سالار سید محمد غازیؒ سے ہی مربوط ہے۔

چونکہ بزرگوں کے مرتبہ نسب ناموں کی نقول مختلف خاندانوں میں محفوظ ہیں جن میں امام علی رضا سے سید فضیل، سید میر، سید فرید اور سید رکن الدین ڈوکر تک ناموں کی ترتیب وتعداد میں فرق ہے تاہم سید فضیل، سید میر، سید فرید اور سید رکن الدین ڈوکر سے تاحال سلسلہ نسب صحیح ہیں اس لئے ان چاروں تھوکوں میں سے ہر ایک تھوک (خاندان) میں متعدد نسلوں میں سے ایک ایک نسل کے تاحال نام درج ذیل ہیں تاکہ جو حضرات مناسب سمجھیں اپنے نسب ناموں کو موازنہ کرکے تصحیح کرلیں۔

(۱) تھوک فرید

سید فرید کے بیٹے سید ابراہیم ان کے سید چاند، ان سے سید مراد، ان کے سید روشن علی، ان کے سید ہمت علی، ان کے صاحب زادے میر ضامن علی تحصیلدار میر ضامن علی کے بیٹے سید محمد حسن، ان کے سید شبیر حسین، ان کے سید رضا حیدر، ان کے سید رضا رضوی، ان کے سید علی رضا وسید ابراہیم، سید محمد علی، ڈاکٹر سید محمد حسین، سید محمد رضا سید محمد عباس (موجودہ)

(۲) تھوک فضیل

سید فضیل کے بیٹے سید ابراہیم، ان کے سید کمال، ان کے سید ہاشم، ان کے سید اسحاق، ان کے سید کرم علی، ان کے سید مرشد علی، ان کے سید اوصاف علی، ان کے مولوی سید ضامن علی رضوی پروفیسر آگرہ کالج ۱۸۵۰ء ان کے سید علی محمد انسپکٹر پولیس، ان کے داروغہ سید محمد احمد، ان کے سید رضا حامد (مرحوم)

(۳) تھوک میر

سید رکن الدین حسن میر، ان کے بیٹے سید محمد شاہ، ان کے سید اسرار علی، ان کے سید وقار علی عرف ننھن، ان کے سید نذر علی، ان کے سید علی نقی، ان کے سید امیر علی، ان کے سید احمد حسین، ان کے سید آل حسن ان کے ماسٹر سید منظور الحسن، ان کے سید محمود الحسن رضوی، ان کے سید سعید الحسن رضوی مجاہد اور سید ندیم الحسن رضوی (موجودہ)

(۴) تھوک ڈوکر

سید رکن الدین ڈوکر، ان کے بیٹے سید شبیر، ان کے سید شبر، ان کے سید علی، ان کے سید محمد عاقل، ان کے سید محمد علی، ان کے میر اکبر علی

رسالدار ان کے سید ببر علی ان کے سید حسن رضا ، ان کے سید محسن رضا ، ان کے سید علی اوسط ، ان کے سیّد حسن مشبر ان کے سید آل محسن اور سید علی شبر (موجودہ)

چونکہ زیر نظر کتاب نہ تو نسب نامہ ہے اور نہ یہ ممکن تھا کہ اس تالیف کے محدود صفحات میں آگرہ ونواح آگرہ کی مختلف بستیوں کے سادات جعفری ، نقوی زیدی اور رضوی تو درکنار سادات ہیلک کے تمام افراد اور شاہ گنج آگرہ میں آباد تمام خاندانوں کے نسب نامے اور اسمائے گرامی تحریر کئے جاتے۔ نیز متذکرہ بستیوں سے متعلق سادات کی موجودہ تعداد پاکستان اور دیگر ممالک میں ہزاروں سے متجاوز ہے جن کی ترتیب وتدوین کے لئے وقت وقت نظر ، کارکنوں اور وسائل کی ضرورت کے علاوہ کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی اس سے اجمالی تذکرہ کیا گیا ہماری معلومات کی حد تک اب ہندوستان میں ان سلسلوں کے صرف چار خانوادے باقی رہ گئے ہیں۔ ایک بلرام پور میں سید علی سردار جعفری دوسرے شاہ گنج میں آغا سید ابو القاسم رضوی مہتمم عزاخانہ کے تین صاحبزادگان سید ہمت رضا ، سید جواد احمد اور سید ظفر احمد کے علاوہ سید محمد یونس جعفری جو لاولد ہیں اور گارڈ سید اطہر حسین جعفری کے صاحبزادے اور شاید ہی کوئی اور ہو۔

حوالہ جات

۱) عہد قدیم کا انڈیا اور ایران (انگریزی) مطبوعہ دہلی ۱۹۸۲ء
۲) عرب و ہند کے تعلقات (انگریزی) مطبوعہ دہلی ۱۹۷۵ء
۳) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند (انگریزی) ڈاکٹر اطہر عباس رضوی ، مطبوعہ آسٹریلیا اردو ترجمہ کاظم مہدی جعفری کینڈا۔
۴) تاریخ سادات بھرتپور ۔ مولفہ سید ظہیر الحسن رضوی تحصیلدار بھرتپور مطبوعہ کراچی ۱۹۵۰ء
۵) امپریل گز آف انڈیا جلد ۲ مرتبہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر
۶) مکاتیبات سر سید احمد خان
۷) تاریخ فرشتہ مطبوعہ بمبئی / طبقات ناصری جلد اول
۸) تاریخ راجستھان / تاریخ بلدہ بیانہ / تاریخ سادات بھرتپور
۹) تاریخ راجستھان / تاریخ سلاطین اردو
۱۰) تاریخ سادات بھرتپور / راجہ سورج مل (انگریزی) کنور نٹور سنگھ
۱۱) تاریخ سادات بھرتپور / راجہ سورج مل (انگریزی) کنور نٹور سنگھ
۱۲) امپیریل گزٹ آف انڈیا جلد ۲ / تاریخ راجستھان للتا پرشاد میرٹھی
۱۳) تاریخ راجستھان / بیانہ ۔ ایک تاریخی بستی
۱۴) امپریل گزٹ اف انڈیا ۔ ہنٹر
۱۵) تزک بابری
۱۶) بیانہ ۔ ایک تاریخی بستی / طبقات ناصری جلد ۲
۱۷) عہد اسلامی میں علمی ترقی / طبقات ناصری جلد ۲ / بیانہ ایک تاریخی بستی
۱۸) عہد اسلامی میں علمی ترقی / طبقات ناصری جلد ۲ / بیانہ ایک تاریخی بستی
۱۹) ، ۲۰) بیانہ ایک تاریخی بستی ۔ عبداللہ چغتائی
۲۱) تاریخ فیروز شاہی ۔ مورخ برنی

۲۲) ٹورسٹ گائیڈ آف انڈیا ۱۹۷۵ء

۲۳) تاریخ راجستھان / تاریخ سادات بھرتپور

۲۴) تاریخ بلدہ بیانہ / تاریخ سادات بھرتپور

۲۵) تاریخ سادات مومنین شاہ گنج آگرہ جلد ۲ قلمی ۔ داروغہ سید احترام علی / مجلہ تجلیات فکر ۔ مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ

۲۶) تاریخ سادات بھرتپور / گلدستہ سادات از منظور احمد جعفری

۲۷) عمر رفتہ از محمد تقی خورجوی

۲۸) ٹورسٹ گائیڈ آف انڈیا ۱۹۷۵ء / مغل عہد کی عمارات و محلات (انگریزی)

۲۹) ٹروٹ گائیڈ آف انڈیا ۱۹۷۵ء / مغل عہد کی عمارات و محلات (انگریزی) / سفرنامہ فیج

۳۰) تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند (انگریزی) جلد ۱

۳۱) ، ۳۲) تاریخ آگرہ / مرقع اکبر آباد

۳۳) ، ۳۴) تاریخ آگرہ / مرقع اکبر آباد

۳۵) تاریخ آگرہ / آگرہ و دہلی (انگریزی کی کتاب) ـــــ بارسویرا

۳۶) تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۲

۳۷) تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ قلمی / تجلیات فکر محرم ۱۳۷۸ھ

۳۸) تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ قلمی / تجلیات فکر محرم ۱۳۷۸ھ

۳۹) تاریخ سادات بھرتپور / تاریخ بلدہ بیانہ / تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ قلمی

۴۰) کتاب انوار قم (تاریخ سادات رضوی) ـــ

۴۱) تاریخ سادات بھرتپور / گلدستہ سادات منظور احمد جعفری / تاریخ بلدہ بیانہ / تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ

۴۲) تاریخ سادات بھرتپور / گلدستہ سادات منظور احمد جعفری / تاریخ بلدہ بیانہ / تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ

۴۳) تاریخ آگرہ، تاریخ اثنا عشری شعیان ہند جلد اول

۴۴) تجلیات فکر و مطبوعہ کراچی ۱۳۷۸ھ / تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ قلمی جلد ۲

۴۵) تاریخ آگرہ / مرقع اکبر آباد

۴۶) تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ قلمی جلد ۱ / ۲ تاریخی یادداشتیں قلمی (زوار حسینیہ بدھا) سید عزیز الحسن رضوی اکبر جام

ooo

باب ۴

سادات شاہ گنج آگرہ

کے چند خاندانوں کا تذکرہ

جیسا کہ پہلے لکھا گیا کہ شاہ گنج کے اس مرکز سادات کو سید حبیب اللہ نے ۱۷۰۴ء کے لگ بھگ آباد کیا تھا ان کے ہمراہ ان کے بہنوئی سید عبدالعزیز بھی تھے۔ یہ دونوں خاندان ہیلک کے تھوک فرید میں رضوی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ اندازاً ۱۷۳۰ء میں سید حبیب اللہ کی دعوت پر میر اکبر علی رسالدار کے والد سید محمد علی پیمدار نے ہیلک سے آکر یہاں سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد میر نیاز علی کے والد سید صاحب علی یہاں تشریف لائے اور پھر غالباً ۱۷۶۴ء میں ڈپٹی میر تراب علی و میر ضامن علی کے والد سید ہمت علی نے اس کو رونق دی۔ میر اکبر علی رسالدار اور سید صاحب علی کا ہیلک کے تھوک ڈوکر سے تعلق تھا جب کہ سید ہمت علی تھوک فرید سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا شاہ گنج آگرہ کے مرکز سادات کے ابتدائی آباد کار یہ ہی پانچ خاندان تھے۔ ۱۷۷۲ء کے بعد مختلف اوقات میں دیگر تھوکوں اور بستیوں کے سادات بھی یہاں آتے اور سکونت اختیار کرتے رہے۔ اس طرح انیسویں صدی کے اواخر تک شاہ گنج آگرہ مشرقی راجپوتانہ اور نواح آگرہ کی بستیوں کا حسین گلدستہ بن گیا تھا۔ جہاں سادات رضوی کی بھاری اکثریت کے علاوہ کافی تعداد میں سادات جعفری، سادات نقوی اور سادات زیدی بھی آباد تھے۔ اس لئے ہم ذیل میں ان پانچ خاندانوں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے اور دیگر خانوادوں کا بیان مختصراً پیش کرتے ہیں۔ جو داروغہ سید احترام علی رضوی، حکیم سید علی رضا بیانوی، سید زوار حسین عرف بدھا اور دیگر بزرگوں کی نگارشات کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔

(ا) خاندان سید حبیب اللہ

ہیلک کے تھوک فرید کے سید حبیب اللہ بن سید عنایت کے تین فرزند اور چار دختران ہوئے بی بی بنائی سید عتیق اللہ بن سید عبدالعزیز کو بی بی عاقلاں لوہامنڈی کے سید عظیم کو بیاہی تھیں۔ آخر الذکر کے بطن سے سید اسد علی تولد ہوئے۔ آپ بڑے عالم و فاضل تھے۔ موصوف کے پرپوتے سید مہدی بن سید محمد بڑے عالم و فاضل تھے۔ سید حبیب اللہ کی اولاد نرینہ میں تین بیٹے یعنی سید سلطان ، سید حسین اور سید زبردست ہوئے۔ سید سلطان کے بیٹے سید کرم علی تھے جن کے بیٹے سید یعقوب علی لاولد رہے۔ سید حسین کے فرزند سید امان علی ہوئے۔ آپ بڑے مخیر اور فیاض تھے جو اپنی بنڈی کا ضرورت سے زیادہ غلہ محتاجوں میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔ آپ نے موروثی جائیداد کی تقسیم کے بعد چھوٹی حویلی تعمیر کی جب کہ بڑی حویلی سید حبیب اللہ نے یہاں آباد ہوتے ہی بنوائی تھی ۔ سید امان علی کے چار بیٹے سید مردان علی ، سید ذوالفقار علی ، سید مظہر علی اور سید مظفر علی ہوئے۔ اول الذکر کے ایک بیٹے سید محمد حسین تھے جن کے پانچ فرزند سید مرتضیٰ حسین ، سید مصطفیٰ حسین ، سید حامد حسین ، سید وصی حیدر اور سید حسین ہوئے۔ سید ذوالفقار علی کے تین بیٹے سید تراب علی ، سید ولایت حسین اور سید اولاد حسین تھے۔ سید تراب علی لاولد اور سید ولایت حسین اولاد نرینہ سے محروم رہے ۔ سید اولاد حسین کے دو بیٹے سید ابرار حسین اور سید اکرام حسین ہوئے۔ سید ابرار حسین کے تین فرزند سید ناظم حسین ، سید کاظم حسین اور سید شرافت حسین تھے۔ اول الذکر یوپی کے محکمہ جنگلات میں رینجر تھے دیگر دونوں حضرات ایسٹ انڈین ریلوے میں ملازم تھے۔ سید کاظم حسین لاولد اور سید شرافت حسین کے اولاد نرینہ نہ تھی ۔ سید ناظم حسین کے تین بیٹے سید ذوالفقار حیدر ، سید دلیر حیدر اور سید اولاد حیدر ہوئے۔ سید ذوالفقار حیدر کے تین فرزند سید ذوالقرنین حیدر ، سید رضوان حیدر اور سید شجاع حیدر ہوئے۔ موصوف ٹی اینڈ ٹی میں ہیڈ کلرک تھے۔ آگرہ میں انجمن معراج الادب کے بانی

سکریٹری اور کراچی میں انجمن معین الملت گمبھار کے بڑے فعال رکن تھے۔ سید دلیر حیدر حسینی اسکاؤٹس کراچی کے بانی صدر تھے۔ سید اکرام حسین بن سید اولاد حسین متعرم تھے۔ آپ کے پانچ بیٹے سید حسن عباس، سید انعام حسین، سید محمد صغیر، سید محمد قدیر اور سید محمد تنویر ہوئے۔ سید حسن عباس کے دو فرزند سید آل عباس اور سید محمد عباس تھے۔ یہ دونوں حضرات خفیہ پولیس کراچی اور ریلوے پولیس میں ملازم تھے۔ سید محمد عباس کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ سید آل عباس کو ماسٹر سید ابن رضا کی بیٹی منسوب تھی جو اول کے نقوی سید تھے۔ ان کے بیٹے تراب، ناصر، ظفر اور وزیر ہیں۔ سید انعام حسین جو علی گڑھ میں تحصیلدار اور کرکٹ کے نامور کھلاڑی تھے کے دو بیٹے سید اسلام حسین اور سید اظہار حسین ہوئے جو بالترتیب کراچی پورٹ ٹرسٹ اور کراچی ٹیلیفون ریجن میں ملازم ہیں۔ سید محمد صغیر بن سید اولاد حسین آگرہ میں تجارت پیشہ تھے۔ آپ کو حاجی سید العابدین بن داروغہ سید احترام علی کی دختر بیاہی تھی، آپ کے پانچ بیٹے سید اختر مہدی، سید محمد رشید، سید محمد سعید، سید نصیب احمد اور سید رفیق احمد ہوئے۔ سید اختر مہدی آگرہ میں دوکانداری کرتے تھے کراچی میں انکم ٹیکس میں ملازم تھے۔ آگرہ میں انجمن مہدیہ کے بڑے فعال عہدیدار تھے۔ دیگر افراد بھی کراچی میں برسرکار ہیں۔

ان کے بیٹوں میں اکرام مہدی روزنامہ جنگ کراچی میں فوٹو گرافر ہیں۔ سید محمد قدیر بن سید اکرام حسین کا ایک فرزند سید علی نصیر کراچی کے پاسپورٹ آفس میں افسر ہے۔

سید مظفر علی بن سید امان علی حافظ قرآن اور عابد و زاہد تھے۔ ان کے بیٹے حاجی سید موسیٰ رضا ہوئے جو آگرہ کے بڑے صنعت کار، مخیر اور مقتدر شخص تھے۔ آپ کا ذکر مشاہیر میں بعد میں کیا گیا ہے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید محمد رضا عرف کھلو، سید عابد رضا عرف چندا، سید کاظم رضا، سید محسن رضا اور سید ابن رضا ہوئے۔ سید محمد رضا عرف کھلو ایسٹ انڈین ریلوے کلکتہ میں واچ اینڈ وارڈ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ آپ ممتاز تحت اللفظ مرثیہ خواں

بھی تھے اور اس فن کی آپ نے باضابطہ تربیت لی تھی ۔ آپ کے اکلوتے بیٹے سید آل رضا کا اکلوتا فرزند سید حبیب رضا تھا۔ حاجی سید عابد رضا عرف چندا شاہ گنج کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں نمایاں تھے۔ نیز مسلم لیگ ضلع آگرہ کے عہدیدار بھی تھے۔ ان کے محل نما مکان پر ۱۹۴۵ء ۔ ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں مسلم لیگ کے خفیہ اجلاس منعقد ہوتے تھے جن میں ضلعی مسلم لیگ کے سیکرٹری غلام جیلانی کے علاوہ کوتوال شہر صدر الاسلام بھی شریک ہوتے جو بڑے کٹر مسلم لیگی تھے۔ ان میں نوجوانوں کی نمائندگی سید شبر مہدی جعفری اور سید انتظار رضا رضوی (مولف کتاب) کرتے تھے۔ سید کاظم رضا نے عین جوانی میں انتقال کیا ان کو سیدہ انوار خاتون بنت سید کلب حسن منسوب تھیں۔ آپ لاولد رہے۔ سید محسن رضا نے بھی کم عمر پائی ۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید احسن رضا ، سید مستحسن رضا اور سید ناصر رضا سید طاہر رضا ہوئے۔ سید مظہر علی بن سید امان علی کی اولاد نرینہ میں دو بیٹے سید نثار حسین اور سید محمد حسین ہوئے۔

سید زبردست علی بن سید حبیب اللہ بڑے صاحب علم ، عامل باصفا اور عبادت گزار تھے۔ آپ کے علم و فضل کا شہرہ سن کر شاہ عالم دو مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑی عقیدت واحترام سے پیش آیا۔ آپ کے فرزند سید حسین علی کے تین فرزند سید شاہ علی ، سید بشارت علی اور سید کرامت علی ہوئے۔ سید بشارت علی کے بیٹے سید عنایت حسین تھے۔ آپ کی ایک بیٹی بی بی افضلی تھیں جو جگت وادی افضلی کہلائیں۔ آپ شاہ گنج کے پہلے مدرسہ نسواں کی معلمہ اور بڑی عزادار تھیں۔ محترمہ کی خالہ زاد بہن وزیر بیگم عرف چندو بھی عزادار تھیں ان کی عزاداری کا سلسلہ گلبہار (گولیمار) کراچی میں اب تک جاری ہے۔ سید کرامت علی لاولد رہے۔ سید حسین علی کی بڑی جائیداد تھی جس پر بڑی حویلی کے سید علی رضا ابن سید عباس علی متصرف تھے۔ سید علی رضا پولیس میں داروغہ تھے۔ سید حسین علی کے بیٹے سید اولاد حسین اور سید ابن حسن ہوئے۔ سید اولاد حسین کے فرزند سید صادق حسین تھے۔

ابن حسن کے بیٹے سید حبیب الحسن ، سید علی قاسم اور سید علی جان ہوئے۔
سید علی رضا بن سید عباس علی کے فرزند سید حسن رضا اور سید قاسم رضا تھے۔
سید حسن رضا کے بیٹے سید ثقت رضا اور سید عقیل رضا ہوئے۔ انکی اولاد میں
سید علی جعفر، سید حسن جعفر، عمران رضا ، جعفر رضا ، تہذیب رضا ، دانش
رضا ، رضوان رضا اور اقبال رضا ہوئے۔ سید قاسم رضا کی اولاد نرینہ میں سید
نعیم رضا تھے۔ سید قاسم رضا جو شاہ گنج کے اہم عزاداروں میں تھے ان کی
عزاداری سید نعیم رضا کی اولاد نے ۱۱ ڈی تی کراچی میں برقرار رکھی ہے۔ سید
نعیم رضا کو حمیدہ خاتون بنت سید محمد اطہر بیاہی تھیں آپ کے چھ فرزند ذاکر
رضا ، ہاشم رضا ، نصیب رضا ، محمد رضا ، علی رضا اور تسلیم رضا ہیں۔ سید
عنایت حسین بن سید بشارت علی کے تین فرزند سید محمد حسین ، سید
زبردست علی اور سید مہدی حسن ہوئے۔ سید محمد حسین کی اولاد زندہ نہ رہی
سید زبردست (ثانی) کے اکلوتے بیٹے سید امداد حسین اور سید مہدی حسن کے
اکلوتے فرزند سید عاشق حسین تھے۔ سید شہزاد علی بن سید حافظ علی کو اسی
خانوادے کی بی بی سیدہ بیاہی تھی جن کے بطن سے سید جعفر حسین اور سید
حسین ہوئے جو بڑے اچھے مرثیہ خواں تھے۔

(۲) خاندان سید عتیق اللہ

آپ سید عبدالعزیز کے فرزند تھے آپ کو سید حبیب اللہ نے اپنی بیٹی
بیاہی تھی اور جہیز میں حویلی کے ایک حصے کے علاوہ عزاداری بھی دی تھی ۔
آپ شاہ گنج کے پہلے عزادار تھے اور یہ عزاداری آپ کی نسل میں آج تک باقی
ہے۔ آپ کے تین بیٹے سید سعادت علی ، سید امان علی اور سید نجیب علی
ہوئے آخر الذکر مغل افواج کے کیمپ کانپور میں کمانڈر تھے۔ آخر الذکر کے دو
بیٹے سید عنایت علی اور سید ہدایت علی ہوئے۔ ان کی اولاد میں عزاداری کی
سالانہ رسومات تقسیم ہو گئیں ۔ ایک سال سید عنایت علی نے ورثہ عزاداری
کے ذمہ دار ہوئے اور دوسرے سال سید ہدایت علی کے ورثاء ۔ سید عنایت

علی کے دو فرزند سید عابد علی اور سید معصوم علی ہوئے۔ سید عابد علی کے اکلوتے بیٹے سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر تھے جو مولف کے نانا تھے۔ سید شجاعت حسین کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ فرزندان میں سید ذوالفقار حسنین ، سید نظیر الحسن اور سید محسن حسین ہوئے۔ سید ذوالفقار حسنین ریلوے پولیس میں انسپکٹر تھے۔ آپ شاعر و مصنف اور مترجم بھی تھے۔ آپ نے فضلی کی دہ مجلس کا اردو ترجمہ کیا تھا اور جابجا اس کو اشعار سے آراستہ بھی کر کے مزید حسین بنادیا تھا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ بہت اچھے ستار بھی تھے۔ آپ کے چار بیٹے سید علمدار حسین ، سید اختر حسین ، سید دلدار رضا اور سید ابراہیم رضا ہوئے۔ سید علمدار حسین پولیس میں داروغہ تھے۔ آپ کے بیٹے سید مظفر حسین ، سید باقر حسین ، سید شجاعت علی اور سید محمد حسین ہیں۔ سید مظفر حسین گمبھار (گولیمار) کراچی کی عزاداری میں نمایاں تھے آپ انجمن جعفریہ گمبھار کے سکریٹری بھی رہے۔ پی آئی اے میں آفسر تھے ان حضرات کی اولاد ذوالفقار حسین ، شاہ نواز اور شاہ زیب ہیں۔ سید اختر حسین ریلوے میں ملازم تھے آپ کے بیٹے سید ذوالفقار حیدر ہوئے جو کسی فیکٹری میں فورمین تھے۔ دوسرے فرزند سید ظفر الحسن علامہ اقبال کالج میں لکچرار ہیں۔ سید دلدار رضا ہندوستان میں پولیس تھانیدار تھے۔ ان کی اولاد نرینہ میں سید انتظار مہدی ہیں جو امریکہ میں مقیم ہیں اور سردار رضا ہیں۔ سید ابراہیم رضا واپڈا لاڑکانہ میں آفسر تھے آپ کی اولاد نرینہ میں سید احسن رضا ، سید محمد رضا اور سید ذوالفقار عباس ہوئے۔

سید شجاعت حسین کے دوسرے بیٹے سید نظیر الحسن ہوئے جو مصنف ومترجم تھے آپ غیر منقسم ہند میں بڑے نامور تھانیدار پولیس تھے۔ آپ کو کتب بینی سے بڑا شغف تھا اور ایک چھوٹی سی لائبریری کے مالک تھے۔ آپ شمشیر براں کے مصنف تھے اور بائبل کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید اظہار الحسن ، سید علی زائر ، سید تطہیر حیدر ، سید مظہر حسین عرف ابن حسن ، سید منظور الحسن ، سید مظاہر عباس اور سید علی طاہر ہوئے۔

سید اظہار الحسن غیر منقسم ہند میں داروغہ تھے اور پاکستان میں سول ڈیفنس میں انسپکٹر رہے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید ایثار الحسن ہوئے جن کے بیٹے سید محمد ذوالقرنین اور سید نظیر الحسن ہیں۔ سید علی زائر کے دو بیٹے سید محمد حسین اور سید علی ظفر ہیں۔ آخر الذکر بینک میں VP ہیں۔ اور بڑے پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ سید ظہیر حیدر کے بیٹے سید کونین حیدر، سید سراج حیدر اور سید پرویز حیدر ہیں۔ سید علی طاہر کے سید علی اطہر، سید علی مظاہر بیٹے ہیں۔

سید مظہر حسین (ابن حسن) جو سیکورٹی پریس میں افسر رہے کی اولاد نرینہ میں ایک فرزند سید کمال حسین ہے۔ سید مظاہر عباس کی اولاد نرینہ میں سید محمد بن قاسم عرف حسن اور کاشف وآصف ہیں۔ سید منظور الحسن نے عین جوانی میں انتقال کیا۔ یہ کراچی یونیورسٹی سے MSC تھے

سید محسن حسین بن سید شجاعت حسین مشرقی فن سپہ گری کے ماہر تھے۔ آپ حدیث خوان کربلا بھی تھے اور محرم کی مجالس میں فضلی کی • دہ مجلس • کا ترجمہ پڑھا کرتے تھے۔ آپ اور آپ کے بڑے بھائی سید نظیر الحسن دونوں شکاریات کے دلدادہ اور ماہر شکاری بھی تھے ان دونوں کو باڑی (دھولپور) کے سید محمود الحسن رضوی چیف انجینئر واہ فیکٹری کی ہمشیرگان بیاہی تھیں۔ سید محسن حسین کے بیٹے سید عابد رضا، سید جمشید رضا اور سید معصوم رضا ہوئے۔ سید عابد رضا سیمنٹ فیکٹری روہڑی میں افسر تھے۔ سید معصوم رضا پاک لینڈ فیکٹری میں اسسٹنٹ منیجر ہے۔

سید عنایت علی کے دوسرے بیٹے سید معصوم علی کی اولاد نرینہ میں سید اعجاز حسین، سید لطافت علی اور سید محمد اسمعیل ہوئے۔ سید اعجاز حسین کے فرزندان سید سجاد حسین، سید فدا حسین اور سید زوار حسین عرف جھبو ہوئے۔ سید فدا حسین کے فرزند سید اسرار حسین تھے جو لاولد رہے۔ سید زوار حسین عرف جھبو کے بیٹے سید علی جرار سید علی مختار اور سید علی انصار ہیں۔ علی جرار مسلم لیگ نیشنل گارڈ آگرہ کے سالار رہے۔ سید علی مختار

رضوی کراچی کے مشہور طالب علم رہنما رہے ہیں۔ سید علی جرار کے بیٹے سید شعیب اوونیس ہیں۔ سید لطافت علی عرف صدرو بڑے محنتی بزرگ تھے۔ آپ کی دوکان مسجد میر اکبر علی کی جائیداد میں واقع تھی ۔ امام حسینؑ کے سوئم کے دن حلیم کی خصوصی نیاز آپ کی توجہ کی مرہون منت تھی ۔ آپ کے بیٹے سید رضا عرف جمعہ اور سید مصطفیٰ حسین عرف چھٹوا تھے۔ سید رضا عرف جمعہ کی اولاد میں سید ابن رضا، سید حیدر رضا اور سید معصوم رضا ہوئے۔ سید محمد اسمعیل کی اولاد نرینہ نہ تھی۔

سید ہدایت علی بن سید نجیب علی بن سید عتیق اللہ کے تین بیٹے سید طالب علی، سید احترام علی اور سید احمد حسن ہوئے۔ سید طالب علی کے بیٹے سید جواد حسین اور سید مطلوب حسین ہوئے۔ سید جواد حسین نامور ماہر تعمیرات تھے آپ کا نام لانس ڈاؤن برج سکھر کی تعمیر کے سلسلے میں وہاں کندہ ہے۔ آپ کے بیٹے سید زاہد حسین، سید ضامن حسین، سید لیاقت حسین اور سید علی اوسط تھے۔ آخر الذکر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ریاضی میں ماہر مانے جاتے تھے۔ آپ میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ آپ نہایت عبادت گزار تھے۔ سید زاہد حسین اوورسیئر تھے آپ کے فرزند سید خلیل حسین اور سید مجاہد حسین ہوئے ہیں۔ سید خلیل حسین کے فرزند سید طالب حسین سید ضامن اور لیاقت حسین تجارت پیشہ تھے۔ اولذکر کی اولاد میں سید رفاقت حسین، رفعت حسین، فصاحت حسین ہوئے۔ آخرالذکر کے سید مبارک حسین اور سید تبارک حسین وغیرہ ہوئے۔ یہ حضرات حیدر آباد اور خیرپور سندھ میں آباد ہیں۔ سید فصاحت حسین طب کے پیشہ سے وابستہ ہیں اور کئی برس تک مسقط میں طبی فرائض انجام دیتے رہے۔

سید مطلوب حسین بن سید طالب علی کے بیٹے سید عتیق الحسن اور سید قریب الحسن تھے۔ سید عتیق الحسن کے فرزند سید ادیب الحسن ہیں جو کراچی کے ایک ہائی اسکول میں صدر مدرس رہے۔ ان کے بیٹے سید باقر عباس اور سید انجم عباس ہیں۔ سید قریب الحسن کے فرزند سید ظہیر احسن ہوئے جو لکھنو میں شیعہ کالج کے پرنسپل اور یوپی میں ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات رہے۔ ان کی اولاد میں

سید منظور الحسن اور سید ضمیر الحسن ہیں۔

سید احمد حسن بن سید ہدایت علی کے بیٹے سید دلشاد حسین تھے جن کے فرزند سید وزارت حسین و سید صدارت حسین ہوئے۔ سید وزارت حسین کی اولاد میں سید ہدایت حسین، سید عنایت حسین، سید حمایت حسین، سید سعادت حسین اور کفایت حسین ہوئے۔ آخرالذکر حاجی اور زوار تھے اور کراچی کے نوحہ خوانوں اور سوزخوانوں میں نمایاں تھے نیز امام باڑہ جعفریہ کے ٹرسٹی تھے سید صدارت حسین کی اولاد میں سید شفاعت حسین، سید صداقت حسین، سید محمد حسین اور شہامت حسین ہوئے۔ سید شفاعت حسین کے بیٹے سید ہادی رضا ہیں۔

سید احترام علی بن سید ہدایت علی بڑے نامور داروغہ تھے۔ آپ نے سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ کی تاریخ دو جلدوں میں لکھی تھی جو طبع نہ ہوسکی۔ آپ نے کئی اور تصانیف بھی چھوڑیں جو پروفیسر سید علی عارف رضوی کی تحویل میں تھیں۔ شاہ گنج کی پہلی انجمن امامیہ کے سربراہ تھے۔ آپ کے فرزندوں میں سید احتشام علی، سید العابدین، سید محمد مدثر بکا اور سید الساجدین ہوئے۔ سید احتشام علی کے بیٹے سید وحید الحسن اور وصی الحسن ہوئے۔ سید وحید الحسن کے چار فرزند سید علی مقدس، سید علی اقدس، سید علی اطہر اور سید علی امام ہوئے۔ سید علی مقدس رضوی ڈبل ایم اے تھے۔ آپ آگرہ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز رہے کراچی میں ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ آپ کی اولاد میں سید ابراہیم نفیس، سید اسمعیل حیدر، سید سلطان حیدر، سید رضوان حیدر، سید فرقان حیدر، سید عرفان حیدر اور سید نعمان حیدر ہیں۔ سید ابراہیم نفیس اور سید فرقان حیدر فلم اور ڈرامہ میں ممتاز ہیں۔ سید رضوان حیدر سعودی عرب میں طویل عرصے سے مقیم ہیں اور حجاج وزوار کی بڑی بے لوث خدمات انجام دیتے ہیں۔ سید اسمعیل حیدر نیویارک امریکہ میں ایک اسٹور میں سیلز منیجر ہیں۔ ابراہیم نفیس کی اولاد میں سید علی عمران سید علی عامر اور بی بی نگین ہیں۔ اسمعیل حیدر عرف نوشہ کے ایک بیٹے محمد کاظم ہیں رضوان حیدر کے ایک دختر نورین ہے۔ سلطان حیدر

کی اولاد میں محسن ، سلمان ، منور ، وحد اور بی بی مرضیہ اور فریہ ہیں۔ سید عرفان حیدر کے تین بیٹے وصی حیدر ، جری حیدر اور حسن ہیں اور دو بیٹیاں الماس اور سحر ہیں۔ آپ مکہ میں کعبہ کی تعمیر نو کی نگرانی کا فریضہ ادا کرنے کا اعزاز بھی رکھتے ہیں فرقان حیدر اور ریحان حیدر کے تاحال کوئی اولاد نہیں ہے۔

حاجی سید العابدین بن سید احترام علی شاہگنج آگرہ میں عہد آخر کے عزاداروں کے سرخیل تھے۔ آپ اعلیٰ درجہ کے مرثیہ و سوزخواں تھے۔ آپ کے فرزندوں میں سید مزمل حسین ، سید المتقین ، اور سید المنذرین تھے۔ یہ حضرات حیدر آباد سندھ میں آباد ہیں۔ سید مزمل حسین کی اولاد میں سید آل یسین اور آل عمران ہیں۔ سید المتقین کے بیٹے سید شفیق احمد ، سید خلیق احمد اور سید نجیب احمد ہیں۔ سید المنذرین کے فرزند سید المبشرین ، سید المحدثین اور سید الذاکرین ہیں۔ سید محمد مدثر بکا شاعر تھے اور ریلوے مواصلات میں ٹیلیگراف ماسٹر تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید علی عین اللہ اور سید محمد مدبر ہیں جو بالترتیب انشورنس کمپنی میں ملازم اور پاک فضائیہ میں اسکواڈان لیڈر رہے۔ سید علی عین اللہ کے بیٹے سید علی اعلیٰ عرف پپو اور سید علی ساجد اور سید علی عابد زندہ رہے ہیں۔ سید محمد مدبر کے بیٹے سید قسیم انجم اور سید سلمان انجم ہیں۔ سید الساجدین بن سید احترام علی کی اولاد میں سید المصلین ، سید المہاجرین ، سید المجتہدین ، سید الصالحین اور سید الناصحین ہوئے۔ سید المصلین کے بیٹے سید المفسرین لاہور میں اکاونٹس افسر ہیں جن کے دو بیٹے سید علی رضا اور سید امجد رضا ہیں۔ سید المہاجرین کی اولاد میں سید الشافعین اور سید الزاہدین ہیں جو مدرس ہیں۔ سید الصالحین کے بیٹوں میں سید المطاہرین ، سید الناصرین اور سید الشاکرین ہوئے۔ سید المطاہرین گلبہار کراچی کی انجمن حیدری کے سیکریٹری اور عزاداری میں نمایاں تھے۔ ان کے اولاد نرینہ نہ تھی ۔ سید الناصرین کے بیٹے سید آل حیدر اور غضنفر حیدر ہیں۔ سید الشاکرین ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر تھے جوانی میں انتقال کیا۔

سید المجتہدین کے بیٹے سید علی عارف رضوی تھے جو کراچی یونیورسٹی

کے شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر رہے۔ ان کے بیٹے سید صالح عباس عرف بنجی اور سید ساجد عباس ہیں۔

(۳) خاندان میر اکبر علی رسالدار

میر سید اکبر علی بن سید محمد علی بن سید محمد عاقل بن سید علی ہیلک کے سادات رضوی تھوک ڈوکر سے تعلق رکھتے تھے آپ اور آپ کے بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ آپ کے والد سید محمد علی مرہٹہ عملداری میں آگرہ ونواح آگرہ کی علاقائی فوج کے افسر اعلیٰ تھے۔ آپ کی مہر پر پہدار دین است محمد علی (عامل پرگنہ) ندیٔ لکھا ہوا تھا جو تحصیلدار سید ظہیر الحسن رضوی کی تاریخ سادات بھرتپور کے ایک فرمان پر موجود ہے۔ سید محمد علی سید حبیب اللہ کی دعوت پر ہیلک سے شاہ گنج میں غالباً ۱۷۳۰ء میں آکر بس گئے تھے اور ایک محل نما حویلی تعمیر کی تھی جس کا صدر دروازہ زمین سے تقریباً بارہ فٹ بلند تھا۔

میر اکبر علی رسالدار ۱۷۵۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۹ء میں وفات پائی۔ آپ اپنی تعمیر کردہ مسجد میر اکبر علی میں دفن ہوئے۔ آپ صاحب سیف اور حافظ قرآن تھے۔ آپ کا تفصیلی تذکرہ مشاہیر میں کیا گیا ہے۔ میر اکبر علی کو فتح پور سیکری کی بی بی نصیب بنت سید نذر علی بیاہی تھیں۔ آپ کے چار بیٹے اور ایک دختر ہوئیں۔ جو فتح پور سیکری کے سید شبیر علی کو منسوب تھیں ان سے دو بیٹے سید محمد حسین اور سید نظیر حسین ہوئے۔ آخرالذکر کو ماسٹر سید منظور الحسن رضوی کی پھوپھی بیاہی تھیں۔ ماسٹر صاحب موصوف کو گلبہار کراچی میں ۱۹۸۳ء میں شہید کر دیا گیا۔ آپ کے فرزند ارجمند سید محمود الحسن رضوی ابن الشہید ملت جعفریہ پاکستان کے دماغ کا درجہ رکھتے

تھے۔ آپ کا ذکر مشاہیر میں کیا گیا ہے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید سعید الحسن رضوی عرف مجاہد اور سید ندیم الحسن رضوی ہیں جو بالترتیب پاک فضائیہ میں افسر اور سندھ میڈیکل کالج کراچی کے سند یافتہ ڈاکٹر ہیں دوران تعلیم ممتاز طالب علم رہنما رہے ہیں آج کل کینڈا میں مقیم ہیں۔

فرزندان میر اکبر علی میں سید قائم علی، سید دائم علی، سید امام علی اور سید ببر علی ہوئے۔ حاجی سید قائم علی بندرابن متھرا میں کوتوال تھے۔ آپ نیک عابد شب زندہ دار اور بڑے عامل باصفا تھے۔ آپ پاپیادہ حج وزیارات سے مشرف ہوئے۔ آپ کی اولاد میں ۸ بیٹے اور ۳ بیٹیاں ہوئیں۔ فرزندوں میں سید حکمت علی، سید محمد حسین، سید صادق حسین، حاجی سید سخاوت حسین، سید فدا حسین، سید قاسم حسین، سید جعفر حسین اور حاجی سید مقرب حسین تھے۔ سید حکمت علی نامور تھانیدار تھے آپ کی اولاد نرینہ میں داروغہ سید مرتضیٰ حسین ہوئے جن کے بیٹے سید غضنفر حسین بھی داروغہ تھے۔ غضنفر حسین کے بیٹے سید قائم حسین ہوئے۔ سید محمد حسین کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ سید صادق حسین کی اولاد نرینہ میں سید لطیف الحسن تھے جن کے فرزند سید فدا حسین ہوئے۔ آخرالذکر کے بیٹے سید اسرار حسین لاولد رہے۔ سید دائم علی بن میر اکبر علی ریاست قرولی میں وکیل تھے۔ عہد انگریزی میں ۱۸۵۷ء سے قبل پولیس آفیسر رہے۔ آپ عالم وفاضل تھے اور بڑی خوبصورت تحریر میں قرآن مجید بمعہ فارسی ترجمہ لکھا تھا۔ آپ کی خوش خطی آپ کی نسل میں دور تک گئی ہے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید حسن علی سید قادر علی اور سید باقر حسین ہوئے۔ آخرالذکر آگرہ سے دہلی چلے گئے تھے جہاں وہ کسی معرکہ حق وباطل میں شہید ہوگئے۔ آپ کا مزار اوکھلا (نزد دہلی) میں واقع ہے۔ جہاں سالانہ عرس ہوتا ہے اس مزار کے قریب ہی مرزا غالب

کا مقبرہ بھی واقع ہے۔ سید حسن علی اور سید قادر علی نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء
میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جنگ شاہ گنج میں خصوصی کردار ادا کرکے ہیروز
میں شمار ہوئے۔ سید قادر علی کی اولاد میں سید سراج الحسن، سید ظہور الحسن،
سید مہدی حسن، سید عزیز الحسن، سید ریاض الحسن اور سید ابوالحسن ہوئے۔
سید سراج الحسن کے فرزند سید شبیر حسین تھے جن کی اولاد نرینہ میں سید دائم
رضا، سید امداد رضا، سید علی قادر اور سید شریف الحسن ہوئے۔ سید دائم رضا
کے بیٹے سید حیدر رضا، سید حسن رضا، سید آصف رضا اور سید ہاشم رضا ہیں۔
سید ظہور الحسن بڑے اعلیٰ درجہ کے مرثیہ خواں تھے۔ آپ کے اکلوتے بیٹے سید
انوارالحسن تحصیلدار تھے۔ آپ کو بی بی حلیمہ خاتون بنتِ سید کلب حسن
بیاہی تھیں۔ آپ لاولد رہے۔ سید مہدی حسن کی اولاد نرینہ میں سید فضائل
حسین، سید فضیل حسین اور سید بندہ حسن تھے۔ سید فضائل حسین کے سید
اقبال مہدی فرزند ہوئے۔ سید عزیز الحسن مورخ و شجرہ نگار تھے۔ آپ کے فرزند
سید ضمیر الحسن، سید ظہیر الحسن اور سید اظہار الحسن ہوئے۔ اول الذکر
پاکستانی فوج کے محکمہ سپلائی میں افسر تھے۔ آپ کے فرزند سید محمد علی سعید
رضوی پاکستانی فوج میں میجر (انجینئر) رہے۔ آپ نے شاہراہ ریشم کی تعمیر
میں چینی انجینئروں کے ساتھ تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ آپ کے دو بیٹے سید نیاز
علی اور سید حسن عباس ہیں۔ سید ریاض الحسن بڑے دیندار بزرگ تھے۔ آپ
کے بیٹے سید رفیق الحسن اور سید حبیب الحسن ہوئے۔ اول الذکر ریلوے میں
ملازم ہوئے تھے اور عرصہ دراز سے لاپتہ ہیں۔ سید حبیب الحسن کے دو بیٹے
سید عامر رضا اور سید نظیر رضا ہیں۔

سید حسن علی بن سید دائم علی تحصیلدار تھے۔ انہوں نے موضع گانوڑی
ضلع آگرہ میں اپنی جیب خاص سے زمیندار خریدی تھی۔ ۲ محرم کی نیاز آپ

اعلیٰ پیمانے پر کرتے تھے آپ کی وفات بھی ۴ محرم ہی کو ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ آپ نے انگریزوں کے خلاف مزاحمتی تحریک اور جنگ شاہ گنج میں عملی حصہ لیا تھا۔ آپ کے دو فرزند اور تین دختران یعنی سید کلب حسن اور سید مثنیٰ حسن ، بی بی اکبری زوجہ سید حسن احمد جعفری ، بی بی شبیرہ زوجہ سید عابد رضا جعفری گارڈ اور بی بی حیدری زوجہ داروغہ سید علی رضا تھیں۔ سید کلب حسن زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے آپ ہندوستان میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے عہد میں کرکٹ کے نامور باولر تھے۔ ہندوستان کا نامور باولر علی حسین آپ کا شاگرد تھا جس کا تذکرہ انسائیکلوپیڈیا برطانیہ میں ملتا ہے۔ آپ کی اولاد میں سید وقار حسن ، سید افتخار حسن ، سید اکبر حسن ، سید حسن محمد فرزندان اور تین دختران سیدہ انوار خاتون ، سیدہ حلیمہ خاتون اور سیدہ امنیہ خاتون تھیں۔ جو علی الترتیب سید کاظم رضا بن حاجی سید موسیٰ رضا ، سید انوار الحسن بن سید ظہور الحسن اور ڈاکٹر سید ذاکر حسین بن حبشی سید ناظر حسین کو منسوب تھیں۔ سید وقار حسن نقشہ نویس اور ممتاز خوش نویس تھے۔ آپ نیک نفس اور دیندار تھے۔ آپ کو سیدہ بنت اسد فاطمہ بنت سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر بیاہی تھیں۔ آپ کی اٹھارہ اولاد میں سے فقط پانچ زندہ رہے ان میں سید انتظار رضا رضوی (راقم الحروف) سید محمد مہدی ، سیدہ سعیدہ خاتون ، سیدہ عتیقہ خاتون اور سیدہ ملیکہ خاتون ہیں۔ سیدہ سعیدہ خاتون کی شادی ڈاکٹر سید علی اوسط بن سید محسن رضا سے ، سیدہ عتیقہ خاتون کی شادی سید آل احمد بن سید مہدی حسن سے اور سیدہ ملیکہ خاتون کی شادی سید محمد علی؟ نزل مرچنٹ بن سید محسن رضا سے ہوئی۔ سید انتظار رضا رضوی ناز اکبر آبادی شاعر وادیب اور مورخ و معلم ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل آگرہ میں مسلم لیگ کے نمایاں کارکن رہے۔ آپ

کی شادی سیدہ اقبال فاطمہ بنت سید افتخار حسن رضوی سے ہوئی ۔ آپ کی اولاد میں چھ بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ ان میں سیدہ آمنہ خاتون تبسم ، سیدہ نکہت فاطمہ ، سیدہ طلعت فاطمہ اور سیدہ عصمت فاطمہ شادی شدہ ہیں۔ سیدہ عفت فاطمہ بی اے بی ایڈ اور سیدہ شفق فاطمہ یونیورسٹی میں ایم ایس سی کر رہی ہیں یہ غیر شادی شدہ ہیں۔ سید گوہر مہدی KESC میں ایگزیکٹو انجینئر ، سید نیر رضا ڈاکٹر ہے جو آج کل نیویارک میں ہے ، سید کامران رضا کمپیوٹر سائنس میں سند یافتہ انجینئر اور آج کل الکٹیکل فرانس کا بین الاقوامی مواصلاتی ادارہ میں پرنسپل انجینئر ہے۔ سید عامر رضا بی کام ہے اور مزید تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ سید محمد مہدی بن سید وقار حسن ٹی اینڈ ٹی ڈائریکٹریٹ جنرل میں اعلیٰ عہدیدار رہے آج کل ایک پرائیوٹ ادارہ میں مینجنگ ڈائریکٹر کے سکریٹری ہیں۔ آپ ایڈوکیٹ بھی ہیں۔ آپ کی شادی منورہ خاتون بنت داروغہ سید نظیر الحسن رضوی سے ہوئی ۔ آپ کے بیٹوں میں سید فضیلت مہدی ، سید وقار رضی اور سید علی مہدی ہیں۔ بیٹیوں میں سیدہ نزہت فاطمہ ، سیدہ مسرت فاطمہ اور سیدہ ریحانہ خورشید ہیں۔ سید فضیلت مہدی ایم ایس سی ہیں اور معلم و مصنف ہیں ۔ اب حکومت سندھ میں سلیکشن آفسر ہیں۔ سید وقار رضی NED یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ سید علی مہدی انٹر میں زیر تعلیم ہے۔ سیدہ نزہت فاطمہ معلمہ ہے ان کی شادی ڈاکٹر سید اقتدار حسین سے ہوئی ۔ مسرت فاطمہ اور ریحانہ خورشید بھی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔

سید کلب حسن کے دوسرے فرزند سید افتخار حسن تھے۔ آپ اپنے عہد کے ممتاز اور ہونہار طلبہ میں تھے۔ آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل گیا تھا اور وظیفہ بھی لیکن باوجود آپ نے تار گھر میں ملازمت کرلی ۔ ڈاکٹر

طاہر رضوی جو یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ جغرافیہ کے سربراہ تھے، آپ کے ہم جماعت رہے تھے۔ آپ اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل تھے۔ آپ ممتاز خوش نویس بھی تھے اور ستھرا شعری وادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ آپ کی شادی سیدہ ماجدہ خاتون بنت سید وصی حیدر بن سید محمد باقر چندا سے ہوئی تھی۔ آپ پاکستان میں سینٹرل ٹیلیگراف آفس (کراچی) اور بعد میں علی آٹوموبائیل کمپنی میں اکاؤنٹنٹ رہے۔ آپ کی اولاد میں سید محمد منتظر راز اکبر آبادی مرحوم سید کلب احمد، سید محمد مدبر، سیدہ ریاض فاطمہ، سیدہ اقبال فاطمہ اور سیدہ حکیمہ خاتون ہوئے۔ سید محمد منتظر راز ڈبل ایم اے تھے ریڈیو پاکستان کے صدر دفتر میں مترجم فارسی تھے۔ عین جوانی میں ایک آپریشن کے نتیجے میں ستمبر ۱۹۵۳ء میں آپ نے رحلت کی۔ سید کلب احمد کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی ہیں اور اب ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ آپ فن بیمہ کے دماغ تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کی شادی سیدہ صالحہ خاتون عرف چمن بنت ڈاکٹر سید انصار حسن رضوی سے ہوئی ہے۔ آپ کی اولاد میں سید نوید احمد، سید ندیم احمد، سید نہال احمد، سید نجم احمد اور ناصور احمد نیز بی بی فرح اور بی بی نادیہ ہیں۔ سید نوید احمد اور سید ندیم احمد ڈاکٹر ہیں اول الذکر امریکہ (نیوجرسی) میں ہیں سید نہال احمد نے منیلا فلپائن سے انجینئرنگ کی ڈگری لی ہے۔ بی بی فرخ کمپیوٹر سائنس میں انجینئر ہے۔ سید محمد مدبر ڈبل ایم اے ہیں اور مدبر رضوی کہلاتے ہیں۔ آپ لائبریری سائنس میں بھی سند یافتہ ہیں۔ آپ پاکستان ٹیلی ویژن میں اعلیٰ عہدیدار (اسکرپٹ ایڈیٹر) ہیں، بی بی سی لندن کے خصوصی پروگرام کتب خانہ مرتبہ رضا علی عابدی کے مطابق آپ چلتی پھرتی لائبریری ہیں۔ آپ کا شمار دانشوروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی شادی سیدہ خورشید مریم بنت سید علی مقدس رضوی سے ہوئی۔ آپ کی

اولاد میں سید محمد مکرم، سید محمد خرم، سیدہ کرن رضوی اور سیدہ ضحیٰ رضوی ہیں۔ سید محمد مکرم نے بی کام کرلیا ہے اور آج کل لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دیگر افراد زیر تعلیم ہیں۔ سیدہ حکیمہ خاتون عرف چھنا کی شادی سید آغا جعفر بن سید حسن احمد جعفری سے ہوئی۔ آپ کے دو بیٹے سید حسن اور سید فراز اور بی بی انجم زہرہ ہیں آخر الذکر کی شادی ڈاکٹر سید نیر رضا سے ہوئی ہے۔ سید کلب حسن کے تیسرے بیٹے ماسٹر سید اکبر حسن تھے جو اسکول ٹیچر تھے۔ آپ کی شادی ریاست دھولپور کے سید حامد حسین کی دختر سیدہ آل زہرا سے ہوئی تھی۔ آپ کی اولاد میں سید غلام حسن، سید قاسم حسن اور سید دائم حسن ہیں۔ سید غلام حسن ریلوے میں ڈرائیور رہے۔ ان کے بیٹے سید آفتاب احمد اور سید عمران احمد ہیں نیز دختران سیدہ غزالہ، سیدہ نکہت ہیں۔ سید قاسم حسن زرعی ترقیاتی بینک میں افسر رہے۔ آپ کی شادی سیدہ نرجس خاتون عرف گڈن بنت ڈاکٹر سید علی اوسط مرحوم سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں سید کاشف رضا، سید ثاقب رضا، سید آصف رضا، بی بی عینی اور شانی ہیں۔ سید دئم حسن کسی فیکٹری میں ملازم اور غیر شادی شدہ ہے

سید کلب حسن کے چوتھے فرزند سید حسن محمد ہیں۔ آپ ٹیلی فون سپروائزر رہے۔ آپ کی شادی سیدہ آل مسعودہ بنت داروغہ سید داور حسین سے ہوئی تھی۔ آپ کی اولاد میں سید منتظر مہدی، سید باقر مہدی، سید عمار یاسر، سید میثم تمار، سید محمد رضوی، سید ضیا رضوی، سیدہ حسنیٰ خاتون عرف وکٹوریہ اور سیدہ شاہ زنان عرف شنو ہیں۔ سیدہ حسنیٰ خاتون کی شادی سید علی جرار بن سید زوار حسین سے ہوئی اور سیدہ شاہ زنان کی شادی محمد احمد سے ہوئی ہے۔ شاہ زنان پاکستان میں اکبر جام کی پہلی خاتون ہیں جس نے ۱۹۶۲ء میں ایم ایس سی کیا اور ایٹمک انرجی کمیشن میں ریسرچ آفیسر مقرر

ہوئی ۔ سید منتظر مہدی فضائیہ میں گروپ کیپٹن ، کورنگی کریک کے کمانڈر
بھی اور فرانس میں ایراتاشی رہے ۔ سید باقر مہدی پاکستان اسٹیل ملز میں
جنرل منیجر (پرسنل) ہیں۔ سید عمار یاسر کویتی ائرسروس میں افسر ہیں ۔ سید
ضیا رضوی ایم اے کامرس ہیں اور کراچی کے مشہور صاحب بیاض نوحہ
خواں ہیں۔ آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ سید میثم تمار اسٹیل مسلز میں اور
سید محمد رضوی کے ڈی اے میں ڈرافٹ مین ہیں۔ سید منتظر مہدی کے بیٹے
سید علی جری اور سید علی رضوی نیز بی بی معصومہ عرف فرح اور شیریں فاطمہ
ہیں۔ سیدہ معصومہ فرانسیسی زبان کی ماہر معلمہ رہی ہیں۔ سید علی جری
امریکہ میں زیر تعلیم ہیں۔ سید باقر مہدی کے بیٹے سید علی شجاع ، سید علی
کاشف ، سید علی شہریار اور سید شاہ رضوی ہیں۔ آخرالذکر بھی امریکہ میں زیر
تعلیم ہیں۔

عمار یاسر کی اولاد میں بلال رضوی ، تراب رضوی اور سردار رضوی
ہیں میثم تمار کے دو بیٹے علی رضا اور احسن رضاہیں۔ محمد رضوی کے دو
اولادیں حمزہ رضوی اور سارہ رضوی ہیں علی ضیاء کے بیٹے نائم رضوی ، جاسم
رضوی اور دختر ایمہ رضوی ۔ سیدہ شاہ زناں کے بیٹے نقی رضوی اور فراز
رضوی ہیں دونوں میاں بیوی امریکہ میں سائنس کے ریسرچ افسر ہیں۔

سید حسن علی ولد سید دائم علی کے دوسرے فرزند سید مثنیٰ حسن تھے
جو متھرا میں سرشتہ دار رہے۔ آپ کی شادی سیدہ بنت اسد بنت سید حسن
رضا سے ہوئی تھی ۔ آپ کی اولاد میں سید مختار حسن ، سید اسرار حسن ، سید
انصار حسن ، سید غفار حسن اور بی بی عقیلہ خاتون ہوئے۔ سید مختار حسن
آگرہ میں امین تھے کراچی میں مسجد اثنا عشری لیاقت آباد سی ایریا کی دوکانوں
میں تجارت کرتے تھے۔ آپ کی پہلی بیوی میمونہ خاتون بنت سید آل محمد

پھر سری سے ہوئی تھی ان کا جلد انتقال ہو گیا اور کوئی اولاد نہ ہوئی ۔ آپ کی دوسری شادی بی بی سائرہ خاتون بنت سید ذوالفقار حسنین سے ہوئی ۔ آپ کی اولاد میں سید ضامن رضا ، سید ثامن رضا ، سید معین رضا ، سید رکن رضا ، سیدہ ظہیرہ خاتون اور سیدہ حسنیہ خاتون ہوئے۔ سید ضامن رضا کی شادی سید شبیر حسین بن سید سراج الحسن کی دختر سے ہوئی جن سے سید ظفر رضا ، سید محمد رضا ، سید حسن رضا ، سید مظہر رضا اور حسین رضا وغیرہ ہیں۔ سید ثامن رضا کی شادی سیدہ نیاز فاطمہ بنت سید غفار حسن سے ہوئی جن سے تاحال کوئی اولاد نہیں ہے۔ سید معین رضا کی شادی بنت ایمن عرف تبسم سے ہوئی ۔ سیدہ ظہیرہ خاتون کی شادی آغا علی کاظم بن آغا محمد سجاد سے ہوئی سیدہ حسنیہ خاتون کی شادی سید محمد حسین بن ماسٹر سید حامد علی جعفری سے ہوئی ۔

سید اسرار حسن بن سید مثنیٰ حسن محکمہ موسمیات میں اعلیٰ افسر رہے۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آگرہ یونیورسٹی کی پہلی بی ایس سی کی ڈگری آپ کو ملی تھی ۔ آپ صاحب جائیداد اور حاجی وزائر ہیں۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر میں کیا گیا ہے آپ کی شادی سیدہ توصیفہ خاتون بنت سید جواد حسین سے ہوئی ۔ آپ کی اولاد میں سید علی مظفر، سید علی غضنفر، سید علی باقر، سید علی شبیر، سیدہ ضامنہ خاتون اور سیدہ فیروزہ خاتون ہوئے۔ سید علی مظفر کے ایک بیٹا سید علی حسین اور دو بیٹیاں ہیں۔ آپ کینڈا میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ سید علی غضنفر بھی کینڈا میں ہیں سید علی باقر، ہارڈویئر کا کاروبار کرتے ہیں۔ آپ کی شادی زہرہ خاتون بنت سید مقصود الحسن جعفری سے ہوئی آپ کی اولاد میں احسن عباس ، رضا عباس ، عابد عباس اور دو دختر ہیں۔

سید علی شبیر کی شادی سیدہ صبیحہ خاتون بنت سید منظور الحسن بن

پروفیسر سید ظہیر احسن سے ہوئی ۔ آپ کی اولاد میں سید علی اسد اور سید علی جعفر ہیں۔ آپ کراچی کے معروف ایڈوکیٹ ہیں۔ سیدہ ضامنہ خاتون کی شادی سید شریف احمد جعفری بن سید حسن احمد جعفری سے اور سیدہ فیروزہ خاتون کی شادی سید اکبر عباس بن ڈاکٹر سید انصار حسن رضوی سے ہوئی ۔

ڈاکٹر سید انصار حسن بن سید مثنیٰ حسن تقسیم ہند تک ریاست الور میں ڈاکٹر رہے۔ قیام پاکستان سے چالیس سال تک خیرپور سندھ میں ڈاکٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حال ہی میں سیاسی حالات کے تحت کراچی آگئے تھے اور انتقال کیا۔ آپ کی شادی سیدہ شکیلہ خاتون بنت سید حامد حسین رضوی سے ہوئی ۔ آپ کی اولاد میں سید ناصر عباس ، سید اکبر عباس ، سید اصغر عباس ، سید سعید عباس ، سیدہ صالحہ خاتون ، سیدہ عابدہ خاتون اور سیدہ سیما خاتون ہیں۔ سید ناصر عباس خیرپور میں اور اب کراچی میں وکالت کرتے ہیں۔ آپ کی اولاد میں سید صالح عباس ، سید محمد عباس ، سید یاور عباس ، سید جعفر عباس اور بی بی رانا ہیں جو کراچی میں لکچرار ہیں۔ سید اکبر عباس مسقط میں طبی پیشے سے وابستہ ہیں ان کے بیٹے سید حسن علی ، سید محسن علی اور سید جواد علی ہیں سید اصغر عباس محکمہ صنعت میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں آپ کے بیٹے سید عدنان حیدر ، سید رضوان حیدر اور سید عرفان حیدر ہیں۔ سید سعید عباس تاحال لاولد ہیں۔

سید غفار حسن بن سید مثنیٰ حسن فوج میں صوبیدار میجر رہے۔ آپ کی شادی سیدہ ریاض فاطمہ بنت سید افتخار حسن رضوی سے ہوئی ۔ آپ کی اولاد میں سید رضا مہدی ، سید قیصر مہدی، سید کوثر مہدی ، سیدہ نیاز فاطمہ ، سیدہ اعجاز فاطمہ ۔ سیدہ بکھراج فاطمہ ، سیدہ سرتاج فاطمہ ، سیدہ بنت فاطمہ عرف افشاں اور سیدہ ریحانہ بتول عرف شمع ہیں۔ سید رضا مہدی ایم ایس سی اور

پلاسٹک ٹیکنالوجی میں ماہر ہیں۔ آپ جدہ سعودی عرب میں ایک بڑی پلاسٹک فیکٹری میں منیجر ہیں۔ آپ کی شادی سیدہ تبسم فاطمہ بنت سید سبط احمد جعفری سے ہوئی ہے۔ آپ کی اولاد میں تاحال تین دختر سمن زہرا، عنبر زہرا اور سدرہ بتول اور ایک صاحبزادہ سید مرتضی ہے۔ سید قیصر مہدی ایک پرائیوٹ کمپنی میں ملازم ہیں ان کی شادی سیدہ فرزانہ فردوس بنت سید شریف احمد جعفری سے ہوئی ہے۔ ان کے تاحال کوئی اولاد نہیں۔ سید کوثر مہدی حبیب بینک کراچی میں افسر ہیں۔ ان کی شادی سیدہ شگفتہ بنت سید انصار حسین جعفری سے ہوئی ہے۔ ان کی دو بیٹیاں عروسہ اور ام ایمن ہیں۔ سیدہ نیاز فاطمہ کی شادی سید ثامن رضا بن سید مختار حسن سے، سیدہ اعجاز فاطمہ کی شادی سید محمد جان سے، سیدہ معراج فاطمہ کی شادی سید قیصر عباس سے، سیدہ سرتاج فاطمہ کی شادی سید ناصر عباس بن سید آل عباس سے، سیدہ بنت فاطمہ عرف افشاں کی شادی سید گوہر مہدی بن سید انتظار رضا رضوی سے ہوئی ہے۔ ان کی اولاد میں عذرا کنول، مثال زہرہ، وقار حیدر اور انصر مہدی ہیں۔ سیدہ ریحانہ بتول عرف شمع کی شادی نظیر عالم عرف پرنس بن ابوالحسن بن انتظار حسین سے ہوئی ہے ان کی اولاد میں تاحال دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

میر اکبر علی کے تیسرے بیٹے سید امام علی تھے جو مہاراجہ بھرتپور کی طرف سے آگرہ میں ریاست بھرتپور کے وکیل تھے آپ بڑے شاندار، زور آور اور عبادت گزار تھے۔ آپ کی اولاد میں سید محمد رضا، سید علی حسن اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ سید محمد رضا لاولد رہے۔ سید علی حسن کی اولاد میں سید محمد تقی، سید علی جان، بی بی سیدہ خاتون، بی بی سیدہ زبیدہ اور بی بی سیدہ عابدہ ہوئے۔ بی بی سیدہ خاتون کی شادی نواب ابن رضا سے ہوئی تھی جو مرثیہ

خوانی میں منفرد تھے جن سے مبارک علی، آل علی اور بی بی منظمہ ہوئے۔ بی بی زبیدہ عرف زبو کی شادی سید انتظار حسین بن اعجاز حسین سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد کا ذکر دیگر خاندانوں میں کیا گیا ہے

سید علی جان بن سید علی حسین کے بیٹے سید محمد عاقل اور سید ابو علی اور کئی دختران ہوئے۔ سید محمد عاقل لاولد رہے۔ سید علی حسین بڑے عابد اور زاہد تھے۔

میر اکبر علی کے چوتھے فرزند سید ببر علی تھے۔ آپ مہاراجہ بھرتپور کے مدارالمہام (چیف سکریٹری) تھے۔ آپ نہایت پرشکوہ، رعب دار اور طاقتور تھے۔ آپ بڑے عبادت گزار تھے۔ آپ کی شادی سید پورہ کے سید وزیر علی زیدی کی دختر سیدہ وحیدہ خاتون سے ہوئی تھی آپ کی اولاد میں سید حسن رضا سید علی رضا، سید کاظم رضا، بی بی محبوب النساء اور بی بی الفت النساء ہوئے۔ سید حسن رضا آگرہ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ آپ محکمہ نہر میں اکاونٹنٹ تھے اور پنشن کے بعد ضلع آگرہ میں سب رجسٹرار رہے۔ آپ نے تحصیل فتح آباد میں زمینداری خریدی تھی۔ آپ کو پہرسر کی بی بی سکینہ خاتون بنت سید امیر علی ابن میر دولت علی بیاہی تھیں۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی اولاد میں ایک بیٹے سید محسن رضا اور تین دختران بی بی ہاجرہ خاتون بی بی بنت اسد فاطمہ اور بی بی طاہرہ خاتون ہوئے۔ سید محسن رضا آگرہ سینٹ جانس کالج کے تعلیم یافتہ اور گنہ فوجی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ یہاں سے آپ نے تحریک ترک موالات کے سلسلے میں ۱۹۱۹ء میں استعفیٰ دیدیا تھا اور پھر حیدر آباد ریاست میں اورنگ آباد میں نائب صدر مدرس رہے۔ آپ کی پہلی بیوی پہرسر کی بی بی مریم بنت میر سید شمشاد حسین رضوی وزیر ریاست بھرتپور تھیں جن سے ایک دختر سیدہ خاتون عرف بڑو ہوئی۔ دوسری

شادی بی بی عفیفہ خاتون بنت سید شجاعت حسین رضوی ڈپٹی کلکٹر سے ہوئی تھی ۔ان سے آٹھ بیٹے سید محمد اطہر، سید محمد اسد، سید علی اوسط، سید محمد علی سید علی، سید محمد مقصود، سید محمد کامل اور سید حسن بن محسن ہوئے۔ بی بی سیدہ خاتون عرف بڑو کی شادی پہرسر کے سید آل سبطین بن سید آل محمد سے ہوئی تھی ۔آپ کی اولاد میں سید سلطان عباس، بی بی سیدہ لوبا خاتون اور بی بی حسنیہ عرف کھلو ہوئے۔ سید سلطان عباس انجمن پنجتنی آگرہ کے خاص نوحہ خوانوں میں تھے اور گلبہار کراچی میں ہتایں پہرسر کی عزاداری قائم رکھے ہوئے تھے۔ نیز ہر سال سالانہ مجالس کے اشتہار کے علاوہ گزشتہ برس کے مرحوم مومنین برادری کے اسماء بھی شائع کیا کرتے تھے۔ سیدہ لوبا خاتون کی شادی پہرسر کے سید احسن رضا انجینئر سے ہوئی تھی جن کی اولاد میں نمایاں ترین شخص سید عظمت رضا ہیں جو مخدوم زادہ حسن محمود رحیم یار خاں کے سیکریٹری رہے جن کی اولاد نرینہ میں سید اختر رضا، سید انور رضا اور سید احمد رضا، سید محمد رضا، سید یاسر رضا، سید اقتدار رضا، سید سکندر رضا اور چار بیٹیاں ہیں۔

سید محمد اطہر بن سید محسن رضا کی شادی سیدہ زاہدہ خاتون، بنت سید ذوالفقار حسنین انسپکٹر ریلوے پولیس سے ہوئی تھی ۔ ان کے دو بیٹے سید غلام عباس اور سید محمد عباس ہوئے جو لاولد رہے۔ دختران میں سیدہ امتل خاتون (امت الخاتون) کی شادی ماسٹر سید شاہد حسین سے، سیدہ وحیدہ خاتون کی شادی سید نعیم رضا بن سید قاسم رضا (بڑی حویلی والے) سے، سیدہ نثار فاطمہ کی شادی سید افتخار حسین جعفری بن سید مختار حسین جعفری سے ہوئی ۔ یہ سب صاحب اولاد ہیں۔ سید نعیم رضا نے شاہ گنج آگرہ کی عزاداری کو پہلے بہرلو ریاست خیرپور میں اور بعد میں کراچی میں جاری رکھا۔

سید محمد اسد بن سید محسن رضا شاہ گنج آگرہ میں مدرسہ اسلامیہ میں معلم تھے اور ممتاز ذاکرین میں شمار ہوئے۔ آپ کی شادی مونس خاتون بنت سید محمد حسن دھولپوری سے ہوئی تھی ان کی اولاد میں سید حسن عمران، سید حسن سلمان، سیدہ رضیہ خاتون، سیدہ تقویہ خاتون اور سیدہ نقویہ خاتون ہوئے۔ سید حسن عمران ایم اے ہیں اور کراچی کسٹمز میں ملازم ہیں اور اپنے والد کی طرح ذاکری بھی کرتے ہیں۔ آپ کے بیٹے سید علی محسن عرف رضوان اور سید علی عرفان اور ایک بیٹی ہے۔ سید حسن سلمان نیشنل بینک میں ملازم تھے ان کے بیٹے میثم اور زین ہیں۔ سیدہ رضیہ کی شادی سید سجاد احمد بن سید محمد خضر بہرسری سے، سیدہ تقویہ کی شادی سید مردان علی بن ڈاکٹر سید غفار حسین جعفری سے اور سیدہ نقویہ کی شادی سید شاکر حسین بن سید ابوالحسن سے ہوئی۔

سید علی اوسط بن سید محسن رضا ہندوستان میں ایسٹ انڈیا ریلوے میں انسپکٹر واچ اینڈ وارڈ تھے۔ جنگ عظیم ثانی میں وائسرائے کمیشنڈ افسر کی حیثیت سے خدمات کلکتہ میں انجام دیں۔ آپ اعلیٰ درجے کے ہومیو پیتھ ڈاکٹر بھی تھے اور نہایت دیانتدار اور پرہیزگار انسان تھے۔ آپ نمایاں سوزخواں اور صاحب طرز مرثیہ خواں تھے۔ آپ کی شادی سیدہ سعیدہ خاتون بنت سید وقار حسن سے ہوئی آپ کی اولاد میں سید حسن مشبر، سید حسن مدثر، سید حسن رضا، سیدہ منورہ خاتون، سیدہ رباب سکینہ، سیدہ آل مریم، سیدہ نرجس خاتون، سیدہ طاہرہ خاتون، سیدہ ناصرہ خاتون اور سیدہ افروز زہرا ہوئے۔ آخر الذکر غیر شادی شدہ اور کراچی میں ہیڈ مسٹریس ہیں۔ سید حسن مشبر ٹی اینڈ ٹی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر رہے ہیں ان کا شمار ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کی شادی مشبرہ خاتون بنت سید علی سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں سید آل محسن

سید علی شبر، سیدہ یاسمین زہرا، سیدہ تصویر فاطمہ ہیں۔ سید آل محسن نے پولی ٹیکنک سے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا ہے اور ایک تعمیراتی ادارے میں سب انجینئر ہے۔ دیگر تاحال زیر تعلیم ہیں۔ سید حسن مدثر ایکسائز میں ملازم ہیں ان کی شادی سیدہ نجمہ خاتون بنت سید محمد کامل سے ہوئی ہے ان کے نو دختران اور ایک فرزند سید محمد باسط علی ہیں۔ یہ سب ابھی زیر تعلیم ہیں۔ سید حسن رضا ٹی اینڈ ٹی اسٹور میں اسسٹنٹ ہیں۔ آپ ہومیوپیتھی کے طریقہ اعلاج میں کافی درک رکھتے ہیں۔ آپ کراچی کے ممتاز سوز خوانوں میں ہیں۔ آپ کی شادی سیدہ عصمت خاتون بنت سید علی مہدی جعفری سے ہوئی ہے۔ تاحال آپ صاحب اولاد نہیں ہیں۔

سید محمد علی بن سید محسن رضا بڑے پرہیزگار، عبادت گزار اور عامل باصفا تھے۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی سید مرتضیٰ حسین عرف پیرجی کی دختر سے ہوئی تھی جو اچھے سوزخوان تھے ان کی کوئی اولادزندہ نہ رہی۔ دوسرے بیوی سیدہ ملکیہ خاتون بنت سید وقار حسن سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں سید آدم مہدی، سید اعظم مہدی، سید معظم مہدی اور سیدہ بنت محمد عرف حنا ہیں۔ سید آدم مہدی حافظ قرآن ہیں ٹی اینڈ ٹی میں سپروائزر ہیں آپ کا ذکر ممتاز شخصیات میں کیا گیا ہے۔ آپ کو سیدہ آمنہ خاتون تبسم بنت سید انتظار رضا بیاہی ہے۔ ان کی اولاد میں سید اکبر علی عرف ذیشان، سید افتخار حسن عرف فرحان، بی بی نازنین سکنیہ اور بی بی ثمین زہرا ہیں۔ سب ابھی کم عمر اور زیر تعلیم ہیں۔ سید اعظم مہدی سب انجینئر ہیں اور تعمیراتی کمپنی میں سپروائزر ہیں۔ آپ کو سیدہ حسن مریم عرف شاہین بنت سید حسن بن محسن بیاہی ہے۔ ان کی اولاد میں فراز، شیراز اور سکنیہ بتول ہیں۔ سید معظم مہدی کسی پرائیویٹ ادارے میں برسرکار ہیں اور مجالس عزاء میں

خاص حصہ لیتے ہیں۔ سیدہ بنت محمد عف حنا کسی دوائی کی کمپنی میں ملازم ہیں۔ اور تاحال غیر شادی شدہ ہیں

سید علی بن سید محسن رضا کراچی پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ آپ کی پہلی بیوی سیدہ منظر النساء بنت داروغہ سید نظیر الحسن تھیں جن سے ایک دختر سیدہ مبشرہ خاتون ہوئیں۔ دوسری بیوی سیدہ امیر فاطمہ بنت سید ناظم حسین ہیں۔ ان کی اولاد نرینہ میں سید خضر مہدی عرف مہروز، سید عسکری مہدی، سید نرجس خاتون اور سیدہ حسن فاطمہ ہیں۔ سید خضر مہدی ایم اے ہیں اور بینک میں افسر ہیں۔ آپ کی اولاد میں سید مرتضیٰ علی، سیدہ بتول، سیدہ نور فاطمہ اور سیدہ ناز فاطمہ ہیں جو ابھی زیر تعلیم ہیں۔

سید محمد مقصود بن سید محسن رضا آگرہ میں تجارت پیشہ تھے۔ آپ انجمن پنجتنی آگرہ کے بانیوں میں تھے اور طویل عرصہ تک اس کے سکریٹری اور روح رواں رہے۔ آپ کا تذکرہ ممتاز شخصیات میں کیا گیا ہے۔ آپ کی شادی بنت سید مہدی حسن (سیردھنہ والے) سے ہوئی تھی۔ کراچی میں آپ محکمہ ڈاک خانہ جات میں ملازم تھے۔ آپ کی اولاد میں سید ببر علی، سید محمد علی سیدہ غدیر فاطمہ اور سیدہ سکینہ خاتون ہیں۔ سیدہ سکینہ خاتون کراچی میں ممتاز ایڈوکیٹ ہیں۔

سید محمد کامل بن سید محسن رضا پاکستان حبا کو کمپنی میں ملازم رہے۔ گلبہار کراچی کی دینی اور سماجی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور مولانا کامل مشہور ہیں۔ آپ بڑے حوصلہ مند شخص رہے ہیں اور مسجد و امام باڑہ جعفریہ گلبہار کے نگہبانوں میں ہیں۔ آپ کی شادی بیانہ کے سید مہدی حسن کی دختر سیدہ حدیثہ خاتون سے ہوئی ہے۔ آپ کی اولاد میں سید عیسیٰ مہدی، سید ہاشم رضا، سید حسین اصغر، سید حسین محمد، سیدہ نجمہ خاتون، ثریا خاتون

سیدہ شبیرہ خاتون اور بی بی شبو ہیں۔

سید حسن بن محسن بن سید محسن رضا واپڈا میں انجینئر رہے۔ آپ کا تذکرہ ممتاز شخصیات میں کیا گیا ہے۔ آپ کی شادی سیدہ حلیمہ خاتون بنت سید ابن علی تاجر چشمہ سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں سید محسن رضا عرف خورشید، سید حسین رضا عرف شمع، سید حسنین رضا عرف چمن، سید قائم رضا عرف مون، سید دائم رضا عرف ندیم، سید کاظم رضا عرف نوید، بی بی انجم، بی بی حسن مریم شاہین اور حسن فاطمہ عرف لاڈو ہیں۔ سید محسن رضا عرف خورشید بینک میں افسر ہیں سید حسین رضا ٹیچر ہیں، سید حسنین رضا پولیس میں سب انسپکٹر ہیں۔ سید دائم رضا عرف ندیم کوٹری میں اسٹنٹ فورمین ہیں۔ بی بی انجم کی شادی سید علی اظہر جعفری، حسن مریم عرف شاہین کی شادی سید اعظم مہدی اور حسن فاطمہ عرف لاڈو کی شادی سید گوہر رضا سے ہوئی ہے۔ سید قائم رضا عرف مون نیوی میں ہیں۔

سید ببر علی بن میر اکبر علی کے دوسرے فرزند سید علی رضا محکمہ نہر میں ملازم تھے۔ آپ کی پہلی بیوی سے سید آل رضا، سیدہ یونسہ خاتون، سیدہ مونسہ خاتون اور سیدہ انیس خاتون ہوئے۔ دوسری بیوی حیدری حسن بنت سید حسن علی سے جن کے کئی بیٹوں نے طاعون کی وبا میں وفات پائی ان میں فقط سید غلام رضا زندہ رہے۔ آپ پولیس میں ملازم تھے آپ کو بی بی مطاہرہ خاتون بنت کاظم حسین بیاہی تھیں جو سینیٹر اور وفاقی وزیر قانون حکومت پاکستان اقبال حیدر کی سگی پھوپھی تھیں۔ سید آل رضا ہندوستان میں ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ آپ کو بی بی انوری خاتون بنت سید کاظم رضا بیاہی تھی۔ آپ کے اکلوتے بیٹے سید مطاہر رضا ہوئے جن کو بابو سید محمد اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی رئیسہ خاتون بیاہی تھی۔ آپ کے اولاد نرینہ نہ ہوئی۔

بی بی یونسہ خاتون سید محمد مقدس جعفری کو بیاہی تھی جو پاکستانی فضائیہ میں گروپ کیپٹن اور انٹر سروس سلیکشن بورڈ کے رکن رہے۔ بی بی مونسہ خاتون عرف ملکہ سید شفیع احمد جعفری کو بیاہی ہیں وہ بھی فضائیہ میں افسر رہے۔ بی بی انیسہ خاتون سید ضمیر الحسن رضوی بن سید عزیز الحسن کو بیاہی گئی سید ضمیر الحسن کے فرزند سید محمد علی سعید رضوی انجینئر پاکستان آرمی میں میجر اور شاہراہ ریشم تعمیر کرنے والے انجینئروں میں نمایاں رہے۔ سید محمد مقدس جعفری کے بیٹے سید محمد مشرف جعفری پاک فوج میں میجر تھے۔

سید ببر علی کے تیسرے فرزند سید کاظم رضا تھے جو محکمہ نہر میں ملازم تھے۔ آپ کی دو بیویوں سے تین بیٹے سید اکرم رضا، سید ضیغم رضا، سید مبارک رضا اور تین دختران بی بی طیبہ، بی بی انوری اور بی بی سیدہ تھیں۔ بی بی طیبہ سید عزیز الحسن بن سید قادر علی کو، بی بی انوری سید آل رضا بن سید علی رضا کو اور بی بی سیدہ بابو سید محمد اسٹیشن ماسٹر بن سید محمود علی کو بیاہی تھیں۔ سید اکرم رضا ہندوستان میں پولیس انسپکٹر تھے۔ آپ کی شادی دہلی والوں میں ہوئی تھی۔ آپ کی اولاد میں سید احسن رضا اور سید اختر رضا ہوئے ان کے سید عمران اور سید ماہر دو بیٹے ہیں۔ سید ضیغم رضا آگرہ میں تجارت اور کراچی میں معلمی کرتے تھے۔ آپ بڑے دیانتدار اور خوددار انسان تھے۔ آپ کی شادی بی بی واجدہ خاتون بنت سید وصی حیدر سے ہوئی تھی۔ آپ کے بیٹے سید اشرف علی اور سید احمد علی عرف سید معظم علی اور چار دختران سیدہ رشیدہ خاتون، سیدہ کنیز فاطمہ، سیدہ سعیدہ خاتون اور سیدہ پروین عرف بے بی ہوئے۔ سید اشرف علی ایم ایڈ ہیں اور کراچی میں سینئر ٹیچر ہیں۔ سید احمد علی بھی ایم ایڈ اور کراچی میں سینئر ٹیچر تھے۔ انہوں نے مئی ۱۹۹۰ء میں انتقال کیا۔ آپ کو سید انتظار رضا رضوی کی دختر سیدہ نگہت فاطمہ بیاہی تھی

مرحوم نے دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں جو کمسن ہیں۔ دو بیٹے وجیہ عباس، شجیع عباس دو بیٹیاں حنا فاطمہ اور رباب فاطمہ ہیں۔ سیدہ رشیدہ خاتون شکار پور کے سید حسن امیر نقوی کو بیاہی تھیں۔ ان کی اولاد میں سید اختر امیر، سید باقر امیر، سید ضامن امیر، سید محسن امیر اور بی بی نگہت فاطمہ ہیں۔ آخر الذکر ہومیو پیتھی کی سند یافتہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ سید اختر امیر بینک میں ملازم ہیں ان کو سید علی زائر بن داروغہ سید نظیر الحسن رضوی کی دختر بیاہی ہیں۔ سید مبارک رضا بن سید کاظم رضا آگرہ اور کراچی دونوں مقامات پر معلمی کرتے رہے۔ نیز پشاور ٹیلیگراف آفس میں ملازم بھی رہے۔ آپ نیک اور سادہ انسان تھے۔ آپ کو سیدہ شاکرہ خاتون بنت سید علی اقدس جعفری بیاہی ہیں۔ آپ لاولد ہے۔ آپ مرثیہ وسوزخوان تھے۔

(۴) خاندان سید صاحب علی

سید صاحب علی بن سید خان محمد ہیلک کے سادات رضوی اور سید شبر بن سید رکن الدین ذوکر کی نسل میں تھے۔ آپ کی پھوپھیوں (بی بی رشیدہ اور بی بی وحیدہ) کی شادیاں بڑی حویلی والے سید حسن علی اور سید بشارت علی سے ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے سید صاحب علی ہیلک سے شاہ گنج منتقل ہوگئے تھے۔ سید خان محمد کے بیٹے سید صاحب علی کو سید پورہ کے سید محمد علی کی بیٹی منسوب تھی۔ ان کا ایک بیٹا سید نیاز علی اور چار دختران ہوئے۔ ان میں ایک دختر سید امداد علی کو بیاہی تھی جو داروغہ سید احترام علی کے ماموں تھے۔ دوسری بیٹی پہرسر کے سید کرامت علی کو بیاہی تھی۔ تیسری بیٹی بھی پہرسر کے مولوی التفات علی کو منسوب تھیں۔ چوتھی سے سید محسن حسن اور سید زین العابدین ہوئے۔ آخر الذکر کا ایک بیٹا سید علی حیدر تھا۔

۔ مولوی التفات علی صاحب علم تھے اور سادات شاہ گنج کے معلم دینی بھی تھے۔ ۔ سید صاحب علی متھرا میں تحصیلدار تھے۔ آپ نے اپنی لیاقت سے دولت کمائی اور جائیداد بنائی ۔ داروغہ سید احترام علی کی تحریر کے بموجب ۔ آپ نے مہاتی جائیداد کے علاوہ شمرو کی قلعہ نما حویلی جسے ڈیوڑھیاں کہتے تھے اور دو بڑے باغ بھی اپنے اثرو رسوخ سے بہت کم قیمت پر حاصل کئے تھے۔ یہ وہی شمرو تھے جو مغل وائسرائے آگرہ ، نواب نجف علی خان کے مصاحب تھے اور جن کی بیگم شمرو نے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کی زبردست فوجی اور مالی مدد کی تھی ۔ ان کی میرٹھ کے علاوہ آگرہ میں بھی بڑی جائیداد تھی جس کا بڑا حصہ خاندان میر اکبر علی کی تحویل میں تھا۔ سید صاحب علی بڑے پرہیزگار تھے۔ آپ روسائے آگرہ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ۱۸۳۵ء میں وقف کا امام باڑہ اور مسجد تعمیر کروائے تھے۔ آپ اچھے مرثیہ خواں بھی تھے۔ آپ کے بیٹے نیاز علی تھے۔ جو ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ اور راجپوتانہ میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے سکریٹریٹ میں اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ (۱۷) آپ جائیداد وقف سے زائرین کربلا کے لئے اور مزار شہید ثالث آگرہ کے اخراجات کی کفالت میں حصہ لیتے تھے۔ شاہ گنج میں عیدگاہ ، زنانی مسجد ، اور بھونڈا گاؤں میں مسافر خانے تعمیر کروائے تھے۔ آپ کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئے۔ سید مشتاق علی ، سید ابراہیم علی ، سید محسن علی ، سید معصوم علی اور سید صادق حسین بیٹے تھے جو سب کے سب تحصیلدار تھے۔ سید محسن علی کا ایک بیٹا سید مصطفیٰ حسین اور چار دختران تھیں۔ سید مصطفیٰ حسین بھی تحصیلدار تھے۔ سید ابراہیم علی کے دو بیٹے سید علی عباس اور سید علی جواد تھے اور تین دختران تھیں۔ میر نیاز علی کی ایک بیٹی پہرسر میں خان بہادر سید اولاد حسین بن سید ثابت علی رضوی کو بیاہی تھی ۔ جن کا تذکرہ مشاہیر میں کیا گیا ہے۔ سید صادق حسین کے

چار بیٹے سید آل نبی، سید ابن علی، سید علی جان اور سید امیر حیدر تھے۔ سید آل نبی بڑے نامور ہوئے ۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر میں کیا گیا ہے۔ سید آل نبی کی اولاد نرینہ میں سید آل علی، سید آل نیاز، سید آل ضامن، سید آل حیدر اور سید آل امام ہیں۔ سید آل نیاز کراچی میں انکم ٹیکس افسر رہے۔ سید آل حیدر انجینئر ہیں ۔ سید آل ضامن کراچی میں مرکزی حکومت کے سول سرجن رہے۔ سید آل امام کراچی میں تجارت پیشہ ہیں۔ اور پی ڈی [illegible] رہے۔ سید علی خان کی اولاد میں سید علی اوسط موجودہ نسل کے افراد میں پاکستان میں موجود ہیں۔

(۵) خاندان سید ہمت علی

سید ہمت علی بن سید روشن علی بن سید مراد ہیلک کے سادات رضوی اور تھوک فرید سے تعلق رکھتے تھے۔ سید روشن علی کے دو بیٹے سید امیر علی اور سید ہمت علی ہوئے۔ سید امیر علی کی اولاد نرینہ نہ تھی ۔ سید ہمت علی کی شادی پہر سر میں ہوئی تھی ۔ آپ ریاست کوٹہ میں ملازم تھے۔ آپ کے دو فرزند اور چار دختران تھے۔ فرزندان میں سید ضامن علی اور سید تراب علی ہوئے۔ سید ضامن علی کی شادی شاہ گنج کے سید عصمت علی کی دختر سے اور سید تراب علی کی شادی اچھنیرہ کے سید حیدر علی کی بیٹی سے ہوئی تھی ۔ غالباً شاہ گنج آگرہ میں آباد ہونے والے سید ہمت علی ہی تھے۔

میر ضامن علی ۱۸۵۷ء میں سیتاپور (اودھ) میں تحصیلدار تھے۔ انہیں انگریزوں کی خیرخواہی میں بڑی تکالیف اٹھانا پڑیں۔ جس کے صلے میں انہیں لکھیم پور میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا علاقہ جاگیر میں ملا تھا۔ آپ نیک اور خوش نیت انسان تھے۔ آپ حاجی وزائر بھی تھے۔ شاہ گنج میں عزاخانہ وقف کے

آپ بانی تھے۔ آپ نے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی ۔ "(۷۴) آپ کی دو بیویوں سے چھ بیٹے اور دو دختران ہوئے۔ فرزندان میں سید رضا حسین، سید محمد حسن، سید ابوالحسن، سید احمد حسن، سید محمد ہادی اور سید محمد تھے۔ سید رضا حسین نیک اور عبادت گزار انسان تھے۔ ان کے بیٹے سید ابن رضا کی اولاد میں سید مبارک رضا اور سید ضامن رضا ہوئے۔ سید مبارک رضا کے بیٹے سید سلامت رضا اور سید امامت رضا تھے۔ یہ دونوں حضرات مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں بس گئے تھے۔ سید محمد حسن بن میر ضامن علی ریاست بلرام پور میں نائب دیوان تھے۔ آپ نے مزار شہید ثالث آگرہ کے اصل روضہ کی اولین تعمیر کروائی تھی ۔ "(۷۵) آپ نے ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ آپ کے تین فرزند سید علی حسن، سید شبیر حسین اور شبر حسین تھے۔ سید شبیر حسین کے بیٹے سید رضا حیدر تھے جن کے چار فرزند سید رفیق حسین، سید رضا، سید ضیا حیدر اور سید حسن ضامن ہوئے۔ سید رفیق حسین وکیل تھے۔ ان کی اولاد میں ممتاز ترین فرد۔ حمید احمد بینک افسر و دوسرے پی آئی اے میں انجینئر ہیں۔ سید رضا (سید رضا رضوی) پاکستان ٹی اینڈ ٹی میں ملازم تھے۔ معاصر میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپ نے اولاد نرینہ میں علی رضا، محمد ابراہیم، محمد علی، محمد حسین، اور رضا عباس چھوڑے ہیں۔ سید ضیاء حیدر اور سید حسن ضامن حیات ہیں اور کراچی میں برسرکار ہیں۔ سید شبر حسین جو نواب شبر حسین کہلائے کے چار بیٹے خانصاحب سید اطہر حسین خانصاحب سید یونس رضا، سید ناصر حسین اور سید عادل حسین ہوئے۔ نواب سید اطہر حسین آگرہ میں بلدیہ کے ڈپٹی چیرمین رہے۔ شاہ گنج کے عہد آخر کے مقتدر حضرات میں نمایاں تھے۔ آپ کے بیٹے سید محمد ضامن اور سید علی ضامن ہیں۔ سید محمد ضامن پہلے اصفہانی چائے کمپنی میں ملازم رہے اب رضویہ سوسائٹی کے

مینیجنگ ٹرسٹی ہیں۔ سید علی ضامن ٹی اینڈ ٹی پاکستان میں ڈویژنل انجینئر رہے ہیں۔ اول الذکر کے بیٹے سید محمد حسن اور سید محمد رضا ہیں آخرالذکر کے ایک فرزند سید علی حسن ہیں۔ خاں صاحب سید یونس رضا بن نواب سید شبر حسین آگرہ میں اعزازی مجسٹریٹ تھے۔ آپ کو آغا سید ابوالقاسم کی بیٹی بیاہی تھیں۔ آپ کی اولاد میں اہم ترین افراد میں سید مشیر رضا ہیں جو بینک میں افسر ہے۔ سید ابوالحسن بن میر ضامن علی لاولد رہے۔ سید احمد حسن بن میر ضامن علی ریاست بلرام پور میں تحصیلدار تھے۔ آپ کے اکلوتے فرزند آغا سید ابوالقاسم تھے۔ جو آخر وقت تک عزاخانہ شاہ گنج کے متولی و مہتمم رہے۔ آپ نے عزاخانہ کو وسعت دی ، ایک عظیم اور نادر الوجود ضریح بنوائی اور لائبریری وجزوقتی شفاخانہ قائم کئے۔ آغا سید ابوالقاسم کے مصاحب خاص مولوی سید عابد حسین تھے جو کلیات نظیر اکبر آبادی کے پہلے اور منفرد مرتب ومحقق تھے۔ (۷۶) آپ کے چھ بیٹوں میں تین بھارت میں اور تین پاکستان میں ہیں۔ سید ہمت رضا ، ظفر حسنین اور سید جواد احمد انڈیا میں جب کہ حکیم سید حسنین رضا ، سید ابوالحسن رضوی سید حبیب احمد کراچی (پاکستان) میں ہیں۔ سید ہمت رضا آگرہ میں عزاخانہ اور مسجد میر اکبر علی کے مہتمم ونگران ہیں حکیم سید حسنین رضا کراچی میں ہمدرد فاونڈیشن سے وابستہ ہیں اور اکثر حکیم محمد سعید کی نیابت کرتے ہیں۔ سید ہمت رضا کی ایک دختر سنسکرت میں ایم اے اور دوسری دختر سید العلماء علامہ سید علی نقی مجتہد نقن صاحب کے فرزند ارجمند مولانا سید محمد علی کو بیاہی ہے۔ جو تہران میں مقیم ہیں اور ایک بیٹا ہاشم رضا ہے جو تاجر ہے۔ حکیم سید حسنین رضا کے تین فرزند سید محمود حسنین ، سید عباس رضا اور سید سہیل رضا ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود حسنین شمسی توانائی میں انگلستان سے پی ایچ ڈی ہیں اور شمسی توانائی کے ادارے

واقع سعودی عرب میں ریسرچ آفیسر ہیں۔ آپ کی شادی سیدہ عصمت فاطمہ بنت سید انتظار رضا (راقم الحروف) کے ساتھ ہوئی ہے۔ آپ کے تاحال تین لڑکیاں سارہ، فضہ اور فاطمہ ہیں۔ سید عباس رضا کا فی الحال ایک بیٹا سید محمد رضا ہے۔ سید سہیل رضا بی کام ہیں تاحال غیر شادی شدہ ہیں۔ اور بینک میں ملازم ہیں۔۔ سید ابوالحسن حکومت سندھ کے الیکٹرک انسپکٹر اور ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ ان کا بیٹا خرم حسن اور دو بیٹیاں سیما حسن اور شہاب حسن ہیں۔ سید حبیب احمد بینک مینجر ہیں ان کا بیٹا سید حسیب احمد اور بیٹی نوشین ہے اور ظفر احمد کے ایک بیٹی ام فروہ ہے جواد احمد کی ایک بیٹی فرخ ہے۔ سید محمد بن میر ضامن علی آگرہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آپ نیک اور عبادت گزار تھے۔ آپ ۸ محرم کی مجلس و نیاز بڑے تزک واحتشام سے کرتے تھے۔ آپ کی دو بیویوں سے چھ بیٹے اور تین دختران ہوئے اولاد نرینہ میں سید ابن حامد سید محمد احمد، سید محمود، سید مسعود، سید حمید اور سید سعیدؔ ان میں نمایاں تر ین فرد سید ابن حامد رضوی تھے جو جغرافیہ میں پی ایچ ڈی تھے۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر میں الگ کیا گیا ہے۔ (۲۲) سید محمد ہادی بن میر ضامن علی کی تین بیویوں سے تین بیٹے اور دو دختران ہوئیں۔ بیٹوں میں سید محمد طیب اور سید محمد مہدی ہوئے۔ سید محمد طیب کے تین فرزند سید محمد مظاہر، سید محمد طاہر او سید محمد مظاہر ہوئے۔ سید محمد طاہر جو ڈاکٹر طاہر رضوی مشہور ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر جغرافیہ تھے آپ جغرافیہ میں پی ایچ ڈی تھے۔ آپ علی گڑھ ہی میں مستقلاً بس گئے تھے۔

سید محمد مہدی کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ آپ کی دختر سید سجاد حسین بن میر تراب علی کو بیاہی تھی جن کے بطن سے دو بیٹے اور ایک بیٹی سید جواد حسین، سید امیر حیدر عرف حاجی حسن اور بے بی آمنہ ہوئے۔ بی بی آمنہ

حاجی سید عابد رضا بن میر تراب علی کو بیاہی تھی۔

سید ہمت علی کے دوسرے بیٹے میر تراب علی تھے۔ آپ ایام غدر میں بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آپ سر سید احمد خان کے قریبی دوستوں اور زبردست مددگاروں میں تھے۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر میں الگ کیا گیا ہے۔ آپ نے ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔ آپ کی اولاد میں پانچ فرزند سید علی احمد، سید سجاد حسین، سید کاظم رضا، سید عابد رضا اور سید علی جان تھے۔ سید علی احمد نے جوانی میں انتقال کیا۔ آپ کے دو بیٹے سید حسن احمد اور سید رضا احمد ہوئے۔ حسن احمد کی اولاد میں سید حسین احمد عرف مولوی بھائی، سید سبطین احمد اور سید حسنین احمد عرف آدم ہوئے آخر الذکر جو ایسٹ انڈین ریلوے کلکتہ میں بہت بڑے افسر تھے اور راجہ بنارس کے داماد تھے۔ سید سجاد حسین کے بیٹے سید جواد حسین اور سید امیر حیدر ہوئے۔ سید جواد حسین کے بیٹے سید زین العباد تھے جو ہندوستان میں محکمۂ جنگلات میں اعلیٰ افسر تھے۔ ان کی اولاد میں اہم ترین فرد سید اخلاق حسین تھے جو حکومت پاکستان کے اعلیٰ عہدیدار ہوئے۔ سید امیر حیدر کے بیٹے سید بشیر حیدر، سید وزیر حیدر اور سید نذیر حیدر تھے۔ ان کی اولاد میں ممتاز افراد میں سید رشید حیدر ہیں جو سیاسی مفکر کا درجہ رکھتے ہیں اور سائیں جی ایم سید کے خاص لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ بڑے پابند صوم وصلوٰۃ بھی ہیں۔ سید کاظم رضا بن میر تراب علی کے بیٹے سید حسن مجتبیٰ تھے۔ ان کے تین بیٹے سید حسن مرتضیٰ، سید حسن ارتضیٰ اور سید آل کاظم تھے۔

سید عابد رضا بن میر تراب علی کے دو بیٹے سید ساجد رضا اور سید زاہد رضا ہوئے۔ سید ساجد رضا ایم اے ایل ایل بی وکیل تھے۔ آپ ضلع آگرہ میں مسلم لیگ کے نائب صدر تھے۔ (۸۰) آپ شاعر وادیب بھی تھے۔ آپ

کی اولاد میں سید تراب رضا اور سید روشن رضا ہیں جو بالترتیب کراچی اور آگرہ میں رہتے ہیں۔ سید علی جان بن سید تراب علی سائنس میں پی ایچ ڈی تھے۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر میں الگ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید علی جان کی اولاد میں میجر سید حسین جان ہیں جو ملتان میں آباد ہیں۔

سید ہمت علی ہی کے خانوادے سے مومن علی متوسل تھے۔ مومن علی کو میر تراب علی نے رڑکی کالج سے انجینئرنگ کی سند دلوائی تھی۔ وہ ریلوے میں انجینئر تھے۔ مومن علی صاحب دولت وثروت تھے۔ آپ نے جے پور میں بھی ایک شادی کی تھی۔ جن سے ایک بیٹا خورشید حسنین اور ایک بیٹی متولد ہوئے۔ بعدہ آپ نے نواب جنرل محمد حسین خاں کی دختر سے عقد کر لیا تھا۔ نواب جنرل روسائے اودھ میں تھے اور ۱۸۵۷ء کے حالات کے بعد سے شاہ گنج آگرہ میں مقیم تھے۔ (۸۲) مومن علی کے دو بیٹے بدرالحسنین اور قمر الحسنین ہوئے جو زمیندار اور نمبردار تھے۔ خورشید حسنین ریلوے ہند میں انجینئر تھے۔ آپ صاحب جائیداد تھے اور محرم کی مجالس عزا بڑے اہتمام سے برپا کرتے تھے۔

بعض دیگر خاندانوں کا مختصر حال اور تعارف

مندرجہ بالا قدیم اور بڑے خاندانوں کے علاوہ شاہ گنج آگرہ میں درجنوں دیگر خاندان آباد تھے۔ جو مختلف نواحی سادات کی بستیوں سے ترک سکونت کر کے یہاں آن بسے تھے۔ ان میں چند اہم خاندان یہ تھے۔

(۱) خاندان سید گلزار علی ولد سید حکمت علی

سید گلزار علی کو میر تراب علی کے خاندان کی بی بی حسینی بیاہی تھی۔

آپ کے تین بیٹے سید محمد باقر چندا، سید حسن رضا بلندا اور سید عطا حسنین تھے۔ اول الذکر دونوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جنگ شاہ گنج کے پانچ ہیروز میں شامل تھے۔ سید محمد باقر چندا کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں سید علی حیدر، سید وصی حیدر، سید محمد طاہر، سید محمد جعفر، بی بی ہاجرہ اور بی بی ساجدہ ہوئے۔ بی بی ہاجرہ حاجی سید العابدین ولد سید احترام علی کو اور بی بی ساجدہ سید محمد حسین بن سید جعفر حسین بن سید ارشاد علی تحصیلدار کو بیاہی تھیں۔ سید علی حیدر لاولد رہے۔ سید وصی حیدر کو بی بی فاطمہ بنت سید جواد حسین بیاہی تھیں۔ آپ کی اولاد میں ایک بیٹا سید حبیب حیدر اور دو دختران ہوئے۔ سید حبیب حیدر اسکول ٹیچر تھے اور نیک انسان تھے۔ آپ کے کئی بیٹے اور ایک بیٹی ہے بیٹوں میں سید علی باقر، افضال باقر، سید محمد وصی، سید حسین امام، علی طاہر، تقی عباس اور مشرف رضا ہیں۔ سید محمد جعفر بن سید محمد باقر چندا نے جوانی میں انتقال کیا۔ آپ کا اکلوتا بیٹا سید تہذیب الحسن جو سندھ آبپاشی میں اسسٹنٹ انجینئر رہے، سکھر میں آباد ہیں۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید محمد غازی ہے جو سول انجینئرنگ میں سند یافتہ ہے۔ سید محمد طاہر بن سید محمد باقر چندا کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ آپ کے دو بیٹیاں سیدہ عزیز فاطمہ اور سیدہ انیس فاطمہ ہوئیں۔ جو بالترتیب سید سبط باقر جعفری اور سید علی عین اللہ کو بیاہی گئیں۔ سید حسن رضا عرف بلندا کی دو بیویوں سے فقط ایک فرزند سید احمد رضا ہوئے۔ آپ کی اولاد کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

سید عطا حسنین متھرا میں تحصیلدار تھے۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے سید صفدر حسین، سید حیدر حسین ہوئے۔ سید صفدر حسین کے تین فرزند اور تین دختران تھے۔ فرزندوں میں سید رہبر حسین، سید رضا حسین اور سید علم الہدیٰ ہوئے۔ سید حیدر حسین لاولد رہے۔

(۲) خاندان سید الطاف علی رسالدار

آپ سید رکن الدین ڈوکر کے چار بیٹوں میں سید مبارک علی کی نسل میں ہیلک کے سادات رضوی میں تھے۔ آپ کا قیام ہیلک ہی میں رہا جہاں آپ کی رہائش گاہ حویلی رسالدار مشہور تھی۔ آپ کے ایک بیٹے سید محمد حسن تھے۔ موصوف کے ایک بیٹے حاجی سید حسن ہوئے۔ آپ ٹھیکیداری کرتے تھے۔ آپ بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں ہیلک سے شاہ گنج آگرہ آن بسے تھے۔ آپ نے روئی منڈی شاہ گنج میں ایک بڑا مکان بنوایا تھا۔ آپ کے دو بیٹے سید مہدی حسن اور سید زیارت حسین ہوئے۔ سید مہدی حسن کے چار فرزند سید آل احمد، سید آل رسول، سید غلام رسول اور سید زوار احمد ہوئے۔ سید آل احمد ریلوے میں وائرلیس مواصلات میں سپروائزر تھے۔ آپ نیک اور سادہ انسان تھے۔ آپ کو بی بی عتیقہ خاتون بنت سید وقار حسن بیاہی تھیں۔ آپ کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں زندہ رہے۔ یہ سید گلزار احمد، سید ریاض احمد سید نسیم احمد، سید وسیم احمد، سیدہ بنت احمد عرف بنو اور سیدہ شہناز فاطمہ ہیں۔ سید نسیم احمد ٹی اینڈ ٹی ڈائریکٹوریٹ اسلام آباد میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر رہے۔ سید وسیم احمد کسی شپنگ کمپنی میں ریڈیو آفیسر ہیں۔ سید گلزار احمد اور سید ریاض احمد ٹی اینڈ ٹی میں ملازم ہیں۔ سید آل رسول خیرپور سندھ میں آباد ہیں اور زمینداری کرتے ہیں۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید آل مقبول اور سید آل مسرور ہیں۔ سید آل مقبول معروف ایڈوکیٹ اب لاڑکانہ میں ایڈیشنل جج ہیں۔ سید غلام رسول سندھ کے محکمہ سندھ انہار میں ملازم تھے۔ آپ کا بیٹا انجینئر ہے سید زوار احمد کراچی میں ملازم ہیں۔ سید زیارت حسین کے دو بیٹے سید نیاز احمد اور سید محفوظ احمد ہیں جو پہلے میرپور خاص اور اب نارتھ کراچی میں آباد ہیں

(۳) خاندان سید محمد ماہ و سید محمد نور

ذوکر کی نسل میں سید محمد ماہ اور سید نور محمد تھے۔ آخر الذکر کی اولاد میں سید وارث علی ہوئے۔ آپ کے دو بیٹے سید سفارش حسین اور سید مصطفیٰ حسین تھے۔ سید سفارش حسین کی اولاد میں سید شبہہ احمد تھے جن کے اعقاب میں سید وصی احمد اور نقی احمد ہوئے۔ سید مصطفیٰ حسین کی اولاد میں سید حسن احمد، سید وزیر احمد اور سید عزیز احمد ہوئے۔ سید حسن احمد انسپکٹر نمک تھے۔ وزیر احمد پاکستان آرمی میں میجر تھے۔ ان دونوں کو داروغہ سید داور حسین کی دختران بیاہی تھیں۔ سید عزیز احمد ڈاکخانہ جات میں پوسٹ ماسٹر تھے۔

(۴) خاندان سید فرحت علی

آپ سید نواز علی بن سید محمد دولت بن میران سید محمد غازی ثانی کی نسل میں ہیلک کے تھوک فرید میں تھے۔ آپ غدر ۱۸۵۷ء سے کافی قبل سید پورہ سے شاہ گنج آکر بس گئے تھے۔ آپ کے فرزند ارجمند سید عبداللہ تھے۔ آپ ماسٹر سید عبداللہ مشہور ہوئے حالانکہ آپ آگرہ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ آپ شاہ گنج کی تعلیمی اور علمی سرگرمیوں کا محور تھے۔ شاہ گنج کے نزدیک تقریباً تمام سرکاری تعلیمی ادارے آپ ہی کی سعیٔ بلیغ کے باعث قائم ہوئے تھے۔ (۸۳) آپ کے بیٹے سید اسد اللہ تھے جو خود بھی انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ رضوی سادات ہیلک کے تھوک فضیل میں مولوی سید ضامن علی، مولوی سید محمد اور سید احفاد حسین تھے۔ مولوی سید ضامن علی کا سلسلہ نسب سید اوصاف علی سے ملتا ہے۔ جو سید ہاشم بن سید فضیل کی اولاد میں تھے۔ آپ فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ موصوف آگرہ کالج میں جو ۱۸۱۸ء سے قبل

مدرسۂ آگرہ کہلاتا تھا عربی وفارسی کے پروفیسر تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید علی محمد اور سید علی ہوئے۔ سید علی محمد پولیس انسپکٹر تھے۔ آپ کی دوشادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے سید محمد احمد، سید عباس اور سید افتخار ہوئے۔ دوسری بیوی سیدہ ذاکیہ خاتون عرف ممو بنت سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر تھیں جن کے بطن سے بی بی مظاہرہ خاتون عرف مبینہ اور سیدہ سعیدہ خاتون عرف بی بی ہوئیں۔ جو بالترتیب سید ابن علی ایکجنٹ اور سید سعید الحسن نقوی کو بیاہی تھیں جو رارے اور مہابن سے تعلق رکھتے تھے۔ سید ابن علی کی اولاد نرینہ میں سید حیدر مہدی ہوئے۔ سید سعید الحسن کی اولاد میں ممتاز ترین فرد نثار حسین بینک افسر ہیں۔ سید محمد احمد بن سید علی محمد کراچی میں تھانیدار پولیس تھے۔ آپکے بیٹے محمد اور آصف ہیں۔

اسی تھوک میں سید اوصاف علی کے بیٹے سید احفاد حسین ہوئے۔ ان کے بیٹے سید حامد حسین، سید افضل حسین، سید فضیل حسین، سید محمود حسین تھے۔ سید حامد حسین کے تین فرزند اور ایک دختر سید حسن عباس، سید حسن عابد، سید حسن ذاکر اور بی بی شکیلہ خاتون ہوئے۔ سید فضیل حسین کے چار بیٹے سید محمد صالح، سید علی ظفر، سید علی کوثر اور سید مظہر عباس ہوئے۔ سید افضل حسین کے بیٹے سید فضل عباس ہوئے۔ سید محمد صالح کے دو بیٹے سید محمد سعید اور سید محمد وزیر ہیں۔

(۵) خاندان سید عادل

تھوک فرید میں بخشی سید فضیل کی نسل میں سید علی حسنین تھے جو سید خونڈ کے ایک بیٹے سید حامد کی اولاد میں تھے۔ سید حامد کے دو بیٹے سید عادل اور سید مراد ہوئے۔ سید مراد کی اولاد میں سید ہمت علی ولد سید روشن علی تھے۔ جب کہ سید عادل کی نسل میں سید عظمت علی ہوئے جن کے ایک بیٹے سید علی حسنین تھے۔ آپ کی پہلی شادی شاہ گنج کے سید دائم علی بن میر

اکبر علی کی دختر سے ہوئی تھی - ان کے بطن سے سید افضل حسین ہوئے۔
موصوف کی پہلی بیوی سید محمد رضا بن سید امام علی کی بیٹی تھی ان سے سید
محمد حسین اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ سید افضل حسین نے دوسری شادی
جے پور میں نواب ہمدانی کی نواسی شمشاد جہاں بیگم سے کی تھی جو اودھ کے
خاندان نوابین میں سے تھے۔ ان کے دو بیٹے سید محمد سعید اور سید محمد حمید
ہوئے۔ سید محمد حمید کی اولاد پروان چڑھی - سید محمد حسین بن سید افضل
حسین آگرہ کرکٹ کلب کے مشہور کھلاڑی تھے اور پاکستان ریلوے میں
ملازم تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید افضال حسین عرف بابو ، سید ممتاز
حسین اور سید سرفراز حسین ہیں۔

اسی خاندان سید عادل میں سید امداد علی تھے جنکے بیٹے سید ولایت
حسین کو شاہ گنج کی بڑی حویلی والے سید حسین علی کی بیٹی بیاہی تھی - ان
کی ایک دختر بی بی افضلی تھیں جو پہرسر کے سید روشن علی کو بیاہی تھیں۔
مگر جلد ہی بیوہ ہو گئی تھیں اسی خاندان سید عادل میں سید شہزاد علی ہوئے
جن کو شاہ گنج کے سید شاہ علی (بڑی حویلی والے) کی دختر منسوب تھی - ان
کی نسل میں سید عترت حسین تھے۔ آپ علی گڑھ کے اولین گریجویٹس میں تھے
اور باندہ میں تحصیلدار تھے ان کی اولاد ترک سکونت کرکے آگرہ سے بمبئی
جاکر بس گئی تھی -

(۶) خاندان سید رحم علی

یہ سادات ہیلک کا خاندان تھا۔ سید رحم علی کے بیٹے سید کریم اللہ
اور سید حبیب اللہ ہوئے اور ایک بیٹی بی بی فرحت ہوئی - سید کریم اللہ کے
فرزند سید مدد علی تھے۔ ان کے بیٹے منشی سید عنایت حسین تھے جو عربی فارسی
کے بڑے عالم تھے۔ آپ بڑے عابد وزاہد تھے۔ ان سے زیادہ پوری آبادی میں
کوئی دوسرا متقی وابرار نہ تھا۔ آپ کی اولاد میں سید اقبالمند علی ہوئے جن کے

دو بیٹے سید ضیاء الحسن اور سید سبط حسن تھے۔ سید ضیاء الحسن ڈاکٹر تھے اور سول سرجن رہے۔ ڈاکٹر سید ضیاء الحسن بڑے دیندار اور مذہبی انسان تھے۔ آپ شاہ گنج کے اہم اور قدیم عزاداروں میں تھے۔ آپ کے بیٹے سید نواب علی نے عزاداری میں دلچسپی لی۔ آخر الذکر کے بیٹے سید اقبال حسین ہیں جو اس عزاداری کو تا رتھ ناظم آباد میں برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اور دوسرے سید اظہار حسین بینک میں ملازم ہیں۔

اسی خانوادے میں سید علی حسین عرف جیون ہوئے۔ آپ بڑے بازار شاہ گنج میں دوکانداری کرتے تھے۔ آپ کے بیٹے سید راحت حسین سید ریاست حسین اور سید لیاقت حسین ہوئے۔ سید ریاست حسین ہومیوپیتھک ڈاکٹر تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید سماعت حسین اور سید محمد یوسف ہوئے۔ سید لیاقت حسین لاولد رہے۔

اسی خاندان میں سید احفاد حسین بن سید سخاوت حسین بن سید محبوب علی ہوئے۔ سید سخاوت حسین کو میر اکبر علی رسالدار کی نواسی بیاہی تھی۔ سید احفاد حسین کے چھ بیٹے سید اشفاق حسین، سید ابرار حسین، سید کرار حسین، سید جواد حسین، سید زوار حسین اور سید زاہر حسین ہوئے۔

(۷) خاندان سید ارشاد علی تحصیلدار

یہ خاندان ہیلک کے سادات رضوی سے تعلق رکھتا تھا ہیلک کی تباہی ۱۷۷۲ء کے بعد اور غدر سے پہلے تک پہرسر میں آباد تھا۔ سید ارشاد علی شاہ گنج آگرہ میں غدر کے کچھ عرصہ بعد پہرسر سے آکر آباد ہوگئے تھے۔ آپ ایام غدر میں فتح پور سیکری میں تعینات تھے۔ ان کو باغی فوج (مجاہدین آزادی) نے پکڑ کر بڑی اذیتیں دی تھیں۔ اور توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا ارادہ تھا کہ مقامی سادات کے جو باغی فوج (مجاہدین آزادی) میں پیش پیش تھے آپ کو پہچان کر چھڑایا کہ یہ ہمارا بھائی ہے۔ (۸۸) آپ نے غدر کے بعد سادات

شاہ گنج کے بعض اہم افراد کو جنگ آزادی میں حصہ لینے اور جنگ شاہ گنج میں انگریزوں کے خلاف فوجی کاروائیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے تختہ دار سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ آپ کے فرزندوں میں سید حسین اور سید جعفر حسین تھے۔ یہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور پہلے وکالت کرتے تھے پھر سید حسین تحصیلداری سے ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ سید حسین کے دو بیٹے سید آل مصطفیٰ اور سید محمد مجتبیٰ ہوئے۔ سید آل مصطفیٰ سی پی بھارت میں تحصیلدار تھے۔ آپ کی اولاد میں سید ریاض احمد، سید محمد احسن اور سید ارشد رضا ہوئے۔ سید ریاض احمد سب رجسٹرار تھے۔ سید محمد احسن ڈاکٹر تھے اور سید ارشد رضا پروفیسر ہیں اور سٹی کالج حیدرآباد سندھ میں پرنسپل رہے ہیں۔ سید محمد مجتبیٰ بن سید حسین گریجویٹ تھے مگر شاہ گنج میں بزازی کی تجارت کرتے تھے۔ سید جعفر حسین بن سید ارشاد علی تحصیلدار ترقی کرتے ہوئے صدر اعلیٰ کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے تھے۔ سید جعفر حسین نے سید قائم علی بن میر اکبر علی کی اولاد سے شاہ گنج میں ایک بڑی جائیداد خریدی تھی جو علی پور والی حویلی کہلاتی تھی۔ (۸۹) اسی خاندان میں سید شمشاد حسین ہوئے جو مہاراجہ بھرتپور کے وزیر تھے۔ سید ارشاد علی کی ایک بیٹی میر تراب علی کے ایک بیٹے سید احمد علی کو بیاہی تھی اور دوسری بیٹی سید محمود کو بیاہی تھی۔ جو سید ثابت علی کے نواسے تھے اور سی پی انڈیا میں کمشنر بندوبست کے منصب پر فائض تھے۔

(۸) خاندان سید مشرف علی زیدی

یہ سید پورہ کا قدیم زیدی خاندان تھا۔ سید مشرف علی فوجی تھے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھے جس کے نتیجے میں آپ کو پھانسی کی سزا سے بچنے کے لئے روپوش ہونا پڑا تھا۔ (۹۰) اسی وجہ سے غدر کے حالات کے بعد ان کے خاندان کو زیدی کے بجائے جعفری

کہلوانا پڑا۔ آپ کے دو بیٹے سید گلزار علی اور سید امتیاز علی تھے۔ سید گلزار علی کے تین فرزند سید بنیاد علی، سید زوار حسین عرف بدھا اور سید شریف الحسن ہوئے۔ سید بنیاد علی کے تین بیٹے سید غلام علی، سید بندہ حسن اور سید ابوالحسن ہوئے۔ سید بنیاد علی انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ آپ شاعر و مرثیہ خواں بھی تھے۔ سید گلزار علی بھی شاعر و حدیث خواں تھے۔ سید غلام علی احسن اکبر آبادی کا تذکرہ مشاہیر میں الگ کیا گیا ہے۔ (۹۱) آپ کی اولاد نرینہ میں سید حامد علی جعفری، سید گلزار احمد جعفری اور سید سردار احمد جعفری ہوئے۔

سید حامد علی جعفری آگرہ و کراچی میں ٹیچر تھے۔ آپ کی اولاد میں سید احمد علی، سید محمد حسین اور محمد تقی اور غلام حسین ہیں۔ یہ حضرات سوزخوانی اور ... خوانی میں نمایاں ہیں۔ سید بندہ حسن آگرہ میں دوکانداری کرتے تھے۔ آپ کے فرزند سید مبارک علی عرف گنوں ہیں۔ سید ابوالحسن بھی حدیث خوان تھے۔ آپ کی اولاد میں منظور الحسن، غضنفر حسین، شاکر حسین ہیں۔ سید غضنفر حسین جناح اسپتال میں سینئر ڈاکٹر ہیں۔

سید زوار حسین عرف بدھا کی اولاد نرینہ میں سید غفار حسین اور سید اسرار حسین ہوئے۔ سید غفار حسین ریلوے میں ہیڈ کلرک تھے اور ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر بھی تھے۔ آپ مسجد و امام بارگاہ جعفریہ گلبہار کے بانیوں میں تھے۔ آپ کو بی بی زبیدہ خاتون بنت سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر بیاہی تھیں۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید افتخار حسین، سید سرکار حسین، سید جرار حسین، سید مشرف علی، سید مردان علی اور سید محمد احسن ہوئے۔ سید مردان علی شاہ گلبہار (گولیمار) کے علاقے کے اہم سماجی اور سیاسی لیڈر ہیں اور مسجد و امام بارگاہ جعفریہ ٹرسٹ کے فعال مہتمم بھی رہے۔ ان حضرات کی اولاد میں سید ذوالفقار حسین بن سید افتخار حسین کراچی میں محکمہ شماریات کارڈ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں اور کراچی کے سوزخوانوں اور نوحہ خوانوں میں نمایاں

ہیں۔ سید انتظار علی بن سید جرار حسین ٹی اینڈ ٹی پاکستان میں ڈویژنل انجینئر ہیں اور سید سرکار حسین کے بیٹے سید افتخار حسین ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ سید محمد احسن بن سید غفار حسین امریکہ کے کسی اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ سید مشرف علی بھی مع خاندان امریکہ (نیوجرسی) میں بس گئے ہیں۔ سید اسرار حسین بن سید زوار حسین عرف بدھا ریلوے میں ملازم تھے اور حیدر آباد سندھ میں آباد تھے۔ آپ کو وکیل سید غلام علی کی بیٹی بیاہی تھی۔ آپ کی اولاد میں سید انتظار حسین سیکورٹی پرنٹنگ پریس میں ڈپٹی منیجر ہیں۔ سید علی حیدر محکمہ زراعت میں ریسرچ آفیسر ہیں اور سید شبیہ حیدر الائڈ بینک میں وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ سید شریف الحسن بن سید گلزار علی آگرہ میں دوکانداری کرتے تھے آپ کی اولاد میں سید محمد حسین عرف بابو اور سید عادل حسین ہوئے۔ سید محمد حسین کی اولاد نرینہ میں نجم الحسن ہیں جو پی آئی اے میں ملازم ہیں اور سعید الحسن ہیں۔ سید عادل حسین کی اولاد نرینہ میں سید گلزار حسین، سید حیدر عباس، سید قمر عباس، سید محمد علی ہیں

سید امتیاز علی ولد سید مشرف علی کے تین فرزندان سید اعجاز حسین، سید سجاد حسین اور سید جواد حسین ہوئے۔ ان کی اولاد کا حال معلوم نہ ہوسکا۔

(۹) خاندان سید محمود علی

سید عنایت علی بن سید اسد اللہ بن سید واسع کا تعلق تھوک فضیل سے تھا اور ہیلک کے سادات رضوی میں تھے۔ آپ کے فرزندوں میں سید امیر حسین اور سید محمد ہوئے۔ سید امیر حسین کے بیٹے سید عابد حسین اور سید مظفر حسین ہوئے۔ سید عابد حسین کی اولاد نرینہ میں سید شاہد حسین اور سید ساجد حسین ہیں۔ سید شاہد حسین آگرہ میں بھی ٹیچر تھے اور کراچی میں کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے ہیں۔ گلبہار کراچی کی اہم سماجی اور مذہبی شخصیات

میں ہیں۔ آپ حدیث خوان بھی ہیں۔ سید ساجد حسین نئی کراچی کی عزاداری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سید ظفر حسین بن سید امیر حسین ہندوستان میں نامور داروغہ پولیس تھے۔ آپ بڑے وضع دار اور اصول پسند انسان تھے۔ آپ کو بی بی اختری خاتون بنت سید جواد حسین بیاہی تھیں۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید رضی الحسن، سید رفیق الحسن اور سید آغا علی حیدر ہوئے۔ ان حضرات کی اولاد میں سید محمود الحسن بن سید رضی الحسن کے ڈی اے میں ڈرافٹسمین ہیں۔

بابو سید محمد بن سید محمود علی ہندوستان میں اسٹیشن ماسٹر تھے اور شاہ گنج کے عہد آخر کے ممتاز گزار بزرگوں میں تھے۔ آپ کی پہلی بیوی سے سید علی احمد ہوئے جب کہ دوسری بیوی بی بی سیدہ بنت سید کاظم رضا بن سید ببر علی سے سید حسن احمد اور بی بی رئیسہ خاتون ہوئے۔ سید علی احمد آگرہ چھاؤنی اور کوئٹہ چھاونی بورڈ میں ملازم تھے۔ آپ کی دو بیویوں سے کئی بیٹے سید رضی احمد، سید شفیع احمد، سید مسعود احمد اور سید محمود احمد ہوئے۔ ان میں سید مسعود احمد آثم اکبر آبادی نمایاں تھے۔ آپ انجمن پنجتنی آگرہ کے نائب صدر رہے ہیں اور تجلیات فکر مطبوعہ کراچی ۱۹۵۸ء کی تدوین و اشاعت میں راقم الحروف کے شریک کار تھے۔ سید حسن احمد بن بابو سید محمد ریلوے میں ملازم تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید محمد احمد، سید حسین احمد، سید رضوان احمد ہوئے

(۱۰) خاندان مرزا محمد علی

۱۸۵۶ء میں اودھ پر انگریزی قبضہ کے باعث مرزا محمد علی شاہ گنج آگرہ میں آن بسے تھے۔ آپ مرزا ہادی علی وزیر اودھ اور مرزا محسن زمان صوبیدار الہ آباد کی نسل میں تھے۔ (۹۲) مرزا محمد علی کے فرزند مرزا احمد علی سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ اس خاندان کے اکثر وبیشتر افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز

رہے۔ ان میں مرزا محمود علی ایرانی آگرہ و کراچی کے معروف عکاس تھے۔ آپ انجمن پنجتنی آگرہ کے بانیوں میں تھے۔ مرزا واجد علی کے نامور سپوت مرزا امجد علی تھے۔ آپ کراچی میں حکومت پاکستان کی وزارت دفاع اور افواج پاکستان کے درمیان افسر رابطہ تھے۔ آپ نہایت مخلص، منکسر المزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ انجمن پنجتنی آگرہ کا سلور جوبلی نمبر تجلیات فکر مطبوعہ کراچی ۱۹۵۸ء آپ کی خصوصی توجہ اور تعاون کا مرہون منت ہے۔

(۱۱) خاندان مولانا سید مبارک علی

آپ کا لکھنو کے رضوی سادات سے تعلق تھا اور مولانا سید علی حیدر کے عظیم المرتبت فرزند تھے جو حضرت نجم الملت کے تلامذہ میں تھے۔ آپ بیک وقت عالم و فقیہ، خطیب و مقرر، صحافی و ادیب اور شاعر و مصنف تھے۔ ۱۹۱۸ء سے آپ مسلسل شاہ گنج اور اہل شاہ گنج سے وابستہ رہے اور آپ نے شاہ گنج آگرہ ہی کو اپنا وطن ثانی قرار دے لیا تھا۔ آپ کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر میں الگ کیا گیا ہے۔

آپ کی اولاد نرینہ میں سید صفدر علی، سید عابد علی، سید معصوم علی اور سید عالم علی ہوئے۔ اول الذکر دونوں لکھنو اور حیدرآباد دکن میں مقیم رہے۔ آخرالذکر دونوں علامہ مبارک علی کے ساتھ آگرہ اور پھر کراچی میں رہے۔ یہ دونوں حضرات شاعر وادیب کی حیثیت سے معروف ہوئے اور انجمن پنجتنی آگرہ کے صدر رہے۔ نیز اس انجمن کی سالانہ بیاض نوحہ جات کے مولف و مرتب بھی رہے۔ مولانا عالم الرضوی شریعت مدار مولانا سید مبارک علی کی سوانح (حیات مبارک) کی تالیف میں مشغول ہیں۔

(۱۲) خاندان مولانا سید علی جعفر

غالباً ۱۹۳۰ء سے قبل آپ مسجد و امام باڑہ وقف میر نیاز علی کے امام

وخطیب مقرر ہو کر شاہ گنج میں آباد ہوگئے تھے۔ آپ کا تعلق سادات جونپور سے تھا۔ آپ عزاخانہ شاہ گنج میں بھی درس قرآن دیا کرتے تھے جہاں ۱۹۳۳ء۔ ۱۹۳۴ء میں میرے چچازاد بھائی سید محمد منتظر راز مرحوم اور میں نے قرآن خوانی اور عربی کی ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے گلبہار کراچی میں مسجد وامام بارگاہ جعفریہ کی ۱۹۴۸ء میں بنیاد رکھی جو عزاداری کراچی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کے بیٹوں میں مولوی سید محمد جعفر وسیم نسیم حسن جعفر اور ڈاکٹر سید حسین جعفر ہوئے۔ اول الذکر نے کئی مضامین میں ایم اے کیا تھا۔ پوسٹ آفس میں ملازم تھے بعد میں رضویہ سوسائٹی کی مسجد کے پیش امام رہے آخرالذکر نے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور کراچی یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے صدر ہیں۔

(۱۳) خاندان مولوی سید ارشاد حسین رضوی

آپ بلند شہر کے سادات رضوی میں تھے اور ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد مولانا سید جواد حسین بلند پایہ عالم تھے۔ آپ خود بھی عربی وفارسی کے عالم تھے۔ ۱۹۲۸ تا ۱۹۴۷ء وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ کے مدرس رہے۔ عزاخانہ شاہ گنج کی محرم کی مجالس کے خطیب تھے اور ادبی وشعری محفلوں کی بڑی اہم شخصیت تھے۔ قیام پاکستان کے بعد خیرپور ریاست تشریف لے آئے اور طویل عرصہ تک معلم وامام جماعت رہے۔ نیز خیرپور میں مدرسہ سلطان المدارس کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔ ۱۹۶۰ء میں کراچی منتقل ہوگئے اور ۱۹۷۹ء میں وفات پائی۔ کراچی یونیورسٹی کی پروفیسر شائستہ زیدی اور پروفیسر حامد شفقت (ماہر امراض قلب) آپ کے ہونہار شاگردوں میں نمایاں ہیں۔

آپ کی اولاد نرینہ میں سید محمد نقی، سید علی مہدی، سید حسن مہدی اور سید حسین مہدی حیات ہیں۔ سید علی مہدی کسٹمز ہیں، سید حسین مہدی مرچنٹ نیوی میں اور سید حسن مہدی کسی کارخانے میں اکاونٹنٹ ہیں۔ یہ

حضرات بوتراب امام بارگاہ عزیز آباد کراچی کے نزدیک اقامت پذیر ہیں۔

(۱۴) خاندان بابو سید علی محمد جعفری

غالباً ۱۹۰۵ء سے بہ سلسلہ ملازمت آپ شاہ گنج آگرہ میں آباد ہو گئے تھے۔ آپ سینٹرل ٹیلیگراف آفس آگرہ میں سینئر تارمالو تھے اور شاہ گنج میں اپنے تعمیر کردہ مکان میں رہتے تھے۔ آپ کے فرزندوں میں سید صفی محمد، سید وصی محمد اور سید علی امام ہوئے۔ اول الذکر کوئٹہ ملٹری ڈیری فارم کے مینجر تھے اور حیدر آباد سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ سید وصی محمد جعفری کراچی ہائی اسکول میں سینئر ٹیچر تھے اور آخر الذکر سینٹرل ٹیلیگراف آفس آگرہ اور لاہور میں تارمالو رہے پھر فوج کے شعبہ مواصلات (سگنل) میں چلے گئے جہاں سے لفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل سروسز کلب کراچی کے سکریٹری ہیں۔

(۱۵) خاندان سید زوار حسین زیدی

آپ ندیؒ کے زیدی سادات میں تھے۔ پولیس میں کورٹ انسپکٹر تھے۔ بہ سلسلہ ملازمت غالباً ۱۹۲۷ء میں شاہ گنج آگرہ میں بس گئے تھے۔ آپ کے بیٹے سید شمیم الحسن اور سید نسیم الحسن ہوئے۔ ان کی اولاد میں ممتاز ترین فرد پروفیسر سید محمد سعید زیدی ہیں جو کراچی میں کالج کے پرنسپل رہے ہیں۔

سید زوار حسین زیدی کے بھائی سید محمد مہدی اور سید علی حیدر تھے۔ اول الذکر لاولد رہے آخر الذکر معلم تھے۔ ان کے بیٹے سید علی قیصر زیدی اور سید محمد تہور زیدی تھے جو بالترتیب ای جی ولی جی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کے سکریٹری اور انشورنس میں اہم عہدیدار رہے۔ سید علی قیصر زیدی کی اولاد نرینہ میں سید محمد عباس ہیں جو الائیڈ بینک میں آڈیٹر ہیں۔ سید محمد تہور کے سید محمد شبر اور سید محمد نیر ہیں۔ اول الذکر چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔

(۱۶) خاندان ڈاکٹر سید ظفر حسین جعفری

آپ کا تعلق سادات پہر سر سے تھا اور بہ سلسلہ ملازمت ۱۹۳۰ء میں شاہ گنج میں بس گئے تھے۔ آپ سول سرجن رہے۔ آپ جدیدیت پسندی میں مشہور تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں سید غضنفر حسین، سید مہدی حیدر اور سید ضمیر حیدر ہوئے۔ سید مہدی حیدر پاک فوج میں میجر تھے سید ضمیر حیدر اٹک آئل کمپنی میں چیف جیولوجسٹ تھے۔ ان تینوں کی اولاد نرینہ میں سید جاوید غضنفر، سید حسین غضنفر، سید حسن عباس، سید سلیم حیدر اور سید اصغر حیدر ہیں۔

(۱۷) خاندان ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی

آپ ہیلک کے تھوک ڈوکر کی نسل میں رضوی سید تھے اور تعلیم وروزگار کے باعث آگرہ لوہا منڈی میں آباد تھے۔ آپ لوہا منڈی کے سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر انچارج تھے اور آگرہ کے ممتاز معالجوں میں شمار ہوئے قیام پاکستان کے بعد کراچی پولیس اسپتال کے سرجن مقرر ہوئے۔ آپ کے بیٹے ڈاکٹر سید محمد حسین رضوی ملک کے نامور ڈاکٹر ہیں اور آنکھوں کے بڑے سرجن ہیں۔

(۱۸) خاندان ڈاکٹر سید علی عبداللہ

آپ پہر سر کے جعفری سید تھے اور آگرہ میں امراض دماغ کے اسپتال کے ڈاکٹر انچارج تھے۔ آپ شاہ گنج میں بس گئے تھے اور اپنے لئے ایک بڑا مکان بنوایا تھا۔ آپ کی پہلی بیوی سے سید علی مظاہر جعفری تھے جو وکیل اور سیاسی رہنما تھے خیرپور سندھ میں آباد ہوئے۔ ان کی اولاد نرینہ میں سید علی اسلم جعفری خیرپور کے ممتاز وکیل ہیں۔ دوسری بیوی عقیلہ خاتون بنت سید

منشی حسن بن سید حسن علی کے بطن سے سید علی ظاہر، سید علی اظہر اور بی بی ارجمند خاتون ہوئے۔ علی ظاہر کسٹمز میں اور سید علی اظہر پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہیں۔ یہ دونوں جامع مسجد و امام بارگاہ عزیز آباد کے ٹرسٹ کے فعال ارکان ہیں۔ ارجمند خاتون سید قمر رضا بن منشی سید سجاد حسین کو بیاہی تھی مگر جلد انتقال کرگئیں اور لاولد رہیں۔

(۱۹) خاندان مولانا محمد مصطفیٰ مازندرانی

غالباً ۱۹۰۸ء میں جن دو خاندانوں نے افغانستان سے ہجرت کی تھی ان میں ایک یہ مازندرانی خانوادہ بھی تھا۔ مولانا مصطفیٰ مازندرانی بڑے عالم و متقی اور عبادت گزار تھے۔ تقدس مآب کہلاتے تھے۔ آپ کے بیٹے آغا محمد جواد آغا محمد سجاد اور آغا محمد عباس ہوئے۔ اول الذکر معلم تھے اور آگرہ کے بزرگ شعراء اور اساتذہ فن میں شمار ہوئے۔ آپ غیر شادی شدہ رہے۔ آغا محمد سجاد کے کئی بیٹوں میں آغا علی کاظم نمایاں ہیں۔ آپ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں افسر رہے۔ موصوف کے ایک فرزند آغا علی سرور قم میں اعلیٰ دینی تعلیم (اجتہاد) حاصل کر رہے ہیں۔ آغا محمد عباس کے ایک بیٹے آغا محمد مصطفیٰ ہوئے جو سٹی کورٹ میں ملازم رہے اور شعروشاعری سے شغف رکھتے ہیں۔

(۲۰) خاندان سید رضی الحسن قانون گو

غالباً آپ ۱۹۰۵ء میں پہرسر سے آکر شاہ گنج میں بس گئے تھے۔ آپ ممتاز مرثیہ خواں تھے۔ آپ کے بیٹوں میں سید شاہد رضا اور سید زاہد رضا نمایاں تھے۔ سید شاہد رضا کو وکیل سید غلام علی کی بیٹی بیاہی تھیں اور سید زاہد رضا کو سید علی اظہر جعفری کی ہمشیرہ منسوب تھیں۔ جن کا خاندان کینیڈا میں مقیم ہے۔ اول الذکر آگرہ میں انگریزی اسکول میں مدرس تھے آخر الذکر انجینئر

تھے اور فوج کے شعبہ انجینئرنگ میں کرنل تھے۔ ماسٹر سید شاہد رضا جعفری کے ایک بیٹے مشہود جعفری ہیں جو کراچی کے شعراء میں معروف ہیں۔ کرنل سید زاہد رضا جعفری بڑے منکسر المزاج اور وضعدار شخص تھے۔ لاولد رہے۔

(۲۱) خاندان عبید الحسن

مومنین سید پورہ کے صاحب علی کو دختر سید نبی منسوب تھی ان کے بطن سے طالب علی اور تراب علی ہوئے۔ طالب علی کے فرزند عزیز الحسن اور عبید الحسن ہوئے۔ تراب علی کے تین بیٹے ولایت حسین ابن علی اور اعجاز حسین تھے۔ آخر الذکر کے فرزند استقرار حسین اور ناظر حسین ہوئے۔ استقرار حسین کو بی بی زبیدہ عرف زبو بنت سید محمد تقی بیاہی تھیں۔ ان کے بطن سے ابو محمد، ابو علی، ابو حامد، ابو الحسن اور ابو ظفر ہوئے۔ ابو حامد معتظر اور ابو ظفر اکبر آبادی پنڈی، اسلام آباد میں آباد ہیں اور معروف شاعر وصحافی ہیں۔ ابو الحسن کے بیٹوں میں نظیر عالم عرف پرنس نمایاں ہیں جو اسٹیل ملز کراچی میں اسسٹنٹ منیجر ہیں۔ ناظر حسین لاولد رہے۔ آپ شاہ گنج آگرہ کے اہم عزاداروں میں تھے۔

سید عبید الحسن بن طالب علی شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے معتبر حضرات میں شمار ہوئے۔ آپ نے روئی منڈی میں ایک بڑا حویلی نما مکان بنوایا تھا۔ جو کٹرہ عبید الحسن میں واقع تھا۔ آپ کی پہلی بیوی سے مستحسن رضا اور احسن رضا ہوئے۔ مستحسن رضا آگرہ واٹر ورکس اور بعد میں گھارو (سندھ) فلٹر پلانٹ میں ملازم تھے۔ آپ کا ایک بیٹا محمد صادق اور کئی دختران ہوئے۔ احسن رضا مشہور شکاری تھے اور شکار پور سندھ میں ٹیلیفون انسپکٹر تھے۔ عبید الحسن کی دوسری بیوی سید سراج الحسن بن قادر علی کی بیٹی تھی جن کے بطن سے علی جعفری اور کئی اور فرزند ہوئے۔ ان میں اکثر امریکہ، کینڈا میں

بس گئے ہیں۔

(۲۲) خاندان منشی کاظم حسین

مومنین لوہا منڈی آگرہ میں داروغہ امداد حسین نمایاں تھے۔ ان کے ورثاء سے سنا ہے کہ موصوف صاحب جائیداد تھے مگر ان کے بیٹوں نے سب کچھ بہت جلد تباہ کردیا۔ ان بیٹوں میں ایک منشی کاظم حسین بھی تھے جو قبالہ نویسی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ آپ کو بی بی مرضیہ خاتون بنت سید قادر علی (اکبر جام) بیاہی تھیں اس لئے آپ شاہ گنج میں آن بسے تھے اور اپنے سسر کے مکان میں رہتے تھے جو مسجد میر اکبر علی کے بالمقابل واقع تھا۔ موصوف کے بیٹوں میں حیدر حسین، ناظم حسین، شوکت حسین اور لیاقت حسین عرف گبو ہوئے۔ حیدر حسین عرف حیدر پاشا جوتوں کے کاروبار سے وابستہ تھے ان کی بیوی بی بی ام سلمیٰ بہت اچھی حدیث خواں تھیں۔ ان کے بطن سے اطہر حسین، ناصر حسین اور اقبال حیدر نمایاں ہیں۔ اول الذکر دونوں ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں۔ اقبال حیدر سینٹر ہیں اور پیپلز پارٹی کی حکومت میں وزیر قانون وانصاف رہے ہیں۔ ناظم حسین کے اولاد نرینہ نہ ہوئی آپ کی بیٹی سکینہ کی شادی سید محمد مدبر بن سید محمد مدثر کے ساتھ ہوئی ہے۔ شوکت حسین پولیس میں ملازم تھے ان کی اولاد نرینہ میں علی مظاہر، علی غضنفر اور علی مظفر ہیں۔ علی مظاہر ناظم آباد میں ہوٹل لارڈز کے مالک ہیں، علی غضنفر علاقے کے کونسلر اور پی پی کے سرگرم کارکن ہیں۔ علی مظفر اہمن ڈیری کے مالک ہیں ان کے بیوی بچے گزشتہ سال ایک بس کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ لیاقت حسین عرف گبو آگرہ چھاؤنی میں ویلڈنگ کی دوکان کرتے تھے ان کی اولاد نرینہ میں اقبال حسین عرف ججی نمایاں ہیں۔

(۲۳) خاندان سید شمس الحسن تحصیلدار

آپ پہرسر کے سادات جعفری سے تعلق رکھتے تھے اور بڑی حویلی شاہ گنج کے سادات میں آپ کی دوسری شادی ہوئی تھی۔ آپ نے یہاں قبرستان کے نزدیک اپنا گھر بنایا تھا اور یہاں ہی بس گئے تھے۔ آپ کے والد خان بہادر سید امداد علی جعفری مشہور خاندان دریا خان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں آغا سید محمد طاہر، سید محمد مہدی، سید کاظم مہدی، سید شبر مہدی، سید آل مہدی، سید اشرف مہدی اور سید اسلم مہدی ہوئے۔ سید کاظم مہدی ریلوے میں افسر رہے اب کینڈا میں مع خاندان مقیم ہیں۔ موصوف نے ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی کی شہرہ آفاق تصنیف۔ تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند (انگریزی) کی دونوں جلدوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ سید شبر مہدی ریلوے بورڈ کے رکن رہے اور مینجر ریلوے کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ موصوف شاہ گنج آگرہ میں راقم الحروف کے سیاسی اور سماجی جدوجہد میں شریک کار رہے ہیں۔ سید محمد طاہر کے ایک بیٹے قاری مصباح الحسن جعفری ہیں جو ہائی کمشنر کینڈا کے سفارت خانے روالپنڈی میں افسر رہے۔ ان کا فرزند سید منہاج الحسن پاک فوج میں کرنل ہے۔

(۲۴) خاندان منشی ناظر حسین

آپ کے والد سید عنایت حسین ڈپٹی کلکٹر تھے۔ غالباً آپ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ شاہ گنج آگرہ میں تعلیم وروزگار کے سلسلے میں آکر بس گئے تھے۔ منشی سید ناظر حسین راقم الحروف کے دادا سید کلب حسن بن سید حسن علی کے بڑے قریبی دوستوں میں تھے۔ آپ کی اولاد نرینہ میں چار فرزند سید ناصر حسین، سید ذاکر حسین، سید داور حسین اور سید یاور حسین ہوئے۔ اول الذکر دونوں ویٹنری ڈاکٹر تھے۔ سید یاور حسین الہ آباد کورٹ میں منصرم تھے

اور داور حسین بلدیہ میں انسپکٹر تھے۔

ڈاکٹر سید ناصر حسین کے چار بیٹے سید مصاحب رضا انجینئر، سید شاہد رضا مرحوم انجینئر، سید ساجد رضا انجینئر اور حیدر رضا اکاونٹ آفیسر رہے۔ ڈاکٹر سید ذاکر حسین کو پہلے راقم الحروف کی پھوپھی سیدہ امینہ خاتون بنت سید کلب حسن بیاہی تھیں جن کا جلد انتقال ہوگیا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹے سید خورشید رضا انجینئر ٹی اینڈ ٹی سید ضامن رضا ڈاکٹر ہیں۔ سید یاور حسین کے فرزند سید عنایت رضا انجینئر، سید تقی رضا ڈاکٹر مرحوم، سید ظفر رضا میرین انجینئر اور مظہر رضا کاروبار کرتے ہیں۔ سید داور حسین کے بیٹے سید مظاہر حسین انجینئر اور سید علی ناظر ڈاکٹر ہیں۔

ان میں اکثر پہلے لاڑکانہ میں رہے مگر ۱۹۷۲ء کے بعد سے کراچی میں آباد ہیں۔

(۲۵) خاندان سید مبارک علی نقوی

آپ اول ضلع متھرا کے سادات نقوی سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً ۱۹۰۵ء میں شاہ گنج آگرہ میں آکر بس گئے تھے۔ آپ کے دو فرزند سید موسیٰ رضا اور سید ابن رضا ہوئے۔ اول الذکر کچہری میں امین تھے جب کہ آخر الذکر اسکول ٹیچر تھے۔ سید موسیٰ رضا کے بیٹے سید محمد علی، سید احمد علی اور سید شہنشاہ علی ہوئے۔ ماسٹر سید ابن رضا کے فرزند سید عالم علی، سید غلام علی، سید علی اور سید رضا علی ہوئے۔

ان میں سید محمد علی بینک آفسر رہے اور ہاکی کے اچھے کھلاڑی بھی رہے ہیں ان کے کئی بیٹے ہیں۔

سید عالم علی بن ماسٹر سید ابن رضا، زینت ڈیکوریشن سروس کے مالک ہیں، آپ گلبہار کراچی کے میونسپل کونسلر بھی رہے۔ ان کے دیگر بھائی سید غلام علی، سید رضا علی اور سید علی ہیں۔

حوالہ جات

اس باب کا تعلق برصغیر کے اس عظیم مرکز سادات سے تھا جو شاہ گنج (آگرہ) مشہور ہوا۔ اس کی تقریباً ۲۲۰ سالہ تاریخ (۱۷۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک) غیر منقسم ہند کی مسلم تاریخ کا ایک درخشندہ باب تھا جہاں عسکری، سیاسی، سماجی، دینی اور ادبی شعبہ ہائے حیات پر گہرے نقوش چھوڑنے والے درجنوں نابغۂ روزگار لوگ پیدا ہوئے اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے۔ ایسے بعض حضرات کا مختصر ذکر باب ہفتم (شخصیات) میں کیا گیا ہے یہ نامور شخصیات جن ڈہائی درجن خاندانوں کے چشم و چراغ تھے ان کا اجمالی بیان اس باب میں کیا جا رہا ہے۔ اس بیان احوال کی اساس درج ذیل کتابوں اور غیر مطبوعہ نگارشات پر رکھی گئی ہے۔

۱) تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ (جلد دوم) مولفہ داروغہ سید احترام علی رضوی یہ تاریخی کتاب ۱۸۸۵ - ۱۹۰۰ء کے دوران لکھی گئی تھی مگر تاحال شائع نہ ہو سکی۔

۲) تاریخ بلدہ بیانہ مولفہ حکیم سید علی رضا جعفری بیانوی

۳) تاریخ سادات بھرتپور مولفہ سید ظہیر الحسن رضوی بھرتپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۸۵ء

۴) تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار جلد ۲، ۳ مطبوعہ کراچی ۱۹۸۲ء / ۱۹۸۵ء مولفہ محمد وصی خان

۵) تاریخی یادداشتیں (قلمی) مولفہ سید زوار حسین عرف بدھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک مجاہد سید مشرف علی زیدی کی نسل میں تھے۔ موصوف

نے یہ یادداشتیں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران تحریر کی تھیں۔

۶) دی نیو تاریخ مولفہ وکیل سید اظہر حسین زیدی بھرتپوری جو ۱۹۲۷ء میں لکھی گئی تھی اور چھپ چکی ہے۔

۷) مجلہ تجلیات فکر (سلور جوبلی نمبر انجمن پنجتنی آگرہ) مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ / اگست ۱۹۵۸ء

۸) خصوصی سالنامہ انجمن وظیفہ سادات مطبوعہ ۱۹۳۹ء - ۱۹۴۰ء

۹) مشاہیر اکبر آباد مولفہ مفتی انتظام اللہ شہابی

۱۰) ماہنامہ افکار کراچی بابت نومبر ۱۹۹۲ء جو سید علی سردار جعفری نمبر ہے۔

۱۱) روزنامہ نوائے وقت لاہور ـــ خصوصی کالم شین میم کی ڈائری بابت مئی / دسمبر ۱۹۶۶ء ، ۱۹۶۳ء جس میں باوا سید محمد علی جعفری کے خاندان کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۲) تاریخی یادداشتیں (قلمی) تحریر کردہ سید عزیز الحسن رضوی (اکبر جام) جو ۱۸۹۶ء میں ضبط تحریر میں لائی گئی تھی ۔

۱۳) ماہنامہ شمع آگرہ کے مختلف شمارے جو ۱۹۳۵ء - ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئے۔

۱۴) روزنامہ الناظر آگرہ کے مختلف شمارے جو ۱۹۳۲ء - ۱۹۳۳ء میں چھپے تھے۔

۱۵) ماہنامہ اصلاح ، کھجوہ (بہار) مختلف شمارے جو ۱۹۱۰ء - ۱۹۱۱ء میں طبع ہوئے۔

۱۶) ماہنامہ شیعہ کھجوہ (بہار) کے مختلف شمارے جو ۱۹۱۳ء - ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئے۔

۱۷) خاندانی روزنامچہ (قلمی) تحریر کردہ داروغہ سید نظیر الحسن رضوی حسرت اکبر آبادی

۱۸) شوخی تحریر ـ سید محمد جعفری مرحوم مطبوعہ ۱۹۶۸ء

۱۹) خوشبوئے قبا ـ ظفر اکبر آبادی مطبوعہ ۱۹۹۵ء

عزاداری میں ہماری روایات

رنج و غم سے دوری اور مسرت وشادمانی سے قربت انسانی فطرت کاخاصہ رہی ہے۔ اس کی واضح ترین دلیل یہ حقیقت ہے کہ اقوام عالم میں جتنے تہوار منائے جاتے ہیں ان سب کا تعلق کسی نہ کسی واقعۂ خوشی سے ہوتا ہے لیکن مسلمانان عالم کا اہم تہوار محرم ہے جو درد وغم کے اظہار سے عبارت ہے۔ محرم المیۂ کربلا کی یاد دلاتا ہے۔ جو محرم ۶۱ ہجری کی دس تاریخ کو رونما ہوا تھا۔ اس لئے امام حسین علیہ السلام کی دردناک شہادت اور اہلبیت اطہارؑ کی اسیری ودربدری کا غم منانا عزاداری کہلاتا ہے۔ محرم اس کے عملی اظہار کے لئے مخصوص ایام اور غم انگیز روایات ورسومات کا نام ہے۔ ماہ محرم کے پہلے دس روز کی تقریبات درد والم کا نقطۂ عروج یوم عاشورہ ہوتا ہے جو ۶۱ھ کے محرم اور بعد کے غم انگیز واقعات کی یاددہانی کراتا ہے۔

المیہ کربلا کو تازگی دینے کی خاطر ہر سال ماہ محرم کا عشرہ اول سوگ منانے اور اظہار غم کرنے کے لئے مخصوص ہے جب کہ اس کا سلسلہ ۸ ربیع الاول تک جاری رہتا ہے۔ تاہم شیعی عقائد کے تحت یہ غم ابدی ہے جیسا کہ کتاب گلستان راز کے شارح شیخ شمس الدین کے اس جواب سے واضح ہوتا ہے جو آپ نے شاہ اسمٰعیل صفوی کے سوال پر دیا تھا (ا) یہ یادگار غم آنحضرتؐ کی پیشگوئی اور تاکیدی حکم کی رو سے معتبر ومتبرک بھی ہے اور واجب التعمیل بھی۔ شہادت عظمیٰ کا غم منانا اور گریہ وزاری کرنا سنت رسولؐ وآئمہؑ ہے اسی لئے ان کی پیروی میں یہ غم گزشتہ

ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلسل منایا جا رہا ہے اور شدید مخالفتوں اور سنگین رکاوٹوں کے باوجود مختلف ادوار اور علاقوں میں نہ صرف باقی رہا بلکہ فروغ پذیر رہا ہے۔ عزاداری و محرم کی تاریخ بڑی طویل ہے۔ یہ سلسلہ کتنے نشیب وفراز اور سخت مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے۔ اس کو جاننے کے لئے ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ (الف) عزاداری کا ابتدائی عہد جو یثرب وحجاز، شام ومصر اور ترکی وایران کے متعلقہ اہم واقعات پر مبنی ہے۔ (ب) برصغیر ہندوپاکستان میں عزاداری ومحرم کی داستان جو پہلی صدی ہجری سے موجودہ صدی ہجری تک کے زمانے کو محیط ہے، اور (ج) آگرہ ونواح آگرہ میں تعزیہ داری اور محرم کے نشانات غم جو مغلیہ سلطنت سے کافی قبل نظر آتے ہیں۔ اس میں شاہ گنج آگرہ کی عزاداری ومحرم کا خصوصی تذکرہ شامل ہے۔

(الف) عزاداری کا ابتدائی عہد

واقعہ کربلا کے بعد ہی اس کا شدید ردعمل شروع ہوگیا تھا۔ یزیدی حکومت اور ناصبی گروہ۔ اس کو چھپانے، دبانے اور مطلوبہ رنگ دینے میں قطعی ناکام ہوگئے تھے۔ اہلبیتؑ کی اسیری وتشہیر نے ظلم بے حد کو رسوا کرنے، اموی ملوکیت کے خلاف جذبات نفرت ابھارنے اور انقلاب فکر ونظر کی اساس رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ واقعہ حُرّہ پیش آیا، جماعت توابین کا ظہور ہوا اور انتقام قتل حسینؑ کی تحریک نے جنم لیا۔ اسیران کربلا کا لٹا ہوا قافلہ، ورود کوفہ پہنچا تو سامان عبرت بننے کے بجائے نقیب انقلاب بن گیا۔ ° ابن زیاد کے دربار اور مسجد کوفہ میں اصحاب رسولؐ جناب زید بن ارقم اور جناب عبداللہ بن عفیف نے ظلم جور کی شدید مذمت کی اور امام حسینؑ کے غم میں گریہ کیا۔ ° (۲) دارالحکومت دمشق میں یزید کے آراستہ دربار میں یزد کی مذمت ہوئی اور

اس کے منہ پر مظلوم کربلا کی مدحت ، اپنی ظاہری فتح کی ترنگ میں یزید اور اس کے بزرگوں کا مافی الضمیر اس کی زبان پر آگیا اور اس نے برملا اعلان کیا کہ " میں نے پیغمبر سے اپنے قرضے وصول کر لئے ہیں اور یہ کہ بنی ہاشم نے حکومت کے لئے ڈھونگ رچایا تھا نہ کوئی خبر آئی اور نہ فرشتہ نازل ہوا۔ " (۳) یہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور عقائد پر ضرب کاری کے مترادف تھا اس لئے حضرت زینبؑ اور امام زین العابدینؑ جو رسن بستہ اور طوق وسلاسل میں جکڑے ہوئے کھڑے تھے ، نے اپنے برمحل خطبوں سے حقیقت آشکار کر دی اور یوں دربار ظلم کا نقشہ ہی الٹ گیا۔ " صحابی رسولؐ جناب ابو برزہ اسلمیؓ نے یزید کی سخت مذمت کی اور امام حسینؑ سے اظہار عقیدت کیا۔ جناب یحییٰ بن الحکم اموی نے درباری شاعر کی ہرزہ سرائی کے جواب میں برجستہ اشعار غم پڑھے۔ خود زوجہ یزید ، ہند بنت عبداللہ بن عامر ، بدحواس ہو کر دربار میں نکل آئی اور یزید کو برا بھلا کہا۔ " (۴)

اہلبیت اطہارؑ زندان دمشق میں ایک سال تک مقید رہے۔ جب سیاسی بے چینی بڑھنے لگی تو یزید ان کی رہائی پر مجبور ہوا۔ " ان اسیروں کے مطالبے پر محل سے ملحق ایک مکان خالی کروایا گیا جہاں تین یا سات روز تک اہلبیتؑ نے شہدائے کربلا کا ماتم کیا اور مجلس عزاء برپا کی جس میں شرفائے دمشق کی خواتین نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اہلبیتؑ کو امام مظلومؑ کا پرسہ دیا۔ " (۵) یہ ہی عزاداری کا نقطہ آغاز تھا جس کی ابتداء مجلس عزاء سے ہوئی ۔

ذکر شہادت کی موافقت ومخالفت کی دو متضاد تحریکیں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ اموی سلطنت کے ہوا خواہوں کی کوشش رہی کہ یہ غم مٹ جائے یا کم از کم ماند پڑجائے جب کہ آئمہؑ اور پیروان اہلبیتؑ نے اس کو زندہ رکھنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مشیت ایزدی نے بھی

اس ذکر شہادت کو باقی رکھنے کی خاطر ایک قوم کی تخلیق کا مسلسل اہتمام کیا ہے جو ذکر شہادت کی بقاء کو اپنا فریضہ حیات تصور کرتی ہے۔ عظیم واقعات غم پر گریہ کرنا انبیاء و مرسلین کا شعار رہا ہے۔ ہابیل کے قتل پر حضرت آدم نے مرثیہ کہا تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کی عارضی جدائی پر خون کے آنسو بہائے تھے کہ آنکھیں روزن دیوار زنداں بن گئی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی گردن پر چھری چلا دی مگر دُنبہ ذبح ہوگیا اور ندائے غیب آئی کہ اے ابراہیمؑ تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہم نے اس کو آخری عہد کے لئے ذبح عظیم پر ملتوی کردیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پوچھنے پر ذبح عظیم کی تشریح کی گئی اور واقعہ کربلا پیش کیا گیا۔ "شہادت عظمیٰ کی اس خبر پر آپ نے بے حد گریہ کیا تھا۔" (۶) حضرت ابوطالب اور ام المومنین خدیجتہ الکبریٰ کے سال وفات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "عام الحزن" قرار دیا تھا جیسا کہ تمام تواریخ میں درج ہے۔ جنگ احد میں حضرت حمزہ کی شہادت واقع ہوئی تھی۔ مدینے میں ہر طرف اپنے اپنے شہداء کا ماتم برپا تھا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس میرے چچا حمزہؑ کا ماتم کرنے والا کوئی نہیں۔ چنانچہ بعض اصحاب رسول نے اپنے شہیدوں کا ماتم رکوا کر حضرت حمزہ کا ماتم کروایا۔ "یہ دستور متعلقہ قبیلوں میں تاریخ نے تیسری صدی ہجری کے اواخر تک ریکارڈ کیا ہے کہ اپنے مردوں سے پہلے حضرت حمزہؑ کا ماتم کیا جاتا رہا۔" (۷) کوفہ سے صفین کو جاتے ہوئے امیر المومنین حضرت علیؑ نے کچھ دیر کو سرزمین کربلا پر قیام فرمایا تھا۔ "مستقبل میں ہونے والے اس واقعہ شہادت پر آپؑ نے بڑی گریہ وزاری کی تھی۔" (۸) عاشورہ محرم ۶۱ھ کی شام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ام المومنین ام سلمیٰؑ اور جناب عبداللہ ابن عباس کے خواب میں اس طرح تشریف لاتے

کہ "گریبان چاک تھا، سر پر خاک تھی اور ریش مقدس آنسوؤں سے تر تھی پوچھنے پر فرمایا کہ ابھی ابھی کربلا سے آرہا ہوں جہاں میرا فرزند حسینؑ تین دن کا بھوکا پیاسا ذبح کر دیا گیا۔" (۹) رسالت مآبؐ کے بعض مقتدر اصحاب کے انتقال پر مرثیے کہے گئے اور تقاریب غم کا اہتمام کیا گیا۔ اس لئے شہادت عظمیٰ کا غم منانا اور گریہ وزاری کرنا سنت انبیاءؑ وآئمہ کی پیروی ہے۔

المیہ کربلا کو تازگی دینے کی خاطر آئمہ اطہار نے اپنے دو سو سالہ دور امامت میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ امام زین العابدین واقعہ کربلا کے بعد چونتیس سال تک مسلسل گریہ کرتے رہے آپؑ کسی تقریب مسرت میں صرف اس وقت شرکت فرماتے جب وہاں ذکر شہادت کا اہتمام بھی کیا جاتا، جیسا کہ علامہ زہری کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے۔ امام محمد باقرؑ نے مومنین کو ہدایت کی تھی کہ "تم جب بھی اور جہاں بھی جمع ہوا کرو تو ہمارا ذکر کیا کرو اور ہمارے مظلوم جد کی شہادت کے واقعات کو یاد کیا کرو۔" (۱۰) آپؑ کے عہد کے ایک بڑے شاعر اسمٰعیل حمیریؒ تھے، جنہوں نے کلام عزاء پیش کرنے میں سبقت حاصل کی تھی۔ امام جعفر صادقؑ اور امام علی رضا نے شعراء کو مرثیے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ "خوف جاں کے باوجود نامور شعراء نے مرثیے کہے اور مجالس عزاء میں پڑھ کر رونے اور رلانے کی طرح ڈالی جس کی آئمہؑ نے حوصلہ افزائی بھی کی ان شعراء میں ابو عمارہؒ، جعفر بن عفانؒ، کمیت اسدیؒ اور دعبل خزاعیؒ ممتاز تھے۔" (۱۱) جناب علی بن بابویہ قمی نے امام علی رضا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جو شخص ہماری مصیبت پر روئے گا وہ قیامت کے دن ہمارے ساتھ ہوگا۔" امام علی رضا نے اپنے مختصر دور ولی عہدی میں ذکر شہادت کو حکومت کے ایوانوں تک پہنچا دیا اور شہادت عظمیٰ سے متعلق ان احادیث

رسولؐ کی کھل کر تبلیغ فرمائی جن کو اب تک حکومت جور نے چھپا رکھا تھا۔ آئمہ کبارؑ نے امام حسینؑ کے غم میں رونے اور رلانے والوں کو دعائیں دی ہیں اور کربلائے معلّٰی کی زیارت کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔

عزاداری میں مجلس عزاء کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کی بنیاد اہلبیتؑ نے دمشق میں رکھ دی تھی ۔ ام المومنین حضرت ام سلمیٰؑ اور جناب عبداللہ ابن عباسؓ کے خوابوں کے ضمن میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا کردہ شیشی میں کربلا کی خاک کے تازہ خون میں تبدیل ہوجانے کے باعث مدینے میں کہرام مچ گیا اور روزانہ مجلس عزاء برپا ہونے لگی ۔ علمدار کربلا حضرت ابوالفضل العباسؑ کی والدہ گرامی حضرت ام البنینؑ کا روز کا دستور تھا کہ صبح آپ جنت البقیع چلی جاتیں اور دن بھر بینیہ اشعار کی صورت میں ذکر شہادت کرتیں جن کو سن کر ہر گزرنے والا متاثر ہوتا تھا۔ ایک بڑی مجلس عزاء مدینہ میں اس وقت منعقد ہوئی جب اہلبیتؑ کا لٹا ہوا کاروان دردبھاں واپس ہوا تھا۔ اور حضرت ام کلثومؑ نے فی البدیہہ نوحہ کہا تھا۔ المیہ کربلا کے بعد جماعت توابین کے اجلاسوں میں ذکر شہادت لازمی عنصر تھا۔ " ایسا ہر اجلاس ایک بڑی مجلس عزاء میں ڈھل جاتا تھا جس میں ذکر شہادت حاضرین کے دلوں کو گرماتا اور جہاد پر ابھارتا تھا۔ " (۱۲) انتقام قتل حسینؑ کی تحریک کو جناب مختار ثقفیؓ نے بڑھاوا دیا۔ آپؑ نے اپنے مختصر دور اقتدار میں اپنے مخصوص انداز میں بدلہ لیا۔ آپؓ قاتلان حسینؑ سے ان کی شقاوت کی داستان ان ہی کی زبانی سنتے اور اکثر غش کر جاتے۔ یہ کھلے اجلاس عام ہوتے تھے جن میں لوگوں کی بڑی تعداد شرکت کرتی تھی ۔ " ایسا ہر اجلاس ایک بڑی مجلس عزاء میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ " (۱۳) دوسری صدی ہجری میں پہلے عباسی حکمران ۔ ابوالعباس سفاح کے عہد کے ایک بڑے شاعر صدیفؓ تھے جو نوحہ نگاری

میں مشہور تھے اور اجتماعات میں پڑھ کر حاضرین کو خوب رلاتے تھے۔
• مشہور جرنیل جناب خالد بن ولید کے پوتے جناب خالد بن مہاجر نے واقعہ کربلا کے ضمن میں بنی امیہ کی سخت مذمت کی اور امام حسینؑ کے غم میں اشعار لکھے اور پڑھے تھے۔ • (۱۴) جناب ابو مخنف بن لوط نے واقعات المقتل لکھی۔ چوتھی صدی ہجری میں عظیم کتاب • امالی • منظر عام پر آئی جو جناب شیخ صدوق کے محرم سے متعلق خطبات پر مشتمل تھی۔ ابن قولیہ کی المزار اور ابن نما کی مقتل لکھی گئیں۔ اسی صدی میں بابویہ حکمرانوں کی محبت اہلبیتؑ کے باعث محرم کے پہلے دس دن سرکاری طور پر بطور ایام غم منائے گئے۔ سیف الدولہ ہمدانی نے روضہ امام حسینؑ کی ازسر نو تعمیر وتزئین کی طرف توجہ دی جس کو نقصان پہنچانے اور منہدم کرنے کی ہارون الرشید اور متوکل عباسی نے مذموم کوشش کی تھی۔
• ۳۵۲ ہجری میں بغداد میں عاشورہ محرم بڑے اور سرکاری طور پر منایا گیا۔ جلوس عزاء میں لوگوں نے بھاری تعداد میں شرکت کی اور ماتمی لباس پہن کر سینہ کوبی کی۔ • (۱۵) مصر اور المغرب (مراکش) کے فاطمی اور اسمعیلی خلفاء تعزیت (عزاداری) میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ فاطمی خلیفہ العزیز نے ۳۶۵ ھ میں عزاداری کا سرکاری فرمان جاری کیا جس کے نتیجہ میں شمالی افریقہ، شام اور حجاز و یمن میں ذکر شہادت کو فروغ ملا کیونکہ یہ سب علاقے اس وقت فاطمی خلیفہ کے زیر نگیں تھے۔ لیکن صلاح الدین ایوبی نے اقتدار پر قابض ہوتے ہی اس فرمان کو منسوخ کردیا، عزاداری پر پابندی لگا دی اور عید عاشور کی بدعت کو پھر رائج کردیا۔ اس کے باعث مومنین کو ترک سکونت کرکے شام میں آکر بسنا پڑا۔ اس طرح شام اور لبنان کے پہاڑی علاقوں کے درمیان نصیبین اور عسقلان میں مراکز عزاداری قائم ہوئے جب کہ حلب اور موصل تو پہلی صدی ہجری ہی میں عزاداری کے مراکز بن چکے

تھے۔ عباسی عہد میں عزاداری کی جو تصویر مورخ قاضی ابو بکر حمید الدین نے کھینچی ہے اس سے محرم کی مجالس اور جلوس ہائے عزاء کی غم انگیز کیفیت کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ (۱۶) ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری حکمرانوں کے اسلام اور پھر مذہب امامیہ قبول کرلینے کے باعث عزاداری کے فروغ میں بڑی مدد ملی ۔ اجتماعی اور بڑی مجالس عزاء بغیر کسی روک ٹوک کے برپا ہونے لگیں۔ جن میں اراکین سلطنت بھی شریک ہوتے تھے۔ دسویں صدی ہجری میں ملا واعظ کاشفی نے روضۃ الشہداءؔ تصنیف کی جو فارسی نظم میں ذکر شہادت پر پہلی کتاب تھی ۔ صفوی عہد میں ایرانیوں کو حقیقی تاریخ اسلام اور آلؑ محمدؐ کے بارے میں علم ہوا تو یہاں بھی عزاداری کے لئے فضا سازگار ہو گئی ۔ " یہ تاریخی صداقت ہے کہ صفوی عہد سے قبل ایران پر سنی علماء وفضلاء کا غلبہ تھا لیکن اس کے بعد سے تاحال شیعی دانشوروں اور اہل علم وفن فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔ " (۱۷) اس دور کے نامور شعراء میں محتشم ، مقبل اور وصال نمایاں تھے جنہوں نے کلام عزاء پیش کرنے میں بلند مقام پایا۔

مصر میں فاطمی خلافت کے بعد بھی طویل عرصہ تک عزاداری کے نقوش باقی رہے۔ قاہرہ میں راس الحسینؑ کی یادگار محرم میں گریہ وزاری کا مرکز بن گئی تھی ۔یہاں سلسلہ عزاء کبھی پوری طرح ختم نہ ہوسکا۔ مولانا جلال الدین رومی رقم طراز ہیں کہ " روز عاشورہ باشندگان الیپو انٹیارک کے دروازے پر رات بھر جمع رہتے اور اہلبیتؑ اطہار کی یاد میں مسلسل گریہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی آہ وگریہ کی آواز بہت بلند ہو کر چیخوں میں ڈھل جاتی ہیں " (۱۹) مولانا رومی کے ہمعصر اور اناطولیہ کے ولی اور بابا اسحٰق کے مرید حاجی بیک تاش نے ترکی اور شام کے طول وعرض میں محرم کی رسومات غم کو عام کرنے میں زبردست خدمات انجام دیں۔

" وہ اور ان کے مرید شب عاشور کو ایک خاص دیگ (کازان) میں عاشور مسمی (ایک قسم کا حلیم) تیار کرتے تھے اور صبح کو نوحہ وماتم اور بین کرنے کے بعد بیک تاشی درویش اس میں شرکت کرتے تھے۔ " (۱۹)

مغلوں کا مورث امیر تیمور تعزیہ دار تھا۔ " اس کے پاس ایک عطا کردہ سفید علم اور خاک شفا کی بنی ہوئی ضریح تھی جس سے راتوں کو گریہ وماتم کی صدائیں نکلتی تھیں۔ " (۲۰) اس نے خراسان اور نواح میں ذکر شہادت کے فروغ میں حصہ لیا۔ اس کے فرزند شاہ رخ کے عہد میں خراسان اور ہرات میں محرم کی روایات غم ادا کی جاتی تھیں۔ کمال الدین عبدالرزاق جو اس کے سفیر کی حیثیت سے مہاراجہ وجے نگر کے دربار کالی کٹ میں حاضر ہوا تھا نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ " پہلی محرم ۸۴۸ھ کا چاند اس نے مسقط کے نزدیک اپنی کشتی سے دیکھا کشتی سمندر میں لنگر انداز رہی جب کہ رسوم عزاء کا اہتمام ہوا۔ " (۲۲)

(ب) برصغیر میں عزاداری و محرم

قدیم سندھ جو سندھ ، پنجاب ، راجپوتانہ ، کچھ ، گجرات اور کاٹھیاوار کے علاقوں پر مشتمل تھا ، میں عزاداری کی نشانیاں ابتدا ہی سے ملتی ہیں۔ " حضرت علیؑ کے عہد خلافت (۳۵ تا ۴۰ھ) میں پانچ صحابی اور تابعی قدیم سندھ کے مکران اور نواح میں برسر عمل تھے جو حضرت علیؑ کے معتقد اور محب تھے۔ (۲۲) نیز وہ مقامی جاٹ بھی یہاں موجود تھے جن کے سینکڑوں عزیز واقارب کو حضرت علیؑ نے کوفہ میں آباد کر دیا تھا۔ مستقبل میں ہونے والے واقعہ کربلا سے متعلق احادیث رسولؐ یہ لوگ سن چکے تھے اس لئے جب شہادت عظمیٰ کی خبر یہاں پہنچی ہوگی تو کسی نہ کسی شکل میں ذکر شہادت شروع ہوگیا ہوگا۔ " ۶۱ھ ہی میں واقعہ کربلا کے بعد چند محترم خواتین وارد لاہور ہوئی تھیں۔ یہ بی بیاں پاک دامن کہلاتی ہیں ، (۲۳) یہ

معزز خواتین واقعہ کربلا کی عینی شاہد تھیں اس لئے ذکر شہادت سے غافل نہ رہی ہوں گی اور لاہور میں رسومات محرم کی ابتداء ہو گئی ہوگی ۔ غالباً ۹۳ ہجری میں امام زین العابدینؑ نے اپنی خالہ ماہ بانو کو المیہ کربلا کے بارے میں تفصیلی خط لکھا تھا۔ ماہ بانو حضرت شہربانو کی بہن ، نوشیرواں عادل کی پوتی اور رانا اودھے پور کی زوجہ تھیں جو چندر بھوگا کے نام سے مشہور تھا۔ یہ مکتوب گرامی اودھے پور کے شاہی توشہ خانے (دفتر / لائبریری) میں تقسیم ہند تک موجود تھا اور ہمارے ایک بزرگ سید آل سبطین رضوی نے ملاحظہ کیا تھا۔ اس لئے اغلب ہے کہ ذکر شہادت کی گونج اودھے پور میں سنائی دینے لگی ہوگی ۔ ۹۲ ھ میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔ یہ اموی لشکر تھا تاہم اس میں اشراف و معتقدین کافی تعداد میں تھے جن میں جناب جہم بن زجر بن قیس جیسے فوجی سالار اور محب اہلبیتؑ بھی تھے۔ " دیبل پر حملہ عاشورہ محرم ۹۳ ھ کو ہوا تھا اس سے قبل محمد بن قاسم کے کیمپ میں ذکر شہادت کیا گیا تھا۔ (۲۴) اس روایت کو مصنف طبقات ناصری (منہاج سراج) کی اس تحریر سے تقویت ملتی ہے جس میں موصوف نے سلطان التتمش کے عہد میں محاصرہ گوالیار کے ضمن میں لشکر سلطانی کو مذہبی مواعظ (تذکرات) کا ذکر کیا ہے۔ موصوف کا بیان ہے کہ " ابتدائی عہد میں ذکر شہادت مسجدوں ، عوامی اجتماعات اور فوجی کیمپوں میں کیا جاتا تھا۔ " (۲۵) گوالیار کا محاصرہ طول پکڑ گیا چنانچہ فوجیوں کے حوصلے بلند رکھنے کی غرض سے ذکر شہادت پر مبنی خصوصی وعظ دیئے گئے۔ اس مقصد کے لئے امام حسینؑ اور ان کے عظیم ساتھیوں کا کردار ہی نمونہ عمل ہو سکتا تھا۔ اور اسی لئے ذکر شہادت کیا جاتا تھا اور المیہ کربلا کے ہیرو کی ذات سے سہارا لیا جاتا تھا۔

اسمٰعیلی مبلغوں نے فاطمی خلفائے مصر کی طرز پر سندھ ، گجرات اور

دہلی میں ذکر شہادت منانے کی بنا ڈالی ۔ تیرہویں صدی عیسوی میں اسمعیلی خطیب جناب نورالدین (نور گسترؔ) نے دہلی اور نواح کے اہلسنت میں ذکر شہادت کو مصر کے فاطمی خلفاء کے انداز میں منانے کو رواج دیا۔ ٭ محمد تغلق کے عہد میں محرم کی عزاداری عام ہوتی تھی ۔ ٭ (۲۶) عظیم صوفی بزرگ جناب محمد اشرف جہانگیر سمنانی جو ۱۲۸۰ء میں ہند تشریف لائے تھے ، نے چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں محترم کا جلوس عاشورہ برآمد کرنے میں پہل کی تھی ٭ آپ نے عاشورہ محرم کے دن علموں کا جلوس سبزوار کی طرز پر نکالا تھا۔ ٭ (۲۷) خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے پیش رو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے جناب خواجہ نصیر الدین چراغ تک سب روز عاشورہ سوگ مناتے اور اپنے اپنے اجتماعات میں نوحہ ومرثیہ خوانی کیا کرتے تھے۔ (۲۸) چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں سید حسین مشہدی خنگ سوار کی مساعی کے باعث اجمیر میں سادات کی بستی اور مرکز عزاء قائم ہوئے جہاں اب تک تعزیہ داری ہوتی رہی ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی خانقاہ میں ایک حجرہ تعزیہ رکھنے کے لئے مخص تھا۔ عزاداری کے اخراجات کے لئے عہد جہانگیری میں مالی مدد ملتی تھی ۔ (۲۹) بابر نے گوالیار کی طرف پیش قدمی کرتے وقت اپنی روزمرہ کی ڈائری میں عاشورہ محرم ۹۵۱ھ کے واقعات اور کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ ہمایوں کے زمانے میں محرم کی مجالس کو محارک کہتے تھے جو بڑی مقبول تھیں۔ (۳۰) اکبر اعظم کے عہد میں ہندوستان سے مشہد مقدس روضہ امام رضا پر نذر کے لئے علم روانہ کرنے کا دستور تھا۔ عاشورہ کے دن تعزیہ قلعہ آگرہ سے برآمد ہوتا تھا۔ جس پر حیدر توتیائی کے اشعار کندہ ہوتے تھے جو جلوس عزاء میں پڑھے جاتے تھے۔ (۳۱) بیرام خان نے ۴۶ تولہ خالص سونے کی ضریح بنوائی تھی جو اس نے ہمایوں بادشاہ کو تحفہ میں دیدی تھی ۔ ۹۵۳ھ میں میرمراد نے ڈھاکہ میں ایک

عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کروایا تھا۔ عہد عالمگیری میں ملک کے مختلف مقامات سے جلوس تابوت وتعزیہ نکلتے تھے جیسا کہ ۱۰۷۹ھ میں برہان پور کے جلوس تابوت کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے۔ اس میں دو گروہوں میں تصادم ہوگیا تھا جس کو آڑ بنا کر اورنگ زیب نے جلوس عزاء پر سارے ملک میں پابندی لگا دی تھی۔ معظم شاہ نے خود بھی تعزیئے بنوائے جو حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں رکھے جاتے تھے۔ ان کی تصاویر خواجہ حسن نظامی نے اپنے جریدے " منادی " میں شائع کی تھیں۔ شاہ عالم راتوں کو محرم کی مجالس عزاء میں شرکت کرتا اور مرثیے بڑی عقیدت سے سنتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں قلعہ دہلی کے اندر محرم کی رسومات غم منائی جاتی تھیں اور تعزیوں کی زیارت بڑی عقیدت واحترام سے کی جاتی تھی۔ " مغل تاجداروں کی اکثریت عزاداری میں دلچسپی لیتی تھی جو آگرہ ودہلی کے قلعوں کے اندر کی جاتی تھی اور روز عاشورہ علم وتعزیئے شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ برآمد ہوتے تھے۔ (۳۲) سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں مرشد آباد (بنگال) میں عزاداری کے لئے ایک بہت بڑا وقف قائم ہوا جہاں محرم ی مجالس بڑے اعلیٰ پیمانے پر برپا ہوتی رہیں۔ اسی زمانے میں دہلی میں دو بڑے مراکز عزاء وجود میں تھے ایک درگاہ شاہ مردان دوسرا درگاہ پنجہ شریف جہاں ۱۲ محرم (امام حسینؑ کے سوئم کے دن) اور ۲۰ صفر (امام حسینؑ کے چہلم کے روز) بڑی مجالس عزاء برپا ہوتی رہیں۔ دہلی، آگرہ اور اطراف بلکہ پورے شمالی ہند میں لاہور سے کلکتہ تک محرم کی عوامی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید وغیرہ کی شیعہ دشمنی کے باوجود تعزیہ داری کی غم انگیز رسومات میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ خود شاہ عبدالعزیز کی خانقاہ میں محرم کی مجلس عزاء برپا ہوتی رہی جس میں حاضرین مجلس بشمول شاہ عبدالعزیز گریہ کرتے تھے۔ " (۳۳)

سید احمد شہید کی سوانح کی کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ تعزیوں کے خلاف
ان کی زبردست جدوجہد کے باوجود پورے شمالی ہند کے طول وعرض میں
پنجاب سے بنگال تک شیعہ اور سنی مل کر جلوس عزا نکالتے رہے۔ ناصبی
ذہن علماء تعزیہ داری کے بڑھتے ہوئے فروغ سے خائف تھے کیونکہ خود
شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے خاندان شیعی افکار سے متاثر ہو رہے تھے
نیز امام باڑے، تعزیئے رکھنے کے چبوترے اور تعزیوں کو دفن کرنے کی
جگہیں کربلائیں) دور دراز کے مضافاتوں تک میں وجود میں آگئی تھیں۔
(۴۴) انیسویں صدی عیسوی میں پنجاب وسندھ اور سرحد میں سیاسی تغیرات
کے باعث بھی شیعی اثرات میں اضافہ ہوا کیونکہ سکھ مسلمانوں کے مذہبی
معاملات میں کوئی خاص دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ اسی صدی کے وسط
میں نواب علی رضا قزلباش نے افغانستان سے ہجرت کی اور لاہور میں
سکونت اختیار کی۔ ان کے وارث نواب نوازش علی قزلباش پنجاب کے
بڑے بااثر شخص ہوئے۔ انہوں نے متعدد امام باڑے بنوائے اور محرم کی
رسومات غم کو مقبول عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ فقیر برادران جو
اہلسنت تھے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے امرا میں شمار ہوتے کے اثرات
کے باعث انارکلی لاہور میں فقیر حویلی تعزیہ داری کا مرکز بن گئی تھی۔
گردیزی اور صوفی خاندانوں نے ملتان میں عزاداری کو فروغ دیا۔ مخدوم
جہانجہانیاں کی اولاد نے اوچھ شریف میں تقریبات محرم کے انعقاد کا
زبردست بندوبست کیا۔ سیہون کے لال شہباز قلندر اور ان کے مریدوں نے
رسومات محرم کو سندھ، پنجاب، بلوچستان اور شمالی سرحدی صوبے کے
تمام علاقوں میں عام کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ انیسویں صدی
عیسوی میں ان سب علاقوں میں رسومات محرم کا انداز اودھ کے طرز پر تھا
لیکن کشمیر میں میر شمس الدین عراقی کی رائج کردہ مراسم عزا ہی برقرار

رہیں۔" سری نگر میں ان کی خانقاہ عزاداری کا عظیم مرکز رہی ہے لداخ میں اب تک مسجدوں ہی میں ارکان عزا، انجام دیئے جاتے ہیں۔" (۳۵)

دکنی ہند میں شیعیت کے نفوذ کے ساتھ عزاداری داخل ہو گئی تھی۔ یہاں ۷۴۸ھ میں عظیم بہمنی سلطنت کا ظہور ہوا۔ ۸۲۹ھ میں سلطان احمد شاہ نے شیعی مسلک اختیار کیا جس کے باعث عزاداری کو ترقی ملی۔ خواجہ محمود (گاوان) کے زوال کے بعد یہ عظیم سلطنت بھی گہنا گئی اور اس کے بطن سے بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ نے جنم لیا۔ ان تینوں مملکتوں کی مجموعی عمر ۳۵۰ برس تھی۔ یہ برید شاہی، برہان شاہی، نظام شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کا عہد حکومت تھا۔ یہ سب محب اہلبیتؑ تھے۔ شہدائے کربلا کے غم میں سینہ کوبی اور مجلس عزا، کے انعقاد کی ابتداء بیجاپور کے عادل شاہ سے ہوئی۔ برید شاہی زمانے میں بیجاپور میں ایک عجوبۂ روزگار عظیم امام باڑہ تعمیر ہوا جس کی منقش دیواروں میں سے ایک پر جو تحریر کندہ تھی وہ مختلف سمتوں سے پڑھنے میں مختلف نظر آتی تھی (۳۶) عزاداری کے فروغ میں نظام شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں نے قابل رشک خدمات انجام دیں۔ قطب شاہی عہد آخر میں محرم کے ایام غم پہلی سے بارہ محرم تک سرکاری طور پر منائے جاتے تھے۔ عزاداری کے بھاری اخراجات کا بوجھ غریب، امیر اور حکومت تینوں مخصوص تناسب سے برداشت کرتے تھے۔ محرم کے تقدس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ناچ گانے اور دیگر تقریبات مسرت قطعی بند ہو جاتی تھیں۔ (۳۷) گلبرگہ میں عظیم عاشور خانے قائم ہوئے جہاں حسینی علم نصب ہوتے تھے۔ حکومت عزاداری کے لئے لوگوں کو خصوصی فنڈ اور ماتمی لباس مفت فراہم کرتی تھی۔ بھاگ نگر (حیدر آباد دکن) کی تعمیرات میں گنبد کے بجائے چہار مینار نے جگہ لے لی جن پر علم اور تعزیئے کو خصوصی اہمیت دی گئی تھی۔ یہ عزاداری کی

علامت تھی ۔ (۳۸) عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جلوس عزاء میں لنگروں کا اضافہ ہوا جو منفرد خصوصیت تھی ۔ مرزا غلام حسین نے گلزار آصفیہ جو ۱۸۴۰ء میں لکھی گئی تھی ، میں حیدر اباد کے محرم کی تقریبات غم کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ نیز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر ہرکلوڈ نے ۱۸۳۲ء میں " انڈین مسلم " کتاب لکھی جس میں تقریباً پچاس صفحات عزاداری کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی کے دکنی کلچر کے مطابق بیجاپور ، احمد نگر اور گولکنڈہ میں ایام محرم میں گریہ وماتم وسینہ کوبی کا عام دستور تھا۔ آصف جاہی عہد میں قطب شاہی دور کی رسومات محرم کو برقرار رکھنے میں نواب سالار جنگ کے خاندان نے خصوصی خدمات انجام دیں۔ آخری نظام دکن میر عثمان علی خان نے ایک عظیم الشان مرکز عزاء تعمیر کروایا۔ یہ عزاخانہ زہرا مشہور ہے یہ امام حسینؑ کی تیرہ سو سالہ یادگار (۱۳۹۱ھ) کے موقع پر بن کر تیار ہوا تھا۔ موصوف بذات خود مجالس عزاء میں شریک ہوتے تھے۔ قطب شاہی حکمرانوں نے تقریبات محرم کو میسور اور مدراس میں بھی مقبول عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے زوال کے بعد مغل گورنروں نے یہ رسومات غم جاری رکھیں اور مناتے رہے۔ ۱۶۹۱ء میں میسور کے گورنر عباس قطب خان نے سرا کے مقام پر ایک بڑا امام باڑہ تعمیر کروایا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے تحت ایرانی امرا واکابرین نے سرنگا پٹم میں ایک بڑا امام باڑہ بنوایا جس کے اخراجات حکومت ادا کرتی رہی ۔ بنگلور میں بھی محرم تزک واحتشام سے منایا جاتا تھا۔ نوابین کرناٹک کی اردو شاعری سے گہری دلچسپی کی بدولت اس علاقے میں محرم منانے کی بڑی ترغیب ملی ۔ (۳۹) مہاراجہ چندولال عزاداری سے گہری وابستگی رکھتا تھا۔ عاشورہ محرم کی رات کو جلوس تعزیہ زبردست روشنی کی جلوں میں نکلتا تھا۔ یہ چراغان جنوبی ہند میں اپنی مثال آپ تھا۔ (۴۰) بنگال اور راجستان کے

ہندو بھی عزاداری میں دلچسپی لیتے تھے۔ محمد حسین قاتل نے کتاب ہفت تماشہ اور عبداللطیف شوشستری نے " تحفتہ العالم " میں اس کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ بہار کے ہندوؤں کی محرم میں دلچسپی کے بارے میں آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد جو عظیم مورخ، آل انڈیا کانگریس کے بڑے رہنما اور بھارتی جمہوریہ کے پہلے صدر تھے نے اپنی مشہور تصنیف The Devided India کے صفحہ ۳۶ پر نہایت خوبصورتی سے تذکرہ کیا ہے۔ شمالی ہند میں عزاداری و محرم سے ہندوؤں کی وابستگی کی بابت ان کی تحریر کا اردو خلاصہ یہ ہے کہ " شمالی ہند کے طول وعرض میں مسلمانوں کے تہوار محرم میں ہندو عوام کی شرکت وشمولیت بڑی واضح اور مشہور ہے۔ ماضی قریب میں ایسا زمانہ بھی گزار جب محرم کی تقریبات منانے والوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ اکثریت ہندوؤں کی ہوا کرتی تھی ۔ یہ نہ صرف محرم کے جلوس کی خصوصیت تھی کہ ان میں اہل ہنود بھاری تعداد میں شریک ہوتے تھے بلکہ خود ہندو بھی ان رسومات غم کو اسی طرح مناتے تھے جس طرح مسلمان اپنے گھروں کے اندر ایام غم وعبادت کے بطور مناتے تھے۔ ان ایام غم میں خوشی کا کوئی کام نہ کیا جاتا۔ مثلاً نہ کوئی شادی کی تقریب ہوتی اور نہ کسی نئے مکان میں رہائشی داخلے کے لئے کوئی رسم مسرت ادا کی جاتی ۔ کافی بڑی تعداد میں ہندو خود اپنے تعزیئے اور سہرے رکھتے تھے اور ہندو لڑکے ہرا لباس زیب تن کر کے بدھی لگاتے اور پانی کی مشک اٹھا کر فقیر اور بہشتی بنتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ اکھاڑے آراستہ ہوتے جہاں تلوار دیگر ہتھیار اور لاٹھی کی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ اکثر وبیشتر اکھاڑوں کی جداگانہ حیثیت نہ رہتی بلکہ دونوں قوموں کے مشترکہ ومتحدہ اکھاڑے وجود میں آجاتے تھے۔ ڈاکٹر موصوف کی اس تحریر سے یہ بات قطعی واضح ہوجاتی ہے کہ محرم کی

رسومات غم منانے میں اہلسنت ہی نہیں بلکہ اہل ہنود کی بھاری تعداد بھی تعزیہ داری میں شامل رہی ہے۔

جنوبی ہند کی شیعی ریاستوں کی تباہی کے بعد اودھ میں شیعی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ یہاں مسلم اقتدار کی ابتدا۔ سالار سید مسعود غازی کے والد سالار ساہو سے ہوئی جو جناب محمد حنفیہ بن حضرت علیؑ کی نسل میں تھے۔ بہرائچ میں آپ کا مقبرہ زیارت گاہ ہے جہاں اس وقت سے اب تک حسینی علم نصب ہے۔ یہ عزاداری کی علامت ہے۔ (۴۱) اودھ میں شیعی حکمرانی کا بانی میر محمد امین (سعادت خان) تھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد مرکز حکومت بھی تھا اور مرکز عزاداری بھی۔ یہاں مجلس عزاء میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے۔ جلوس عزاء کی قیادت وہ برہنہ سر اور برہنہ پا ہو کر خود کرتا تھا۔ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنو دارالحکومت بنا اس طرح ایک اور مرکز عزاء وجود میں آگیا۔ " وہ عزاداری میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ جہاں بھی وہ گیا وہاں کے مرکز عزاداری کے لئے اس نے خصوصی گرانٹ دی۔ اس کی عظیم یادگار لکھنو کا امام باڑہ آصفیہ ہے جس کی تعمیر میں اس وقت کا دو کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ یہ تعمیری فن کا شاہکار ہے۔ " (۴۲) غازی الدین حیدر نے حضرت علیؑ کے روضے کی شبیہہ تعمیر کروائی جس کے وسط میں شیشے کا وہ تعزیہ رکھا ہوا تھا جو لندن سے بن کر آیا تھا۔ واجد علی شاہ نے حضرت گنج میں ایک خوبصورت امام باڑہ بنوایا جس کو سبطین آباد کا نام دیا گیا۔ " اپنی نظر بندی کے زمانے میں مٹیابرج کلکتہ میں وہ ایک چھوٹا لکھنو وجود میں لے آیا اور ایک عظیم مرکز عزاء کی بنیاد رکھی۔ " (۴۳) نوابان اودھ کے عہد کا اودھ بذات خود ایک بہت بڑا امام باڑہ کہا جاسکتا تھا۔ جہاں محرم کے ایام غم محرم کی چاند رات سے آٹھ ربیع الاول تک منائے جانے لگے تھے اور جہاں گھر گھر عزاداری کا چرچا ہونے لگا تھا جو شاہان اودھ

اور امامیہ علمائے لکھنؤ کی مساعی کا براہ راست نتیجہ تھا۔ لکھنؤ میں ایام عزاء کے پہلے دس روز، امام حسینؑ کے سوئم کے دن (۱۲ محرم) اور امام حسینؑ کے چہلم کے روز (۲۰ صفر) کی رسومات غم کی بڑی تفصیل کے ساتھ بیگم میر حسن علی نے اپنی کتاب "مسلمانان ہند پر ایک نظر" مطبوعہ لندن ۱۸۳۲ء میں بیان کیا ہے۔

محرم کی رسومات غم اور جلوس عزاء میں برادران اہلسنت کی بھرپور شرکت اتحاد بین المسلمین کا عظیم مظاہرہ بھی تھی اور بقائے اتحاد کی ضامن بھی۔ لیکن ناصبی ذہن علماء کو یہ گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ اس کی شدید مخالفت کی جاتی رہی کہ ان کے نزدیک محبت اہلبیتؑ رفض اور عزاداری بدعت ہے۔ اس کے باعث حقیقی اسلام سے دوری پیدا ہوئی اور مختلف فرقوں کے مابین اتحاد ویگانگت کو سخت دھچکہ بھی لگا اور ملت مسلمہ منتشر اور بکھر کے رہ گئی۔ تعزیوں کے خلاف طرح طرح کی لغو باتیں کی گئیں۔ ان کو لکڑی اور کاغذ کا ڈھانچہ قرار دیا گیا اور ان کے احترام کو بدعت سے تعبیر کیا گیا۔ تاہم صحیح العقیدہ علمائے اہلسنت نے ان خیالات فاسدہ کو مسترد کردیا اور اس احترام کو حضرت موسیٰ کی امت کے تابوت سکینہؑ سے زیادہ محترم قرار دیا۔ "دہلی میں سلسلہ چشتیہ کے بزرگ مولانا فخر الدین فرنگی محلی علماء کے سربراہ تھے ان کا عقیدہ تھا کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ارواح پاکیزہ خود ان تعزیوں اور ضریحوں کی زیارت کے لئے تشریف لاتی ہیں۔" (۴۴)

ملفوظات رزاقی میں درج ہے کہ ایک مرتبہ پیر موصوف جولاہے کہ تعزیئے کی زیارت کے لئے تشریف نہیں لے گئے تو خود کو خواب میں تعزیئے کے قریب پایا۔ آپ کو دیکھ کر آئمہؑ نے پوچھا کہ اس مرتبہ ہمارے ہاں نہ آنے کی کیا وجہ ہوئی۔ پیر موصوف نے آئمہؑ کی قدم بوسی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ میری جرات کیسے ہوسکتی ہے کہ میں آپ کے مقدس مکانوں کی زیارت

کو نہ آؤں۔ اس کے بعد آپ ہمیشہ تعزیوں کی زیارت کے لئے جاتے رہے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ تعزیہ فقط لکڑی اور کاغذ کا تیار کردہ ایک ڈھانچہ ہے بلکہ آئمہ کی ارواح پاکیزہ اس کے اردگرد رہتی ہیں۔ سید احمد شہید بریلوی کی تعزیوں کے خلاف پر تشدد مہم زیادہ کامیاب نہ ہو سکی ۔ انہوں نے اور ان کی جماعت کے لوگوں نے تعزیوں کو آگ لگانے تک کی ترغیب دی اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے باعث کئی شہروں سے ان کو شہر بدر ہونا پڑا۔ اودھ کے حکمرانوں نے ان کی شدید مخاصمانہ تحریک میں کوئی رخنہ نہ ڈالا بلکہ غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ - ۱۸۲۷ء) نے اپنے وزیر آغا میر کے مشورے پر نصیر آباد کے شیعوں کو تنبیہ کی کہ وہ مراسم عزاداری میں کچھ تخفیف کرلیں اور رفع فساد کی غرض سے محرم کے رسومات غم منانے میں قدرے احتیاط برتیں۔ جناب غفراں مآب نے بھی شیعوں کی توقعات کے برعکس حکومتی اقدام کی تائید کی ۔ لیکن شیعوں نے محرم کی عزاداری کی مروجہ روایات و رسومات میں کسی قسم کی تبدیلی سے انکار کر دیا۔ (۴۵)

انگریزی اقتدار ۱۸۵۷ء سے سیاسی صورت حال میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی ۔ اب حکمرانوں کو عزاداری سے کوئی عناد واختلاف نہ تھا۔ اسی لئے حکومتی اقدامات میں جانبداری کا عنصر بڑی حد تک رفع ہوگیا تھا۔ انگریزوں کی مذہبی پالیسی میں بعض نقائص کے باوجود یہ حکومت مجموعی اعتبار سے شیعہ مخالف نہ تھی ۔

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں (۱۸۴۷ - ۱۹۴۷ء) کی سو سالہ مدت برصغیر میں عزاداری کے ارتقاء کا عہد کہی جا سکتی ہے۔ اس دوران میں عزاداری کے بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے ان میں دہلی، لکھنو، آگرہ، لاہور حیدر آباد دکن، پٹنہ اور ملتان وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی جہاں عظیم

الشان اجتماعی مجالس عزا منعقد ہونے لگیں اور محرم کا عشرہ ثانی بھی خاص طور سے برپا ہونے لگا۔ ان مجالس عزا میں سترھویں صدی / اٹھارویں صدی عیسوی میں کاشفی کی روضۃ الشہداء اور فضلی کی وہ مجلس کے اقتباسات پڑھے جاتے تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسویں صدی عیسوی کے اوئل میں ان کے اردو ترجمے پڑھنے کا رواج ہوا۔ مترجمین میں دوسروں کے علاوہ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید ذوالفقار حسنین بن سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر بھی تھے جو بڑے اچھے نثار اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ موصوف کے ترجمے کے اقتباسات امام باڑہ قدیم کی مجالس محرم میں اکثر سید محسن حسین بن سید شجاعت حسین پڑھا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں مرثیوں کو فروغ ملا تو مرثیہ خوانی مجلس عزا کا اہم عنصر بن گئی اور عظیم مرثیہ نگار ابھرے۔ اس کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی (موجودہ صدی) میں خطابت اور ذاکری کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں عظیم خطیب اور ذاکر منظر عام پر جلوہ گر ہوئے۔ ان میں مولانا سید مقبول احمد ، مولانا سید سبط حسن ، علامہ عبدالعلی حائری ، مولانا سید کلب حسین ، علامہ سید علی نقی ، حکیم سید مرتضیٰ حسین الہ آبادی ، مولانا اظہر حسن زیدی ، حافظ کفایت حسین ، علامہ رشید ترابی ، پروفیسر عبدالحکیم بوترابی ، پروفیسر سید موسیٰ رضا آف پٹنہ ڈاکٹر سید کلب صادق ، علامہ سید ابن حسن رضوی جارچوی ، علامہ سید عباس حیدر عابدی ، علامہ سہیل آفندی (فرزند ارجمند علامہ نجم آفندی اکبر آبادی) ، مولانا عباس کمیلی ، علامہ عرفان حیدر عابدی اور علامہ طالب جوہری ممتاز ہوئے۔

محرم کی مجالس عزا روح کو بہترین اور صالح غذا بھی فراہم کرتی ہیں اور دل وجان کو معطر و منور بھی کرتی ہیں۔ یہ آلِ محمدؐ کی تعلیمات کی

عظیم درسگاہ کی حیثیت رکھتی ہیں جو شہادت عظمیٰ کے علاوہ تمام اسلامی علوم اور فلسفہ حیات کا احاطہ بھی کرتی ہیں ۔ اسی لئے دنیوی اور دینی فلاح کی ضامن بھی ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ " تم اپنی مجالس کو ذکر علیؑ سے زینت دو ۔ " یہ عبادت الہیٰ کا بہترین ذریعہ ہے۔ شہادت عظمیٰ کے بعد مجلس فقط ذکر شہادت سے مخصوص ہو گئی ہے تاہم مجالس عزاء کے موضوعات کا سلسلہ تذکرہ محمدؐ آلؑ محمدؐ تک لازمی پہنچتا ہے۔ یہ آلؑ محمدؐ کی تعلیمات کی عظیم درسگاہ کی حیثیت رکھتی ہیں جو شہادت عظمیٰ کے علاوہ تمام اسلامی علوم اور فلسفۂ حیات کا مکمل احاطہ بھی کرتی ہیں۔ اس طرح یہ دینی اور دنیوی فلاح کی ضامن بھی ہیں۔ اس لئے ان درسگاہوں کی حفاظت اور فروغ و ترقی ہم سب کا دینی فریضہ بن گیا ہے۔

امام حسین کی عزاداری سے فقط مسلمانوں ہی کو لگاؤ نہ تھا اور مسلمان ریاستوں اور علاقوں کے ہندو ہی متاثر نہ تھے بلکہ محرم کی غم انگیز رسومات وتقریبات خالص ہندو ریاستوں اور بھاری ہندو اکثریت کے علاقوں میں منعقد ہوتی رہیں۔ گوالیار اور جے پور قدیم زمانے سے خالص ہندو اکثریتی ریاستیں رہی ہیں۔ یہاں مسلمان بہت کم تھے اور سادات وشیعہ تو برائے نام ہی رہے ہوں گے لیکن یہاں کے ہندو مہارجگان تعزیہ دار تھے اور محرم کی رسومات غم بڑی عقیدت واحترام اور شان وشوکت سے مناتے تھے۔ یہ دونوں ریاستیں سابق راجپوتانہ یا راجستھان میں بیانہ، اجمیر اور آگرہ کے قرب وجوار میں واقع تھیں اس لئے ان ریاستوں کی عزاداری ومحرم اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہ ہندو علاقے سادات مذکورہ سے کس درجہ متاثر تھے۔ متھرا جو آگرہ کا پڑوسی شہر ہے اور قدیم سے ہندوؤں کا گڑھ

رہا ہے ۔ میں بھی محرم اور عزاداری کی روایات غم کا انعقاد ثابت کرتا ہے کہ یہ ہندو علاقہ بھی سادات مذکورہ کے افکار و اعمال سے کس قدر اثر پذیر تھا۔ یہاں کے ۹ ۔ محرم کا جلوس دیدنی تھا جس کا احوال اس باب کے آخری جزو میں دیا گیا ہے اور جس کا تذکرہ تجلیات فکر مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ ۔ / ۱۹۵۸ء میں بھی ملتا ہے۔

اہل ہنود اسلام سے مخاصمت کے باوجود کربلا کے ہیرو سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں انہوں نے ہر دور میں محرم کی رسومات غم میں عملی حصہ لیا ہے اور اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ ان میں دت قوم کی ایک شاخ جو بامن کہلاتی ہے امام مظلومؑ کے سوگ میں جوگی پن اختیار کرتے ہیں جیسا کہ علامہ نجم آفندی نے اپنی طویل نظم کربل نگری میں کہا ہے۔

کوئی تو ہے اس دیس سے مظلوم کا بندھن
کیوں ورنہ حسینی ہیں یہ دت قوم کے بامن
کچھ بھید ہے جو سوگ میں جوگی سے بنے ہیں
ہندو اسی دھرتی پہ عزادار گھنے ہیں

ذکر شہادت کو جو فروغ اور قبولیت برصغیر میں حاصل ہوئی وہ کہیں اور نہ ہو سکی شاید اس کی وجہ امام حسینؑ کا یہ عندیہ ہو جو آپؑ نے فوج یزیدی کو عاشورہ محرم ۶۱ ھ کی صبح اپنے خطاب میں ظاہر کیا تھا کہ اگر تمہیں میرا وجود وقیام اپنے درمیان گوارا نہیں ہے تو راستہ دیدو میں ہند چلا جاؤں گا۔ آخر آپؑ نے ہندوستان ہی کا نام کیوں لیا آپؑ وسطی ایشیا کے کسی ملک یا چین چلے جانے کی بات بھی کر سکتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپؑ کی چشم بصیرت نے بخوبی دیکھ لیا تھا کہ مسلمان ملکوں میں المیۂ کربلا کو

دہرانے پر بھی بندشیں لگائی جائیں گی جبکہ ہندوستان میں ذکر شہادت بڑی شدومد سے مسلسل جاری رہے گا۔ آپؑ کی شہادت محض دین اسلام کی بقاء کے لئے نہ تھی بلکہ اس سے اعلیٰ اقدار انسانی کا گہرا اور ابدی تعلق ہے۔ آپؑ عالم انسانیت کا مشترکہ اثاثہ ہیں آپؑ کے اقدام نے حریت فکر، حق وصداقت اور عزت نفس کا جو درس وپیام دیا ہے وہ لازوال بھی ہے اور فقید المثال بھی ۔ کربلا سے قبل آپ فقط مسلمانان عالم کے حسینؑ تھے لیکن کربلا کے بعد سے آپ ساری دنیائے بشری کے حسینؑ بن گئے ہیں۔ لہذا آپؑ کا ذکر شہادت نسل ورنگ اور زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس لئے آپؑ کی شہادت کا غم منانا سب کا فریضہ ہے۔ ایک ایسا فریضہ جو بذات خود ایک عظیم عبادت ہے۔ یہ غم ابدی ہے اور باوقار زندگی کے لئے ایسا پیغام ہے جس کی افادیت کبھی کم نہ ہوگی یہ دل وجاں کے آئینے کو جلا دینے اور فکرونظر کی دنیا کو سنوارنے کا ضامن بھی ہے۔

(ج) آگرہ ونواح آگرہ میں عزاداری ومحرم

حضرت میکش اکبرآبادی نے آگرہ کے محرم کے بارے میں اپنے مضمون کی ابتداء یوں کی ہے کہ " ہماری طرف آگرہ ، گوالیار اور جے پور کے محرم بہت مشہور ہیں۔" گوالیار جنوب میں اور جے پور شمال میں واقع ہے۔ "ہماری طرف" کے الفاظ ان تمام علاقوں کا احاطہ کرتے ہیں جو آگرہ کے قرب وجوار میں واقع ہیں اور نواح آگرہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ گویا ہماری طرف کے الفاظ کا مصداق وہ وسیع وعریض علاقہ ہے جو گوالیار اور جے پور کے درمیان واقع ہے اور جس کو ہم آگرہ نواح آگرہ سے معنون کرتے ہیں۔ اور یہ ہی ہمارا موضوع گفتگو بھی ہے۔

جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ماہ محرم میں امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے غم کا اظہار کسی نہ کسی انداز میں ہوتا رہا ہے۔ قرائین سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد غوری کی فتح منڈیوں کے بعد نواح آگرہ یعنی بیانہ اور اجمیر (راجپوتانہ) میں سادات عظام کے قیام، خاص طور سے عہد غوری میں بیانہ میں سالار محمد غازی مشہدی اور اجمیر میں خواجہ سید معین الدین چشتی اور سالار سید حسین مشہدی خنگ سوار کی مستقل رہائش کے زمانہ سے اس علاقے میں عزاداری کی ابتداء ہو گئی تھی جو آہستہ آہستہ اس علاقے کے مسلمانوں کے مزاج میں رچ بس گئی اور ہر سال ماہ محرم کے پہلے عشرہ میں مسلمان بڑے پیمانہ پر واقعہ کربلا کی یاد منانے لگے۔ جس کی نشاندہی غیر ملکیوں کے درج ذیل وقائع نگاری سے ہوتی ہے۔

دور اکبری میں پہلا عیسائی مشن وارد ہندوستان ہوا۔ یہ مشن گوا (جنوبی ہند) سے ۱۷ دسمبر ۱۵۷۹ء کو روانہ ہو کر ۲۵ فروری ۱۵۸۰ء کو فتح پور سیکری پہنچا۔ جب دوران سفر یہ مشن ۱۵ فروری ۱۵۸۰ء کو ناروار (مابین بیانہ و گوالیار) پہنچا جو اس دور میں ایک مشہور شہر تھا (۱) اس مشن کے رکن مسزاپ نے تحریر کیا کہ یہاں مسلمانوں کا نو دن کا تہوار حسنؑ وحسینؑ کے اعزاز میں منایا جارہا تھا جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نواسے اور ان کی دکھی بیٹی فاطمہ (سلام اللہ علیہا) کے بیٹے تھے جن کے باپ علی (علیہ السلام) تھے جنہوں نے اپنے نانا کے دین کے قیام و تبلیغ کے لئے کافروں سے جنگ کی۔ کافروں نے انہیں سخت تکلیف پہنچائی اور جلتی ریتی پر ننگے پیر چلایا اس لئے مسلمان ان دنوں میں فاقے سے رہتے ہیں اور صرف دالیں کھاتے ہیں۔ (۲) ان دنوں میں کچھ لوگ بلند پلیٹ فارم (منبر) سے عام مجمعوں میں حسنؑ وحسینؑ پر مظالم کی داستان بیان

کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ وبیان سے مجمع کے شرکا پر حزن وملال اور رقت کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ زاروقطار روتے ہیں۔ اس تہوار کے آخری دن لکڑیاں جمع کر کے جلا دی جاتی ہیں اور وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں داخل ہو کر اپنے ننگے پیروں سے بھڑکتے ہوئے انگاروں کو کچل کر منتشر کر دیتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ زور زور سے دیوانہ وار حسنؑ حسینؑ پکارتے ہیں۔" (۳۶)

دور جہانگیری میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک رکن جو ۱۶۲۰ء سے اواخر ۱۶۲۷ء تک آگرہ میں رہا اس نواح میں پہلے عشرہ کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ۔

"حسنؑ حسینؑ دو بھائیوں کی یادگار جو علی (علیہ السلام) اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ (سلام اللہ علیہا) کے بیٹے تھے کفار کے ساتھ لڑائی میں قتل ہوئے۔ اس ظالمانہ قتل کے خلاف وہ (مسلمان) دس دن تک تمام رات بہت شور (گریہ وبکا) کرتے ہیں۔ مرد اپنی عورتوں سے دور رہتے ہیں اور دن بھر فاقہ کرتے ہیں۔ عورتیں نوحے پڑھتی ہیں اور اظہار غم کرتی ہیں۔ مرد دو Coffin (تابوت یا تعزیہ) بنا کر انہیں جس قدر قیمتی چیزوں سے سجا سکتے ہیں سجاتے ہیں اور کاندھوں پر اٹھا کر لاتعداد روشنیوں اور جم غفیر کے ساتھ زور دار آہ وبکا کے ساتھ رات میں شہر کی گزرگاہوں اور شاہراہوں پر گشت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کا سب سے زیادہ زور دسویں کی شب کو ہوتا ہے۔ اس وقت اس زبردست سوگ کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے پورے ملک پر محیط ہو جیسا کہ کبھی فرعون کی ہٹ دھرمی سے ہوا تھا جب سارے پہلوٹی کے نوزائیدہ بچے ایک ہی دن میں مار دیئے گئے تھے۔ یہ شور آہ وبکا اگلے دن پہلے پہر تک جاری رہتا ہے جب کہ ان کے ساتھ بڑی مجمع ہوتا ہے وار غم والم کی چیخیں

بلند ہوتی ہیں اور بہت شور ہوتا ہے۔ یہ Coffin (تعزیہ یا تابوت) دریا پر لائے جاتے ہیں۔ ان جلوسوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنے تابوتوں / تعزیوں کو دریا برد نہیں کردیتے اس کے بعد وہ واپس آتے ہیں اور اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کی قبروں پر جاتے ہیں جو نئے سرے سے چونے سے پوتی جاتی ہیں۔ ساتھ میں کھانا اور پھول بھی لے جاتے ہیں اور تقریب (مجلس) کے بعد کھانا غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس روز جو بھی نیک عمل یا خیرات مرحومین کے نام پر کیا جائے اس کا انہیں ثواب ملتا ہے۔

اس نواح کے سادات عظام کے مخلصانہ عمل کا نتیجہ تھا کہ مغل حکمرانوں سے قبل ہی مراسم عزا نہ صرف مسلمانوں کی روایت بن چکے تھے بلکہ مسلمانوں کے ساتھ اس علاقے کے غیر مسلم بھی نہایت خلوص اور جوش وخروش سے تعزیہ داری کرتے رہے تھے۔ پست اقوام کے ہندو ہی نہیں جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے زیر اثر تھے بلکہ اونچی ذات کے ہندو اور بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور جنگجو راجپوت اور مرہٹے بھی عزاداری کرتے تھے۔ آگرہ، بیانہ اور بھرتپور کے قریب دھولپور، جیپور اور گوالیار کی ریاستوں اور ان کے شہروں اور قصبوں میں تعزیہ داری کی رسومات بڑے تزک واحتشام کے ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ عبداللطیف شوشتری جنہوں نے ۱۸۰۰ء میں تحفتہ العالم تصنیف کی رقم طراز ہیں کہ جے پور (بیانہ سے ملحقہ علاقہ) کے علاقوں میں جہاں نہ کوئی مسلمان ہے نہ اذان کی آواز آتی ہے، وہاں مالدار اور بااثر ہندوں نے بڑے خوبصورت خانے (امام باڑے) بنائے ہیں محرم کا چاند دیکھ کر وہ (اہل ہنود) غم کا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ مزے دار کھانوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور بہت سے فاقہ کرتے ہیں۔ روزانہ ہندی اور

فارسی میں مرثیہ خوانی کرتے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں معطر اور خوش
رنگ شربت پلاتے ہیں۔ لکڑی اور کاغذ کی ضریح اور تعزیئے بناتے ہیں ان
کے سامنے احتراماً بیٹھتے ہیں۔ دس محرم شام کے وقت انہیں دریا میں ٹھنڈا
کرتے ہیں یا ایک مخصوص مقام پر جسے کربلا کہتے ہیں دفن کردیتے ہیں۔

کنور پریم کشور فراقی نے یہ چشم دید شہادت دی ہے کہ سفر میں
بھی مراسم عزا بجالائے جاتے تھے۔ چنانچہ جب افراسیاب خاں کی درخواست پر
شاہ عالم آگرہ کو روانہ ہوئے تو ۲ محرم کو لشکر شاہی سیدپور (تعلقہ فتح پور
سیکری) میں مقیم ہوا۔ وہاں شاہی اور دکنی دونوں ہی فوجوں نے مل کر
"عزائے امامین" (امام حسنؑ وامام حسینؑ) کا انتظام کیا پھر ۲۰ محرم کو اسی
سفر میں شاہ عالم نے حکم دیا کہ "حضرات حسنینؑ اور شہدائے کربلا" کی
فاتحہ کے لئے کھانے پینے کی چیزیں پوری احتیاط سے تیار کریں۔

نواح آگرہ میں مرہٹوں کی تعزیہ داری سے دلچسپی کا اظہار۔

Letters from marratha camp 13y sir

Themas dure reters volume VIII

سے ہوتا ہے نیز قیام پاکستان سے قبل تک گوالیار اور لشکر کی
تعزیہ داری برصغیر میں مشہور تھی جس میں وہاں کے مہاراجہ ذاتی دلچسپی لیتے
رہے تھے۔ لاکھوں روپیہ خرچ کرتے تھے اور تعزیہ کے جلوس کے ساتھ ننگے
سر ننگے پیر رہتے تھے۔ سنا ہے کہ اب بھی گوالیار کی مہارانی تعزیہ داری
میں ذاتی دلچسپی لیتی ہیں اور ریاست ختم ہوجانے کے بعد اس روایت کو
برقرار رکھا ہوا ہے۔

درج بالا حقائق سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آگرہ اور اس کے
نواح میں تعزیہ داری بہت پہلے سے رائج ہوچکی تھی ۔ اس علاقے میں
شیعت کے اثرات کے شواہد بھی ابتداء سے پائے جاتے ہیں گو عام طور سے

عہد مغلیہ میں بھی تقیہ کا رواج تھا لیکن اس نواح کے سادات کے ایک بطل جلیل علامہ فتح اللہ شیرازی کا انداز بتاتا ہے کہ یہاں کے سادات کی یہ حوصلہ مندی تھی کہ کم از کم عہد مغلیہ میں انہوں نے تقیہ نہیں کیا۔ جیسا کہ ملابدایونی نے بھی تحریر کیا ہے۔

آگرہ اور اس کے نواح میں اہل سنت اور ہندوؤں نے بھی بڑھ چڑھ کر تعزیہ داری میں حصہ لیا مغلوں کے زوال اور جاٹوں کے عروج کے زمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور مورخ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی اپنی کتاب "مولوی احمد شاہ اور پہلی جنگ آزادی شائع کردہ دائرۃ المصنفین کراچی ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۳ اور ۱۴ پر آگرہ کی مذہبی حالت کے ضمن میں رقمطراز ہیں کہ۔

"حکمراں طبقہ کا اثر یہ تھا کہ مسلمان شعائر اسلامی سے دور ہٹ گئے تھے۔ نماز روزہ کی طرف سے تغافل برتا جاتا تھا۔ متولیان مساجد وجامع واکبری نے مسجد کی زریں دوکانیں ہندوؤں کے ہاتھ رہن رکھ دی تھیں۔ جامع مسجد کا مصرف یہ رہ گیا تھا کہ اس کے صحن میں کبوتروں کی قلقلیں کھڑی کی جاتی تھیں اور سوتی رسی بٹنے کے گھر گے لگے ہوئے تھے۔ بیچ کے درس چند چٹائیاں پڑی رہتی۔ گنتی کے لوگ نماز پڑھتے تھے جمعہ کی نماز میں بیس پچیس مسلمان شریک ہوتے تھے۔ امیرالامرا۔ ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے زمانہ میں البتہ تعزیہ داری کا رواج بڑھ گیا تھا۔ پھولوں کا تعزیہ رکھا جاتا تھا جس پر عرضیاں چڑھتیں، چڑھاوا صدہا روپیہ کا چڑھتا، تعزیہ کو شہر کا گشت کرایا جاتا۔ عمائدین شہر ہاتھ باندھ کر ساتھ ساتھ پیچھے تعزیہ کے چلتے اور کاندھا دیتے۔ دسویں کی صبح الوداع پڑھی جاتی۔ ہزارہا مسلمان عورت مرد جمع ہوتے۔ حتیٰ کہ مولانا غلام امام شہید الوداع پڑھتے تھے۔ بچوں کو تعزیہ پر رہن رکھا جاتا۔ ۵ محرم کو امام حسینؑ کے نام پر فقیر بنائے جاتے۔

نویں کی شب کو عورتیں اور مرد تعزیوں کی زیارت کے لئے شہر کا گشت لگاتے۔ بچے بوڑھے فقیر بنائے جاتے جو صبح کربلا سے مٹی لے کر آتے اور تعزیوں پر رکھ دیتے بلوچوں کا جلوس ساتویں کو نکلتا پچاس پچاس ڈھول آگے بجتے ہوئے ہوتے۔ علم ، ذوالفقار اٹھائے جاتے۔ اکھارے جس میں لتوار بنوٹ اور لکڑی کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ عام طور سے. مسلمان نئے نئے لباس عزاداری امام حسینؑ پہنتے۔ البتہ شیعہ مجالس کرتے اور اپنے عقائد کے لحاظ سے. عزاداری کے رسوم ادا کرتے ، سنیوں کی عزاداری کا یہ عالم تھا جو پیش کیا گیا۔ عشرہ محرم میں مسجدیں غیر آباد البتہ امام باڑے آباد نظر آتے تھے۔"

اس کے علاوہ معروف مورخ اور شاعر مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش اکبر آبادی اپنے درج ذیل مضمون " آگرہ کے محرم " شائع شدہ ماہنامہ دور جدید کراچی ۱۹۶۳ء میں رقم طراز ہیں کہ۔

آگرہ کے محرم

حضرت میکش اکبر آبادی نے لکھا

" ہماری طرف آگرہ ، جے پور اور گوالیار کے محرم مشہور تھے۔ گوالیار کے مہاراجہ مادھوراؤ سندھیہ تو خود تعزیہ داری کرتے ، اَقربری پہنتے ، مجلسیں کراتے اور دسویں کو ننگے پاؤں ننگے سر تعزیے کے ساتھ جاتے۔ وہاں کے محرم کا کہنا ہی کیا مگر آگرے والوں کو آگرے کے محرم سے زیادہ کہیں کا محرم نہ بھاتا۔ مشہور بات تھی کہ آگرے کے آدمی کہیں ہوں محرم پر آگرے آجاتے۔

محرم کے دنوں میں آگرہ بالکل بدل جاتا تھا۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں تعزیوں ، سبیلوں کی آرائش وزیبائش کا یہ عالم ہوتا کہ دیکھے

ہوئے گلی کوچے پہچانے نہ پڑتے۔ مسلمان اور بہت سے ہندو تعزیہ داری کرتے ۔ فقیری پہنتے اور فاتحہ درود کرتے تھے۔ ہندو عورتیں اپنے بچوں کو لے کر تعزیوں کے نیچے سے نکلتیں ، چڑھاوا چڑھاتیں ، عرضیاں باندھتیں اور ہاتھ جوڑے کھڑی رہتیں۔ قدم قدم پر سبیلیں لگی ہیں ، محلے محلے بازار بازار تعزیے رکھے جاتے۔ سینکڑوں آدمی سبز کپڑے پہنے ادھر سے ادھر گھومتے رہتے سال بھر جو لوگ کسرت نہ کرتے وہ بھی ایک مہینہ پہلے کسرت شروع کردیتے اور پھر اپنے ڈنڑ (بازو) خود دیکھتے اور دوسروں کو دکھاتے ۔ بانکے بنے سارے شہر کا گشت لگاتے پھرتے اور جب محرم ختم ہوجاتے تو سارے شہر پر ایک سناٹا چھا جاتا ، دل بجھ جاتے اور آنکھیں پر نم ہوجاتیں۔ ہندو دوکاندار ایک ایک سے پوچھتے رہتے محرم میں کتنے دن ہیں۔ جتنی بکری ان کی ان بارہ دنوں میں ہوتی سال بھر میں نہ ہوتی ۔ فقیروں کے گروہ کے گروہ اور غول کے غول حسینؑ کی خیرات لیتے ادھر سے ادھر گھومتے رہتے۔ سارا شہر یا حسینؑ یا حسینؑ اور نعرہ حیدری یا علیؑ اور ڈھول تاشوں کی آوازوں اور مرثیوں کی صداؤں سے گونجتا رہتا۔ پندرہ بیس دن چاند رات سے پہلے ایک فقیر سر پر سبز کسادہ کسے ، سبز کرتا پہنے ، ایک ہاتھ میں علم ایک میں مورچھل لئے گشت شروع کردیتا۔ اس کے ساتھ ایک تاشہ اور ایک ڈھول ہوتا۔ تھوڑی تھوڑی دور تک ڈھول تاشہ بند ہوجاتا اور وہ صدا لگاتا ماموں بھانجے کی کمائی پر ہندو مسلمان کی کمائی سے تعزیہ بنے گا اور ہندو مسلمان سب اسے پیسے دیتے ، عورتیں بچوں کے ہاتھ سے پیسہ دلواتیں اور وہ بچے کے سر پر مورچھل پھیر کر آگے بڑھ جاتا۔ سب جان لیتے محرم آگئے۔

چاند اگر انتیس کا ہوگیا تو مغرب کے بعد نہیں تو تیس تاریخ کو مغرب سے پہلے گھگا کے علم اٹھتے تھے۔ محرم کا چاند صرف تعزیہ دار ہی دیکھتے

کے لیے کوٹھوں پر چڑھتے تھے اور کوئی نہیں دیکھتا تھا۔

گھگا آگرہ گائیکی گھرانے کے نامی گویئے تھے اور نئی بستی میں میراثیوں کی گلی میں رہتے تھے۔ وہیں ان کے علم رکھے جاتے تھے۔ ان کے علموں کا جلوس نئی بستی سے کشمیری بازار، کناری بازار، سیو کے بازار ہوتا ہوا چوبیمار ٹولے کے راستے سے پھر نئی بستی پہنچ جاتا تھا۔ جلوس میں شیعہ سنی عوام وخواص سب ہی ہوتے تھے آگے تاشے ہوتے اس کے پیچھے مجمع ہوتا۔ علم ٹھہر جاتے تو تاشے بند ہوجاتے اور سوزخوانی شروع ہوجاتی ۔ آگرہ گھرانے کے نامی فن کار سب ہی سوزخوانی کرتے ۔ آفتاب موسیقی فیاض حسین خان ، استاد تصدق حسین خان ، استاد ولایت حسین خان ، استاد اسد علی خاں اور ان کا سارا خاندان ہی سوزخوانی کرتا جاتا۔ علم ان کے گھر کے ہی تو تھے۔ یہ علم اب گشت کو نہیں اٹھتے مگر اپنے مقام پر بدستور رکھے جاتے ہیں اور مجلسیں ہوتی ہیں۔ آفتاب موسیقی کے زمانے میں بڑے نامی گرامی لوگ انہیں سننے کے لئے اس مجلس میں آتے تھے۔ پہلی دوسری تاریخ میں بہت سے تعزیہ براقیں اٹھتی تھیں کسی زمانے میں تیسری تاریخ بالکل خالی تھی پر کنو نامی بھولڑے کے ایک شخص نے تیسری کو بھی ایک تعزیہ نکالنا شروع کردیا۔ یہ تعزیہ مسالے کا کہلاتا تھا۔ تمام قسم کے ناج اور مسالوں سے اس میں پھول بیل بنائے جاتے تھے چوتھی تاریخ کو کسیل کوے کا ہالوں کا تعزیہ اور ہالوں کی براق اٹھتی تھی اور بھی بہت سے تعزیہ اٹھتے تھے۔ مگر یہ تعزیہ اس لئے مشہور تھا کہ اس پر شروع سے آخر تک سبز گھاس بوئی جاتی تھی اور چوتھی تاریخ تک وہ گھاس چار چھ انگل بڑھ کر لہلہانے لگتی تھی ۔ اس طرح براق بھی تھی اور پھر بعد میں ایک سبیل بھی ایسی ہی گھاس کے اٹھنے لگی تھی ۔ سبیل ایک تو اسے کہتے ہیں جو کسی مقام پر تخت بچھا کر آرائش کرتے ہیں اور پانی یا شربت وہاں پلایا جاتا ہے

اور ایک سبیل تعزیہ کی قسم ہے۔ ان سبیلوں میں بڑی صنعت دکھائی جاتی تھی ۔ ابرک اور پنی سے چوکٹوں میں مختلف مقامات کے خوبصورت نقشے بنے ہوتے جو ڈوری کھینچنے سے ایک کے اندر ایک نکل کر بلند ہوجاتے تھے اور پھر انہی کو نیچا کردیا جاتا تھا۔ تعزیہ داری میں ان کے علاوہ علم شدے ، براق سبیل ، ذوالفقار ، تابوت اور ضریح رکھے جاتے تھے۔ ضریح شیعوں کے ساتھ مخصوص ہے سنیوں میں کم اور شیعوں میں مجلس کا رواج زیادہ تھا۔ شاہ گنج کی مجلسوں کے علاوہ شہر میں " شیخ بزرگ علی کے یہاں پانچویں کی مجلس اور گلاب خانہ کے امام باڑے کی آٹھویں کی مجلس مشہور تھی ۔ ان مجلسوں میں ہندو مسلم شیعہ سنی عمائدین شہر اور اہل علم سب ہی شریک ہوتے تھے۔ آٹھویں کی مجلس میں شیرمال تقسیم ہوتی تھی ۔ امام باڑے کی وسیع عمارت میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی اور جو لوگ دیر سے آتے انہیں اندر جانا مشکل ہوجاتا۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر مجلس ختم ہونے کے بعد بھی باہر آنا مشکل تھا۔ پانچویں کو پیک بنائے جاتے تھے۔ ایک خاص قسم کی مزدوری دی ہوئی سفید اور نیلی شیواجی قسم کی پگڑی سر پر رو پہلی بادے کی بدھی گلے میں ، کمر میں گھنٹیاں بنی ہوئی بیس بیس چالیس چالیس کے غول ادھر ادھر بھاگتے پھرتے۔ جدھر سے گزر جاتے کیسا ہی مجمع ہو کائی کی طرح چھٹ جاتا۔ نویں تاریخ کو یہ ساری رات تعزیوں پر شہیدی پڑھتے پھرتے ۔ ایک آدمی مصرع پڑھتا " آیا ہوں کربلا سے خبر لے حسینؑ کی " اور سب کہتے ہے ہے ۔ اس طرح طوری نظم ایک خاص لہجے میں پڑھی جاتی ہے۔

ہر تعزیے کے دوگشت ہوتے تھے ایک جس روز وہ رکھا جاتا تھا اور ایک نو تاریخ کو ۔ ان تعزیوں کی وجہ سے تعزیہ داروں کا نام زندہ تھا ورنہ بنلیئے شہیدی بنو کا نام کون جانتا مگر وہ تو مشال (مشعل) لئے اپنے

تعزیے کے ساتھ ہوتی تھیں اور کسی نہ کسی سے جھگڑا کر ڈالتیں ۔ اس وجہ سے لوگ انہیں شہدی بنو کہتے تھے اس طرح بی پیاری کا تعزیہ ، کالے چوہدی کا تعزیہ ، حکیم شفیع اللہ اور صفدر خاں کے تعزیے ، جوالا کے علم ، عیدا کی براق اور اس طرح کے بہت سے تعزیے تھے جو رکھنے والوں کے نام سے مشہور تھے۔ بہت سے محلو کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی وجہ سے ایسے ایسے محلوں کے نام سننے میں آجاتے تھے جنہیں عام طور سے لوگ نہیں جانتے اور بہت سے تعزیے اپنی صنعت کاری کی وجہ سے مشہور تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ آگرہ والوں نے اپنے فن اور صنعت کا کمال ان تعزیوں میں صرف کردیا تھا۔ ایسا حسین اور باریک کام اب شاید دیکھنے میں نہ آئے۔ عیدا کی براق پر سنا ہے چھ مہینے پہلے سے کام شروع ہوجاتا تھا۔ کوئی چیز شاید ہی ایسی باقی رہی ہو جس کا تعزیہ بن سکتا ہو اور لوگوں نے نہ بنایا ہو ۔ مثلاً روئی کا تعزیہ ، ابرک کا تعزیہ ، چوڑی کا تعزیہ ، کاٹ کا تعزیہ ، سرکی کا تعزیہ ، موم کا تعزیہ ، رانگ کا تعزیہ ، کاغذ کے پھولوں کا تعزیہ ، مٹی کا تعزیہ گھاس کا تعزیہ ، اناج کا تعزیہ ، مٹھائی کا تعزیہ ، قالین کا تعزیہ ، کپڑے کا تعزیہ یہاں تک کہ سونے چاندی کا تعزیہ بھی تھا یہ تعزیہ گشت نہیں کرتا تھا۔ ہر تعزیے میں صنعت کار اپنی صنعت اور فن کی ہر ممکن نمائش کرتا تھا۔ پھر گشت کے وقت گلی چھوڑا کے ان کی نمائش ہوتی ۔ تعزیوں کا تعزیوں سے اور براقوں کا براقوں سے مقابلہ ہوتا۔ اس طرح تاشے والے تاشے والوں سے مقابلہ کرتے۔ ان کا مقابلہ یہ تھا کہ دونوں گروہ آمنے سامنے ڈٹ جاتے باری باری تاشے نوازی کا کمال دکھاتے۔ اس طرح گھنٹے گزر جاتے۔ جو ہٹ جائے وہی ہار جائے۔ اس لئے لوگ درمیان میں پڑ کر صلح کرادیتے اور دونوں چوکیاں ایک ساتھ تاشے کی ایک مخصوص جگت تال بجاتی ہوئی اپنا اپنا راستہ لیتیں۔

آگرے میں چار تعزیے اپنی بلندی کے اعتبار سے مشہور تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ، قلعہ کا تعزیہ، بابو گنج کا تعزیہ اور صاحب علی کا تعزیہ۔ مٹھائی کا تعزیہ نوری دروازے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ مٹھائی بنانے والے اور بتاشے والے رکھتے تھے۔ قلعہ کا تعزیہ قلعے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ قلعے کے سپاہی رکھتے تھے۔ ایک تعزیہ میں کتنے ہی کھن ہوتے تھے جو علیحدہ علیحدہ بنائے جاتے اور پھر اوپر نیچے رکھ کر کس دیئے جاتے تھے۔ کھنوں میں چاروں طرف رسیاں باندھ دی جاتی تھیں۔ جنہیں لوگ چاروں طرف سے کھینچتے رہتے تھے تاکہ چلنے میں توازن قائم رہے اور تعزیہ کسی طرف جھوک نہ کھا جائے۔ قلعے کے تعزیہ کی برجی پر کاغذ کے مور ناچتے رہتے تھے اور بابو گنج کے تعزیے پر کاغذا کی پھرکنیا۔ مٹھائی کے تعزیے کی دو برجیاں ہوتیں جن کے کلس شکر سے بنائے جاتے تھے سارے تعزیے پر بتاشوں سے پھول بیل بنائے جاتے تھے۔ شہرے میں بتاشے اور دوسری مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ شہر میں اونچی سے انوچی عمارت سے یہ تعزیے اونچے ہوتے اور بازار کے قریب رہنے والوں کو اپنے صحن میں سے نظر آجاتے تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ بلا استاد رکھتے تھے۔ مذہب سے ہند اور پیشے کے اعتبار سے بتاشے والے تھے۔ تعزیہ کی محبت اور اعتقاد سے آخر عمر میں مسلمان ہوگئے تھے۔ وصیت کے مطابق کربلا میں جہاں ان کا تعزیہ دفن کیا جاتا تھا اسی کے برابر دفن ہوئے۔ ان کا تعزیہ آٹھویں کی رات کو اٹھتا تھا اور لے جا کر روات پاڑے میں سڑک پر رکھ دیا جاتا تھا پھر صبح سات بجے وہاں سے اٹھا کر دوسرے تعزیوں کے ساتھ گشت میں شریک ہوجاتا۔ ایک سال تعزیہ سڑک پر رکھا تھا کہ مہتروں نے جھاڑو دینا شروع کردی اور تعزیہ پر خاک پڑنے لگی۔ پاڑہ ہمیشہ سے خالص اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور تجارت پیشہ لوگوں کا محلہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے بھنگیوں کو روکا۔ بھنگی نہ مانے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ آخر خود استاد نے صلح

کرا کے معاملہ رفع دفع کیا۔ آگرے میں کالے محل کے قریب چوراہے پر
گجراوالوں کی حویلی ہے۔ یہ وہاں کے سب مکانوں سے بلند ہے اور مٹھائی
کا تعزیہ اس سے بھی بلند ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے حویلی کی بالائی
منزل پر کھنگر رکھوا کر اسے اور اونچا کردیا۔ مٹھائی کے تعزیے والوں کو خبر
ہوگئی انہوں نے راتوں رات ایک کھن بنا کر اور لگا دیا اور جب تعزیہ
حویلی کے مقابل پہونچا تو تعزیہ اونچا رہا۔

سات تاریخ کو آگرے کا مقبول ترین تعزیہ رکھا جاتا ہے یہ بچے
گلاب کے پھولوں سے بنتا ہے اور تعزیوں کی طرح اس کا بھی گشت موقوف
ہے۔ اس میں کئی من پھول صرف ہوتے ہیں اس کا تو کوئی حساب نہیں۔
جب یہ گشت کرتا تھا تو جن جن راستوں سے گزرتا تھا بلامبالغہ گلاب کی
کیچڑ ہوجاتی تھی۔ سات تاریخ کو جب یہ تعزیہ بازار میں آتا تو بازار دوسرے
تعزیوں سے بھرا ہوتا تھا مگر احتراماً تمام ڈھول تاشے بند ہوجاتے تھے۔ یہ
تعزیہ مرثیوں سے گشت کرتا تھا۔ یہ تعزیہ اب بھی رکھا جاتا ہے اور ہر
مذہب اور ہر فرقے کے زائرین اس کی زیارت کرتے ہیں۔

تعزیوں کے علاوہ محرم میں بڑی تعداد اکھاڑوں کی تھی جن میں فنون
سپہ گری کی نمائش ہوتی تھی۔ ان میں ایک مشہور اکھاڑہ ننھے استاد، منیر
خلیفہ کا تھا۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ان کے باپ بھیگن خان کہیں باہر سے
وارد ہوئے تھے۔ انہیں ایک ہٹ گئی کا داؤں ایسا رواں تھا کہ اچھے اچھے
استادوں کے گتے پتے رکھوائے تھے دونوں بھائی اکنگ، گتکا، ظفر پیکر، بانا
بنیٹی، بچھوا، پٹہ سب ہی کچھ جانتے تھے اور بقول خود بانک بنوٹ کے بھی
ماہر تھے۔ محرم کی آٹھ تاریخ کو ان کا اکھارہ کناری بازار میں چوراہے سے
ہٹ کر لگتا تھا۔ بلی کا ایک کنارا بازار کی ایک طرف کی کوک پر رکھ دیتے
ان میں رسوں کے چھوٹے بڑے کئی کئی جھولے پڑے ہوئے سب پر لاٹوں

لپٹی ہوتی ۔ بیچ بازار میں تخت بچھ جاتے۔ جوانوں اور لڑکوں کی ٹولیاں کسرتی ہررنگ لباس پہنے ہوئے ان جھولوں اور تختوں پر طرح طرح کی کسرتیں قلابازیاں اور جمناسٹک کے کرتب دکھاتے۔ اسی کے ساتھ لکڑی پٹے کے کمالات کی نمائش کرتے نیز خلیفہ شاگردوں کے ماتھے پر کوڑی رکھ کر تلوار سے کاٹ دیتے اور پیٹ پر پان رکھ کر ایسا پٹا لگاتے کہ پان برابر سے دو ٹکڑے ہوجاتے۔ کیا مجال جو ماتھے یا پیٹ پر ذرا بھی آنچ آجائے۔ ساتیوں کو بلوچپورے سے شدے اور تاج گنج سے ذوالفقار اور شدے آتے تھے۔ تاج گنج کی چھٹی کی مہندیاں مشہور تھیں۔ نویں کے دن شام تک سارے تاشے سے گشت کرنے والے تعزیے گشت ختم کردیتے اور دسویں شب میں جتنے تعزیے کہ مرثیے سے اٹھتے تھے وہ گشت کرتے۔ صبح ہر تعزیے پر شہیدی پڑھی جاتی ۔ پھولوں کے تعزیے کی شہیدی بڑی مشہور اور پراثر تھی جسے سننے کے لئے دور سے لوگ آتے تھے پھر دس تاریخ کو تمام تعزیے کربلا لے جائے جاتے اور دفن کر دیئے جاتے۔ سب سے آخر میں جوالا کے علم آتے اسے دیکھتے ہی لوگ سمجھ لیتے کہ اب شہر میں کوئی تعزیہ کربلا جانے کو باقی نہیں رہا۔ یہ علم بھی ایک ہندو کے تھے۔ محرم کے ڈھول تاشے باجے سب ایک ہی مخصوص لے تال سے بجائے جاتے اسے ماتم کہتے تھے۔ سن کر معلوم ہوجاتا تھا کہ یہ محرم کا ماتی باجا ہے۔ ۱۹۴۷ء آگرے میں محرم ختم ہوگئے اور باجے تاشے والے بھی اپنا فن بھول گئے۔ لپنے لپنے مقام پر تعزیے اب بھی رکھے جاتے ہیں مگر مشکل سے سو میں دس ۔ فاتحہ خیرات اور مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں مگر بہت کم ۔ دس تاریخ کو اب کئی سال سے دس بیس تعزیے کربلا جانے لگے ہیں مگر خاموشی کے ساتھ ۔"

علامہ نجم آفندی اکبرآبادی نے اپنی خود نوشت میں تحریر کیا کہ " یہ وہ زمانہ تھا جب آگرہ میں تعزیہ داری بڑے زور وشور سے ہوتی تھی ۔ شیعہ

سنی اور ہندو سب تعزیہ داری کا فریضہ ادا کرنے میں حصہ لیتے۔ اہلسنت کے اہتمام سے ایک پھولوں کا تعزیہ اتنا اونچا بنا کر گشت کرایا جاتا تھا کہ پردہ دار عورتیں اپنے مکانوں کے بالاخانوں سے زیارت کرلیتی تھیں اور ایک پھولوں کا چھوٹا تعزیہ جس کا گشت ، اور ۹ محرم کو ہوتا تھا اس میں صادق نامی ایک اہل سنت نوجوان اور اس کے ساتھی ۔ انیس اور جلیل کے سلام راستے بھر پڑھتے تھے اور بہت بڑا مجمع ساتھ دیتا تھا۔ صادق نے رعنا اکبر آبادی کے توسط سے سلام کہنے کی خواہش کی اس پر میں نے سلام کہہ کر دیا۔ جس کا مطلع تھا۔

خدا کے سب تھے بندے پر بہتر تھے خدا والے
وفا پر کربلا میں ہوگئے صدقے وفا والے

یہ سلام بے حد مقبول ہوا۔ (۴۹)

درج بالا حوالے اس علاقے کی تعزیہ داری کی روایات کے آئینہ دار ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا کی یاد بلا امتیاز مذہب وملت یہاں کی مذہبی اور تہذیبی روایت بن گئی تھی ۔

اس علاقے کے جاٹ ، گوجر ، راجپوت اور دیگر اقوام تعزیہ داری کی رسومات کا انتہا درجہ احترام کرتے تھے مثلاً متذکرہ قصبات میں جب تعزیہ اور علم کے جلوس گشت کرتے تو راستہ میں واقعہ دوکانوں سے بنئے اتر کر احتراماً کھڑے ہوجاتے سر راہ چارپائیاں الٹ دی جاتیں اور حقوں کی چلمیں اوندھی کردی جاتیں تاکہ کوئی تمباکو نوشی نہ کرے۔ شب عاشور کو اہل ہنود قتل کی رات کہتے تھے۔ اس رات میں ان کے یہاں راگ رنگ قطعاً بند کردیا جاتا تھا۔ اکثر ہندو گھرانوں میں عشرہ محرم کے دوران خوشی کی تقریبات مثلاً شادی بیاہ بھی نہیں ہوتی تھیں اور زیادہ تر ہندو تعزیوں پر نذرانہ چڑھاتے اور پرشاد (مٹھائیاں) تقسیم کرتے تھے برادران اہل سنت

چہلم تک ہر تقریب [illegible] سے کلیتاً اجتناب برتتے تھے۔ جلوس برآمد کرنے پر نہ کوئی اعتراض تھا نہ پابندی نہ اجازت ناموں کی ضرورت ۔ دیہی بستیوں کے ہندو مسلمان سب ہی تعزیہ داری کے انعقاد میں تعاون کرتے تھے۔ البتہ شہروں میں دو ایک کشیدگی کے واقعات رونما ہوئے جس کا سبب نہ معلوم ہوتا ہے کہ قصبات میں چونکہ سادات کی زمینداریاں تھیں اور تعزیہ داری بھی قدیم سے ہوتی چلی آرہی تھی لہذا روایتی اثرات اور تعلقات کی کارفرمائی تھی اور پھر دور دراز کے علاقے ہندوں کی سنگھٹن اور لکھنو کے شیعہ سنی تنازعات سے متاثر نہ ہوسکے تھے اور مولوی عبدالشکور فاروقی کے ناصبی اثرات وہاں تک نہیں پہنچے تھے۔

قصبہ بیانہ ریاست بھرتپور کی عزاداری

شیعوں کی عزاداری

۱۔ محلہ قاضی باڑہ کا امام باڑہ جو مسجد کے سامنے تھا وہاں ایام عزاء میں پہلی مجلس صبح ۸ بجے ، دوسری مجلس ایک بجے دوپہر، تیسری مجلس چار بجے شام اور چوتھی مجلس دس بجے شب منعقد ہوتی تھی ۔ ایک مجلس حاجی مبارک علی صاحب کے دولتکدہ پر منعقد ہوتی تھی ان کے بعد یاور حسین صاحب اس فریضہ کو انجام دیتے رہے یہ امام باڑہ موصوف کے نام سے مشہور ہوگیا۔ بیانہ میں ایک زنانی مسجد اور امام بارہ بھی تھا۔ جہاں مومنات نماز ادا کرتی تھیں اور ایام عزاء میں زنانی مجلس برپا ہوتی تھی ۔ یہاں ایک قدیم عمارت تھی جو محمد حسین (جھنڈو) کے محل کے نام سے مشہور تھی یہاں بھی محرم میں تعزیہ بنتا تھا اور نوجوان روزانہ ماتم برپا کرتے تھے۔ قاضی پاڑہ کی عزاداری پاکستان میں سید مجتبیٰ حسین لکھا ہے

جمیلہ خاتون زوجہ پروفیسر طاہر حسین کے مکان واقعہ رضویہ سوسائٹی میں ہوتی ہے۔

جلوس

بیانہ میں پہلا جلوس گہوارہ حضرت علی اصغر چھ محرم کو امام باڑے سے برآمد ہوتا اور محلہ میں گشت کناں ہو کر امام باڑہ ہی پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔

دوسرا جلوس ذوالجناح ۹ محرم کو حویلی قاضیاں سے برآمد ہوتا اور قصبہ کی شاہراہوں سے گزر کر قصائی پاڑہ تک جاتا جہاں شیخ صاحبان بڑے پیمانے پر شربت پلانے کا اہتمام کرتے۔ ذوالجناح کا گھوڑا جو مہاراجہ بھرتپور نے نذر کیا تھا۔ تمام سال سرکاری اصطبل میں رہتا۔ اب یہ جلوس کرنل سید مجتبیٰ حسین کے دولتکدہ واقعہ کیولری گراؤنڈ لاہور سے برآمد ہوتا ہے۔

حضرات اہل سنت کی تعزیہ داری

ریلوے اسٹین کے نزد ۷ محرم کو علم نصب ہوتا اور مجالس عزاء منعقد ہوتی تھیں امام باڑہ ماسٹر سجاد حسین اس امام باڑہ کی باقاعدہ ایک علیحدہ عمارت تھی جو مفتی پاڑہ میں واقع تھی جہاں یکم محرم سے علم اور شدے نصب ہوتے تھے۔ اور روزانہ مجلس عزاء منعقد ہوتی تھی جس کے بعد نوحہ خوانی اور ماتم بھی ہوتا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں مفتی پاڑہ سے متصل ایک عریض وطویل عمارت تھی جس میں پختہ قبریں تھیں جو تکیہ کے نام سے موسوم تھی یہاں بھی سامان عزاء سجایا جاتا اور اہل محلہ مفتیان کے اہتمام سے مجالس عزاء منعقد ہوتی تھیں۔

حضرات اہل سنت ۷ محرم کو ایک جلوس اسٹیشن سے برآمد کرتے تھے۔

ماسٹر سجاد حسین کے امام باڑہ تکیہ اور جھنڈے صاحب کے محل پر قیام کرتا ہوا جب قاضی باڑہ آتا تو اس کا اہل محلہ استقبال کرتے یہ جلوس یاور حسین صاحب کے امام باڑہ سے گزر کر واپس اسٹیشن پر اختتام پذیر ہوتا۔

شہر بھرتپور

اس شہر میں ایک مسجد اور پانچ امام باڑے تھے۔

۱۔ مسجد وامام باڑہ کی پاٹ ۲۔ امام باڑہ سید اکرام حسین وسید شمشاد حسین بدھ کی پاٹ ۳۔ امام باڑہ سید صاحب کا گھر یہ امام باڑہ حیدر حسین محلہ توپ ۵۔ امام بارہ سید حیدر رضا جعفری بمقام سرڑھ کا مڑھ

مجالس عزاء

درج بالا امام باڑوں کے علاوہ (۱) وکیل سید اظہر حسین زیدی کے مکان واقع عقب جامع مسجد (۲) سید شمس الحسن صاحب کے مکان (۳) حاجی سید محمد عقیل صاحب کے مکان نزدیک ویدک اسپتال (۴) سید آل حسن رضوی (میجر سید محمود الحسن رضوی کے والد) کے مکان نزد لچھمن مندر (۵) ٹھیکیدار سید طاہر حسین جعفری صاحب کے مکان بمقام کرانی صاحب کے گھر میں روزانہ مجالس عزاء منعقد ہوتیں۔ عشرہ محرم میں مندرجہ بالا مقامات پر روزانہ مجالس عزاء کے علاوہ مکان سید علی شان صاحب، کوٹھی جج صاحب سید سجاد حسین رضوی محلہ توپ، کوٹھی سید حیدر رضا جعفری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس محلہ شترخانہ اور منشی سید باقر حسین صاحب زیدی کے مکان واقع توپ اور سید جعفر حسین تحصیلدار کے مکان واقع محلہ موری چوبرجی پر سالانہ مجالس عزاء منعقد ہوتیں۔

ان مجالس میں جناب سید ظہیر الحسن رضوی تحصیلدار، جناب سید بشیر حسین صاحب، جناب سید صغیر حسین صاحب رضوی، جناب سید ابوالحسن صاحب جعفری، جناب سید علی جواد صاحب جعفری اور جناب علی مظہر صاحب جعفری سوزخوانی کرتے اور ذاکری سید ظہیر الحسن صاحب رضوی، جناب منشی سید باقر حسین زیدی، جناب مولانا مرزا غضنفر حسین صاحب عرف مولانا ٹگن اور مرزا ابرار حسین صاحب ذاکری فرماتے۔ تحت اللفظ مرثیہ جناب سید اصغر حسین رضوی تحصیلدار، جناب پیشکار سید ابرار صاحب اور مقصود الحسن صاحب پیش کرتے۔

میجر حسن ۸ محرم اور یوم عاشورہ بڑے پیمانے پر نذر کا اہتمام کرتے اور چہلم کے دن حاجی وزائر سید محمد عقیل صاحب جعفری کے ہاں نذر کا اہتمام ہوتا۔

جلوس عزاء

مرکزی جلوس علم وتعزیہ بروز عاشور امام باڑہ سید اکرام حسین و سید شمشاد حسین بدھ کی ہاٹ سے برآمد ہوتا تھا۔ اس جلوس میں ایک علم کا جلوس جناب سید حیدر رضا صاحب کی کوٹھی سے برآمد ہو کر شریک ہوتا۔ اسی طرح جناب اکرام حسین صاحب کے امام باڑہ کا جلوس بھی شریک ہوتا اور یہ جلوس چوبرجی، گنگا مندر، جامع مسجد، لچھمن جی کے مندر، کوتوالی، کمہیر دروازہ ہو کر تقریباً چار میل کی مسافت طے کر کے اکھڈ پر ختم ہوتا تھا جہاں کربلا واقع تھی اور تعزیہ دفن ہوتے تھے۔ دوسرا جلوس ۱۲ محرم سوئم کے دن ندیا کے امام باڑہ سے برآمد ہو کر اسی طرح اختتام پذیر ہوتا تھا اور اسی طرح چہلم کے دن بھی ایک جلوس برامد ہو کر کربلا اکھڈ پر اختتام پذیر

ہوتا۔ ان جلوسوں میں نوحہ خوانی اور سینہ زنی ہوتی تھی ۔ زیادہ تر تبلیغی نوحے پڑھے جاتے تھے۔ خاص طور سے حضرت نجم آفندی کے نوحے پڑھے جاتے۔

عشرہ ثانی

وکیل سید آل حسن رضوی کے مکان نزد لچھمن جی کے مندر پر میجر سید محمود الحسن رضوی بڑے پیمانے پر عشرہ ثانی کا اہتمام کرتے جس میں ہر سال برصغیر کے نمایاں علماء اور ذاکرین خطاب کے لئے مدعو کئے جاتے جو اپنے اپنے مخصوص انداز میں ذکر فضائل ومصائب اہل بیتؑ بیان کرتے۔ عشرہ ثانی کی ان مجالس میں مقامی شیعوں کے علاوہ حضرات اہلسنت اور کچھ ہندو بھی شریک ہوتے تھے اور اس طرح یہ ایک طرح سے تبلیغی اجتماعات تھے۔ بھرتپور میں میجر سید محمود الحسن رضوی نے ۱۳ سو سالہ یادگار حسینی کے جلسوں کا انعقاد میں بھی بڑی اولیٰ العزمی کا مظاہرہ کیا جن میں ہر مسلک اور ملت کے افراد نے شرکت فرمائی اور شیعہ وسنی علماء کے علاوہ عیسائی اور ہندوؤں نے بھی تقاریر کیں۔

بھرتپور کی عزاداری کے ضمن میں علم مبارک حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کے معجزہ کا اجمالی تذکرہ :۔

۱۹۲۷ء میں ریاست بھرتپور میں برسات کے پورے موسم میں بارش کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ باشندگان ریاست قحط کے خطرہ سے سخت پریشان تھے ریاست کے اخراجات پر "ہون" کیا لیکن بارش تو درکنار کہیں بادل بھی نظر نہ آئے۔ ہندوؤں کے مذہب کی ایک مخصوص عبادت اور رت جگا "اکھنڈ کرتن" بھی مسلسل تین شب وروز جاری رہا۔ راجہ اندر کو جو اہل

ہنود کے عقیدہ کے مطابق بارش کا دیوتا ہے بید مارے گئے لیکن تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ برادران اہلسنت نے نماز جمعہ کے بعد دعائیں مانگی اور عید گاہ میں نماز استسقا بھی ادا کی گئی لیکن بارگاہ رب العزت تک رسائی نہ ہوئی ۔

۲۹ ، اگست ۱۹۲۷ء بروز اتوار جب کہ اس دن پنڈتوں کی پیش گوئی تھی کہ بارش کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔ موسم انتہائے گرم تھا چلچلاتی دھوپ اور جھلسا دینے والی لو میں شیعان حیدر کرار نے جلوس علم مبارک برآمد کیا جو ایام عزا۔ کے راستوں سے گزرتے ہوئے نوحہ خوانی اور ماتم کرتے ہوئے کربلا کی جانب روانہ ہوا۔ جب یہ جلوس شہر پناہ کے حدود سے باہر نکلا تو باد مخالف چل رہی تھی لیکن جلوس اس سے بالکل بے نیاز کربلا کی سمت بڑھتا رہا اور چھ بجے شام کو کربلا پہنچا۔ جونہی جلوس کربلا پہنچا ہوا رک گئی ۔ ماتمی اس مقام پر جہاں تعزیہ دفن ہوتے ہیں آدھ گھنٹہ تک ماتم کرتے رہے اور اعلان کردیا کہ جب تک بارش نہیں ہوگی ماتم ختم نہیں ہوگا۔ بزرگ دعاؤں میں مشغول تھے کہ یکایک شہر کے شمال میں بھورے رنگ کی گھٹا نظر آئی اور چشم زدن میں حد نظر تک آسمان پر محیط ہو گئی اور موسلادھار بارش شروع ہوئی ۔ یہ نظارہ قابل دید تھا، جتنی شدت سے بارش ہو رہی تھی اسی شدت سے ماتم برپا تھا۔ آب رواں اس قدر سرد تھا کہ اکثر بچے اور بزرگ اس کی تاب نہ لاسکے۔ ان کی کپکپی بندھ گئی ۔ چہار طرف پانی ہی پانی تھا۔ ہولڈا الفنٹری کے افسران جو قریب ہی کوٹھی موتی جھیل میں مقیم تھے متاثرین میں کمبل تقسیم کئے اور تاپنے کے لئے آگ فراہم کی ۔ فوجی افسران جور جوان یہ کہتے سنے گئے کہ شیعوں کے دیوتاؤں کا آکاش پر قبضہ ہے اور کائنات ان کے کے تصرف میں ہے اس لئے کہ انھوں نے اپنی زندگیاں پالنہار کی راہ میں قربان کردیں۔

بارش ختم ہونے کے بعد جب شرکاء جلوس کربلا سے واپس ہوئے تو اس وقت شہر کی سڑکوں پر پانی بہہ رہا تھا۔ دوکانداروں نے بلاتفریق مذہب وملت شیعوں کو دیکھ کر اور دوکانوں سے اتر کر ان کا استقبال کیا اور کہتے سنے گئے " یہ کربلا کے سپاہیوں سے پانی مانگنے گئے تھے۔ جنہوں نے بھی ایسا موسلا دھار (بے پناہ) پانی برسایا کہ مجا (مزا) آگیا۔

اس سال اس علاقے میں صرف یہی بارش ہوئی جو کافی ثابت ہوئی ریاست قحط سے بچ گئی ۔ یہاں کی آبادی ، صدر ریاست مسٹر ہین کاک ، والئ ریاست مہاراجہ اندر سنگھ اور اعلیٰ حکام بہت متاثر ہوئے اور علم حضرت عباسؑ کی برکت سے شیعوں کے ممنون ہوئے۔

دوسرے دن کربلا میں مجلس عزاء برپا کی گئی ۔ اس مجلس میں جناب سید فرزند حسن زیدی فیض بھرتپوری نے چند قطعات پڑھے ایک قطعہ درج ذیل ہے۔

جنگ کو فتح کیا شاہؑ نے بے سر ہو کر
قطرہ پانی نہ پیا ۔ مالک کوثر ہو کر
فیض بارش کے لئے شیعوں نے ماتم جو کیا
ابر بھی رویا شریک غم سرور ہو کر

شہر دھولپور

مجالس

دھولپور شہر میں درج ذیل مقامات پر روزانہ مجالس عزاء منعقد ہوتی تھیں۔ (۱) امام باڑہ محلہ گوت ۔ کمیدان کا باڑہ (۲) کچہری کپتان مجھوجان (۳) مکان اللہ رکھے صاحب نواب صاحب کا باڑہ (۴) نواب بستی سردار رستم

علی خاں کے مکان، باڑہ رجنین صاحب (۶) حویلی سردار محسن حسین صاحب (۷) مکان ملا سید آل علی صاحب (۸) ترپا نزد مکان ظہور الحسن صاحب باڑہ اجنین صاحب (۹) مکان صوبے دار مہدی حسن صاحب تیلی پاڑہ (۱۰) مکان سید غلام سبطین گھیا پارہ اور (۱۱) مکان سید محسن حسین صاحب۔

جلوس

(۱) محرم کو جلوس ترپا سے برآمد ہوتا تھا اور محلہ گوت کے امام باڑے کا جلوس اس میں شریک ہو کر کندان صاحب کے امام باڑے میں گشت کرکے واپس اتا۔ اس جلوس میں علم، تابوت اور ذوالجناح کی شبیہ ہوتی تھیں۔ (۲) ۸ محرم کو جلوس علم کچہری کپتاں منجھو جان سے برآمد ہو کر اجنین صاحب کے باڑے گوت کے امام باڑہ چھوٹے بازار کا گشت کرکے واپس کچہری پر ختم ہوتا تھا۔ (۳) ۱۰ محرم کو جلوس کچہری منجھو جان سے برآمد ہوتا تھا۔ اس جلوس میں شبیہ علم، تابوت وذوالجناح کی زیارتیں شریک ہوتیں۔ یہ اس شہر کا مرکزی جلوس تھا جس میں دیگر عزاخانوں کے جلوس شامل ہوتے۔ یہ جلوس براستہ بزریہ، بڑا بازار، تلیا، چاند ماری میدان، گھنٹہ گھر کے قریب سے ہوتا ہوا کربلا میں اختتام پذیر ہوتا تھا۔ تمام راستہ نوحہ خوانی اور ماتم ہوتا اور کربلا کے قریب دشمنان اہلبیتؑ سے اظہار برأت کیا جاتا۔ (۴) ۲۰ صفر بروز چہلم کچہری منجھو جاں سے ایک جلوس برآمد ہوتا اور عاشور کے جلوس کی طرح انہیں راستوں سے گزر کر کربلا میں اختتام پذیر ہوتا۔ (۵) ۲۱ رمضان یوم شہادت حضرت علی علیہ السلام میں مجلس عزاء منعقد ہوتی بعدہ جلوس شبیہ تابوت برآمد ہو کر شہر کی شاہراہوں پر گشت کرتا ہوا کربلا میں اختتام پذیر ہوتا۔

شبیہ ذوالجناح کے لئے گھوڑا ریاست کی طرف سے نذر کیا جاتا تھا جو

تمام سال بقر سواری عمدان صاحب کے بارے کے اصطبل میں رہتا تھا۔

یہاں مجالس میں سوزخوانی جناب سید آل علی، جناب سید ابن علی، نواب رستم علی خاں (جوش ملیح آبادی کے ماموں اور معروف شاعر) جناب سید مہدی حسن، جناب سید الیاس حسین، ذاکری کے فرائض جناب ابن علی اور جناب ابرار حسین انجام دیتے اور تحت اللفظ مرثیہ جناب رستم علی خاں پڑھتے تھے۔ اس شہر میں دو ماتمی انجمنیں تھیں ایک ناصریہ اور دوسری عباسیہ۔

باڑی

اس قصبہ میں دس پندرہ گھرانے سادات و مومنین کے آباد تھے جو سب عزادار تھے اور زنانی اور مردانی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ سید سجاد حسین صاحب کے مکان واقع سید باڑے سے جلوس عزاء برآمد ہوتا تھا۔

پہرسر

سید منظور احمد جعفری ابن وکیل سید محمد جعفری کی تالیف گلدستہ سادات کے مطابق ۱۹۴۷ء سے قبل پہرسر میں مجالس حسب ذیل نظام الاوقات کے مطابق برپا ہوتیں۔

	مقام مجلس	محلہ	وقت	مہتمم
۱	امام باڑا خام یاپھوگا امام باڑا	ڈیرپٹی	بعد نماز فجر	وکیل سید ابرار حسین جعفری
۲	مکان سید افضل حسین رضوی	علائی پاڑا	قبل دوپہر	سید افضل حسین رضوی
۳	کرہ سید محمد حسین جعفری عرف منجھوجی	علائی پاڑا	قبل دوپہر	افراد خاندان
۴	مکان حاجی سید جعفر حسین جعفری	جلال پاڑا	قبل دوپہر	افراد خاندان
۵	مکان سید باقر حسین جعفری	ڈیرپٹی	قبل دوپہر	افراد خاندان
۶	امام باڑا	ڈیرپٹی	قبل دوپہر	افراد خاندان سید مومن علی بدھا
۷	مکان سید عزیز الحسن جعفری کوتوال	ڈیرپٹی	قبل دوپہر	افراد خاندان
۸	مکان ولی محمد	ڈیرپٹی	بعد دوپہر	واحد حسین بلق
۹	مزار پنج جی	ڈیرپٹی	بعد دوپہر	افراد محلہ ڈیرپٹی
۱۰	امام بارا	علائی پاڑا	بعد دوپہر	انجمن خاکسار

١١	مکان خانبہادر سید اولاد حسین رضوی	علائیا پاڑا	بعد دوپہر	افراد خاندان
١٢	مکان سید آل رسول جعفری	ڈیرپٹی	بعد دوپہر	افراد خاندان
١٣	امام باڑا	ڈیرپٹی	بعد دوپہر	سید آل محمد جعفری
١٤	سید نادر حسین جعفری	جلال پاڑا	بعد دوپہر	افراد خاندان
١٥	امام باڑا خاص	علائی پاڑا	بوقت شب	افراد خاندان راقم الحروف
١٦	بڑا امام باڑا	جلالی پاڑا	بوقت شب	افراد خاندان
١٧	مسجد بانس والی		بوقت شب	افراد خاندان

درج بالا عشرہ کی مجالس کے علاوہ متعدد زنانی مجالس منعقد ہوتیں۔ یہاں سے متعلق سادات جو بسلسلۂ ملازمت وکاروبار دوسرے شہروں میں مقیم ہوتے اپنے وطن واپس آجاتے اور مجالس منعقد کرتے تاہم ٦ محرم کو عزاخانہ ڈیڑھ پٹی ٨ محرم کو محلہ علائی پاڑے اور حویلی خان بہادر سید اولاد حسین رضوی میں مجالس بہت بڑے پیمانے پر منعقد ہوتیں جس میں شیرنی بندیاں مٹی کی تشتریوں میں تقریباً ڈیڑھ پاؤ وزن تقسیم کی جاتیں۔ ڈیڑھ پٹی کی مخصوص مجلس میں سید شبر حسین صاحب جعفری تسیم بھرتپوری اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھتے جن کی وفات کے بعد آپ کے شاگرد رشید جناب سید حمید الحسن صاحب جعفری قتیل پہرسری اپنا نوتصنیف مرثیہ پڑھتے۔ ان کے انتقال کے بعد جناب سید ظفر حسین صاحب جعفری عرف کالے اور ان کے بعد جناب سید محسن علی صاحب جعفری مرثیہ پڑھتے رہے۔ محلہ علائی پاڑہ کی مخصوص مجلس میں جناب سید فضل رسول صاحب رضوی

اپنا نوتصنیف مرثیہ پڑھتے اور آپ کے انتقال کے بعد آپ کے بھائی جناب سید افضل حسن صاحب رضوی افضل پھپھری اپنا نوتصنیف یا اپنے بھائی کا کلام اپنے مخصوص انداز خواندگی میں پیش کرتے۔

جلوس عزاء

۷ محرم اور یوم عاشور جلوس عزاء برآمد ہوتے جن میں شبیہ ذوالجناح تابوت ، علم گہوارہ حضرت علی اصغر برآمد ہوتا۔ ذوالجناح کے روبرو باری باری سوز خوانی ، مرثیہ خوانی کے گروہ مرثیہ خوانی کرتے خاص طور سے یہ مرثیے ضرور پڑھے جاتے "آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے" اور "خاموش کربلا میں جو قندیل دیں ہوئی" ۔ ۷ اور ۸ تاریخ کو مہندیاں اور علم نذر ہوتے۔ جلوس کے راستوں میں سبیلیں لگائی جاتی جس میں سادہ اور دودھ کا خوشرنگ شربت پلایا جاتا۔ گردو نواح کے حضرات اہلسنت اور ہندو بھی زیارت سے مشرف ہوتے۔ منتیں اور مرادیں مانگتے۔ چادریں اور چڑھاوا چڑھاتے۔ شب عاشور امام باڑوں میں روشنی کا خاص اہتمام ہوتا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے تمام راستوں میں بھی بانس گاڑھ کر گیس کے ہنڈے لٹکائے جاتے۔ مستورات اور مرد علیحدہ علیحدہ زیارت کے لئے ہر امام باڑے میں جاتے اور عام طور سے یہ نوحہ "ختم محرم ہوا شاہ سلام ، علیک" پڑھا

جاتا۔ صبح عاشور درج بالا شبیہوں کا جلوس قریب ہی واقع کربلا روانہ ہوتا۔ اس جلوس میں علم بڑی تعداد میں ہوتے جن میں اکثر کی لمبائی ۴۰ فٹ تک ہوتی ۔ تمام راستہ ماتم ہوتا اور دشمنان اہلبیتؑ سے اظہار بیزاری ۔ کربلا پہنچ کر سامان زینت شبیہوں پر سے اتارا جاتا اور تعزیہ دفن کئے جاتے اس وقت گہوارہ حضرت علی اصغرؑ پر جناب سید سلطان عباس جعفری مرحوم نوحہ خواں انجمن پنجتنی شاہ گنج آگرہ لوری کا یہ نوحہ " جھولا جھلانا اسے اے زمین کربلا ، لوری دلانا اسے اے زمین کربلا " پڑھتے۔ موصوف نے گولیمار (گلبہار میں امام بارہ قائم کیا۔ اور سید خضر حسین جعفری نے لیاقت آباد (لالو کھیت) چار نمبر میں اپنے مکان میں بڑے امام باڑہ پہرسر کی یادگار قائم کی ایام عزاء کے انتظامات کے سلسلہ میں انجمن خاکسار فعال تھی جس کے کارکنان میں سید حسین رضا صاحب ، سید ابوجعفر صاحب ، سید نصیب احمد صاحب ، سید محسن رضا صاحب عرف جمعہ ، سید زاہد حسین صاحب ، سید عابد حسین صاحب ، سید حسن احمد صاحب ، سید نقی احمد صاحب ، سید نقی رضا صاحب ، سید نثار عباس صاحب ، سید رضا حسین صاحب ، سید منظور حسین صاحب ، سید سلطان عباس اور سید منظور احمد صاحب مولف گلدستہ سادات نمایاں تھے۔

اہالیان پہرسر ۱۳۶۱ ہجری کے محرم کے لئے " استدعائے ضروری محتاج کرم " زیر عنوان بیرون پہرسر رہنے والے ابنائے وطن سے درخواست کی کہ " امسال " محرم اپنے آبائی وطن میں آکر کریں درج ذیل اپیل آغا محسن جعفری صاحب نے رفاہ عام پریس آگرہ سے چھپوا کر جاری کی جس کے لئے ایک ایک لفظ سے پہرسر کی عظمت رفتہ اور اس علاقے کی روایتی عزاداری کی عکاسی ہوتی ہے۔

فتح پور سیکری

اس قصبہ سے متعلق سادات کے تمام تر خاندان شاہ گنج اور دیگر مقامات میں آباد ہوچکے تھے لہٰذا عشرہ محرم کے بعد قدیم امام باڑے میں سید منظور الحسن رضوی (شہید) ایک خمسۂ مجالس کا اہتمام کرتے جس میں شاہ گنج کے مولانا ارشاد حسین صاحب رضوی مبلغ مجالس سے خطاب کرتے۔ ان مجالس میں کثرت سے اہل سنت حضرات شرکت کرتے اور مشہور قسم کی نان ختائیاں تقسیم ہوتیں۔ اس قصبہ سے متعلق سید آل حسن مرحوم نگر (فتحپور سیکری) میں آباد ہوگئے تھے۔ عشرہ وہاں منعقد کرتے پاکستان میں ان کے صاحبزادہ سید علی شان شروع میں لیاقت آباد (لالوکھیت) نمبر ۲ میں اپنے مکان میں عزاداری کرتے رہے اور ۱۹۸۳ء کی بربادی کے بعد وہ اور ان کے بھتیجے سید محمد عباس رضوی نائب صدر مرکزی تنظیم عزاء کراچی ۱۱ ڈی نیو کراچی میں عشرہ منعقد کرتے ہیں۔ ۸ محرم کو درگاہ شیخ سلیم چشتی کے متولی سید شیخ عزیزالدین بڈھن صاحب بڑے پیمانے پر مجلس عزاء کا اہتمام کرتے تھے جس میں سید منظور الحسن رضوی (شہید) تحت اللفظ خوانی کے لئے شاہ گنج آگرہ سے تشریف لے جاتے اس مجلس کے بعد تانبے کی تشتریوں میں خرمے تقسیم کئے جاتے۔ اس قصبہ کے اہل سنت حضرات بھی تعزیہ داری میں بڑے انہماک کا مظاہرہ کرتے۔ اکھارے، ڈھول اور تاشوں کے ساتھ تعزیوں کے سامنے مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی خاص طور پر صبح عاشور کربلا جاتے ہوئے دس پندرہ مرثیہ خواں ایک ساتھ بڑی پاٹ دار آواز میں یہ مرثیہ پڑھتے۔ آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے۔

رادھا

اس قصبہ کے اکثر و بیشتر سادات بھرتپور آگرہ اول (متھرا) اور دیگر مقامات پر منتقل ہوگئے تھے۔ سادات کے صرف دو گھرانے باقی تھے۔ سید اصغر حسین رضوی اپنے مکان میں عزاداری کرتے اور عشرہ مجالس منعقد کرتے۔ مسجد سے ملحق قدیم امام باڑے میں مشترکہ مجلس شیخ زادگان منعقد کراتے اور قیام پاکستان کے بعد سید اصغر حسین صاحب مرحوم نے چارسو کوارٹر گولیمار (گلبہار) میں عزاداری شروع کی جو اب امام باڑہ مارٹن کے قریب ان کے صاحب زادے سید سجاد حسین رضوی بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔ شیخ زادگان خاص طور سے اظہر الدین، علیم الدین، اعجاز حسین، شاکر حسین اور عابد حسین نے لیاقت آباد نمبر ۸ میں یہاں کے قدیم امام باڑے کی مجلس کا احیاء کیا۔ لیکن ناصبیت کی وجہ سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور اب ان کے اخلاف کراچی کے مختلف محلوں میں آباد ہوگئے ہیں۔ اس قصبہ میں چاند رات بالائے کوٹ مسجد وامام باڑہ کے باہر صحن میں جملہ مسلمان جمع ہو کر بلاامتیاز شیعہ سنی ماتم برپا کرتے اور سامان عزا سجاتے اور فقیر تاشے بجا کر ایک طرح سے اعلان کرتے کہ محرم شروع ہوگیا۔ ۶ محرم کو علموں کا ایک جلوس قصبہ میں گشت کناں ہو کر قریب ۴ میل کے فاصلہ پر واقع قصبہ اول جاتا وہاں گشت کرتا اور امام باڑوں اور عزاداروں کے مکانات کے سامنے قیام کرتے ہوئے مرثیہ خوانی ہوتی۔ ۷ محرم کو اول کے حضرات علموں کا جلوس لے کر رادھ آتے اور اسی طرح مرثیہ خوانی ہوتی دونوں قصبوں میں ان تاریخوں میں نذر کا اہتمام ہوتا جس میں کافی تعداد میں مسلمان شریک ہوتے اور ہندو بھی علموں پر منتیں ماننے۔ شیرنی تقسیم کرتے۔ رادھ کے اس قدیم جلوس کی یاد کو سید اصغر حسین صاحب مرحوم نے اس طرح برقرار رکھا کہ وہ ۷ محرم گولیمار (گلبہار

کے روایتی جلوس شبیہ ذوالجناح ، تابوت وعلم وگہوارہ علی اصغر علیہ السلام میں اپنے امام باڑے سے علم کے ساتھ شریک ہوتے رہے اور اب ان کے صاحبزادے سید سجاد حسین اپنا روایتی علم سجا کر ، اور دس محرم کو شریک ہوتے ہیں۔

اول

ضلع متھرا کے قصبہ اول میں سادات کا علیحدہ محلہ تھا جو جانب مغرب میں واقع تھا روزانہ صبح سے شام تک ۵ مردانی اور کچھ زنانی مجالس منعقد ہوتیں جن میں سوزخوانی اور تحت اللفظ مرثیہ خوانی ہوتی سب سے بڑی مجلس سید حیدر حسین نقوی کے مکان کے امام باڑہ میں ہوتی تھی اور انہیں کے احاطہ میں جلوس ذوالجناح برآمد ہوتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس عزاداری کا اہتمام حیدر آباد میں ہوتا رہا۔

سید پورہ محل

اس قصبہ میں روزانہ مردانی چھ مجالس عزاء کے علاوہ زنانی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں یوم عاشور جلوس کربلا جاتا جہاں تعزیے دفن ہوتے۔ یہاں بھی سوزخوانی اور تحت اللفظ خوانی ہوتی ۔یہاں کی مرثیہ خوانی کے لئے سید محمد تقی زیدی کا نام معروف ہے۔ موصوف ڈرگ روڈ (شاہ فیصل میں آباد عزائے سید الشہداء میں منہمک رہتے ہیں۔

مہابن

یہاں کے سادات بھی زیادہ تر متھرا ، آگرہ اور دیگر مقامات پر آباد ہوگئے تھے۔ تاہم بالائے کوٹ خاں بہادر چودھری سید نظیر الحسن رضوی کے

دوفکدہ پر بڑی پر رونق مجلس عزا ہوتی تھی ایک مجلس زریں کوٹ بھی
ہوتی تھی ۔ خوشنہ میں ۲۰ صفر کی مجلس عزا کا اہتمام ہوتا تھا یہاں کے
مومنین عشرہ محرم میں مہابن کی مجالس عزا میں شرکت کرتے۔
سادات ومومنین آگرہ ونواح آگرہ جہاں بھی آباد ہوتے انہوں نے
اپنا انداز عزاداری اور دیگر مذہبی تقریبات کو برقرار رکھا۔

ریاست بلرام پور میں علی سردار جعفری کے خاندان کی مذہبی سرگرمیاں

سادات آگرہ وبھرتپور کا ایک خاندان بلرام پور ریاست میں آباد ہے
جو اترپردیش (یوپی) کے ضلع گونڈہ میں واقع ہے۔ اس خاندان کے سربراہ
سید حیدر کرار جعفری تھے جو ریاست میں نائب دیوان تھے۔ آپ سید علی
سردار جعفری کے والد سید جعفر طیار کے بھائی تھے۔ اپنی خود نوشت میں سید
علی سردار جعفری نے بہاں کے محرم میں اپنے خاندان کی سرگرمیوں کا ذکر
کرتے ہوئے لکھا ہے۔ " ریاست کے کام کے علاوہ ہمارے خاندان کے
اخراجات کے لئے جو گاؤں ٹھیکے پر لے تھے اس کا انتظام کرتے تھے۔ سال
بھر نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے تھے۔ شعبان میں بارہویں امامؑ کا یوم
ولادت مناتے اور عریضے ڈالنے جاتے تھے۔ محرم بڑے جوش وخروش سے
مناتے تھے۔ چاند رات کو خاندان کی عورتیں چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور
زیورات اتار کر رکھ دیتی تھیں اور سب لوگ کالے کپڑے پہن لیتے تھے۔
باہر کوٹھی کے سب سے بڑے کمرے میں ضریح رکھ دی جاتی تھی اور علم
کھڑے کئے جاتے تھے۔ چاندی اور سونے کے علم کے نیچے اور سنہری کام کے

رنگ برنگ پنکھے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو مہندی اٹھتی تھی اور مجھے علی بند پہنایا جاتا تھا۔ آٹھویں کو حضرت عباسؑ کا علم نکلتا تھا اور شب عاشور عزاخانہ سجا دیا جاتا تھا اور فانوس جگمگا اٹھتے تھے۔ قصبے اور گردونواح کے گاؤں کے لوگ زیارت کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ عورتیں ٹولیاں بنا کر مہاتی مرثیے پڑھتی ہوئی آتی تھیں اور حضرت صغریٰ کے قاصد کے نام پر جوان لڑکے بھیک بن کر آتے تھے ان کی کمر میں ایک ٹیکے کے ساتھ ایک گھنٹہ بندھا ہوتا تھا۔ سر پر پگڑی میں مور کے پر لگے ہوتے تھے اور ہاتھوں میں مورچھ رہتے تھے۔ بچوں کی ٹولیاں اپنے گھنٹے بجاتی ہوئی آتیں اور عزاخانے میں مرثیے پڑھ پڑھ کر ناچتی تھیں۔ ان کے قدم " ہائے اللہ " کے بول پر اٹھتے۔ دس دن مسلسل مجلسیں ہوتیں اور پڑھنے کے لئے لکھنو سے ذاکر آتے تھے۔ عشرہ کے دن سارے قصبے کی فاقہ شکنی ہمارے گھر ہوتی تھی ۔"(۵۰)

آپ نے مزید فرمایا کہ " سال کے اور مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں جن کی بدولت میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے تمام بڑے علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیئے ہیں۔۔۔۔ اس کے علاوہ میر انیس کے مرثیوں کا بڑا چرچا تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر میں منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنا شروع کر دیئے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔(۵۱) چونکہ میں اس عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اس لئے وہ حالات اور قرآن کی بہت سی آیات مجھے زبانی یاد تھیں۔ سب کا

مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق اور صداقت کے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں نے حق و صداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا۔ نمرود و خلیل کی داستان سے لے کر شہادت حسینؑ تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی اور میں علامہ اقبال کے وہ اشعار ہلک ہلک کر پڑھتا تھا جس کا ابتدائی شعر ہے۔

آن امام عاشقاں پور بتول
سرو آزادے ز بستان رسولؑ

شاہ گنج آگرہ

عزاداری سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سادات کی شناخت اور ان کا طرہ امتیاز رہی ہے۔ وہ جہاں جہاں گئے اور قیام کیا۔ کسی بھی ماحول میں رہے روز عاشور آلؑ رسولؑ کی تباہی اور بربادی نہ بھلا سکے اور اسی لئے کربلا کی یاد آج بھی اس شدومد سے منائی جاتی ہے جیسے کہ یہ کل کا واقعہ ہے۔ رضوی سادات ہیلک نے بھی شاہ گنج میں آباد ہونے کے ساتھ ساتھ ۱۱۳۱ ہجری بمطابق ۱۷۱۸ء ، ۲۰ جلوس محمد شاہ بادشاہ دہلی میں یہاں امام بارے کی تاسیس کی جیسا کہ امام باڑہ قدیم کے کتبہ سے ظاہر ہے اور اس طرح یہاں تعزیہ داری کی ابتداء ہوئی ۔ بعد میں جیسے جیسے ہیلک اور دیگر بستیوں کے سادات یہاں آکر آباد ہوتے رہے اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ آگرہ اور نواح آگرہ میں اس محلہ کی عزاداری کو بڑی شہرت نصیب ہوئی ۔ جہاں امام باڑوں کی شہ نشینوں کی بناوٹ اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ عزاداری سے متعلق امام باڑے ، مجالس عزاء ، ماتمی جلوس ، سوزخوانی ، مرثیہ خوانی اور ذاکری جز لانفیک ہیں لہذا ان کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے۔

امام باڑہ قدیم

جیسا کہ تحریر ہوا یہ امام باڑہ سادات شاہ گنج آگرہ کی آبادی کے ساتھ ہی تعمیر ہوا۔ یہیں سب سے پہلے عزاداری کی ابتداء ہوئی ۔ اس محلہ کی تمام منتی رسومات مثلاً نذر ، علم ، مہندی ، سقائی اور فقیری یہیں ادا کی جاتیں۔ ۷ اور ۸ محرم کو یہاں نذر ونیازدلانے والوں کا اژدحام رہتا تھا۔ شب عاشور کی زیارتوں کا سلسلہ اور صبح عاشور اور چہلم کا جلوس بھی یہیں سے شروع ہوتا تھا۔ اس امام باڑہ میں ۲۷ ذی الحجہ سے ۸ ربیع الاول تک روزانہ مجالس عزاء منعقد ہوتیں اور تبرک تقسیم کیا جاتا۔ برصغیر میں شاید ہی دوچار امام باڑے ہوں جہاں اس تسلسل سے مجالس عزاء منعقد ہوتی ہوں۔ اس روایتی انداز کو امام باڑہ جعفریہ گولیمار (گلبہار) کراچی میں برقرار رکھا جارہا ہے۔ (جس کے اطراف میں اس نواح کے افراد آباد ہیں۔) اس امام باڑہ قدیم ہی میں یوم عاشور عصر کے بعد مجلس اور زیارت وارثہ اور فاقہ شکنی کا انتظام ہوتا جس کا اہتمام جناب سید اسرار حسن رضوی وبرادران کرتے تھے۔

اس امام باڑے میں سویم سید الشہداءؑ کے روز بستی کی تقریباً دس ہزار آبادی کے کھچڑے (حلیم) کا اہتمام کیا جاتا تھا جو خواتین کے لئے ان کے گھروں پر فراہم کیا جاتا تھا۔ اتنے بڑے پیمانہ پر کھچڑے کی تیاری اور تقسیم میں جناب سید لطافت علی رضوی عرف صدرو مرحوم اور محلہ کے نوجوانوں کی توجہات اور محنتوں کا بڑا دخل تھا۔ اس امام باڑے کے سامنے ایک بڑا چوک تھا جو اس بستی کی سماجی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ۹ ربیع الاول کی مخصوص تقریبات بھی اسی چوک میں منعقد ہوتی تھیں۔ قیام

پاکستان کے بعد اس امام باڑے کی عزاداری کو منتظم خاندان کے افراد گولیمار (گلبہار) اور پکا قلعہ حیدر آباد میں برپا کرتے رہے ہیں۔

امام باڑہ وقف میر نیاز علی مرحوم شاہ گنج کی جامع مسجد سے متصل ایک عظیم الشان وسیع وعریض امام بارہ تھا جس میں بڑے پیمانہ پر علم اور شدے نصب کئے جاتے۔ یہاں کے پنجے صناعی کا نادر نمونہ ہیں جنہیں اس خانوادہ کے افراد سید علی کوثر رضوی ۔ رضویہ سوسائٹی اور سادات سوسائٹی نمبر ۲۰ فیڈرل بی ایریا میں اپنے امام باڑوں میں سجاتے ہیں۔ یہاں روزانہ صبح کے وقت ذاکری کے فرائض وقف سے متعلق مولانا سید مبارک علی صاحب مرحوم اور مولانا سید علی جعفر مرحوم انجام دیتے رہے۔

امام باڑہ جنرل مہدی ۔ اس امام باڑہ کو نواب جنرل مہدی نے بڑی خوش اسلوبی سے تعمیر کرایا تھا۔ یوں تو دوسرے امام باڑوں میں بھی سونے اور چاندی کے پنجے نصب تھے لیکن اس امام باڑہ کے تمام پنجے سونے کے بنے ہوئے تھے۔ یہاں زنانی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔

امام باڑہ میر مومن علی ۔ یہ امام باڑہ حویلی کے ایک حصہ میں واقع تھا جو فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ تھا۔ ایام عزاء میں یہاں روزانہ مجالس عزاء منعقد ہوتی تھیں اور مختلف ذاکرین خطاب کرتے تھے۔ یہاں وقت کی بڑی سخت پابندی کی جاتی تھی ۔

امام باڑہ حاجی سید موسیٰ رضا رضوی مرحوم ۔ یہ امام باڑہ بھی حویلی کے ایک حصہ میں تھا جس کے پنجہ اور پٹکے بڑے زرنگار اور جاذب نظر تھے۔ یہاں روزانہ دس دن زنانی مجالس عزاء منعقد ہوتی تھیں۔ عزاداری کی ذمہ داری محترمہ انور خاتون بنت سید کلب حسن اٹھاتی تھیں۔

عزاخانہ ۔ اسے آغا سید ابوالقاسم رضوی مرحوم نے وقف میر ضامن علی سے تعمیر کرایا۔ موصوف نے زرکثیر سے ایک ضریح روضۂ اقدس امام

حسینؑ بنوائی جو ہوبہو روضہ کی شبیہ ہے۔ یہ ضریح جو صناعی کا شاہکار ہے ایک سال کی مدت میں تیار ہوئی ۔ یہ اس قدر طویل وعریض ہے کہ ایام عزا۔ میں اس کے حجروں ، محرابوں اور میناروں میں برقی بلب روشن کئے جاتے ہیں۔ یہاں ایام عزا۔ میں روزانہ صبح مجالس عزا۔ کے علاوہ جن میں مولانا ارشاد حسین خطاب کرتے ۔ عشرہ ثانی کی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں جن میں برصغیر کے ممتاز خطیب مولانا سید علی نقی صاحب مجتہد (نقن صاحب) اور حکیم مرتضیٰ حسین صاحب الہ آبادی اور دیگر حضرات تشریف لاتے رہے۔ ان حضرات کا انداز خطاب اس قدر مقبول تھا کہ ان مجالس میں لاتعداد برادران اہل سنت بڑے ذوق وشوق سے تشریف لاتے رہے۔ حکیم صاحب اکثر تین تین چا چار گھنٹہ مسلسل خطاب فرماتے اور ایسا بھی ہوتا کہ درمیان میں کھانے کا وقفہ دیا جاتا۔ توحید اور معراج آنجنابؑ کے پسندیدہ موضوع تھے۔ آغا سید ابوالقاسم نے چاندی کی ایک خوبصورت ضریح پہرسر کے امام باڑے کے لئے بھی نذر کی تھی جو ۱۹۴۷ء کے بلوہ عام میں لوٹ لی گئی ۔ (۵۴)

مجلس شام غریباں

امام باڑہ قدیم کے علاوہ سید غلام علی صاحب وکیل کے دولتکدہ پر منعقد ہوتی تھی ۔ درج بالا امام باڑوں کے علاوہ بھی مختلف مقامات ، حویلیوں اور مکانات میں بھی تعزیہ داری ہوتی اور مجالس عزا۔ منعقد ہوتی تھیں۔ امام باڑوں میں پنجے ، پٹکوں ، تعزیوں اور ضریحوں کی بناوٹ اور سجاوٹ پر خاص توجہ دی جاتی ۔ عہد قدیم میں امام باڑوں میں شہداء کربلا کی خیالی تصاویر بھی آویزاں کی جاتی تھیں۔ ہر عزادار کی کوشش ہوتی کہ اس کے امام باڑے کے علم ، پنجے ، پٹکے دیدہ زیب اور مثالی ہوں۔ لوہا

منڈی میں حاجی سید حسن صاحب کے امام باڑے کے بڑے علموں کے پٹکے خانہ کعبہ کے غلاف سے بنائے گئے تھے۔ امام باڑے اور عزاخانے قیمتی جھاڑ وفانوس، ہانڈیوں، گل دانوں سے سجائے جاتے اور قیمتی پردہ آویزاں کئے جاتے جن پر فارسی اشعار تحریر ہوتے۔

• اصلاح • کھجوا بہار نمبر ۵ جلد ۹ ۱۳۲۲ ہجری کی قومی رپورٹ متعلق شہر آگرہ میں تحریر ہے کہ

• تقریباً ۱۰۰ گھرانے خاص ایک محلہ شاہ گنج میں آباد ہیں۔ سربراوردہ افراد میں (۱) سید محسن علی صاحب تحصیلدار پنشنر (۲) سید حسین صاحب آنریری مجسٹریٹ (ڈپٹی کلکٹر پنشنر (۳) نواب سید شبر حسین صاحب آنریری مجسٹریٹ (۴) سید محمد صاحب ڈپٹی کلکٹر پنشنر (۵) سید موسیٰ رضا صاحب میونسپل کمشنر (۶) سید آل نبی صاحب وکیل میونسپل کمشنر (۷) سید عبداللہ صاحب سکریٹری مدرسہ (۸) عبید الحسن صاحب۔

خاص محلہ شاہ گنج میں شیعوں کی دو مسجدیں ہیں اور دونوں آباد ہیں۔ ہر دو مساجد میں نماز جماعت ہوتی ہے۔ مولوی سید مبارک علی صاحب لکھنوی اور حکیم سید محمد حسین صاحب مرادآبادی پیش امام ہیں۔ مدرسۂ ایمانیہ شاہ گنج وقف حاجی میر نثار علی صاحب مرحوم میں دینیات وعربی پڑھائی جاتی ہے۔ مدرسۂ اسلامیہ شاہ گنج آگرہ میں علاوہ دینیات کے اردو فارسی پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے اخراجات باہمی چندے اور امداد باہمی سے پورے ہوتے ہیں۔

امام باڑہ ڈاکٹر ضیاء الحسن رضوی :- یہ امام باڑہ موصوف کے مکان کے ایک حصے میں واقع تھا جہاں ایام عزاء میں روزانہ مردانی مجالس عزاء منعقد ہوتی تھیں علاوہ ازیں ۲۱ رمضان شہادت حضرت علیؑ کے سلسلے کی مجلس

اور جلوس عزاء برآمد ہوتا تھا جو کربلا تک جاتا تھا اس عزاداری کو موصوف
کے پوتے سید اقبال حسین رضوی نارتھ ناظم آباد میں برقرار رکھے ہوئے
ہیں۔

امام باڑہ افضلی بیگم :۔ یہ امام باڑہ محترمہ افضلی بیگم کے مکان میں واقع
تھا جہاں چاند رات سے ۸ ربیع الاول تک روزانہ زنانی مجلس منعقد ہوتی
تھی موصوفہ بڑے خلوص اور جذبے کے ساتھ عزاداری کرتی تھی علاوہ ازیں
محلے کی لڑکیوں کو قران پڑھاتی اور دینی تعلیم دیتی تھیں اور مدرسہ کی پہلی
معلمہ تھی اس عزاداری کو آپ کی بہن وزیر بیگم عرف چندو نے گولیمار
(گلبہار) کراچی میں قائم رکھا لیکن ان کے وفات کے بعد سے تاحال یہ
عزاداری الحاج سید اسرار حسن رضوی اپنے مکان واقع رضویہ سوسائٹی میں
برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

آگرہ میں عزاداری بڑے زوروشور سے ہوتی ہے۔ ہر دو فریق خوب
خرچ کرتے ہیں ان ایام میں دو ایک مجالس اہلسنت والجماعت بھی کرتے
ہیں لیکن عموماً شیعہ ہی کرتے ہیں اس موقع پر سادات شاہ گنج حیثیت سے
زیادہ دریا دلی دکھا دیتے ہیں۔ یعنی یہ باشندے دو ایک روز سویم تک برابر
محلے بھر کو نذر امام حسین علیہ السلام کھانا کھلاتے ہیں اور مجالس میں
تقسیم کرتے ہیں اور ان تاریخوں میں مخصوص آٹھویں تاریخ حاضری جناب
ابوالفضل العباس کی صبح کو ہوتی ہے۔ جو جناب سید محمد صاحب ڈپٹی کلکٹر
پنشنر کے مکان پر ہوتی ہے۔ اس حاضری میں پہلے مجلس ہوتی تھی ۔ اس
کے بعد آزادی سے لوازمات حاضری (دشمنان اہل بیت سے اظہار برأت)
ادا کئے جاتے ہیں اور بعد میں کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جناب ڈپٹی صاحب
موصوف اس حاضری میں نہایت اعلیٰ قسم کے کھانوں کا اہتمام کرتے تھے۔
اس حاضری میں قریب بارہ سو کا مجمع ہوتا تھا۔

جہاں بکثرت مجالس برپا ہوتی ہیں لیکن اول و دوم مجالس میر محسن علی صاحب و میر ابراہیم علی صاحب ان ہر دو مجالس میں مولوی مبارک علی اور مولوی مظفر علی خاص صاحب وعظ فرماتے تھے۔یہی دو مجالس آگرہ میں ہیں جو مجلس کا سچا مصداق ہو سکتی ہیں۔ شاہ گنج کے امام باڑے کی مجلس شب کے وقت ہوتی ہے قریب بارہ ایک بجے ختم ہوتی تھی ۔ جہاں دو انجمنیں ہیں ایک انجمن امامیہ شاہ گنج آگرہ اور دوسری مجلس تعلیم ۔ آگرہ میں ہندو مسلمان ، شیعہ و سنی میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں ، ملے جلے رہتے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے شیعوں کا جہاں پر کچھ کم زور نہیں

انجمن پنجتنی شاہ گنج آگرہ کے شائع کردہ نظام مجالس ۱۹۳۷ء درج ذیل ہے۔

نظام مجالس سلسلہ وار شاہ گنج آگرہ

نمبر شمار	نام عزادار	نام عزاخانہ یا مقام	نام محلہ
١	جناب آقا ابو القاسم صاحب رئیس	عزاخانہ بعد نماز صبح	نئی بستی
٢	جناب علی جان صاحب رجسٹرار پنشنر	بڑا امام باڑہ وقف	گھٹولی پاڑہ
٣	جناب علی جواد صاحب زمیندار	پھاٹک جناب ابراہیم علی مرحوم صاحب تحصیلدار	گھٹولی پاڑہ
٤	جناب جواد حسین صاحب	عقب مسجد خورد	چھوٹا بازار
٥	جناب محمد قاسم رضا	بڑی حویلی	بڑی حویلی

صاحب زمیندار

۶ جناب محمد علی صاحب مکان جعفر حسین صاحب نزد نیاز محل
پنشنر منصرم مرحوم

۷ جناب مجید الحسن صاحب پھاٹک روئی منڈی
مرحوم حسینی محلہ

۸ جناب مظفر علی صاحب پھاٹک چھوٹا بازار
زمیندار

۹ جناب لیفٹاف حسین
صاحب اسسٹنٹ کمشنر

آگرہ تال برکت علی جواد آباد
صاحب مرحوم

۱۰ جناب خورشید حسنین کوٹھی تال برکت علی
صاحب پی ڈبلیو آئی صاحب مرحوم

۱۱ جناب عزیز الحسن صاحب نخم والی باکھل چلی پاڑہ
مرحوم

۱۲ جناب ذوالفقار حسین کولہائی کولہائی
صاحب مرحوم

۱۳ جناب مظہر حسین صاحب گھٹولی پارہ گھٹولی پاڑہ
مرحوم سپرنٹنڈنٹ پریس

۱۴ جناب ڈاکٹر ضیاء الحسن حسن منزل گھٹولی پاڑہ
صاحب مرحوم

۱۵ جناب نواب ناظر حسین چلی پاڑہ چلی پاڑہ
صاحب

١٦	جناب نواب شبر حسین صاحب مرحوم رئیس	چلی پاڑہ	چلی پاڑہ
١٧	جناب حاجی سید حسن صاحب رئیس	پھاٹک لوہا منڈی	لوہا منڈی
١٨	جناب مرزا فیاض حسین صاحب	باڑہ طوطا رام لوہا منڈی	باڑہ طوطا رام لوہا منڈی
١٩	مشترکہ عزاداری جناب سید العابدین صاحب و محسن حسین صاحب	قدیم امام باڑہ	چلی پاڑہ
٢٠	جناب انعام حسین صاحب تحصیلدار	حسین منزل	سید آل نبی
٢١	جناب مولوی مبارک علی صاحب	دولتکدہ شریعت	روئی منڈی

درج بالا عشرہ کی مجلسوں کے علاوہ بھی تقریباً ہر گھر میں منتی مجالس عزاء منعقد ہوتیں جن میں سوزخوانی کے بعد تحت اللفظ خوانی کا عام رواج تھا۔ مردانی مجالس کے علاوہ عشرہ محرم میں مختلف مکانوں میں تقریباً بیس پچیس زنانی مجالس عزاء منعقد ہوتیں۔ مردانی اور زنانی مجالس میں ہر عزادار حسب حیثیت تبرک تقسیم کرتا۔ جس میں ریوڑیاں، بتاشے، مونگ پھلی، لڈور نگدیاں اور دیگر مٹھائیاں اور نان تقسیم ہوتیں تھیں۔ سات محرم کو عام طور پر سوجی کا حلیہ اور آٹھ محرم کو شیرمال تقسیم کئے جاتے۔

جلوس ہائے عزاء

یوں تو برصغیر کے تمام تر علاقوں میں ۷ تا ۸ محرم کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن شاہ گنج آگرہ میں ان تاریخوں میں زیادہ گھما گھمی نظر آتی تھی کیونکہ اس بستی میں قدیم سے یہ رسم چلی آرہی تھی کہ جس گھرانے میں گذشتہ سال کے دوران شادی ہوئی ہو وہاں سے مہندی کا نذر کرنا اور جس گھر میں اولاد نرینہ پیدا ہوئی ہو وہاں سے علم نذر کرنا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے ۷ محرم کو مہندی کے لاتعداد چھوٹے بڑے جلوس برآمد ہو کر امام باڑہ قدیم آتے جن میں عام طور سے یہ نوحہ " رن میں بیوہ حسن کی پکاری میرے قاسم کی آتی ہے مہندی " بڑے سوز و گداز سے پڑھا جاتا۔ اسی تاریخ کو فقیری کی رسم ادا کی جاتی جس میں بلا امتیاز دولت و ثروت فقیر بنتے تھے۔ اعزا اور احباب اپنی فقیری دیتے جس کی وہ نذر دلاتے۔ جن خانوادوں میں اولاد نرینہ پیدا ہوتی وہاں سے لاتعداد علم برآمد ہو کر جلوس کی شکل میں امام باڑے قدیم آتے جن میں عام طور سے یہ نوحے پڑھے جاتے۔ " بوچھار ہے تیروں کی اور مشک سکینہ ہے " " خیمہ میں غل ہے بپا لو وہ علم آتا ہے " ۸ محرم کو محلہ میں علموں کا عام گشت ہوتا جس کے سامنے تھوڑے فاصلہ پر رک کر نوحہ خوانی اور مرثیہ خوانی ہوتی خاص طور سے امام باڑوں اور جن مکانات میں زنانی یا مردانی عزاداری ہوتی وہاں رک کر اس مرثیہ کے " جب کٹ گئے دریا پہ علمدار کے بازو " کے چند بند سوزخواں مل کر پڑھتے۔ مختصراً یہ کہ ۷ اور آٹھ محرم کو ہر طرف سے نوحہ، مرثیہ اور ماتم کی صدائیں بلند ہوتیں علم اور مہندیاں برآمد ہوتیں نوجوان سبز و سیاہ کرتے پہنے گلوں میں کلاوے ڈالے۔ اکثر ہاتھوں میں علی بند پہنے نظر آتے اور کچھ سقائی کی رسم ادا کر کے مشکیزے لئے کٹوروں میں شربت پلاتے نظر آتے

اور اس طرح امام باڑہ قدیم اور اس کے سامنے ماتم داروں کا ایک ازدحام رہتا۔ آگرہ کے اس محلہ کے سادات کا یہ مزاج تھا کہ وہ کسی بھی جگہ تعینات ہوں یا کسی شہر میں قیام ہو ایام عزاء میں شاہ گنج آجاتے اور عزاء امام مظلوم میں منہمک رہتے ہوئے خاندانی روایات کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتے۔

۹ محرم کو امام باڑہ قدیم سے علموں کا عام گشت شروع ہوتا۔ جس میں تمام چھوٹے بڑے علم شریک ہوتے۔ یہ جلوس محلے کے تمام راستوں سے گزر کر دوپہر کے وقت بڑی حویلی پہنچتا جہاں مجلس عزاء منعقد ہوتی جس میں آگرہ شہر اور قرب وجوار کے عام مومنین شریک ہوتے بعد مجلس یہاں سے آگرہ کا واحد جلوس شبیہ ذوالجناح برآمد ہوتا تھا جو شہر کا سب سے بڑا جلوس عزاء تھا۔ اس جلوس میں تقریباً سات آٹھ ماتمی دستے شریک ہوتے زوردار ماتم ہوتا اور زنجیر زنی بھی ہوتی اور تقریباً پندرہ بیس ہزار مومنین اور مسلمان شریک ہوتے۔ ماتمی دستے ٹھہر ٹھہر کر اور رک رک کر ماتم برپا کرتے۔ ذوالجناح کے سامنے مرثیہ خوانی ہوتی ۔ مستورات پردے میں رہتے ہوئے اپنے گھروں کے دروازوں سے باراستہ میں واقع امام باڑوں میں جمع ہو کر زیارت سے مشرف ہوتیں۔ اس جلوس کا منظر دیدنی ہوتا۔ وہاں شبیہات ، علم تابوت اور تعزیوں خاص طور سے ذوالجناح کا جس قدر احترام کیا جاتا وہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ شہر میں واحد ذوالجناح کا جلوس تھا۔ اس جلوس کے مہتمم سید قاسم رضا رضوی مرحوم تھے جو تمام سال سیاہ لباس میں ملبوس رہتے۔ اب اس خانوادہ کے افراد ۹ محرم کو اس روایتی جلوس کو ۱۱ ڈی نیو کراچی سے برآمد کرتے ہیں۔

چونکہ ۱۹۳۹ء کے لکھنو کے مناقشہ کے بعد ناصبیت کی زہرآلود تندوتیز

ہواؤں کے اثرات آگرہ میں بھی اثر انداز ہونے لگے تھے۔ مولوی عبدالشکور لکھنوی کے پروپیگنڈے کا آگرہ میں سب سے زیادہ اثر غیر تعلیم یافتہ قریش (قصائی) برادری نے قبول کیا اور شاہ گنج کے جلوس ذوالجناح کی برآمدگی پر آمادہ فساد ہوئے۔ حکومت نے نقص امن کے اندیشہ کے تحت اس جلوس پر پابندی لگائی اور بانی جلوس سید قاسم رضا رضوی کے احاطہ کے سامنے پولیس نے بڑی تعداد میں چھولداریاں لگا کر جلوس روکنے کا انتظام کیا۔ یہ صورت حال سادات شاہ گنج کے لئے جو روایتاً بالادستی سے زندگی گزار رہے تھے گراں گزری کیونکہ یہ ان کی غیرت اور حمیت کو چیلنج تھا۔ لہذا مومنین شاہ گنج بالخصوص اراکین انجمن پنجتنی نے حالات کا جائزہ لے کر اور ذہنی طور پر پولیس کا مقابلہ کرنے کی تیاری کے ساتھ فیصلہ کیا کہ جلوس ہر قیمت پر برآمد ہوگا خواہ نتائج کچھ بھی ہوں۔(۵۳)

۹ محرم ۱۳۶۲ ہجری مطابق ۱۹۴۲ عیسوی قاسم رضا صاحب کے مکان کے احاطے (بڑی حویلی) کے سامنے وسیع میدان مسلح پولیس سے پٹا پڑا تھا۔ حکام ضلع موجود تھے جو بار بار انتباہ کر رہے تھے کہ اگر ذوالجناح نکلا تو گولی چلا دی جائے گی لیکن سادات شاہ گنج خاص طور سے انجمن پنجتنی کے تقریباً ایک صد نوجوان سید محمد مقصود رضوی کی قیادت میں جذبہ قربانی کا مظاہرہ کرنے اور بقائے عزاداری کے لئے جان دینے پر آمادہ تھے۔ تاکہ آن پر فرق نہ آئے ورنہ اس طرح تو صدہا سال قدیم عزاداری پر پابندیاں شروع ہوجانے کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا۔ الغرض مقررہ وقت پر مجلس ختم ہونے کے بعد ذوالجناح کو احاطہ کے صدر دروازے سے باہر لانے کا ارادہ کیا لیکن شبیہ ذوالجناح نے دروازہ پر قدم جما دیئے جیسے کہ کسی نے زمین میں گاڑھ دیئے ہوں۔ نوجوانوں نے گھوڑے کو آگے بڑھانے کے لئے اپنی پوری

کوشش صرف کردی لیکن ذوالجناح تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا جیسے کسی
غیبی طاقت نے جو نوجوانوں کی مشترکہ قوت سے کہیں زیادہ تھی اس کو
روک دیا ہو ۔ سامنے مسلح پولیس شیعوں پر بندوقیں تانے ضلع مجسٹریٹ
کے حکم کی منتظر تھی کہ ذوالجناح باہر آئے اور گولی چلائیں۔ سید زادے ہر
قربانی دینے پر آمادہ تھے اور گھوڑے کی لگام کھینچ کر اور پشت سے دھکیل کر
آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن آدھ گھنٹہ کی مسلسل جدوجہد
کے بعد سمجھ لیا گیا کہ صابر وشاکر مظلوم کربلا کو یہ گوارا نہیں کہ ان کے
فدائی ماتم دار اس طرح گولیوں کا نشانہ بنیں لہذا بزرگوں کی مداخلت سے
بادل ناخواستہ جب واپسی کے لئے ذوالجناح کی باگ موڑی گئی تو امام عالی
مقامؑ کی سوار کی شبیہ نے بغیر کسی مزاحمت کے واپسی اختیار کی (۵۴) ۔ اس
واقعہ سے نوجوانوں میں ایک قسم کا احساس محرومی تو ہوا لیکن مرضئ مولا
پر صبر وشکر کیا مگر واہ حسینؑ مظلوم یہ آپؑ کی معجزاتی شخصیت ہی ہے کہ
صدیوں سے ناصبیت کی مخالفت اور رخنہ اندازی کے باوجود عزاداری نہ
صرف یہ کہ قیامت تک باقی رہے گی بلکہ اس میں فروغ ہوگا۔ ۹ محرم کو
متذکرہ صورت حال سے مخالفین اور حکام بالا اس قدر متاثر ہوئے کہ آئندہ
سال خود مخالفین نے ذوالجناح کی باگ تھام کر ذوالجناح برآمد کیا اور حکام
بالا بھی خوش اسلوبی سے انتظامات میں پیش پیش نظر آئے۔

شب عاشور

امام باڑوں اور عزاخانوں میں اضافی روشنی کا اہتمام کیا جاتا جن امام
باڑوں اور عاشور خانوں میں بجلی نہ تھی وہاں گیس کے ہنڈے روشن کئے
جاتے اور امام باڑے بقعہ نور نظر آتے۔ محلہ کے گلی کوچوں میں بھی اضافی
روشنیوں کا اہتمام ہوتا۔ تمام راستوں پر سقے پہلے سے چھڑکاؤ کر دیتے تاکہ

دھول نہ اڑے۔ بعد مغربین ایک بڑا گھنٹا بجایا جاتا جو اس کا اعلان ہوتا کہ
اب کوئی بالغ مرد گھر سے باہر نہ نکلے کیونکہ اب صرف مستورات کو امام
باڑوں کی زیارت کی اجازت تھی ۔ اس پابندی کے باوجود سیدانیاں برقعوں
میں ملبوس نکلتیں۔ انجمن پنجتنی کے نوجوان محلہ کی ناکہ بندی کردیتے کہ
محلہ میں کوئی داخل نہ ہو ۔ بچے گلیوں میں گشت کرتے رہتے اصطلاحاً یوں
کہا جائے کہ مردوں کے لئے یہ ایک قسم کا خودساختہ کرفیو آرڈر تھا۔
مستورات عزاخانوں میں جانیں زیارت کرتیں اور الوداعی نوحے پڑھتیں۔
گیارہ بجے شب پھر گھنٹا بجایا جاتا جو اس امر کا اعلان ہوتا کہ مستورات کا
وقت ختم ہوگیا۔ جس کو سن کر وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوجاتیں اور
اس کے چند دقیقوں کے بعد مرد شب عاشور کی زیارت کے لئے نکلتے اور
زیادہ تر چوک میں جمع ہونا شروع ہوجاتے اور اجتماعی شکل میں پہلے امام
باڑہ قدیم میں نوحہ خوانی اور سینہ زنی کرتے۔ اس کے بعد جلوس کی شکل
میں محلہ کے امام باڑوں میں جہاں مردانی اور زنانی عزاداری ہوتی زیارت
کرکے نوحہ خوانی اور ماتم برپا کرتے۔ اس جلوس میں شریک اگلی صف میں
کچھ بزرگ شہید کربلا ، شہید نینوا فارسی نوحے کے الفاظ دہراتے اور جواب
میں تمام افراد حسینؑ حسینؑ کی صدا بلند کرتے اس طرح محلہ کا
گشت بڑی حویلی پر پہنچ کر ختم ہوجاتا جہاں سے بزرگ اور بچے واپس امام
باڑہ چلے جاتے اور شب بیداری میں شریک ہوتے۔ جہاں تمام رات نوحہ
خوانی اور اعمال بجالائے جاتے۔ بڑی حویلی سے نوجوانوں کا گروہ جلوس کی
شکل میں دیگر محلوں کے گشت ک ے لئے روانہ ہوتا اور سب سے پہلے
لوہا منڈی اور گھاس کی منڈی پہنچتے جہاں تین امام باڑے تھے اور اہل سنت
حضرات بھی بڑی کثرت سے تعزیہ بناتے تھے ان تعزیوں پر نوحہ خوانی کے

بعد یہ جلوس حسینؑ حسینؑ کی صدائیں بلند کرتا راجہ منڈی اور خوری
دروازہ کے جلیبیوں، بتاشوں، ریوڑیوں اور دیگر مٹھائیوں سے بنائے
ہوئے تعزیوں اور سرکوں اور گھاس اور سرسوں کے تعزیوں پر نوحہ خوانی
کے بعد یہ جلوس فوارہ کشمیری بازار اور چوکی کے تعزیوں کی زیارت کرتا
ہوا آگرہ کے مشہور گلاب کے پھولوں کے تعزیہ پر نوحہ خوانی اور سینہ زنی
کرتا۔ یہ روایت بن گئی تھی کہ آگرہ کا یہ مشہور تعزیہ اس وقت تک گشت
کے لئے نہیں اٹھایا جاتا تھا جب تک کہ شاہ گنج کے میر صاحبان وہاں پہنچ
(۵۵)
کر نوحہ خوانی اور سینہ زنی نہ کریں۔ یہاں بہت بڑا مجمع نوحے سننے کا منتظر
رہتا تھا۔ یوں تو برادران اہلسنت کے تعزیوں کے سامنے نوحہ خوانی کرتے
ہوئے یہ جلوس زیارت گزرتا تھا لیکن یہاں انجمن پنجتنی کے نوجوان پورے
جوش وخروش سے ماتم کرتے اور تبلیغی نوحے پڑھتے زیادہ تر نجم آفندی اکبر
آبادی کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ آگرہ کے اس تعزیہ کے قرب وجوار کی سڑکوں پر
اس قدر اژدحام ہوتا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی لیکن اہالیان شہر حسینؑ
حسینؑ کی آواز سن کر بہ مشکل راستہ بناتے۔ اس کے بعد یہ جلوس کٹرہ
حاجی حسن اور بابری امام باڑے کی زیارت کرتا ہوا گلاب خانہ پہنچتا جہاں
قزلباشوں کا قدیم امام باڑہ تھا۔ اس کے بعد یہ جلوس جامع مسجد، کناری
بازار، ہینگ کی منڈی، نائی کی منڈی سے گزر کر ایک ہندو کمہار کے تعزیہ
کے روبرو نوحہ خوانی کرکے علی الصبح واپس شاہ گنج پہنچتا روایتی نوحوں کے
علاوہ اس جلوس میں ہندی کے نوحے بھی پڑھے جاتے جنہیں مسلمان ہی
نہیں ہندو بھی سنتے اور سر دھنتے تھے اور شب عاشور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ
ہر طرف سے حسینؑ حسینؑ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ صبح عاشور امام
باڑہ قدیم میں وہ مجلس پڑھی جاتی بعدہ سامان عزا۔ بڑھایا جاتا۔ سروں پر

بھس اور خاک ڈالی جاتی اور حاجی سید العابدین کی پرسوز مرثیہ خوانی کے بعد جلوس عزاء برآمد ہوتا جس میں امام باڑے کے بڑے علم تابوت اور تعزیئے ہوتے۔ راستہ میں دیگر امام باڑوں کے علم اور تعزیہ شریک ہوتے جاتے۔ بڑے علموں میں لمبے لمبے بانس استعمال ہوتے۔ جن کو طاقتور نوجوان ڈوری کے سہارے اٹھاتے تھے۔ اس جلوس میں سب کے آگے جو علم ہوتے اس میں کماں کے ساتھ ننگی تلواریں لگی ہوتی تھیں جسے اصطلاحاً ذوالفقار کہا جاتا ان کے بعد باقی علم ہوتے جن میں پنجے پٹک اور پھریرے ہوتے اس کے بعد دیگر شبیہات کربلا تک تمام راستوں پر میونسپل کمیٹی کی طرف سے چھڑکاؤ ہوتا جلوس میں یوں تو ہر شخص ننگے سر اور ننگے پیر ہوتا خواہ کیسا بھی موسم ہو لیکن علموں اور شبیہوں کے اٹھانے والوں کے لئے تو لازمی تھا کہ وہ ننگے سر اور ننگے پیر ہوں۔ تمام راستہ نوحہ خوانی ہوتی اور کچھ فاصلوں اور چوراہوں پر رک کر سینہ زنی اور زنجیر زنی ہوتی ۔ لوگ جلوس حزن وملال کی تصویر بنے شریک ہونے اور صحیح معنوں میں غم واندوہ کا اظہار ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ واقعہ کربلا ابھی کا تازہ واقعہ ہے۔ راستہ میں اغیار خاموش سرجھکائے کھڑے نظر آتے اور ذوق وشوق سے مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی سنتے۔ نوحہ خوانوں میں آل مہدی جعفری ، سید علی اوسط رضوی ، مفتی اقبال احمد ، شیخ کریم حسین ، جرار حسین جعفری ، سید منور حسین ، سید مظفر حسین جعفری ، سید مبارک حسین ، عادل حسین جعفری اور دیگر حضرات نوحہ خوانی کرتے اور اس طرح یہ جلوس روئی کی منڈی ہوتا تقریباً دو میل کا راستہ طے کرکے قبل از دوپہر خوجے کی سرائے نزد کینٹ اسٹیشن پہنچتا جہاں اہالیان شاہ گنج کی کربلا واقع تھی ۔ وہاں پہلے سے دفن کے لئے قبریں تیار ہوتیں۔ سقے مشکیں لئے منتظر رہتے۔ وہاں

علموں اور شبیہوں سے سامان زینت اتارا جاتا اور تعزیہ اور دیگر تبرکات دفن کئے جاتے۔ تربتوں پر پانی کا چھڑکاو ہوتا اگربتیاں جلائی جاتیں گل پاشی ہوتی

اس طرح چہلم کے روز بھی امام باڑہ قدیم سے ایک جلوس عزاء برآمد ہو کر کربلا پہنچتا اور ۲۱ رمضان کو ڈاکٹر سید ضیاء الحسن رضوی مرحوم کے مکان حسن منزل سے جلوس شبیہ تابوت حضرت علی علیہ السلام برآمد ہوکر کربلا جاتا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ جلوس شروع میں گولیمار (گلبہار) سے برآمد ہو کر کربلا واقعہ اندرون مسجد وامام بارگاہ جعفریہ پر اختتام پذیر ہوتا۔ جب اب اسے ان کے پوتے سید اقبال حسین رضوی بلاک ایچ نارتھ ناظم آباد سے بڑی شان وشوکت سے برآمد کرتے ہیں اور یہ مسجد وامام باڑہ باب العلم پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ شب ضربت انجمن پنجتنی مسجد میر اکبر علی میں شب بیداری کا اہتمام کرتی اور صبح شبیہ تابوت حضرت علیؑ برآمد ہوتا۔ شب ۱۵ شعبان میں بھی یہی انجمن مسجد میں شب بیداری اور قصیدہ خوانی کا انتظام کرتی اور جلوس علی الصبح دریائے جمنا میں عریضہ ڈالنے جاتے۔
ان روایات کو گلبہار کراچی میں انجمن پنجتنی اور انجمن معصومیہ نے برقرار رکھا ہوا ہے۔

ایام عزاء میں مومنات چاند رات کو چوڑیاں توڑ دیتی تھیں۔ تمام زیورات اتار دیئے جاتے۔ آرائش وزیبائش کا تو سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پان کھانا ترک ہوجاتا۔ اکثر مومنین اور خاص طور سے عزادار فرش پر سوتے عام تقریبات ۸ ربیع الاول ترک ہوجاتی تھیں۔ چہلم سید الشہداء تک برادران اہلسنت بھی شادی بیاہ کی تقریبات منعقد نہیں کرتے تھے۔

مسالمہ

شاہ گنج آگرہ میں شعر و شاعری کا عام چرچا تھا۔ اراکین بزم ادب شاہ گنج آگرہ وقتاً فوقتاً بزم مشاعرہ سجایا کرتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں طے پایا کہ بعد عشرہ محرم ایک مسالمہ منعقد کیا جائے جس میں بلاتفریق مذہب وملت آگرہ ونواح آگرہ کے شعراء مدعو کئے جائیں لہذا دعوت نامے جاری کئے گئے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء پہلا اتوار (یکشنبہ) بعد سوئم شہداء کربلا علیہم السلام مسالمہ منعقد ہوا جس کے لئے تمام شہر اور قرب وجوار کے قصبات میں ہینڈبل تقسیم کئے گئے اور پوسٹر لگائے گئے۔ عزاخانہ شاہ گنج آگرہ میں یہ مسالمہ بج مرزا معظم علی بیگ ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کی صدارت میں شروع ہوا۔ تین بجے سہ پہر تک موصوف نے صدارت کی اس کے بعد جناب مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش اکبرآبادی نے صدارت کی یہ مسالمہ مغرب تک جاری رہا۔ تقریباً دس گھنٹوں میں یوں تو لاتعداد شعراء نے بارگاہ حسینی میں نذرانہ عقیدت پیش کیا جن میں منشی یعقوب علی خان صاحب وکیل۔ مولوی ولی الدین صاحب ولی فتحپوری، منشی لچھمن نرائین سخا جے پوری، مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش، سید ساجد رضا صاحب فہیم ایڈوکیٹ شاہ گنج، آغا سید محمد حسنین کٹرہ حاجی حسن، مولوی خادم علی خاں اخضر (استاد صبا اکبرآبادی)، سید محمد منظر راز شاہ گنج، منشی رضی الدین خاں جناب سید غلام علی صاحب احسن وکیل سکریٹری بزم ادب شاہ گنج آگرہ، جناب بالکشن ورس باغ، جناب منشی علی محمد خاں صاحب ندا، سید انتظار رضا صاحب ناز شاہ گنج، منشی شمس الدین خاں صاحب ملتمس اور سید علی مقدس صاحب شاہ گنج، استاد قمر جلالوی، رعنا اکبرآبادی، صبا اکبرآبادی قنبر بریلوی شریک ہوتے رہے ابو حامد معظر ابتدائی دور میں سالانہ مسالمہ میں اراکین انجمن مہدویہ اور بالخصوص اس ادارے کے سکریٹری سید واجد

حسین پیش پیش تھے۔ یہ مسالہ ایک تسلسل سے محرم ۱۹۳۷ء تک جاری رہا۔ اس مسالہ میں پڑھا جانے والا کلام ہر سال شائع ہوتا رہا۔ آخری کتاب ۲۰ فروری ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی ۔ شعرا کا تذکرہ آگرہ ونواح آگرہ کے دبستان شاعری میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔

اس نواح میں سوزخوانی مرثیہ خوانی اور تحت اللفظ خوانی کا بھی اپنا علیحدہ ایک انداز تھا۔ اسی لئے پروفیسر سبط جعفر صاحب زیدی نے اپنی معروف کتاب صوتی علوم وفنون اسلامی میں آگرہ وبہرسر کے دبستان کا خصوصی تذکرہ فرمایا ہے اور یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے کہ سوزخوانی کی ابتدا اسی نواح میں ہوئی ۔ اس دبستان سے متعلق قبل از تقسیم برصغیر کے آگرے کے گھرانے کے فن کاروں میں آفتاب موسیقی فیاض حسین خاں ، استاد تصدق حسین خاں ، استاد ولایت حسین خاں ، استاد اسد علی خاں وغیرہ نمایاں تھے۔ سوزخوانی اور مرثیہ خوانی کے لئے سید ظہور الحسن صاحب ، سید ذوالفقار حسنین صاحب ، سید محمد رضا صاحب عرف کھلو ، سید علی رضا صاحب ، حاجی سید العابدین صاحب ، استاد علی ضامن و استاد محمد ضامن منجھو خاں صاحب ، نواب ابن علی صاحب ، سید علی اوسط صاحب ، سید مرتضیٰ حسین صاحب ، سید شمشاد حسین صاحب عرف ٹولی پہلوان وجناب سید زین العابدین کے اسماء گرامی معروف تھے اور بعد میں درج ذیل حضرات اس انداز خواندگی کے لئے کراچی میں معروف رہے۔ عظیم الحسن ، سید علی اوسط رضوی ، سید منظور احمد جعفری ، سید معصوم الحسن رضوی ، سید ناصر حسین جعفری ، سید فائق حسین رضوی ، سید کفایت حسین رضوی ، سید مردان علی شاہ ، سید احمد علی جعفری ، سید رضا علی جعفری ، سید محمد جعفر جعفری ، سید نقی رضا جعفری ، سید ظہور حسن جعفری سید شہنشاہ حسین شفق اکبرآبادی ، مرتضی حسین زاد ، سید علی ناصر جعفری

سید محمد تقی زیدی ، سید تنویر حسین بیانوی ، سید محمد احمد جعفری ، سید ذوالفقار حسین جعفری ، سید حسن رضا رضوی وسید حسن مدثر رضوی سید تراب احمد جعفری ، سید سلطان عباس جعفری وغیرھم ۔

زنانی مجلسوں میں بھی مومنات بڑی پراثر سوزخوانی اور مرثیہ خوانی کرتی رہیں اس نواح کے مومنین اور مومنات نے پیش وارانہ انداز سے ہمیشہ اجتناب برتا اور وہ اس لئے کہ سادات کے لئے شہید اعظمؑ کے تذکرہ کی اجرت لینا بہرحال نامناسب ہے اور سادات کے شایان شان بھی نہیں ہیں۔

تیرہ سو سالہ یادگار حسینی

محرم ۱۳۶۱ ہجری یوں تو ہندوستان کے اکثر چھوٹے بڑے شہروں میں مظلوم کربلا کی شہادت کی ۱۳ سو سالہ یادگار بڑے جوش وخروش سے منائی گئی جس کے روح رواں مولانا سید علی نقی صاحب تھے۔ لیکن آگرہ میں جس شان وشوکت سے سادات ومومنین شاہ گنج نے اہتمام کیا وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ان یادگار جلسوں میں نقن صاحب قبلہ ، خواجہ حسن نظامی ، علامہ نجم آفندی اکبر آبادی کے علاوہ جناب پنڈت راج ناتھ کنزرو ممبر ڈیفنس کاؤنسل انڈیا۔ جناب شنکر لال چندل پروفیسر ٹرننگ کالج آگرہ ، جناب پورن چند سور ایڈووکیٹ آگرہ نے نہ صرف شرکت کی بلکہ پرمغز مقالے پڑھے۔ اس موقع پر آل انڈیا مسالمہ بھی منعقد ہوا جس کی صدارت خواجہ حسن نظامی صاحب فرمائی ۔ برصغیر کے نامور شاعر حضرت نجم آفندی اکبر آبادی نے اپنی معرکتہ الارا نظم کربل نگری کچھ اس انداز سے سنائی کہ شیعہ سنی مسلمان اور ہندو اور عیسائی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان یادگار

جلسوں کے مستقل انتظامات میں جن میں مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام بھی تھا۔ اراکین انجمن پنجتنی کی خدمات لائق ستائش تھیں۔(۵۶) اس یادگار کے لئے بیرون شہر سے بھی مشاہیر تشریف لائے تاہم نواب بہادر یار جنگ (حیدر آباد دکن) نے معذرت کرلی

قیام و فروغ عزاداری اور محرم کی ہمہ گیر ترقی کے بارے میں درج بالا مختصر جائزے سے یہ حقائق پوری طرح واضح ہوجاتے ہیں کہ :۔ (۱) ان روایات دردوغم کو رواج دینے کی ابتدا. پہلی صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی ہی میں المیۂ کربلا کے فوراً بعد ہوگئی تھی ۔ (۲) قدیم ہند میں ذکر شہادت کے واضح نشانات تیسری صدی ہجری دسویں صدی عیسوی میں نظر آتے ہیں جب کہ المیۂ کربلا کے ابلاغ کا سراغ ۹۳ ہجری ۷۱۲ عیسوی میں دیبل پر محمد بن قاسم کے حملہ سے قبل اس کے فوجی کیمپ میں ذکر شہادت سے ملتا ہے گویا برصغیر (قدیم ہند) میں مجلس عزا. کی شروعات پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی میں ہوگئی تھی ۔ (۳) برصغیر میں مغل سلاطین سے کافی قبل محرم کے جلوس عزا. برآمد کرنے کی نشانیاں ملتی ہیں۔ مشہور صوفی بزرگ جناب اشرف جہانگیر سمنانی نے دہلی میں ۹۸۰ء میں ایران کے سبزوار کے طرز پر علموں کا جلوس منظم کیا تھا۔ (۴) گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں سلطان محمد غوری کے لشکر کے ہمراہ آنے اور سکونت اختیار کرنے والے سالار سید محمد غازی مشہدی نے بیانہ و نواح بیانہ میں عزاداری کی باضابطہ اساس رکھ دی تھی ۔ بیانہ کو سادات کرام کا اولین مرکز قرار دیا گیا ہے جہاں صحیح النسب سادات ابتدا. ہی میں بس گئے تھے۔ (۵) آگرہ و نواح آگرہ میں محرم کی خصوصیات و انفرادیت کے آثار عہد اکبری میں ملتے ہیں جن کی آنکھوں دیکھا حال ان غیرملکی مشنوں نے تحریر

کیا ہے جو سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں وارد ہند ہوئے تھے۔ (۶) آگرہ گوالیار اور جے پور کے محرم صدیوں سے مشہور رہے ہیں جب کہ آخرالذکر دونوں علاقے خالص ہندو آبادی کے علاقے تھے۔ عزاداری سے ہندو مہاراجگاں کی گہری وابستگی اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ یہ علاقے بیانہ کے قرب و جوار میں ہونے کے باعث سادات بیانہ سے کس قدر متاثر تھے۔ (۷) آگرہ کے محرم کی جو تفصیل علامہ میکش اکبرآبادی نے اپنے مضمون "آگرے کے محرم" میں پیش کی ہے وہ یہاں کے محرم کی خصوصیات کی بین گواہ ہے۔ (۸) برصغیر کا ایک نہایت ممتاز مرکز سادات شاہ گنج آگرہ تھا جس نے اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک کی مختصر مدت میں تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے اور درجنوں نابغۂ روزگار لوگ پیدا کئے۔ یہ عزاداری کا بھی بڑا مرکز تھا۔ یہاں نماز فجر کے بعد سے رات گئے تک مسلسل مجالس عزا برپا ہوتی تھیں۔ مردانہ اور زنانی مجالس کی تعداد دو جین سے زائد تھی۔ یہاں کے چار جلوس ہائے عزا مشہور تھے جو ۹ محرم (جلوس ذوالجناح)، ۱۰ محرم جلوس عاشورہ، ۲۰ صفر جلوس چہلم اور ۲۱ رمضان کو شہادت حضرت علیؑ کے سلسلے میں جلوس تابوت نمایاں تھے۔ یہاں محرم میں روزانہ خصوصی عام نذر کا اہتمام بھی ہوتا تھا جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے تھے اور سوئم کے دن خصوصی حلیم کی دعوت عام ہوتی تھی۔ (۹) یہاں سالانہ طرحی مسالمہ عزاخانہ میں منعقد ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ محافل میلاد بھی منعقد ہوتی تھیں جن میں قصیدہ خوانی کا دستور تھا۔ اسی کی بدولت راقم الحروف کو قصیدہ گوئی جیسے مشکل صنف شعر کی طرف رغبت ملی اور درجنوں قصیدے لکھے۔ یہاں عزاخانے کے علاوہ دو بڑے امام باڑے بھی تھے۔ ایک امام باڑہ قدیم جو ۱۸۱۸ء میں قائم ہوا تھا اور دوسرا امام باڑہ وقف

جو ۱۸۳۵ء میں تعمیر ہوا تھا۔

اس لئے یہ دعویٰ بڑے وثوق کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کہ سادات آگرہ و نواح کو عزاداری میں دوسری تمام سادات کی بستیوں پر اولیت کا شرف حاصل ہے اور یہ کہ ہماری عزاداری کسی حکمران کی چشم التفات کی رہین منت نہ تھی نیز یہ کہ ہم ہر دور میں کھلے ہوئے شیعہ رہے اور کبھی تقیہ اختیار نہ کیا۔ اس حقیقت کی روشن ترین مثال علامہ سید فتح اللہ شیرازی کی شخصیت تھی جو اکبر اعظم کے عہد کے بہت بڑے عالم، انجینئر، سائنس دان اور بے مثل دانشور تھے۔ موصوف فتح پور سیکری کے دیوان خاص میں امامیہ طرز کی نماز باجماعت نہایت بے باکی سے ادا کیا کرتے تھے جیسا کہ عہد اکبری کی مشہور و متعصب مورخ مسلاً بدایونی نے منتخب التواریخ میں اعتراف کیا ہے۔

حوالہ جات

۱) مجالس المومنین ۔ حضرت قاضی نور اللہ شوستری
۲) تاریخ طبری جلد ۶
۳) تاریخ طبری جلد ۶ / تاریخ قصطفی / شہید انسانیت
۴) تاریخ طبری جلد ۶ / تاریخ عزاداری مولانا مرتضی حسین / شہید انسانیت
۵) تاریخ طبری جلد ۵ / شہید انسانیت مطبوعہ لاہور
۶) روضتہ الشہداء ملا واعظ کاشفی
۷) سیرت النبی جلد ۲ علامہ شبلی / طبقات ابن سعد جلد ۲
۸) واقعات الصفین ۔ ابن مزاحم
۹) سرالشہادتین / مسند امام احمد حنبل / تاریخ طبری جلد ۵
۱۰) تاریخ عزاداری (انگریزی)
۱۱) عزاداری کا تاریخی تجزیہ بحوالہ انسان کامل (انگریزی) شائع کردہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی
۱۲) عزاداری کا تاریخی تجزیہ (انگریزی) / تاریخ ابن عساکر / تاریخ عزاداری مولانا ہنسوی
۱۳) عزاداری کا تاریخی تجزیہ (انگریزی) / تاریخ ابن عساکر / تاریخ عزاداری مولانا ہنسوی
۱۴) احسان التقاسیم علامہ مقدسی / تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۲

انگریزی ڈاکٹر اطہر عباس رضوی
۱۵) تاریخ اسلام جلد ۲ نجیب آبادی
۱۶) تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۲
۱۷) تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۲
۱۸) مثنوی مولانا روم مطبوعہ لندن ۱۸۳۳ء
۱۹) بیگ تاشی سلسلۂ درویشان (انگریزی)
۲۰) عجائب القدور فی الاخبار پتھور
۲۱) مطلع سیدین و مجمع البحرین
۲۲) تاریخ صوفیائے ہند ۔ محمد اسحاق بھٹی
۲۳) ماہنامہ آئینہ لاہور بابت اگست ۱۹۹۱ء
۲۴) تاریخ فرشتہ مطبوعہ بمبئی / تذکرۃ الذاکرین مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۶ء
۲۵) طبقات ناصری جلد اول / تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۲
۲۶) تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۲ / لطائف اشرفی اشرف جہانگیر سمنانی
۲۷) ایضاً
۲۸) ایضاً
۲۹) سیر المتاخرین جلد ۲
۳۰) منتخب التواریخ جلد ۲ ملا بدایونی
۳۱) ایضاً
۳۲) منتخب التواریخ جلد ۲ ملا بدایونی / بزم آخر ۔ منشی فیض الدین
۳۳) تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۲
۳۴) ایضاً
۳۵) ایضاً
۳۶) دکنی قبائل میں عزاداری ضیاء الحسن موسوی

۳۷) حدیقتہ السلاطین ۔ مورخ زبیری

۳۸) تاریخ حیدر آباد دکن ۔ شائع کردہ حیدر آباد ٹرسٹ کراچی

۳۹) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند جلد ۲

۴۰) ایضاً

۴۱) عزاداری کا تاریخی تجزیہ (انگریزی)

۴۲) سوانحات شاہان اودھ

۴۳) واجد علی شاہ اور ان کا عہد

۴۴) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند جلد ۲

۴۵) مخزن احمدی مطبوعہ آگرہ ۱۱۹۹ھ

۴۶) ہفت روزہ دور جدید کراچی بابت محرم ۱۹۸۳ء

ان کے علاوہ جن دیگر مطبوعات سے استفادہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ (۱) کتاب تحفتہ العالم از عبداللطیف سوشتری (۲) زاد سبیل آخر ۔ سید اولاد حسین رضوی مداح (۳) سفر نامہ فیج (۴) انڈین ٹورسٹ گائیڈ ۱۹۷۵ء / ۱۹۸۲ء (۵) وقائع عالم شاہی (۶) دہلوی مرثیہ گو مولفہ علی جواد زیدی (۷) سرفراز لکھنو محرم نمبر اپریل ۱۹۳۵ء (۸) جہانگیر کا انڈیا (انگریزی) (۹) دبستان دبیر از ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی (۱۰) بزم ادب آگرہ انجمن پنجتنی آگرہ کراچی اور تیرہ سو سالہ یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ کی مطبوعہ روداد شائع کردہ لکھنو / آگرہ / کراچی

باب ششم

آگرہ و نواح آگرہ کا دبستان شاعری

امام حسین علیہ السلام کا سفر شہادت تقریباً پانچ ماہ کی مدت کو محیط تھا۔ یہ سفر مدینہ سے ۲۸ رجب سنہ ۶۰ ہجری کی صبح شروع ہو کر ۱۰ محرم ۶۱ھ کی شام (عصر عاشور) کربلا میں آپ کی شہادت واقع ہونے پر تمام ہوا' لیکن ذکر شہادت کا ادبی سفر جس کی ابتداء شہادت عظمیٰ کے بعد ہوئی' ہنوز جاری ہے۔ صدیوں کی مسافت طے کر کے اور عرب و ایران کی سرحدوں کو عبور کرنے کے بعد جب یہ برصغیر (قدیم ہند) کی فضاؤں میں داخل ہوا تو یہاں ماحول یکسر مختلف اور سازگار میسر آیا۔ یہاں ذکر شہادت کو جو قبولیت اور پذیرائی ملی وہ کہیں اور نصیب نہ ہو سکی۔

رثائی ادب یعنی نوحوں' غم انگیز نظموں اور مرثیوں کی تخلیق کا سلسلہ عرب میں شہادت عظمیٰ کے بعد پہلی صدی ہجری میں ہی شروع ہو گیا تھا جب المیۂ کربلا کے بیان و ابلاغ کے لئے شعر کو ذریعہ اظہار بنایا گیا۔ اولین نوحہ نگاروں میں حضرت ام البنین اور حضرت ام کلثوم کے بعد مشہور شاعر جناب ابوالاسود دوائلی نے اشعار غم کہنے میں پہل کی۔ جناب سلیمان بن قتا نے بہت سے طویل نوحے اور نظمیں تصنیف کیں۔ علامہ ابن شہر آشوب کے مطابق جناب عتبہ بن عمیق نے عربی زبان میں پہلا باضابطہ مرثیہ لکھا۔ جب ذکر شہادت ایران پہنچا تو فارسی زبان میں ذکر شہادت پر سب سے پہلی منظوم تصنیف ملا واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہداء" قرار پائی۔ اس کے اقتباسات صدیوں تک ایران کے علاوہ ہندوستان میں بھی پڑھے جاتے رہے۔ شمالی ہند میں فضل علی فضلی کی "دہ مجلس" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے منظوم و منثور اردو ترجمے مجالس عزاء کی زینت بنتے رہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں

مرثیوں کو عروج ملا تو مرثیہ خوانی کو مجالس محرم میں بڑی ہردل عزیزی اور غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔

برصغیر کے مسلمانوں کی محبوب زبان اردو ہے جس کی نثر و نظم دونوں پر ذکر شہادت کی چھاپ نہایت واضح اور گہری نظر آتی ہے۔ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ذکر شہادت کی بدولت جتنا ادبی سرمایہ اردو کو نصیب ہوا وہ کسی اور زبان و ادب کو کسی ایک واقعہ کے ضمن میں آج تک میسر نہ آسکا۔ بعض ادبی مورخوں اور محققوں کا کہنا ہے کہ اردو زبان میں جو اشعار سب سے پہلے کہے گئے وہ واقعہ کربلا اور شہادت عظمیٰ ہی سے متعلق تھے۔(۱) اور یہ صداقت بھی ناقابل تردید ہے کہ اردو زبان و ادب کا منبع و ماجا اکبر آباد (آگرہ) ہی ہے۔

اردو کا نشوونما

اردو کے مختلف ناموں اور اس کے مولد کے سلسلے میں اہل ادب اور ماہرین لسانیات کے مختلف مباحث اور نظریات ہیں جن میں سے کسی ایک پر بھی مکمل اتفاق نظر نہیں آتا۔ تفصیلات و جزئیات سے قطع نظر اردو کے مختلف ناموں میں ہندی، ہندوی، ریختہ، اردو، اردوئے معلیٰ، گجری اور دکنی تک شامل ہیں لیکن اردو کے تمام مستند اور معتبر شاعروں اور ادیبوں نے فصیح اور شستہ اردو کے لئے ریختہ کا لفظ پسند کیا ہے۔ جہاں تک اردو کی ابتداء فروغ اور ارتقاء کا تعلق ہے مختلف علاقوں کے ضمن میں مختلف و متعدد دعوے ہیں۔ جن میں سے اکثر محتاج دلیل و ثبوت ہیں۔ اکبر آباد اور نواح اکبر آباد کے سلسلے میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ سلاطین دہلی کے دور اور شاہان مغلیہ کے عہد کا ایک اہم تاریخی شہر و علاقہ اور ثقافت و حکومت کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔ ذرا غور

کہئے کہ اردو کے باوا آدم اور طوطی ہند حضرت امیر خسرو تھے۔ (جو دراصل نواح آگرہ کے ایک موضوع پٹیالی میں پیدا ہوئے تھے) اور آج بھی اردو کے ابتدائی شیریں نمونوں کے لئے جن کا تعلق تقریباً سات سو سال قبل سے ہے ہمیں امیر خسرو کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کتاب "ہندی زبان کے مسلمان شاعر" مصنف سہیل بخاری میں لکھا ہے کہ "امیر خسرو کا اصل نام ابوالحسن تھا آپ ۶۰۵ہجری بمطابق ۱۲۳۷عیسوی میں موضع پٹیالی ضلع ایٹہ(نواح آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے غیاث الدین بلبن سے لے کر قطب الدین مبارک شاہ تک گیارہ شاہان دہلی کا زمانہ دیکھا۔ آپ کی وفات ۱۳۲۵ء میں ہوئی۔ یہ حقیقت ڈاکٹر وحید مرزا اور عبدالرؤف عروج نے بھی امیر خسرو پر اپنی تحقیقی کتابوں میں صراحتاً" بیان کی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہی دراصل اردو ریختہ کے بانی قرار پائے ہیں۔ اس طرح اردو کی ابتدا ہی ریختہ سے ہوئی اس کے استادان فن میں میر و غالب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ مرزا غالب اکبر آبادی نے خود کہا تھا کہ

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

مرزا غالب کے پیش رو میاں ولی محمد نظیراکبر آبادی تھے جن کو اردو شاعری کا شیکسپیئر مانا گیا ہے اور ان کی زبان کو اردو کی ٹکسالی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ تینوں اردو شعروادب کے عظیم ترین معمار تھے اور ان کا تعلق سرزمین اکبر آباد(آگرہ) سے ہی تھا۔ جس نے مشفق ماں کی طرح اردو کی پرورش کی اور پروان چڑھایا۔

"گلزار نظیر" مرتبہ سلیم جعفر شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۵۱ء میں درج ہے کہ مولوی سید علی حیدر طباطبائی کسی شاعر کو اس خطے سے منسوب

کرنا چاہتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوا اور زبان سیکھی۔ موصوف نے لکھا ہے کہ "میر اور غالب دونوں بزرگ اکبر آبادی ہیں۔ یعنی زبان آنے (سیکھنے) کی عمر دارالسلطنت اکبر آباد میں گزری" (۲) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی نے غالب کو تحریر کیا "سابقا" مستقرا الخلافہ اکبر آباد ناز اقرار اش سرگرم کبروبود۔ اکنوں دارالخلافہ شاہجہان آباد بدیں نسبت غیرت افضائے صفہان و شیراز" خود غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "امجد علی شاہ کے آغاز سلطنت میں ایک صاحب وارد اکبر آباد ہوئے تھے۔ میرے ہاں ایک دو بار آئے تھے پھر وہ خدا جانے کہاں چلے گئے اور میں دلی آرہا" مولوی محمد حسین آزاد نے میر تقی میر کے بارے میں تحریر کیا کہ "باپ کے مرنے کے بعد دلی میں آئے" گلشن بے خار میں شیفتہ دہلوی شاگرد غالب نے لکھا "میر از اہل اکبر آباد است دو بدوں حال شہجہاں مرفت' تمتع' نہ یافت' ناکام' برگشتہ' در لکھنؤ گزرانید"

"اب اگر غالب کو دہلوی کہو تو میر کو لکھنوی کہنا ضروری ہے مگر ان دونوں کی زبان یہ کہہ رہی ہے کہ نہ وہ دہلوی ہیں نہ یہ لکھنوی' انصاف یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ اکبر آباد کے لئے مایہ فخروناز ہیں۔" ماضی قریب میں جناب اعجاز حسین صدیقی مدیر ماہنامہ "شاعر" نے اپنے رسالے میں چند شاعروں کے حالات لکھتے ہوئے اس کا ان لفظوں میں اعادہ کیا ہے کہ "اس دور میں نظریہ وطنیت بدلتا جارہا ہے اور وطنی نسبت کی جکڑ بندیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ایک عالمگیر رشتے کو دنیا محسوس کر رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظریہ وطنیت ہماری زندگی اور تعلقات کو ایک محدود ماحول میں لا کھڑا کر دیتا ہے لیکن یہ بھی تو نہ ہونا چاہئے کہ شمال سے تعلق ہو تو جنوب بتلایا جائے اور جنوب کے پروردہ لوگوں کو شمال سے منسوب کیا جائے یا تو وطنی نسبت قطعی ہونا ہی نہیں چاہئے اور اگر کوئی اس کو روا رکھے تو وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہو۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں نے مدتوں غالب کو دہلوی اور میر کو لکھنوی کہا

لیکن اب اس تاریخی غلطی کا احساس ہوتا جارہا ہے اور ان دونوں استادوں کو اکبر آبادی ہی لکھا جانے لگا ہے"(۳) مخمور صاحب (سادات شاہ گنج آگرہ کے سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی) رقم طراز ہیں کہ۔

"نظیر کی زبان اکبر آباد کی خالص قدیم زبان ہے اور یہ ہی ٹکسالی اردو ہے آگرہ میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ نظیر کی زبان کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ نظیر کی زبان کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ وہ کسی ضرورت میں ان مقامات کی زبان کی دست نگر ہے۔ نظیر متقدم اور بہت پرانے زمانے کے شاعر ہیں اس لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی زبان جنس عالی ہے اور دیگر مقامات کے مدعیان زبان کی زبانیں اس کی انواع ہیں۔ یہ بین ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ متاخرین نے آنکھ کھول کر جس زبان کو دیکھا وہ نظیر کی زبان تھی۔ انہوں نے اس کو اصل قرار دے کر ترامیم اور اصلاحات کیں اس لئے دہلی اور لکھنؤ کی شستہ زبانیں اکبر آباد کی قدیم زبان کی ارتقائی شکلیں ہیں اور نظیر کی زبان کو خاندان اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اردو شعراء میں ولی دکنی کو اور بنی نوع انسان میں حضرت آدمؑ کو ہے۔(۴) مقالات طباطبائی مرتبہ اشرف رفیع مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۸۳ء صفحہ نمبر ۱۳۹ کے بموجب اہل دہلی اور اہل شہر نیز دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نظم طباطبائی نے تحریر کیا "فیض آباد اور آگرہ دونوں شہر لکھنؤ اور دلی سے کوسوں دور ہیں لیکن اردو زبان وہاں کی اردوئے معلی ہے۔ شاید اتنا بھی اختلاف نہ نکلے جتنا دہلی اور لکھنؤ کا لکھا گیا ہے۔"

دبستان اکبر آباد

بجا طور پر آگرہ و نواح آگرہ کا علاقہ اردو کا گہوارہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ضلع آگرہ، ضلع متھرا اور ریاست بھرت پور کے علاقوں پر مشتمل وہ خطہ ہے جس کو برج بھاشا کا ماخذ مانا گیا ہے۔ اکبر آباد (آگرہ) کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے مطابق اردو کی نشو و نما اکبر اعظم کے عہد میں اس کے دار السلطنت اکبر آباد اور نواح اکبر آباد میں ہوئی۔ اس نے ترقی کے منازل عہد شاہجہانی میں طے کئے اور اب وہ اس قابل ہو گئی کہ جملہ ادبی اغراض میں کام دے سکے۔ (۵) مرزا اختر حسین نے لکھا کہ یہ ہی سرزمین (اکبر آباد) ہے جہاں عہد مغلیہ میں اردو نے جنم لیا، قصر اردو کی بنیادیں رکھی گئیں، اردو کے نام سے زمانے کے کان پہلی مرتبہ آشنا ہوئے اور اس نے دیدہ زیب لباس پہن کر دنیا کی حیرت زدہ نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ (۶) سرزمین اکبر آباد و نواح نے شرف الدین مضمون، میر سجاد، نظیر، میر غالب، سراج الدین علی خان آرزو، حاتم علی مہر، عنایت علی ماہ، مرزا مظہر جانجاناں، مرزا جعفر علی فصیح، گلزار علی اسیر، بقا اللہ بقا، ملا شیدا، جرات، مفتون، رئیس، ولگھو، منیر شکوہ آبادی، نسیم بھرت پوری، بزم آفندی، علامہ سیماب اکبر آبادی، نجم آفندی، صبا، ممکش اور علی سردار جعفری جیسے باکمال شعراء اور اساتذہ فن پیدا کئے جنھوں نے ہر صنف سخن میں قیمتی سرمایہ ادب چھوڑا اور اپنی شاعرانہ عظمت کو منوایا۔

حضرت نجم آفندی نے دبستان آگرہ کے بارے میں ایک طویل نظم (مسدس) بعنوان دار الادب اکبر آباد تصنیف فرمائی جس کے چند بند درج ذیل ہیں۔

اے دیار آگرہ اے ہند کے دارالادب
بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و منتخب
مدفن شاہ جہاں اردو کی خلقت کا سبب

تجھ سے ملتا ہے جہاں میں نسل اردو کا نسب
کیوں نہ ہو آفاق میں پھر تیری ہستی لاجواب
چھانٹ لے جب تجھ کو اکبر کی نگاہ انتخاب

ہیں زبانوں پر تیری رونق کے افسانے بہت
شمع رو تھے سینکڑوں تجھ میں تو پروانے بہت
اس ڈھلے جوبن پہ بھی نکلیں گے دیوانے بہت
بن گئے ہیں تیرے میخانے سے میخانے بہت

خوبیاں سب مٹ چکیں بس نام باقی رہ گیا
بانٹ کر سب جام خالی ہاتھ ساقی رہ گیا

تھے نظیر و جرات و مضمون کیا کیا من چلے
کس سے پنہاں ہیں بتا نے جو دکھائے ولولے
وہ ہمارے میر و غالب تیری گودی کے پلے
لکھنؤ دلی کے جن کے نام سے سکے چلے

جان جاناں حضرت مظہر تھے جان آرزو
شاعروں کے قبلہ و کعبہ تھے خان آرزو

دور اول میں کوئی مضمون سے بہتر نہ تھا
آرزو سے دور ثانی میں کوئی بڑھ کر نہ تھا
میر کا دور سوئم میں ایک بھی ہم سر نہ تھا
دور چارم میں کسی کو فوق جرات پر نہ تھا

درحقیقت رشک عرفی فخر طالب ہوگیا
دور پنجم میں تو غالب کل غالب ہوگیا

کیوں تجھے چپ لگ گئی ہے اے میرے ناز آفریں
بلبلیں اب بھی تیرے رنگیں چمن میں کم نہیں
ہنس رہی ہے تجھ پہ دنیا کھول چشم شرمگیں
پھر بتادے سرزمیں کو اپنی چرخ چارم میں
آگ دنیا میں لگادیں وہ شرارے اب بھی ہیں
چاند سورج تھے اگر پہلے ستارے اب بھی ہیں

ہے امانت آج تک قلبوں میں وہ سوز و گداز
ہے وہی اگلا سا حسن و عشق کا راز و نیاز
پھر قیامت ہے تیری یہ خامشی اے محو ناز
بت کدہ کیوں بن گئی محفل تری محفل طراز
بادہ کش لاکھوں ہیں ذوق بادہ پیمائی نہیں
اتنے دیوانے ہیں اور ہنگامہ آرائی نہیں

مٹ گیا کیوں نام تیرا تیری شہرت کیا ہوئی
تیرے فرزندوں کی تجھ سے وہ محبت کیا ہوئی

تجھ سے ہے نقاد شاکی تیری غیرت کیا ہوئی
اک قیامت ہوگئی کم بخت غفلت کیا ہوئی

ایک بلبل نالہ کش ہے جو چمن سے دور ہے
نجم کو کچھ کچھ ہے سودا وہ وطن سے دور ہے

(رسالہ "نقاد" آگرہ جناب نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی کی ادارت میں نکلتا تھا)

اردو شعر و شاعری کو عہد طفلی سے موجودہ بھرپور جوانی تک تقریباً پانچ صدیاں گزری ہیں۔ مذکورہ نظم ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی۔ غالباً اسی لئے حضرت نجم آفندی نے مرزا غالب اکبر آبادی کی وفات تک پانچ ادوار شاعری مختص کئے ہیں۔ لیکن ۱۸۷۰ء سے اب تک تقریباً ۱۲۵ برس کا عرصہ ہوتا ہے لہٰذا اس مدت میں مزید ادوار شاعری کا اضافہ ضروری ہوگیا ہے۔ اس لئے دور ششم ۱۸۷۰ء سے ۱۹۳۵ء تک اور دور ہفتم ۱۹۳۶ء سے موجودہ صدی عیسوی کے آخر تک کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں ادوار شاعری میں بڑے شعرائے اکبر آباد و نواح اکبر آباد کی ایک کہکشاں سی افق ادب پر نظر آتی ہے۔ چھٹے دور میں جناب خادم حسین رئیس اکبر آبادی' جناب سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی' جناب سید شبیر حسین نسیم بھرت پوری اور مرزا عاشق حسین بزم آفندی جیسے باکمال شعراء مسند آرائے ادب دکھلائی دیتے ہیں۔ جنہوں نے غزل' نظم' مرثیہ کے اصناف شعر میں شاندار اضافے کئے اور اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا۔ ساتویں دور شاعری (بیسوی صدی کا نصف ثانی) بھی عظیم شعرائے آگرہ و نواح آگرہ سے خالی نہیں رہا اس زمانے میں بھی بعض شعراء فضائے شعر و ادب پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں علامہ عاشق حسین سیماب' علامہ تجمل حسین نجم آفندی' خواجہ محمد امیر خان صبا اور علی سردار جعفری' ممتاز ہیں جن کی شاعرانہ حیثیت مسلمہ ہے اور ان میں سے ہر ایک

کسی نہ کسی صنف شعر میں اوج ثریا پر متمکن اور منفرد مقام و منزلت پر فائز دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً علامہ سیماب اکبر آبادی نے وحی منظوم جیسا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ حضرت نجم آفندی نے رثائی ادب کو نیا رخ اور جدید مرثیہ کو منفرد لب و لہجہ دیا۔ حضرت صبا اکبر آبادی نے دیوان غالب کی تضمین لکھی اور عمر خیام اور مولانا رومی کی رباعیوں کو اردو کا لباس پہنایا اور جناب علی سردار جعفری نے دیوان غالب کو بھارت کی زبان (ہندی) کے رسم الخط میں چھپوا دیا ہے تاکہ مستقبل بعید میں کلام غالب اسی طرح محفوظ رہ سکے اور آئندہ نسلوں کی ادبی رہبری کر سکے۔

ان ساتوں ادوار میں سے کوئی دور شاعری ایسا نہ ہوا جس میں اکبر آباد و نواح کے بڑے شاعر موجود نہ رہے ہوں۔ یہ تسلسل بذات خود دبستان اکبر آباد کے مسلسل وجود کا بین ثبوت ہے۔

موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں ایک بڑا مشاعرہ دلی میں جناب جالب دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مفتون دہلوی نے غزل کے آخر میں ایک اشتعال انگیز شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرعہ تھا۔

"زبان اردو ہے دہلی و لکھنؤ کے لئے"

حضرت نجم آفندی نے اس کے جواب میں برجستہ یہ قطعہ پڑھا۔

یہ اس سے کہہ دو ہے دعویٰ زبان کا جس کو
ہمارے آگے زباں کھولے گفتگو کے لئے
زبان میر کی ہے میر آگرے کے تھے
مقام فخر ہے دہلی نہ لکھنؤ کے لئے

"اس پر زبردست ہنگامہ ہوا سارے مجمع میں حق بات حضرت سائل دہلوی نے کہی اور اس تلخ صورت حال کا ذمہ دار مفتون دہلوی کو ٹھہرایا کہ

انہوں نے متنازعہ شعر پڑھ کر پہل کی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے (نجم آفندی) کو ڈیڑھ برس تک دہلی کے کسی مشاعرے میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی"(۷) اسی نوعیت کا واقعہ حیدر آباد دکن میں غالباً ۱۸۷۷ء میں رونما ہوا تھا جب جناب احمد خان شیفتہ اکبر آبادی اور وصفی لکھنوی میں نوک جھونک ہو گئی تھی۔ فصیح الملک داغ دہلوی نے اپنے قیام حیدر آباد دکن کے دوران ایک غزل پڑھی جس کا ایک مصرعہ تھا۔

کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اس چوٹ کو جناب شیفتہ اکبر آبادی برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے یہ شعر پڑھا ۔

عجیب شیریں یہ کچھ زباں ہے فصاحت ایسی بھلا کہاں ہے

جو تیرا اے شیفتہ بیاں ہے یہ طرز کس کی ہے گفتگو کا

یہ جناب شیفتہ اکبر آبادی کی عمر کا آخری زمانہ تھا جو میاں نظیر اکبر آبادی کے فرزند جناب گلزار علی اسیر کے شاگرد تھے اور یہ واقعہ ۱۳۰۵ھ کا ہے"(۸) ان دونوں واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ زبان دانی کا جب بھی اور جہاں بھی متکبرانہ دعویٰ کیا گیا کسی نہ کسی اکبر آبادی شاعر نے اس کا برجستہ جواب دینے میں مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا۔ دہلی اور حیدر آباد دکن کے دونوں واقعات سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ دبستان اکبر آباد کو سبک گرداننے اور باکمال شعرائے آگرہ کی تضحیک کا معاندانہ رویہ ہمیشہ سے بعض ادبی حلقوں کا وتیرہ رہا ہے۔ حالانکہ یہ سچائی تسلیم کرنا حق پسندی ہو گی کہ اردو ادب کے یہ تینوں مراکز یعنی آگرہ، دہلی اور لکھنؤ مختلف ادوار میں ایک دوسرے سے متاثر رہے ہیں اور اردو شعرو

ادب کی ترقی میں ان تینوں کا حصہ ہے۔ جناب سید محمود الحسن رضوی ابن الشہید نے بالکل حق بات کہی ہے کہ "لکھنؤ' دہلی اور اکبر آباد کی ادبی برتری کے دعوے سے قطع نظر اس صداقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اردو کی ترقی کے یہ تینوں مراکز مختلف زمانوں میں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہے ہیں مثلاً میر تقی میر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ نشو نما پائی اور بھرت پور میں ملازمت کی اور دہلی و لکھنؤ میں جوانی و پیری گزاری اس لئے دہلی اور لکھنؤ نے میر سے گہرے ادبی اثرات لئے اور ان کی زبان و اسلوب سے فیض یاب ہوئے۔(۹) گویا یوں بھی دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں پر دبستان اکبر آباد کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

دبستان اکبر آباد کا امتیازی تشخص

دارالادب آگرہ کی انفرادیت کو ہر غیر جانبدار اور سلیم الطبع مورخ و محقق ادب نے تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے لکھا ہے کہ "تاج محل کا شہر اکبر آباد اردو زبان کا ہمیشہ سے ایک بڑا مرکز رہا ہے وہاں کے گلی کوچوں کی زبان بے ملاوٹ اور ایسی صاف ستھری ہے کہ سنئے تو دل کی کلی کھل جائے۔ عورتوں کی زبان میں وہ تیزی اور ٹکسالی پن کہ شاید ہی کسی اور شہر میں ایسی زبان سننے میں آتی ہو۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جو بڑا شاعر گزرا اس کا تعلق عام طور سے اکبر آباد سے ضرور نکلا۔ میر اگر اکبر آباد کے نہ ہوتے تو ان کی زبان میں اتنی مٹھاس نہ ہوتی جو آج بھی ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ سراج الدین علی خان آرزو' مرزا مظہر جان جاناں' نظیر اور غالب وہ شاعر ہیں جنہوں نے اکبر آباد کی زبان سے اردو زبان کو وہ رنگ روپ دیا کہ حریفوں نے بھی اس

کی عظمت کو تسلیم کیا۔ سیماب اکبر آبادی مغلوں کے اسی عظیم تہذیبی شہر کے باسی اور بیسویں صدی عیسوی میں اس عظیم روایت شاعری کے وارث تھے" (۱۰) ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے تحریر کیا کہ "آگرہ خود ایک اہم مرکز ادب تھا جس کی سرزمین سے نظیر، میر اور غالب جیسے عظیم شاعر ابھرے" (۱۱) پروفیسر سحر انصاری رقم طراز ہیں کہ "اکبر آباد (آگرہ) کی نسبت سے میر اور غالب کی بابت تاریخ ادب کے صفحات اب بھی جگمگا رہے ہیں اور آئندہ بھی جگمگاتے رہیں گے۔" (۱۲) علامہ طالب جوہری نے لکھا ہے کہ "اکبر آباد کا تاریخی شہر اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ اس نے اردو شاعری کی تعمیر میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ دبستان دہلی پر نظر ڈالئے تو وہاں کے مشاہیر دراصل اکبر آباد کے ماحول کے پروردہ تھے۔ نظم نگاری کا سنگ بنیاد اسی شہر کے شاعر نے نصب کیا جو اپنی اختراعی صلاحیتوں میں بے نظیر تھا۔ اردو مرثیہ کے جدید دور میں نجم آفندی کی شخصیت سامنے آتی ہے جنہوں نے مرثیہ کو اس کا بنیادی لہجہ دیا اور اسی دبستان اکبر آباد کے ایک ممتاز شاعر صبا اکبر آبادی اس صنف شعر میں اپنے عصر کی اعلیٰ نمائندگی کر رہے ہیں۔" (۱۳) ڈاکٹر محمد شمس الدین نے اکبر آباد کی اساسی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "اکبر آباد جو مغلوں کی تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ اس کی مرکزی حیثیت میں فرق پڑتا جا رہا تھا لیکن بیسویں صدی کی انقلابی ترقی کا اثر آگرہ کی شاعری اور صحافت کے حلقوں میں بھی دوسرے بڑے شہروں کی طرح شدت سے محسوس کیا گیا۔ اکبر آباد کی سرزمین کو ادبی لحاظ سے تو ایک مردم خیز خطہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ یہاں سے نظیر، میر، غالب، سیماب، نجم آفندی، اور صبا کا خمیر اٹھا ہے لیکن صحافت کے تعلق سے بھی آگرہ برصغیر کے کسی شہر سے پیچھے نہیں رہا۔ اردو کی بیشتر علمی اور ادبی کتابیں آگرہ ہی کے چھاپہ خانوں میں چھپتی رہیں۔ اکبر آباد سے باقاعدگی کے ساتھ جو رسائل و

جرائد شائع ہوئے ان میں پربھودیال شام اکبر آبادی اور فریدالدین گوہر کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ "گلدستہ" تھا جس کو اولیت کا اعزاز حاصل ہوا۔ ادبی رسائل جو یہاں سے شائع ہوئے ان میں شاہ ولکھو اکبر آبادی کا "نقاد" علامہ نیاز فتح پوری، مخمور اکبر آبادی اور حسن عابد جعفری کا مشترکہ ماہنامہ "نگار" مولانا سید مبارک علی رضوی کا اخبار "الناظر" حسن عابد جعفری بیرسٹر کا رسالہ "شمع" اور علامہ سیماب کے فرزند اعجاز صدیقی کا رسالہ "شاعر" ممتاز تھے۔(۱۴) علاوہ ازیں آگرہ سے ماہنامہ "مشورہ" بھی نکلتا رہا جس کا خصوصی ضخیم شمارہ "آگرہ نمبر" جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا جو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل تھا اور جس میں دبستان اکبر آباد اور بڑے شعرائے آگرہ کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا تھا۔"(۱۵)

آگرہ - دہلی کا شعری تعلق

موقر ماہنامہ "نگار" لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۳۵ء صفحات ۲۰۳ تا ۲۰۶ میں علامہ سیماب اکبر آبادی کا ایک مضمون عنوان بالا کے تحت چھپا تھا خلاصہ یہ ہے کہ "آگرہ و دہلی کا ادبی تعلق تین حیثیتوں سے واضح ہوتا ہے۔ جغرافیائی حیثیت، تاریخی حیثیت اور دہلی کے شباب وشاعری میں اکبر آبادیوں کا حصہ کتنا جاندار رہا۔ جغرافیائی حیثیت سے لکھنؤ دہلی اور آگرہ کچھ عرصے قبل تک ایک ہی صوبے (آگرہ و اودھ) کے تین اہم شہر تھے جو ادبی مراکز بھی رہے۔ آگرہ ان دونوں (دہلی و لکھنؤ) کے وسط میں واقع ہے اس لئے آگرہ سے دہلی و لکھنؤ کو وہی تعلق ہے جو کسی نہال کے برگ بار کو اس کی اصل سے ہوتا ہے اس لئے دہلی لکھنؤ اور آگرہ جو ایک ہی زنجیر کی تین کڑیاں ہیں، کو ایک دوسرے سے لسانی اعتبار سے مربوط ہونا چاہئے۔ تاریخی توضیح کے مطابق

آگرہ سکندر لودھی ' ابراہیم لودھی ' بابر ' ہمایوں ' اکبر ' جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد تک ہندوستان کا دارالحکومت رہا۔ اردو زبان ان میں سے آخرالذکر تین بادشاہوں کے زمانے میں ہندی ' فارسی ' عربی اور ترکی زبانوں کے اختلاط سے بنی۔ (کتاب ظہیرالانشا کے بموجب شہنشاہ اکبر کے عہد میں جو زنانہ و مردانہ بازار قلعہ آگرہ میں لگتا تھا اسے اردو کہتے تھے شاہجہاں نے اس کو مزید ترقی دی۔ چونکہ یہ شاہی بازار اردوئے معلی کہلاتا تھا اس لئے اس نئی زبان مرکب کا نام اردوئے معلی رکھا گیا) اس بیان محقق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس مخلوط زبان (اردو) کی بنیاد سب سے پہلے قلعہ آگرہ میں پڑی۔ وضع زبان کے بعد پہلے بھاشا (اردو ہندی) میں شاعری کا رواج ہوا اور پھر اردو شاعری وجود میں آگئی۔ عہد اکبری سے عہد شاہجہانی تک فارسی شاعری زیادہ مروج و مقبول رہی" علامہ سیماب نے مزید لکھا کہ "اس تمام زمانے میں بھی اکبر آبادی الاصل شعراء موجود رہے مثلاً شیخ ابوواجد فارغی ' علامہ فیضی ' میر حشمی ' علامہ صبوحی چغتائی ' ملا شیدا ' محمد امین ذوق ' عبداللہ سحری وغیرہ لیکن اردو شاعری کا رواج بتدریج اورنگزیب عالمگیر کے عہد سے شروع ہوتا ہے عہد شاہجہانی میں جب پایہ تخت آگرہ سے دہلی منتقل ہوگیا تو آگرہ کے شعراء اور ادباء نے بھی دہلی کا رخ کیا حتی کہ جب کاروان ادب دہلی سے لکھنؤ پہنچا تو میر کارواں میر تقی میر اکبر آبادی ہی تھے۔ اگر اورنگ زیب کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل ' میر جعفر زٹلی اور نواب لطف اللہ صادق وغیرہ نے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا تو عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خان آرزو اکبر آبادی اور مرزا مظہر جان جاناں اکبر آبادی آگرہ کی شاعرخیز مٹی سے اٹھے اور دہلی میں صدرالصدور بن کر بیٹھے۔ شاہ مبارک آبرو جن کی عمر کا بڑا حصہ اکبر آباد میں گزرا تھا ' عہد عالمگیر ثانی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ عہد محمد شاہی (۱۷۳۰ء) میں میر باقر علی مخلص اکبر آبادی نے دہلی ہجرت کی اور یہاں

کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیئے۔ شرف الدین پیام اکبر آبادی جو خان آرزو کے ارشد تلامذہ میں تھے، اسی زمانے میں آگرہ سے دہلی آئے اور دہلی کے ہی ہو رہے۔ میاں نظام الدین ممنون اکبر آبادی کے بھائی میر جعفر اکبر آبادی آخری عمر میں آگرہ سے دہلی منتقل ہوئے - میر باقر علی حزیں اکبر آبادی جو سادات آگرہ سے تعلق رکھتے تھے اور مرزا مظہر جان جاناں کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے آگرہ سے دہلی اور یہاں سے بنگال تشریف لے گئے۔ میر تقی میر جو خان آرزو کے بھانجے اور میر عبداللہ اکبر آبادی کے بیٹے تھے آگرہ میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت پائی اور شعر کہنا سیکھا۔ باپ کی موت کے بعد دہلی چلے گئے اور دہلی کے اجڑنے پر دوسرے شعراء کی طرح لکھنؤ کو آباد کیا۔ عارف اکبر آبادی جو میر کے دوست اور شرف الدین مضمون اکبر آبادی کے شاگرد تھے، ترک وطن کر کے دہلی چلے گئے" (مضمون کا مولد موضع جاجنو ضلع آگرہ تھا)

علامہ سیماب اکبر آبادی نے مزید تحریر کیا ہے کہ "مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مرزا غالب اکبر آبادی بھی تعلیم و تربیت اور کافی مشق سخن کے بعد اکبر آباد سے دہلی پہنچے تھے۔ مرزا سودا کے شاگرد شاہ نصیر اور ان کے شاگرد ابراہیم علی ذوق دہلوی کی موجودگی میں مرزا غالب اکبر آبادی نے اپنا پرچم سخن لہرایا کہ حریف بن کر کوئی ان کے مقابل نہ ٹھہر سکا۔ ۱۸۶۹ء میں مرزا غالب کی وفات تک آگرہ و دہلی کا یہ شعری رشتہ قائم رہا یعنی آبرو اکبر آبادی، جعفر اکبر آبادی، حزیں اکبر آبادی، میر اکبر آبادی، عارف اکبر آبادی اور غالب اکبر آبادی سب کے سب آگرہ کی ہی خاک پاک کے تربیت یافتہ تھے جو آگرہ میں ہی پیدا ہوئے، آگرہ میں ہی پروان چڑھے، آگرہ ہی میں شاعر بنے اور پھر دہلی کی مرکزیت نے اپنی طرف کھینچ کر انہیں تاریخ و ادب کا ہیرو بنا دیا۔ یہ فقط میرا خیال یا بیان نہیں ہے بلکہ اس کی مکمل

تائید نکات الشعراء' ماصر الامراء آب حیات ' تصویر الشعراء' مخزن نکات' منتخب التواریخ' ظہیر الانشاء ' مراۃ العالم اور گلشن بے خار جیسی کتابوں سے ہوتی ہے۔" آگرہ و دہلی کے شعری تعلق کی تجدید انیسویں صدی کے اواخر میں علامہ سیماب سے ہوئی اور موصوف نے اس ٹوٹے ہوئے سلسلے کو پھر سے جوڑ دیا۔ اب آگرہ اسکول کو ایک ممتاز ادارہ فکر تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ اس کے مجدد اور بہت بڑے مبلغ علامہ سیماب ہی تھے۔

دبستان اکبرباد کا امتیازی تشخص ہر دور شاعری میں برقرار رہا اور سترہویں صدی سے موجودہ صدی عیسوی کے اواخر تک ہر زمانے میں بڑے شعرائے آگرہ کی موجودگی کے باعث باقی رہا۔ اس ضمن میں چند موقر حوالے پچھلے صفحات میں ہم پیش کر چکے ہیں مزید تاثرات و اعترافات درج ذیل ہیں۔

جناب الطاف علی بریلوی نے لکھا ہے کہ "ارض تاج" (اکبر آباد) برصغیر پاک و ہند کا وہ قدیم شہر ہے جہاں لاتعداد تاریخی اہمیت رکھنے والی شخصیتوں نے جنم لیا۔ تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں(۱۶) حضرت مسکش اکبر آبادی نے تقسیم ہند سے قبل کی صورت حال کے حوالے سے تحریر کیا کہ "یہ زمانہ آگرہ کی مسلم تہذیب کی بھری بہار کا عہد نہ تھا پھر بھی بہار کے بہت کچھ آثار باقی تھے۔ یہاں عالموں' دانشوروں' ادیبوں' شاعروں' مصنفوں ' وکیلوں' سیاسی رہبروں اور دولت مندوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی کہ اگر ان کے فقط نام گنوائے جائیں تو فہرست بڑی طویل ہو جائے گی۔"(۱۷) جناب ظہور اکبر آبادی نے اسی "ریاض نمبر" میں "شمع علم" کے عنوان کے تحت لکھا کہ " جب سلطنت مغلیہ کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر جلوہ ریزیاں کر رہا تھا تو اکبر آباد حکومت کا مستقر تھا۔ تشنہ گان علم و فن اسی کے سرچشمہ علم سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ہندوستان اور ایران کی سرکاری زبان کی یکسانی سے بقول علامہ شبلی ہندوستان اور ایران ایک ہی

مکان کے دو صحن بن گئے تھے۔ مغلوں کی علم دوستی اور سرپرستی نے اکبر آباد کو ہندوستان کا "جامعہ الازہر" اور قرطبہ بنا دیا تھا کوئی بڑا شاعر، کوئی بڑا ادیب، کوئی بڑا فنکار اس وقت تک درجہ اسناد و قبولیت حاصل نہیں کر سکتا تھا کہ جب تک سرزمین اکبر آباد پر زانوائے ادب طے نہ کر لے۔ ملک الشعر کلیم، طالب آملی، سلیم، عرفی، نظیری اور قدسی وغیرہ آگرہ کی علم پرور فضاؤں میں رہ کر ہی شہرہ آفاق شاعر بنے۔ دستبرد زمانہ سے سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہوئی تاہم عاشقان علم نے شمع علم کو فروزاں رکھنے کی بھرپور کوشش کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر و غالب اور نظیر و اسیر اسی گلشن علم کے گل ہائے نکہت آفرین ہیں۔ یہاں تک کہ آخری ادوار بھی اساتذہ کرام اور بڑے شعراء و ادباء سے خالی نہ رہے۔ جناب خادم حسین رئیس، مولانا سید نیاز علی نیاز، حضرت بزم آفندی، حضرت نجم آفندی، سیماب اکبر آبادی، جناب عالی، جناب صبا، جناب شوخ، جناب میکش، جناب رعنا، جناب عابد آغائی جیسے شعرا نیز جناب ل احمد، جناب مخمور، شاہ دلگیر، حافظ امام الدین، بیرسٹر سید حسن عابد جعفری، مولانا سعید احمد، مولانا حامد حسن قادری اور مفتی انتظام اللہ شہابی جیسے ادیبوں اور عالموں نے شمع علم و ادب کو روشن رکھا۔(۱۸) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تقریظ میں لکھا کہ "اکبر آباد (آگرہ) چار وجہ سے مشہور ہے۔ اول یہ کہ آگرہ تاج محل کا شہر ہے...... دوئم یہ کہ اکبر آباد ان عظیم شاعروں کا مولد ہے جن کا نام آج بھی اردو شاعری کی آبرو ہے...... تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ صدیوں سے عظیم مسلمان بادشاہوں کا مرکز حکومت و ثقافت رہا ہے...... اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمیشہ سے اردو زبان و ادب کا ایک بڑا مرکز رہا ہے اور یہاں کے لہجہ و محاورے میں ایسی دل آویز گھلاوٹ اور ذائقہ ہے کہ دوسرا شہر اس کو نہیں پہنچتا۔ شاعری یہاں کی فضا میں ایسی رچی بسی ہوئی ہے کہ جیسے پھول میں خوشبو ہوتی ہے۔"(۱۹) حضرت نجم آفندی نے اپنی خود

نوشت سوانح عمری مطبوعہ مجلہ النجم میں لکھا ہے کہ "آگرہ ہمیشہ سے اردو ادب کا ایک بڑا مرکز رہا ہے مگر اس کو ہمیشہ نظرانداز کیا گیا۔"

ڈاکٹر سرور اکبر آبادی نے علامہ سیماب کی عظیم شاعرانہ منزلت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ فی الاصل علامہ سیماب کو ان کا وہ مقام جس کے وہ مستحق تھے، محض اس لئے نہ مل سکا کہ وہ دہلی اور لکھنؤ کی طرح اکبر آباد کا دبستان شاعری قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ (سیماب) ان (شعرائے دہلی و لکھنؤ) کے مدمقابل ہونا چاہتے ہیں(۲۰) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی نے نظیر اکبر آبادی کے انتقال کے چند سال بعد "گلشن بے خار" تصنیف کی تھی جس میں نظیر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا تھا اور بعض باکمال شعرائے اکبر آباد کو قطعی نظرانداز کردیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں حکیم قطب الدین باطن اکبر آبادی نے "گلشن بے خزاں" ۱۲۶۵ھ کے لگ بھگ لکھی اور اس میں مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی پر علاقائی عصبیت اور دہلی پرستی کا جو الزام لگایا وہ بالکل حق بجانب تھا۔

نامور محقق ادب ڈاکٹر سید عبداللہ نے تسلیم کیا کہ "مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی نے اکبر آباد کے بعض ایسے باکمال شعراء کو نظرانداز کردیا جن کی شاعرانہ عظمت کی آج دنیا معترف ہے۔"(۲۱) جناب مجنوں گورکھپوری نے تحریر کیا کہ "نظیر کی طرف اب لوگوں کی توجہ جارہی ہے اور اب یہ آواز سننے میں آنے لگی ہے کہ نظیر اکبر آبادی تنہا اپنی ذات میں ایک دبستان تھے۔"(۲۲) ڈاکٹر طلعت حسین نقوی نے لکھا ہے کہ تقریباً سو برس تک شرفائے ادب کی نگاہوں میں کھٹکتے رہنے کے باوجود گزشتہ پچاس برس کی مدت میں نظیر اکبر آبادی کو حسن قبول کی جو سند ملی ہے وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جوہر قابل کو کبھی نہ کبھی زمانہ پہچانتا ضرور ہے۔"(۲۳) لہٰذا وقتی طور پر کسی دبستان شاعری اور اس کے باکمال سخنوروں کو نظرانداز کردینے سے

ہمیشہ کے لئے ان کی عظمت کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ دبستان آگرہ اور اس کے مسلم الثبوت اساتذہ کی منزل گھٹانے یا دانستہ چشم پوشی اختیار کرنے سے ان کی استادانہ حیثیت کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان کے بعض ادبی حلقوں کی تنگ نظری اس لئے بھی لائق مذمت ہے کہ اس طرز عمل سے ادب کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس روش کی واضح مثال حال ہی میں شائع ہونے والی ضخیم کتاب "بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ" ہے جس کے مولف نے بڑے مرثیہ گو شعراء میں نواح آگرہ کے سید شبیر حسین نسیم بھرت پوری کو عمداً" نظرانداز کردیا۔ نیز مولف نے جدید اردو مرثیہ کے چار معمار مختص کئے ہیں یعنی جوش ملیح آبادی' جمیل مظہری' آل رضا لکھنوی اور نسیم امروہوی۔ اس حلقے سے علامہ نجم آفندی اور حضرت صبا اکبر آبادی جیسے عظیم مرثیہ نگاروں کو باہر رکھا گیا ہے جب کہ ادبی مورخوں اور محققوں نے ان دونوں کو جدید مرثیہ کا اہم ستون قرار دیا ہے مولف کے ممدوح حضرت نسیم امروہوی اپنی تعزیتی نظم میں خود اعتراف کرچکے ہیں کہ

اس کا نہیں کوئی سہیم جوش و رضا ہوں یا نسیم
سب کو پیام انقلاب شاعر اہلبیت نجم

اس لئے ہر اعتبار و معیار کے مطابق علامہ نجم آفندی اور حضرت صبا اکبر آبادی جدید اردو مرثیہ کے عظیم معماروں میں شامل کئے جانے کے مستحق ہیں۔ لہٰذا ہم چار کے بجائے سات معمار قرار دیتے ہیں یعنی جوش ملیح آبادی عزا عروج بھرت پوری، راجہ محمود آباد' سید آل رضا لکھنوی' نسیم امروہوی' نجم آفندی اور صبا اکبر آبادی۔

دبستان اکبر آباد کے باکمال شعراء کے خلاف بعض ادبی حلقوں کی عصبیت اور اغماض کے ضمن میں جناب حمایت علی شاعر کا ایک محققانہ

مضمون "ایک بڑے شاعر کا المیہ" قابل توجہ ہے۔ اس طویل مضمون مطبوعہ "افکار کراچی" نومبر ۹۲ء جو ۷۲ تا ۸۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے' کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

موصوف نے لکھا ہے کہ "۱۹۷۱ء میں صبا اکبر آبادی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "اوراق گل" شائع ہوا۔ قیام پاکستان سے قبل آپ (صبا اکبر آبادی) کا عزائیہ کلام ۱۹۳۸ء میں تحریک پاکستان سے متعلق نظموں کا ایک مجموعہ "زمزمہ پاکستان" ۱۹۴۶ء میں چھپ چکے تھے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ تحریک پاکستان سے متعلق شعری ادب میں صبا کی کسی نظم کا حوالہ نہیں ملتا جب کہ معین الدین عقیل کا تحقیقی مقالہ "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" مطبوعہ ۱۹۶۷ء جو ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی کہیں صبا کا ذکر نہیں حالانکہ متعدد غیر معروف شعراء اپنے کلام کے ساتھ موجود ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد بہت سی ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۵ء تک ملی اور رزمیہ شاعری کا انتخاب شامل ہے۔ مثلاً "نشید حریت" مرتبہ شان الحق حقی میں شاہ حاتم سے بشیر فاروق تک ایک سو دس شعراء کی دو سو گیارہ نظمیں شامل ہیں۔ مگر صبا کی ایک نظم بھی نہیں ہے اسی طرح "نوائے پاک" اور "خیابان پاک" مرتبہ محمد اکرام و حمید نسیم اور "قومی نظمیں" مرتبہ علی مظہر رضوی میں بھی صبا کا نام غائب ہے۔ ادبی حلقوں کی یہ روش یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ آخر ان (صبا اکبر آبادی) کے کلام سے یہ کتابیں کیوں محروم ہیں۔" جناب حمایت علی شاعر نے مزید تحریر فرمایا کہ "۱۹۶۷ء میں حیدر آباد سندھ سے "نئی قدریں" کا شاعر نمبر مرتبہ اختر انصاری اکبر آبادی شائع ہوا تو اس میں صبا اکبر آبادی پر ابو ظفر صہبا کا مضمون پڑھ کر معلوم ہوا کہ قیام پاکستان سے قبل موصوف (صبا) دیوان غالب کی مکمل تضمین جیسا عظیم کارنامہ انجام دے چکے تھے۔ اس کا تذکرہ مولانا حامد حسن قادری نے "نقد و

نظر" مطبوعہ ۱۹۳۲ء میں کیا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں "مشورہ" آگرہ کا آگرہ نمبر جو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل تھا شائع ہوا۔ اس میں اکبر آباد کی ادبی شاعری اور شاعرانہ زندگی کی پوری تاریخ اور ممتاز شعراء آگرہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا تھا لیکن ہمارا معاشرہ قدر ناشناس معاشرہ ہے۔ اتنی خدمات کے باوجود ان کا نام اردو ادب کے کسی نمایاں تذکرے، کسی تاریخ، کسی جائزے کسی رسالے کے خاص نمبر میں نظر نہیں آتا فروری ۱۹۶۲ء میں نقوش لاہور کا ضخیم "غزل نمبر" شائع ہوا جس میں ۲۷۰۰ غزلیں شامل تھیں مگر صبا اکبر آبادی کی کوئی غزل نہیں تھی۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں فنون لاہور کا "جدید غزل نمبر" شائع ہوا جو ۱۶۷۰ صفحات پر مشتمل تھا اور جس میں علامہ اقبال سے لے کر جدید ترین غیر معروف شاعر اعجاز گل تک ۲۲۷ شعراء کی دس دس غزلیں شامل تھیں لیکن صبا اکبر آبادی کی ایک غزل بھی نظر نہ آئی۔ جب کہ خود احمد ندیم قاسمی کی رائے ہے کہ "صبا اکبر آبادی اس دور کے صحیح معنوں میں قادر الکلام شاعر ہیں۔ غزل کی جتنی بھی روشن روایات ہیں وہ انہیں ساتھ لے کر چلتے ہیں جدید فکر، جدید حسیت اور جدید تناظر سب کے سب ان کے کلام پر پوری خوبصورتی اور ایک تکمیل کے انداز میں عکس پذیر نظر آتے ہیں۔" (قومی زبان جنوری ۹۲ء) ایک بڑے شاعر کی تعریف میں اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ قاسمی صاحب نے ایک طرح سے قدر شناسی کا حرف آخر لکھ دیا ہے مگر۔ صبا اکبر آبادی صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر انور سدید نے بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے رسالہ "شام و سحر" لاہور بابت اپریل ۹۲ء میں لکھا کہ "صبا اکبر آبادی کی وفات پر جب یہ بات بالخصوص کہی جانے لگی کہ قادر الکلامی اور معجز بیانی اور اعلیٰ درجے کے شاعرانہ جوہر کا مالک ہونے کے باوجود انہیں زمانہ حال کی ادبی دنیا میں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ حقدار تھے تو مجھے شدید ذہنی صدمہ ہوا کہ ان جیسے مورخ و محقق ادب کی کتابوں میں صبا اکبر آبادی جیسے قادر الکلام شاعر کا ذکر نہیں۔"

ڈاکٹر انور سدید مزید لکھتے ہیں کہ "انہیں (صبا) کو ان کے عہد نے بھی تسلیم کیا ہے اور مستقبل کو بھی نظیر، میر اور غالب کی طرح اپنا غلام بنا چکے ہیں" ایسے جملے عبارت آرائی کی تعریف میں تو آ سکتے ہیں لیکن ضمیر کا آئینہ نہیں دکھا سکتے۔ ظاہر و باطن کے اسی تضاد نے ہماری تنقید کو حرف حق نہیں بننے دیا۔ گزشتہ پچاس برسوں میں جو ادبی جائزے لئے گئے ہیں جو تنقیدیں لکھی گئی ہیں اور جو تاریخیں مرتب کی جاری ہیں وہ مضحکہ خیز حد تک سطحی، غیر تحقیقی اور متعصبانہ ہیں۔ سوائے چند اہل قلم کے سب ہی لوگ مختلف حلقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔" صبا کی غزل کو سب ہی ناقدین نے "قدیم اور جدید کا سنگم" قرار دیا ہے اختر حسین رائے پوری کے مطابق "صبا اکبر آبادی کی غزل میں عہد حاضر کا شعور اور شاعری کی روایات یک جان ہو گئی ہیں۔"(۲۴) محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ "صبا اکبر آبادی کی غزل گوئی کلاسیکی رنگ میں بسی ہوئی جدید حسیت کی آئینہ دار ہے"(۲۵) جناب حمایت علی شاعر کے مذکورہ مضمون کے اختتامی اقتباس کے لفظوں میں "ایسے معتبر ناقدین ادب کی آراء کے باوجود شاعری کے بارے میں جب بھی کوئی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو اس میں صبا صاحب کا ذکر نہیں ہوتا یا برائے نام ہوتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال کراچی سے شائع ہونے والی دو کتابیں ہیں "جدید اردو شاعری" مصنفہ عزیز حامد مدنی مطبوعہ ۱۹۹۰ء اور حسن سوز کی "غزل اردو غزل اور پاکستان" مطبوعہ اگست ۹۱ء جو صبا اکبر آبادی کے انتقال سے دو ماہ قبل چھپی تھی۔ ان کتابوں میں اگر کوئی شاعر نہیں ہے تو وہ صبا اکبر آبادی ہیں اس عالم بیگانگی اور دانستہ چشم پوشی سے جو صبا صاحب پر گزرتی ہوگی اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے کیا جا سکتا ہے

کون سنتا ہے صبا کون سمجھتا ہے صبا
میر کی طرح کہو شعر کہ سودا کی طرح

جناب حمایت علی شاعر نے دبستان اکبر آباد کے اس عہد کے عظیم شاعر

حضرت صبا اکبر آبادی کے ضمن میں بعض ادبی حلقوں کی تنگ نظری کی جو تصویر کھینچی ہے وہ محض صبا اکبر آبادی تک ہی محدود نہیں بلکہ اکبر آباد کے عظیم مرکز ادب کے خلاف اس مہم کا حصہ ہے جو ہمیشہ سے عمداً" اختیار کی گئی ہے اور یہ ہمارے اس موقف کی بھرپور تائید کرتی ہے کہ دبستان آگرہ کے سلسلے میں متعصبانہ روش طویل عرصے سے جاری رہی ہے جو حق اور عدل کے عام اصولوں کے قطعی منافی ہے۔ جس دبستان کا محض ایک شاعر خود ایک دبستان کا درجہ رکھتا ہو اس کی غیر معمولی اہمیت سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی دیدہ ور دھوپ کے ہوتے ہوئے بھی سورج کے روشن وجود کا منکر ہو۔ اکبر آباد کے مرکز ادب کی فضیلت اس اہم واقعہ سے بھی عیاں ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے فاضلین ادب کو نظرانداز کر کے برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کو اردو پڑھانے کے لئے آگرہ کے منشی عبدالکریم کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جیسا کہ نظیر اکبر آبادی کے ضمن میں مجنوں گورکھپوری نے ادب اور زندگی میں اور منشی عبدالکریم کی بابت مفتی انتظام اللہ شہابی نے مشاہیر اکبر آباد میں لکھا ہے۔

اکبر آباد کی علمی اور ادبی منزلت

علمی فضیلت :- اکبر آباد (آگرہ) آج علمی اعتبار سے ایک اجڑی ہوئی بستی ہے لیکن ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ یہ مقام ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا اور بغداد و قرطبہ کا ہم پلہ ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ یہاں دنیا بھر کے صاحبان علم وہنر اور اہل قلم کا جمگھٹا لگا رہتا تھا سکندر لودھی نے یہاں تصنیف و تالیف کا پہلا محکمہ قائم کیا جس کا سربراہ خواص خان کو مقرر کیا جس کے ہمراہ مختلف زبانوں کے ماہرین کی ایک جماعت رہتی تھی۔ خراسان کے ماہر اطباء کو بلوا کر علم طب پر بڑی معیاری کتابیں لکھوائیں۔ طب ہندی کے نسخوں کے دفتر کے دفتر فارسی زبان میں منتقل کروائے اور کتابی شکل دلوا کر طب سکندری کا نام دیا۔(۳۶) اس کے عہد میں شاہ رفیع الدین' ابو عباس اکبر آبادی' سید محمد سعید' ملا قطب الدین' سید صالح معمائی' سید احسن' صدر الدین قنوجی اور عبد الرحمان فتح پوری جیسے علم کے درخشندہ ستارے موجود تھے۔ مغلوں نے علم و فنون کی بڑی سرپرستی کی۔ شہنشاہ بابر فن انشا میں ماہر تھا اور خود ایک رسم الخط کا موجد تھا۔ علامہ ابوالحسن اکبر آبادی کا بیان ہے کہ بابر کئی زبانوں کا ماہر اور شاعر و ادیب تھا۔ علامہ ابوالفضل اکبر آبادی نے بابر کے رسم الخط کو خط بابری کا نام دیا اور فارسی میں ایک مثنوی کا مصنف قرار دیا۔(۳۷) اس کے عہد میں مولانا شہاب الدین معمائی' مولانا یوسف خراسانی' شیخ عبدالواحد' مرزا ابراہیم ہراتی' مولانا بقائی اور خواجہ نظام الدین علی جیسے علماء و فضلاء لائق ذکر تھے۔ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر خود عالم نہ تھا لیکن علم و فن کا بڑا مربی تھا۔ اس کا دربار نامور عالموں' شاعروں اور صاحبان فن سے بھر گیا تھا۔ آگرہ اور فتح پور سیکری میں عالیشان مدرسے وجود میں آگئے تھے۔ ان میں مولانا علاؤالدین لاری اور مولانا سید رفیع الدین محدث اکبر آبادی کے مدارس

ممتاز تھے۔ آگرہ میں ہی علوم فلسفہ کی پہلی درسگاہ علامہ میر فتح اللہ شیرازی نے قائم کی تھی۔(۲۸) آگرہ ہی میں ہندوستان کا پہلا دارالترجمہ قائم ہوا تھا جس سے قاضی سید نور اللہ شوستری' علامہ فتح اللہ شیرازی' علامہ فیضی' علامہ ابوالفضل' ملا بدایونی اور حکیم ہمام جیسے علماء و دانشور وابستہ تھے۔(۲۹) شیخ مبارک ناگوری نے امام رازی کی تفسیر کے مقابلے میں تفسیر نفائس العلوم چار جلدوں میں لکھی۔ علامہ فتح اللہ شیرازی نے تفسیر منہاج الصادقین تحریر کی۔ علامہ فیضی نے عربی میں قرآن حکیم کی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" لکھی جس کی تقریظ علامہ قاضی نور اللہ شوشتری نے بے نقط عربی میں تحریر فرمائی۔ علاوہ ازیں قاضی صاحب ہی نے کئی بیش بہا کتابیں تصنیف کیں ان میں مجالس المومنین' احقاق الحق اور مصائب النواسب بہت مشہور ہیں۔ اسی زمانے میں سنسکرت کی متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ امیر مرتضٰی شریفی' ملا شیخ حسین بغدادی' ملا اویس گوالیاری' ملا حسن موصلی اور ملا شاہ محمد علوم منطق و فلسفہ کے ماہرین میں تھے۔ عہد جہانگیری کے ممتاز علما و فضلاء میں قاضی صدر الدین' مفتی عبداللہ' ملا قطب الدین' ملا محمود' شیخ نور الحق محدث' شیخ عبدالرشید جونپوری' قاضی شہاب الدین اور سید محمد قنوجی تھے عہد عالمگیری میں ملا شیخ نظام برہان پوری' قاضی محمد حسین جونپوری' قاضی محب اللہ بہاری' ملا وجیہ الدین' شیخ عبدالعزیز اکبر آبادی' مرزا زاہد ہروی ممتاز علماء شمار ہوئے۔ ان میں ہر ایک بڑا عالم اور صاحب تصانیف کثیرہ تھا۔

اورنگزیب کی وفات کے بعد ملک میں ایک صدی تک انتظامی افراتفری اور سیاسی انتشار رہا لیکن آگرہ اپنی مردم خیزی کو نہ بھولا۔ میر حسن دہلوی نے قاضی سراج الدین' علی خان آرزو اکبر آبادی کو امیر خسرو کے بعد ہمہ دان اور ہمہ گیر شخصیت قرار دیا تھا کہ اس پائے کا انسان پھر پیدا نہ ہوا۔(۳۰) مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد محمد حسین کلیم اکبر آبادی نے خصوص

الحکم کا ترجمہ کیا- میر تقی میر اکبر آبادی نے نکات الشعرا جیسی کتاب تصنیف کی- مرزا مظہر جانجاناں اکبر آبادی کی کلیات طیبات فارسی ادب میں ایک مقام رکھتی ہے- لالہ ٹیک چند اکبر آبادی نے کتاب بہار لکھی- بارہویں صدی کے آغاز میں ملا ولی محمد بڑی اہم شخصیت تھے جنھوں نے بوستان' سکندر نامہ' اور انوار سہیلی کی فارسی میں تشریحات کتابیں تحریر کیں- نظیر اکبر آبادی کی انشائے نظیر اپنی طرز میں بے نظیر ہے مفتی انعام اللہ خان کی خزینتہ الاولیاء' شرح شمسی اور شرح اسرار قاسمی مشہور تصنیفات ہیں- زبدۃ الاخبار کے مدیر مولانا واحد علی نے فارسی میں علوم و فنون کا انسائیکلوپیڈیا (قاموس) تصنیف کی جس کا نام مطلع العلوم رکھا-(۳۱) مولوی مظفر علی شاہ نے تصوف پر معرکہ آرا کتاب جواہر غیبی لکھی- تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں حکیم غلام امام اکبر آبادی نے چہل حدیث کا ترجمہ کیا اور "منتخب النجوم" نامی کتاب لکھی- میر واجد علی اکبر آبادی نے "دریائے لطافت" کے مقابلے میں "گلدستہ انجمن" تصنیف کی- مفتی انعام اللہ خان نے "مشکاۃ المصابیح" کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ کیا مولوی وارث علی نے شمس التواریخ' مولوی معین الدین نے تاریخ آگرہ' سعید احمد مارہروی نے "بوستان اخیار" اور مرقع اکبر آباد' مولوی سید رضوان اللہ نے "سیرت الرسول من القرآن"' مولانا سید محمد رضوی اکبر آبادی نے رد عیسائیت میں تنزیہہ القرآن' مولوی مظفر علی برق نے قانون کی کئی کتابیں جن میں ضابطہ فوجداری' و ضابطہ دیوانی کے کئی ایڈیشن شامل تھے- مولانا خواجہ یوسف علی جو آگرہ میں پروفیسر اور آگرہ کے عظیم صحافی بھی تھے' نے آگرہ سے "آگرہ اخبار" نکالا جو ہندوستان کا پہلا موقر اخبار قرار پایا-(۳۲) مرزا عظیم بیگ چغتائی نے درجنوں تصانیف چھوڑیں' مولانا شاہ محمد اکبر نے تاریخ عرب' اشرف التواریخ اور مولود فاطمہ جیسی کتابیں تالیف کیں محمد سخاوت مرزا نے تاریخ ادب کے چند باب (دکنی

دور) تذکرہ مبلغین و مجاہدین اسلام اور تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت جیسی کتابیں پیش کیں۔

ماضی قریب کے بڑے ادیبوں میں لطیف الدین احمد (ل احمد) نے ازبک لٹریچر کو اردو میں ڈھالا۔ مولانا حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو اور نقد و نظر تصنیف کیں مفتی انتظام اللہ شہابی نے درجنوں تصانیف پیش کیں جن میں کلیات طیبات' تاریخ اجمیر' حیات خاتون جنت' آثار علما' تذکرہ سخنوران و مصنفین اکبر آباد' تاریخ صحف سماوی' نظیر اور ان کے معاصرین' لطائف الشعراء' تاریخ انبیاء اور مشاہیر جنگ آزادی نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر طاہر فاروقی نے سیرت اقبال پر محققانہ کتاب پیش کی۔ پروفیسر عابد ... فریدی نے ادبیات عجم (تین جلدیں) لکھیں۔ بیرسٹر سید حسن عابد جعفری نے نہج البلاغہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا سید ذوالفقار حسنین بن سید شجاعت حسین رضوی' ڈپٹی کلکٹر نے فضلی کی دہ مجلس کا اردو میں مخصوص انداز میں ترجمہ کیا داروغہ سید احترام علی رضوی نے تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ دو جلدوں میں تالیف کی اور داروغہ سید نظیر الحسن بن سید شجاعت حسین رضوی نے شمشیر براں لکھی اور بائبل کا اردو میں ترجمہ کیا۔ حضرت محمود مخمور اکبر آبادی نے روح نظیر' نظیر نامہ' صحیفہ ادب اردو ۱۹۲۳' ۱۹۷۰ء اور ۱۹۳۶ء میں پیش کی تھیں یہ تینوں تصانیف نہایت اہم اور ممتاز مانی گئی ہیں۔

اکبر آباد (آگرہ) کی ادبی منزلت

(الف) باکمال شعراء و اساتذہ فن

نامور علما و فضلاء اور مصنفوں کی طرح اکبر آباد و نواح اکبر آباد سے تعلق رکھنے والے عظیم شعراء کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ ان میں سے چند

باکمال شعراء کا مختصر ذکر بڑی حد تک ان کے عہد کے لحاظ سے ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

۱) جناب ملا شیدا :- آپ اکبر اعظم کے عہد حکومت یعنی سولہویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں نواح اکبر آباد (فتح پور سیکری) میں پیدا ہوئے اور جہانگیر کے دربار سے وابستہ رہے معاصر ایرانی شعراء کے ساتھ آپ کی شاعرانہ چشمک رہتی تھی آپ نے ایک دیوان یادگار چھوڑا جو ایک لاکھ اشعار پر مشتمل تھا۔ یہ دیوان خان آرزو نے عالمگیری کتب خانہ دہلی میں ملاحظہ کیا تھا۔(۳۳) آپ اردو شاعری کے بالکل ابتدائی عہد کے بہت بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

۲) جناب میر سجاد اکبر آبادی :- آپ میر محمد عظیم اکبر آبادی کے نامور فرزند تھے۔ آپ عہد شاہجہانی میں آگرہ میں غالباً ۱۱۲۶ ہجری میں تولد ہوئے آپ شاہ مبارک آبرو کے شاگرد تھے جو طویل عرصے تک آگرہ میں آباد رہے تھے اور جن کے انتقال ۱۱۴۴ ہجری کے وقت آپ بیس برس کے جوان تھے آپ کے بزرگوں کا تعلق آذربائیجان سے تھا جو عہد اکبری میں آگرہ میں آن بسے تھے۔ آپ کے دادا میر محمد اکرم خان اکبر آباد کے دارالانشاء شاہی میں میر منشی تھے۔(۳۴) آپ کا تعلق سادات آگرہ سے تھا۔ آپ اس بالکل ابتدائی دور شاعری کے نہایت اہم اور ممتاز شاعر تھے جس کو ایہام گوئی کا عہد کہا جاتا ہے۔ پروفیسر شمیم احمد آف پٹنہ یونیورسٹی نے لکھا کہ سجاد اکبر آبادی کا شمار اپنے عہد کے مشہور اردو شعراء میں ہوتا ہے دیوان سجاد شمالی ہند میں اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کی تاریخ کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے نمونہ ادب اور صرف و نحو کے اعتبار سے اس دیوان کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جس عہد کا یہ دیوان ہے اس عہد کے ادبی نمونے بہت کم دستیاب

ہیں۔(۳۵) میر حسن دہلوی کا بیان ہے کہ "درہرا مور کہ دخل نمودہ آں را بکمال رسانیدہ۔ در اکبر آباد بہ ساکن قدیم استقامت دارند' شعر فہمی شعر گوئی و خوش نویسی را بہ مراتب اعلیٰ رسانیدہ اند۔" میر حسن دہلوی کے بیان سے یہ بھی واضح ہوا کہ سجاد اکبر آبادی شعر گوئی کے علاوہ شعر فہمی اور خوش نویسی میں بھی ممتاز تھے۔ میر تقی میر بھی آپ سے بخوبی واقف تھے وہ تحریر کرتے ہیں کہ "قبل ازیں میخانہ او مجلس یاران ریختہ می شود۔"(۳۶) آپ بارہویں صدی ہجری کے نصف اول کے نہایت اہم شاعر گزرے ہیں۔

آپ کی غزلوں کے چند شعر یہ ہیں۔ جن سے آپ کی شاعری کے معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کس قدر دق کیا ہے جی نے ہمیں
مار ڈالا ہے زندگی نے ہمیں

اہل زر کی نظر کسی پہ نہیں
آنکھ ہوتی ہے بند سونے سے

خالی آتی نہیں چمن میں بہار
اک شگوفہ لئے ہی آتی ہے

□ □ □

۳) جناب شرف الدین مضمون :- آپ اکبر آبادی تھے اور اردو شاعری کے بالکل ابتدائی عہد کے بڑے شاعر تھے۔ آپ اورنگ زیب کے زمانہ حکومت یعنی سترہویں صدی کے نصف ثانی میں مسند آرائے ادب تھے۔ آپ میر تقی میر کے دوست عارف اکبر آبادی کے استاد تھے۔(۳۷) آپ خان آرزو کے عہد سے قبل کے بڑے شاعر تھے آپ کا ذکر تذکرہ ریختہ گویان مصنفہ میر فتح علی گردیزی میں بھی ملتا ہے۔

□□□

۴) قاضی سراج الدین علی خان آرزو :- ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے آپ شیخ حسام الدین بن علامہ کمال الدین اکبر آبادی کے فرزند اور نصیر الدین چراغ دہلوی کے ہمشیر زادہ تھے آپ کے والد عہد اورنگزیب کے ابتدائی زمانے میں منصب دار تھے حصول علم اور کافی مشق سخن کی بعد خان آرزو دہلی چلے گئے۔

یہ فرخ سیر کا زمانہ تھا آپ کی شاعرانہ عظمت کو ہر دور میں مانا گیا ہے۔ آپ کی منزلت کا ہمہ دان استاد فن امیر خسرو کے بعد کوئی اور نہ ہو سکا۔(۳۸) اپنی ذاتی رنجش کے باوجود میر تقی میر نے آپ کو ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایران کے فارسی شعراء پر بھی فضیلت دی ہے۔(۳۹) آخر عمر میں آپ اودھ چلے گئے تھے جہاں لکھنؤ میں ۱۱۵۴/۱۷۵۵ء میں آپ نے وفات پائی۔ آپ کی شعری تصانیف اور مجموعہ نفائس کے علاوہ سراج اللغات بھی ہے آپ اردو شاعری کے دور دوئم کے سب سے ممتاز اور بڑے شاعر قرار پائے آپ کی غزل کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے۔

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

آپ کے مرثیے کا ایک بند ہے۔

تم کو خبر ہے آیا محرم ہے مومناں
دیکھو قمر شفق میں ہے اس غم سے خوں فشاں
اندوہ گیں زمیں ہے تو غم ناک آسماں
کیونکر کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ہوں رواں

یہ کیا ستم ہے مومنو کیسا ہے شور و شین
گھوڑوں پہ شامیاں ہیں سناں پر سر حسین

□□□

۵) جناب میر تقی میر :- آپ کو اردو غزل کا شہنشاہ کہا گیا ہے۔ آپ آگرہ میں ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد میر عبداللہ اکبر آبادی تھے جو عظیم درویش ہونے کے باعث میر علی متقی مشہور ہوئے۔(۳۰) آپ کا موروثی مکان ہینگ منڈی آگرہ میں واقع تھا خاندانی حالات کے تحت آپ کو جوانی میں آگرہ چھوڑنا پڑا آپ نے بھرت پور اور نواح آگرہ میں ملازمت بھی کی کچھ عرصہ آپ دہلی میں اپنے ماموں خان آرزو کے پاس رہے۔ دہلی اجڑنے پر ۱۱۸۲ھ میں آپ لکھنؤ تشریف لے گئے جہاں ایک محفل شعر میں اہل لکھنؤ کے استہزا کا جواب آپ نے ایک قطعہ میں دیا جو بہت مشہور ہوا اس میں اہل لکھنؤ کو پورب کے ساکن کہا گیا تھا۔

آپ نے لکھنؤ میں ۱۲۳۵ھ، ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا تذکرہ نکات الشعرا کے مطابق میر نے چھ دیوان ریختہ غزلوں کے پانچ قصیدے' بہت سی مثنویاں اور ایک دیوان فارسی شاعری کا جس میں دو ہزار اشعار ہیں یادگار چھوڑے ہیں۔ علاوہ ازیں نکات شعراء اور ذکر میر آپ کی نثری تصنیفات ہیں۔ آپ کی طبع شدہ کلیات کی پانچویں جلد میں مرثیے بھی ملتے ہیں آپ کی غزلوں کے چند اشعار۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

آپ کی منقبت کا ایک شعر ہے۔

جو معترف نہیں ہے علی کے کمال کا
ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا

□□□
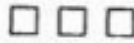
۶) میاں ولی محمد نظیر اکبر آبادی : ۔ آپ کو اردو شاعری کا شیکسپیئر مانا گیا ہے۔ آپ ہی نے اردو شاعری میں نظم نگاری کا سنگ بنیاد نصب کیا۔ آپ آگرہ میں ۱۱۴۸ھ، ۱۷۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ایک نظم میں خود اپنا سراپا کھینچا ہے اور اپنی وطنیت اکبر آباد کا ذکر کیا ہے آپ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ آپ تقریباً" ہر فن اور ہر کھیل سے بخوبی واقف تھے تہواروں' میلوں اور عوامی اجتماعات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور مقامی رنگ آمیزی سے ایسی نظموں کو مزین کرنے کے ماہر تھے آپ کو عزاداری سے گہری وابستگی تھی تعزیہ داری بڑی خوش اعتقادی سے کرتے تھے اور مسلسل پچاس روز تک مجالس عزا برپا کرتے اور سال بھر کی کمائی ان پر صرف کردیا کرتے تھے۔(۴۱) آپ نے ۹۸ برس کی عمر میں ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو آگرہ میں انتقال کیا۔ آپ کی تجہیز و تدفین امامیہ (شیعی) طرز پر ادا کی گئی۔ نماز جنازہ دو مرتبہ دونوں فرقوں نے الگ الگ پڑھی ہزاروں مسلمان اور اہل ہنود نے اس میں شرکت کی۔(۴۲) نظیر اکبر آبادی کا انداز اور اسلوب منفرد تھا وہ واحد شاعر تھے جن کو عوامی شاعر ہونے کی سند ملی آپ کی وفات کے چند برس بعد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی نے گلشن بے خار تصنیف کی تھی جس میں آپ کی شاعرانہ منزلت کو نظرانداز کرتے ہوئے فقط یہ لکھا کہ "نظیر در علم خلق و انکساری بے نظیر روزگار است" اس کے بعد بھی طویل عرصہ تک شرفائے ادب نے نظیر کو بڑے شعراء کی صف میں شامل کرنے سے گریز کی روش اپنائی تھی لیکن گزشتہ

نصف صدی سے آپ کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ آپ کئی دیوانوں کے مصنف تھے جو صدہا نظموں پر مشتمل تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کی تحریر کے بموجب "سید عابد علی نے نظیر کے کلام کا بڑا مجموعہ مرتب کیا تھا جو شاہ گنج آگرہ کے کتب خانہ (عزا خانہ) میں موجود ہے۔(۴۳) دراصل یہ سید عابد علی نہیں بلکہ مولوی سید عابد حسین تھے جو سادات شاہ گنج آگرہ کے ایک ممتاز فرد تھے اور جنہوں نے کلیات نظیر کی تدوین کے سلسلے میں اولیت کا شرف پایا ہے۔ موصوف کی ہی مرتب کردہ کلیات نظیر سے پروفیسر شہباز نے استفادہ کیا اور زندگانی بے نظیر جیسی اہم کتاب پیش کی آپ کی نظمیں آج بھی عوام کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ ان میں آدمی نامہ' فقیر کی صدا' روٹیاں اور بنجارہ نہایت اہم ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی زبان کو اردو ٹکسالی' اور اکبر آباد کی خالص زبان قرار دیا گیا ہے نیز یہ کہ دہلی اور لکھنؤ کی شستہ زبانیں نظیر ہی کی زبان کی ترقی یافتہ شکلیں مانی گئی ہیں۔

□□□

۷) **جناب محمد بقا اللہ بقا :** - آپ کے والد حافظ لطف اللہ قریشی اکبر آباد کے رہنے والے تھے بقا عہد اورنگزیب سے کچھ قبل غالباً ۱۶۴۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۳۰ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ آپ میرو سودا کے ہمعصر تھے۔ اس لحاظ سے اردو شاعری کے دور سوئم کے بڑے شاعر تھے۔ آپ کو اردو اور فارسی زبانوں پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ آپ بڑے ممتاز خطاط بھی تھے۔ حضرت نجم آفندی نے اپنی نظم "دارالادب اکبر آباد" علامہ سیماب نے اپنے مضمون آگرہ و دہلی کا شعری تعلق اور مشاہیر اکبر آباد میں مفتی انتظام اللہ شہابی نے آپ کا ذکر کیا ہے۔

آپ کی ایک غزل کا یہ مطلع ہی آپ کی عظمت شاعرانہ کا بین ثبوت ہے۔

عشق میں بو ہے کبریائی کی
عشق جس نے کیا خدائی کی

□□□

۸) جناب میر جعفر زٹلی :- آپ عہد اورنگزیب کے نہایت مشہور اور بڑے مزاحی شاعر تھے۔ آپ شاہجہان کے زمانے میں آگرہ میں تولد ہوئے اور اردو شاعری کے دور اول کے عظیم شاعروں میں شمار ہوئے۔ شہزادی زیب النساء نے آپ کی ہجویہ شاعری کے باعث آپ کو زٹلی کا لقب دیا جو آپ کے تخلص کا جزو لاینفک بن گیا۔ آپ نے اس دور کے عظیم فارسی شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کی ہجو کہہ ڈالی اور بادشاہ فرخ سیر کو بھی نہ بخشا۔ آخرالذکر نے اپنے سکے پر یہ شعر کندہ کروایا تھا۔

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحروبر فرخ سیر

اتفاقاً" اسی زمانے میں خشک سالی کے سبب دہلی میں غلہ بہت گراں ہوگیا تھا چنانچہ آپ نے مذکورہ شعر اس طرح کردیا جو بہت مشہور ہوا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

کہا جاتا ہے کہ اسی شعر کے نتیجے میں فرخ سیر نے آپ کو ۱۷۱۳ء میں قتل کرادیا تھا۔(۴۴)

□□□
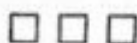
۹) جناب مرزا مظہر جانجاناں :- آپ عہد محمد شاہی کے ان باکمال شعراء اور ارباب طریقت میں نمایاں تھے جن کے علم و فضیلت کی بدولت یہ

زمانہ شاہی ممتاز ہوا۔ آپ بڑے شاعر ہونے کے علاوہ عظیم فقیہ و محدث اور عارف کامل بھی تھے۔ آپ اکبر آباد میں ۱۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے آپ کے والد عہد اورنگزیب میں منصب دار تھے جن کا سلسلہ نسب جناب محمد حنفیہ بن حضرت علی مرتضیٰ سے ملتا ہے۔ آپ کو ہر دور کے تذکرہ نگاروں نے بڑے احترام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے لکھا کہ "مرزا مظہر جانجانان عالم باعمل اور فقیہ کامل تھے آپ اکثر اوقات علمی گفتگو وظائف اور شاعری میں گزارتے تھے۔(۴۵) آپ سیاسی مفکر بھی تھے ۱۱۹۵ھ میں آپ کو کسی نے قرابین مار کر قتل کر دیا۔" اس وقت آپ کی عمر شریف ۵۵ برس تھی آپ کے لوح مزار پر آپ کا یہ شعر کندہ ہے۔

به لوح تربت ما یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول راجز بے گناہی نیست تقصیرے

□□□

۱۰) جناب مرزا جعفر علی فصیح :۔ آپ اٹھارویں صدی عیسوی میں اردو کے بہت بڑے شاعر اور عظیم مرثیہ نگار تھے مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں جن چار بڑے مرثیہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے۔ ان میں مرزا فصیح بھی شامل تھے۔ آپ حضرت بزم آفندی اور علامہ نجم آفندی کے بزرگ تھے۔ مرزا فصیح اودھ (فیض آباد) میں ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد مرزا ہادی علی بہ سلسلہ روزگار مقیم تھے۔ آپ آخر عمر میں عرب جا کر بس گئے تھے جہاں آپ نے وفات پائی۔ حرمین کی خدمت اور حضرت ابوطالب اور محترمہ خدیجۃ الکبریٰ کے مزارات کی تعمیر کے ضمن میں حکومت ترکی۔(جو اس زمانے میں عرب پر متصرف تھی) نے آپ کو آفندی کا خطاب دیا تھا جو آپ کی نسل میں اب تک باقی ہے۔

مرزا فصیح اپنے عہد کے کامل فن استاد تھے۔ آپ نے بہت کچھ کہا مگر زیادہ تر تلف ہوگیا۔ آپ کی یہ خصوصیت اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ ان کا کلام ہر دور میں پڑھا گیا اور اب بھی محرم کی ساتویں کو "سلامی کربلا میں جب بنا ابن حسن دولہا" کہیں نہ کہیں یہ سلام آج بھی سننے میں آجاتا ہے۔ آپ کا یہ سلام بے حد مقبول و مشہور ہوا تھا۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردہ پٹک رہا ہے

آپ کے بہت سے مرثیوں میں یہ مراثی آج تک پڑھے جاتے ہیں جس کا پہلا مصرعہ ہے۔

جب مشک بھر کے نہر سے عباس غازی گھر چلے
مشہور جہاں خاک شفا خاک ہے کس کی(۳۶)

□□□

۱۱) **جناب اسد اللہ خان غالب** :- آپ شعرو ادب میں منفرد مقام اور نظم و نثر دونوں میں کل غالب کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ آگرہ میں ۱۲۱۲ھ بمطابق ۱۷۹۷ء میں تولد ہوئے سن شعور تک آپ آگرہ میں ہی رہے اور شعر کہنا سیکھا۔ شادی کے بعد آپ جوانی میں دہلی منتقل ہوئے لیکن آگرہ سے آپ کا قریبی رابطہ کبھی منقطع نہ ہوا اپنے وطن آگرہ کے بارے میں آپ نے کہا۔

جادہ عرضی و رفتار شفای دارم
دہلی و آگرہ شیرازو صفہان من است

مغل دربار سے آپ کو نجم الدولہ اور دبیرالملک کے خطابات ملے بہادر شاہ ظفر نے آپ کو خاندان مغلیہ کی تاریخ نویسی پر مامور کیا تھا جس کا پہلا حصہ مہرنیم روز ہی مکمل ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا عرصہ دارو گیر برپا ہوگیا۔ ۷۳ برس کی

عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو آپ نے وفات پائی۔ مولانا حالی نے آپ کا مرثیہ لکھا اور "یادگار غالب" جیسی کتاب لکھی۔

مرزا غالب شاعری اور نثر نگاری دونوں میں ہی منفرد ٹھہرے آپ کی مفکرانہ شعر گوئی ہو کہ انتہائی سلیس مکتوب نگاری' کسی میں کوئی آپ کا ہم پلہ نہ ہو سکا۔ آپ کے اردو کلام کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور غالب فہمی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے آپ کو اہل بیت اطہار سے گہری عقیدت تھی آپ کا یہ شعر اس کی واضح دلیل ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

آپ کے کسی شاگرد نے آپ سے مشرک کی تعریف پوچھی تو آپ نے جواب میں لکھا کہ مشرک وہ ہے جو اللہ کی ربوبیت میں کسی اور کو شریک کرے' مشرک وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت میں کسی اور کو شامل کرے اور مشرک وہ ہے جو علی مرتضیٰ کی ولایت میں کسی اور کو شریک کرے۔(۴۷)

حضرت امام مہدی علیہ السلام کی بابت آپ کا یہ شعر لائق توجہ ہے کہ

شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب
اے کہ غائب ز نظر مہر تو ایمان من است

حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں آپ کا وہ قصیدہ شہرہ آفاق ہے جس کا مطلع ہے۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

آپ کی متعدد غزلیں قبول خاص و عام کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں یہ

زیادہ تر مشہور ہیں۔ بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے، درد منت کش دوا نہ ہوا، ابن مریم ہوا کرے کوئی، فریاد کی کوئی لے نہیں ہے، سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں، ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے۔

□ □ □
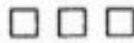
۱۲) جناب حاتم علی مہر : - آپ مرزا رفیق علی بیگ اکبر آبادی کے فرزند تھے آپ ۱۸۱۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ آپ مرزا غالب کے احباب خاص میں تھے اور اکبر آباد کے بڑے اور صاحب تصنیف شعراء میں شمار ہوئے ۱۸۴۰ء میں چنار گڑھ کے جج مقرر ہونے پر آپ کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

از بسکہ سوزہ ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم
منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

آپ نے دیوان غزلیات "شعاع مہر" کے علاوہ کئی مثنویاں اور علم و عروض پر ایک رسالہ بھی یادگار چھوڑے۔ آپ کا تذکرہ انشائے بیجبو اور تذکرہ آب بقا میں ملتا ہے۔

□ □ □
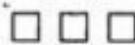
۱۳) جناب خلیفہ گلزار علی اسیر : - آپ میاں نظیر اکبر آبادی کے فرزند اور جانشین تھے آپ غالباً ۱۷۸۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔ آپ نے شاعری ورثے میں باپ سے پائی۔ میاں نظیر اکبر آبادی کی وفات کے وقت آپ جوان العمر تھے۔ مہاراجہ دھولپور نے اپنے خاندان کی منظوم تاریخ نویسی پر مامور کیا تھا۔ آپ نے ستر برس سے کچھ زیادہ عمر پائی میاں نظیر کے مکتب و مسند سنبھالنے کی وجہ سے خلیفہ کہلائے۔ آگرہ میں عیدین کی نماز امامیہ طرز پر اہل تشیع کو پڑھاتے تھے۔(۴۷) اب انیسویں

صدی کی پہلی نصف صدی میں بڑے شعرا میں شمار ہوئے۔ راقم السطور کے چچا سید افتخار حسن رضوی مرحوم نے اپنے بزرگوں کے حوالے سے بتایا تھا کہ آپ مجالس محرم منعقدہ شاہ گنج آگرہ میں ہر سال اپنا تصنیف کردہ مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے بڑے مرثیہ گو بھی تھے پروفیسر شہباز نے زندگانی بے نظیر میں آپ کا تذکرہ کیا ہے۔

□□□
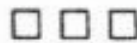
۱۴) جناب سید شبیر حسین نسیم بھرتپوری :- آپ نواح آگرہ (ریاست بھرت پور) کے بڑے شاعر اور استاد فن تھے۔ آپ عہد غالب کے بعد یعنی چھٹے دور شاعری کے عظیم شاعر اور مرثیہ نگار تھے۔ آپ کا قدرے تفصیلی ذکر باب ہفتم (شخصیات۔ مشاہیر) میں کیا گیا ہے۔ اس لئے ذیل میں آپ کے کلام کے چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کی جارہی ہے۔

آپ کی مشہور اور تاریخی غزل سنگلاخ زمین اور سخت ردیف میں تھی جس کا ایک مطلع تھا۔

دکھائے معجزے گروہ بت عیار چنکی میں
تو بولے طائر رنگ حنا ہر بار چنکی میں

آپ کے مشہور و مقبول سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دل میں جس مومن کی حب ساقی کوثر نہیں
پھول ہے خوشبو نہیں آئینہ ہے جوہر نہیں

چشم گریاں گر نہیں بزم عزائے شاہ میں
باغ ہے چشمہ نہیں فردوس ہے کوثر نہیں

بیکس و تنہا کھڑے ہیں دشت میں سبط رسول
چاند ہے تارے نہیں سردار ہے لشکر نہیں

دختران فاطمہ کیونکر چھپائیں اپنا سر
شرم ہے مقنع نہیں بازار ہے چادر نہیں

بزم میں مداح حیدر گر نہیں ہے اے نسیم
طور ہے جلوہ نہیں دن ہے شہ خاور نہیں

آپ کے مرثیہ کا ایک بند ہے۔

جب بے چراغ مرقد خیرالوریٰ ہوا
یعنی سر حسین بدن سے جدا ہوا

اہل حرم میں شور قیامت بپا ہوا
تربت میں بے قرار دل مرتضیٰ ہوا

عالم نگاہ میں زبر و زیر ہوگیا
نور اٹھ گیا جہان سے اندھیرا ہوگیا

حضرت نسیم بھرتپوری کا مذکورہ بالا سلام اور مکمل مرثیہ تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) سے قبل چھپ چکے تھے۔ پاکستان میں بھی یہ دونوں محرم ۱۳۷۸ھ اور ۱۴۱۳ھ میں شائع ہوچکے ہیں۔(۴۸)

□□□

۱۵) جناب سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی :- آپ نواح آگرہ (شکوہ آباد) کے بہت بڑے شاعر اور ہمہ داں استاد فن تھے۔ آپ کے معاصرین میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہ تھا آپ کی شاعرانہ عظمت کے سامنے بڑے بڑوں کی گردنیں جھک جایا کرتی تھیں۔ آپ عہد غالب کے بعد یعنی پچھلے دور شاعری کے ان عظیم شعراء میں ممتاز تھے جن کی ادب میں بلند قامتی کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ آپ کا تفصیلی ذکر باب ہفتم (شخصیات۔ مشاہیر) میں کیا

گیا ہے یہاں آپ کے کلام بلاغت نظام کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔
آپ کی غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

طفلی کی جوانی میں بھی راحت نہیں ملتی
جو کھیل میں گزری ہے۔ وہ دولت نہیں ملتی

کب ہاتھ مرے پہنچیں گے دامان بتاں تک
اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

اللہ رے زور قلم صانع قدرت
تصویر سے تصویر کی صورت نہیں ملتی

آپ کی مثنویوں میں "معراج المضامین" بہت مشہور ہے جس میں محمد و آل محمد سے گہری عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے اور جس کو آپ کا شاہکار مانا گیا ہے۔

آپ نے بہت کچھ کہا مگر زیادہ تر محفوظ نہ رہ سکا یا دوسروں کے نذر ہو کر ان کے ناموں سے شائع ہو گیا۔ مشہور روایت ہے کہ منیر نے اپنا بیشتر کلام دوسروں کو دے دیا۔ اس میں وہ مرثیہ بہ حال حضرت علی اصغر بھی شامل ہے جو ہندو شاعرہ روپ کماری سے منسوب ہے۔ آپ حضرت بزم آفندی کے ماموں استاد اور علامہ نجم آفندی کے نانا تھے۔ آخرالذکر نے آپ کی شاعرانہ عظمت اور استادانہ وقار کا اپنی خودنوشت میں کئی جگہ ذکر کیا ہے۔

□ □ □
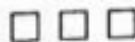
۱۶) جناب خادم حسین رئیس : ۔ آپ چھٹے دور شاعری کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ اکبرآباد کے ممتاز شعراء مولانا سید نثار علی اور احسن اللہ ثاقب کے ہمعصروں میں تھے جو خود استادانہ حیثیت کے حامل تھے۔ آپ کے والد مرزا زین العابدین عابد کا سلسلہ نسب نادر شاہ درانی کے وزیر نواب

عبدالغفور سے ملتا ہے آپ کی طبیعت میں ظرافت اور کلام میں شوخی نمایاں تھی۔ آپ کی ایک دختر کی یادگار حضرت جوش ملیح آبادی تھے۔ آپ نے ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو وفات پائی آخری عمر میں مرض سل میں مبتلا تھے آپ کے دوست ڈاکٹر الہام اللہ دیکھنے کو آئے اور نبض پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ جسم میں نمی زیادہ ہے رئیس صاحب نے برجستہ یہ شعر کہا

ٹھنڈا پسینہ موت کا آنکھوں میں اشک گرم
پانی سمو رہا ہوں نہانے کے واسطے

آپ نے غزلوں کے ایک دیوان کے علاوہ رئیس اللغات اور علم عروض میں ایک رسالہ یادگار چھوڑے آپ کی غزلوں کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اے مرے ہجر کی شب اتنا ذرا یاد رہے
تجھے اک روز قیامت کی سحر ہونا ہے

آنکھیں صلاح کار ہیں عہد شباب کی
دو کنجیاں ہیں یہ دل خانہ خراب کی

ملا عروج اسی کو جو خاکسار رہا
سوار دوش ہوا پر مرا غبار رہا

□□□

۱۷) جناب مرزا عاشق حسین بزم آفندی :۔ آپ بھی پچھلے دور شاعری کے باکمال شعراء میں تھے جو عظیم مرثیہ گو بھی ہوئے آپ کڑہ حاجی حسن آگرہ میں ۱۸۶۰ء میں تولد ہوئے اور ۹۳ برس کی عمر میں ۲۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو آگرہ ہی میں وفات پائی۔ آپ کے بزرگوں میں مرزا ملیح، مرزا بلیغ اور مرزا

فصیح بڑے شاعر اور مرثیہ نگار ہوئے۔ آپ اپنے ماموں منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔ آپ حضرت نجم آفندی کے والد بزرگوار تھے۔ بھارت کے نامور محقق ادب مالک رام نے لکھا کہ "بزم آفندی نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا مگر افسوس کہ اس میں سے بہت کم شائع ہو سکا۔ آپ کی غزلوں کے سات دیوان میں سے فقط دو چراغ بزم اور ایاغ بزم چھپ سکے انہوں نے سینکڑوں مرثیے لکھے تھے سلام، قصائد اور رباعیات ان کے علاوہ۔ "ایک مولود معراج" خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر کہی تھی جو حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں مخصوص اجتماع میں پڑھی تھی اس پر خواجہ صاحب نے آپ کو معراج الشعراء کا خطاب دیا تھا۔(۴۸) آپ کی غزل کا یہ شعر اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے۔

ایک شب عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا
ہجر وہ غم کہ خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا

□□□

۱۸) جناب علامہ عاشق حسین سیماب :- آپ موجودہ صدی کے بہت بڑے شاعر، محقق، مصلح ادب اور عظیم المرتبت استاد فن تھے۔ آپ ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی محمد حسین خود ایک بڑے عالم دین تھے۔ ۱۸۹۸ء میں آپ نے فصیح الملک داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کرلی۔ اکبر آباد سے جاری ہونے والے متعدد رسائل و جرائد کے علاوہ دیوان سنگھ مفتون کے اخبار "ریاست ویکلی" کی بھی ادارت کی۔ ۱۹۲۲ء میں ترک ملازمت کے بعد آپ نے "قصر الادب" کی بنیاد رکھی۔ فیروز سنز کے بانی الحاج فیروز الدین کی خواہش پر مثنوی مولانا روم کا مکمل منظوم ترجمہ چھ جلدوں میں بنام "الہام" منظوم کیا۔(۴۹) ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ "شاعر آگرہ" کا

اجراء کیا جو آج تک بمبئی سے نکلتا ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے اردو زبان و ادب میں بہت سی خوبصورت اصلاحات کیں عروض کی سختیوں میں نرمی پیدا کی اور نظم کی ہیت میں متعدد کامیاب تجربے کئے' غرض کہ تمام عمر شعرو ادب کی جدید قدروں کو عام کرنے میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے متعدد آل انڈیا مشاعروں کی صدارت بھی کی اور صدارتی خطبہ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔(۵۰)

آپ کی غزلیات کے دو دیوان کلیم عجم اور سدرۃ **المنتہا** اور نظموں کے مجموعے کار امروز' ساز و آہنگ اور شعر انقلاب چھپ چکے ہیں۔ رثائی ادب میں بھی آپ کا مقام بلند ہے دو مجموعے نغمہ غم اور سرود غم شائع ہو چکے ہیں۔ نیز قطعات کا ضخیم مجموعہ عالم آشوب بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۲۸۴ بتلائی جاتی ہے۔ آپ کا شعری شاہکار وحی منظوم ہے جو قرآن مجید کا منظوم ترجمہ ہے اور منفرد ہے آپ کی نثری کاوشوں میں سیرت **النبوی** بڑی اہم اور ممتاز تصنیف ہے آپ کے شاگردوں کی فہرست بھی بڑی طویل ہے جو تین ہزار سے زائد افراد پر مشتمل ہے ان میں کئی ممتاز شعرا و اساتذہ فن شامل ہیں آپ نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں رحلت کی۔ انگریزی روزنامہ "ڈان" کراچی نے ۲ فروری ۱۹۵۱ء کو لکھا کہ ۷۳ سالہ سیماب اکبر آبادی جو الہامی شاعر تھے کی بعض تصانیف کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کے کلام کے چند نمونے یہ ہیں غزلوں کے چند شعر دیکھئے۔

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

باقی رہی چمن میں اسیروں کی یادگار
تھی آشیاں کی خاک جہاں آشیانہ تھا

پھیلے تو یوں کہ چھا گئے کل کائنات پر
سمٹے تو اس قدر کہ رگ جاں میں آ گئے

بربادی چمن میں ہے شاید کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

فقط احساس آزادی سے آزادی عبارت ہے
وہی دیوار گھر کی ہے وہی دیوار زنداں کی

آپ کے سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اک دور سلامی دنیا کی صدیوں میں ایسا آتا ہے
جب کوئی پیمبر اٹھتا ہے یا کوئی شہادت پاتا ہے

سجاد اسیر جور ہوئے افسوس کسی نے یہ نہ کہا
یہ پاؤں ستون کعبہ ہیں زنجیر کے پہناتا ہے

سیماب نظر آتی ہے مجھے ہر چیز اداس و افسردہ
فطرت غمگیں ہو جاتی ہے جب ماہ محرم آتا ہے

ایک اور سلام کے چند شعر

نیاز مشرب شبیر کا ہے پاس فطرت کو
بغیر سجدہ مومن نہیں ہوتی سحر اب بھی

جنہیں جنگل میں لوٹا بند جن پر کر دیا پانی
ان ہی کے ہاتھ میں ہے انتظام بحر و بر اب بھی

وہ چہرے وسعت کونین میں جن سے اجالا تھا
ان ہی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں خورشید و قمر اب بھی

جدھر سے پابجولاں عترت شبیر گزری تھی
ہے زخم دیدہ اہل نظر وہ راہگزر اب بھی

جگر بندان حیدر کا لہو چھڑکا گیا جس پر
وہی خاک شفا ہے مرہم زخم جگر اب بھی

□□□
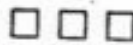
۱۹) جناب علامہ نجم آفندی اکبر آبادی :- آپ کا اسم گرامی مرزا تجمل حسین تھا آپ حضرت بزم آفندی کے نامور فرزند اور مرزا جعفر علی فصیح کے پوتے اور حضرت منیر شکوہ آبادی کے نواسے تھے۔ آپ آگرہ میں مارچ ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے اور کراچی میں ۲۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کو وفات پائی۔ آپ کو مولانا ناصر الملت نے شاعر اہل بیت کا خطاب دیا تھا آپ نے نوجوانی میں دہلی کے ایک مشاعرے کی صدارت کی جس میں حضرت سائل دہلوی جیسے بزرگ شریک تھے آپ برصغیر کے بہت بڑے شاعر اور استاد فن تھے کلام منقبت و عزا میں کوئی آپ کا ہم پلہ نہ ہوسکا آپ میدان غزل کے بھی بہت بڑے شہہ سوار ہوتے اگر آپ نے خود کو مناقب و مصائب اہل بیت کے لئے وقف نہ کردیا ہوتا اور آپ کی غزلیں دوسروں کی نذر ہو کر دوسروں کے کلام کا حصہ بن گئی ہوتیں۔(۵۱) حال ہی میں حیدر آباد دکن کے شہزادہ مکرم جاہ نجم کی غزلیات کا مجموعہ چھپا ہے جو قارئین کو حضرت نجم آفندی کے فکر انگیز اسلوب اور منفرد لب ولہجہ کی یاد دلاتا ہے۔

آپ کا تفصیلی ذکر ہم نے باب ہفتم شخصیات میں کیا ہے اس لئے یہاں فقط آپ کے کلام بلاغت نظام کے چند نمونوں پر اکتفا کی جارہی ہے۔

چند ابیات غزل ملاحظہ ہوں۔

آسودہ ہوں کیا آنکھیں تکرار تماشا سے
بیٹھا ہوں میں دنیا میں منہ پھیر کے دنیا سے

مسافر ہوں مگر کیا زندگی پہ حکمرانی ہے
ٹھہر جاؤں تو باقی ہے گزر جاؤں تو فانی ہے

کھڑا ہوں آئینہ خانے میں ہاتھ پھیلائے
جہاں میں کیا کوئی دست طلب دراز کرے

رہتے ہیں دور مرحلہ غم سے آدمی
آگے تمہیں ملیں گے کہاں ہم سے آدمی

میری تلاش راہ پہ بنتے ہیں آج قافلے
شمع بنائی جائے گی کل مری گرد راہ کی

آپ کی رباعیوں کا مجموعہ "تہذیب مودت" ہے جو فکر و پیام کے اعتبار سے منفرد ہے۔ صرف ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

آنکھوں میں تری زباں پہ صل علی
جذبہ کوئی ان حدوں سے آگے نہ بڑھا
اللہ وہی قوم ہو سب سے پیچھے
جس قوم میں ہو معرکہ کرب و بلا

آپ نے قصائد میں بھی نئی راہ نکالی اور معرکہ آرا قصائد لکھے۔ ایک قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو۔

نمود عالم ہو تھی فضائے تیرہ و تار
نہاں تھے کشتِ عدم میں چراغ و شمع و شرار

یہ قصیدہ غالباً ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ کی ایک بڑی محفل مقاصدہ میں پڑھا گیا تھا جس پر بزرگ شعراء مولانا صفی اور حضرت عزیز لکھنوی نے آئندہ کے لئے آپ کو اپنی مسند پیش کی تھی اس وقت آپ کی عمر فقط ۲۷ برس تھی منقبتی اور رسائی کلام میں آپ کی نظمیں فکر و اسلوب کے لحاظ سے منفرد ہیں ان میں تیرہ رجب کی رات' شب عاشور' صبح عاشور' شام عاشور' کڑیل جوان' ننھا مجاہد' علم بدوش' ایلچی اور نہر علقمہ نہایت ممتاز ہیں۔

علامہ نجم آفندی نے فقط دو مرثیے بھی لکھے ہیں جو دو سو مرثیوں پر بھاری ہیں۔ آپ جدید مرثیہ کے موجد اور عظیم معمار تھے۔ آپ نے جدید مرثیہ کو مرثیہ کا بنیادی لب و لہجہ دیا۔ دور حاضر کا کوئی مرثیہ گو شاعر ایسا نہیں جو آپ سے متاثر نہ ہوا ہو۔(۵۲) فتح مبین اور معراج فکر کے زیر عنوان آپ کے دونوں مرثیوں میں سے ایک ایک بند دیکھئے مرثیہ جس کا پہلا مصرعہ ہے۔

جب لے لیا حسین نے میدان کربلا

کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

جانیں نثار کی ہیں کہ اللہ کی پناہ
کیا کارواں تھا جس کی یہ دنیا ہے گرد راہ
حیراں ہیں اب بھی قطع مسافت پہ مہر و ماہ
پڑتی ہے ہر مفکر و خوش فکر کی نگاہ
انسانیت کا نور تھے ظلمت کے واسطے
لاشے تھے زندگی کی ہدایت کے واسطے

مرثیہ جس کا پہلا مصرعہ ہے۔

صورت گر جلالت اسلام ہے حسین

سے ایک بند جو توجہ طلب ہے

اہل زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر
ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر
مردان حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباس نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسین کا غم لے کے جائیں گے

آپ کی ہندی زبان میں شاعری بھی کچھ کم اہم نہیں ہے اس میں بھی آپ نے بھرپور شاعرانہ قدرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں کربل نگری' ست جگ کا شارہ' درشن کا اجالا اور حسینی سیوا بڑی ممتاز اور اثر آفرین ہیں۔ "کربل نگری" ایک طویل نظم ہے جو آپ نے تیرہ سو سالہ یادگار حسینی (۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء) کے بین الاقوامی اجتماعات کے ضمن میں آگرہ کے خصوصی اجلاس میں پڑھی تھی جس کی صدارت خواجہ حسن نظامی نے کی تھی۔

□□□

۲۰) جناب خواجہ محمد امیر خان صبا اکبر آبادی :- آپ بھی برصغیر میں موجودہ عہد کے بہت بڑے اور باکمال شاعر تھے۔ آپ آگرہ میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۲ء میں اسلام آباد (پاکستان) میں انتقال کیا آپ نے بارہ سال کی عمر سے شعر گوئی کی اور اکبر آباد کے اس عہد کے ایک پختہ کار شاعر جناب خادم علی خان اخفر سے مشورہ سخن کیا۔ آپ ممتاز ادیب اور صحافی بھی تھے ۱۹۳۲ء میں "مشورہ آگرہ" کی ادارت سنبھالی اور ۱۹۳۶ء میں اس کا ضخیم آگرہ نمبر نکالا جو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل تھا اور جس میں اکبر آباد کی شعر و ادب

اور صنعت و حرفت کی مکمل تفصیل دی گئی تھی۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں آپ نے ایک ادبی کارنامہ انجام دیا جب دیوان غالب کی تضمین لکھی جس کا تذکرہ مولانا حامد حسن قادری نے نقد و نظر مطبوعہ ۱۹۴۲ء میں کیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان سے متعلق نظموں کا مجموعہ "زمزمہ" پاکستان چھپا۔ ۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان آگئے اور کراچی میں بس گئے۔ ۱۹۷۱ء ۱۹۸۰ء کے دوران آپ کے مجموعہ ہائے غزلیات' اوراق گل اور چراغ بہار' شائع ہوئے نیز رباعیوں کا مجموعہ' دست زرفشا' شائع ہوچکا ہے جس میں دو ہزار سے زائد رباعیاں ہیں۔ آپ نے عمر خیام کی گیارہ سو رباعیوں کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے آپ نے سینکڑوں سلام اور مرثیے بھی لکھے ہیں اور اس دور کے ممتاز مرثیہ نگاروں میں شمار ہوئے ہیں۔ آپ نے ایک لاکھ سے زائد ابیات غزل تصنیف کئے۔ آپ کو عصر حاضر کا صحیح معنوں میں قادر الکلام اور معجزبیاں شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔(۵۳) تاہم آپ کے ساتھ بعض ادبی حلقوں کا معاندانہ اور دانستہ نظرانداز کرنے کا رویہ رہا ہے کہ اس دور کا اتنا بڑا اور باکمال شاعر ہونے کے باوجود آپ کا تذکرہ ہوتا ہی نہیں یا پھر برائے نام ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جناب حمایت علی شاعر کا محققانہ مضمون ایک بڑے شاعر کا المیہ لائق توجہ ہے۔ یہ مضمون رسالہ "افکار" کراچی بابت دسمبر ۹۳ء میں چھپا ہے آپ اس عہد کے باکمال غزل گو ہی نہ تھے بلکہ ہر صنف شعر میں مہارت تامہ رکھتے تھے آپ نے سینکڑوں موشیے بھی لکھے جو جدید فکر و اسلوب کے آئینہ دار ہیں ذیل میں آپ کے کلام کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

آپ کی غزلوں سے چند متفرق اشعار

قفس میں آکے ملے روشنی کہاں سے ہمیں
چراغ لے کے نکلنا تھا آشیاں سے ہمیں

گھبرا کے مسرت کی طرف لوٹ پڑے گا
وہ دل کہ جو شائستہ آلام نہیں ہے

قدر کر بے قراری دل کی
یہ تڑپ عمر بھر نہیں رہتی

بھیڑ تنہائیوں کا میلا ہے
آدمی آدمی اکیلا ہے

بس اتنا واسطہ ہے کاراوں سے
لٹا ہوں میں نے کچھ لوٹا نہیں ہے

آپ کے ایک سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نام حسین لے کے بڑھو کائنات میں
لغزش نہ آئے گی کبھی پائے ثبات میں

بننا پڑے گا چادر زینب کو بادباں
سیلاب غم بھی آئے گا راہ نجات میں

پیاسے نے جان دے کر کنارے لگا دیا
قرآن ڈوبنے کو تھا آب فرات میں

میں چھوڑ دوں جو دامن مشکل کشا صبا
پھر کون کام آئے مری مشکلات میں

حضرت صبا اکبر آبادی کے مرثیے کے چند بند دیکھئے اور ان کی مرثیہ نگاری پر ایمان لے آیئے۔

چہرے کا ایک بند ہے

ہر لحظہ ہے نمود نئے انقلاب کی
کیفیتیں عجب ہیں جہان خراب کی
ملتی نہیں ہے کوئی دوا اضطراب کی
لو آخری کرن بھی گئی آفتاب کی

پھر رات آگئی غم تازہ لئے ہوئے
ڈوبا ہے مہر دن کا جنازہ لئے ہوئے

امام حسین کی شہادت کے بعد نوک نیزہ پر آپ کے سر مبارک سے متعلق بند دیکھئے۔

کہتے ہیں جب سناں پہ چڑھا تھا سر حسین
جنبش میں تھے لبان شہنشاہ مشرقین
عالم تھا گفتگو و خموشی کے بین بین
مشغول تھا دعاؤں میں زہرا کا نور عین

معراج بندگی تھی عروج سناں نہ تھا
اس وقت جیسے فاصلہ دو کماں نہ تھا

□□□

۲۱) جناب میکش اکبر آبادی :- آپ اکبر آباد کے دور حاضر کے نہایت ممتاز اور عظیم شاعر تھے آپ کے والد مولوی سید علی اصغر ابن سید مظفر علی آگرہ کے بزرگ علماء میں تھے۔ آپ کا اسم گرامی محمد علی شاہ تھا آپ، غالباً ۱۸۹۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور چند سال قبل آگرہ میں ہی وفات پائی۔ حضرت میکش اکبر آبادی آگرہ کے علمی اداروں کے روح متحرک تھے۔ آپ مصنف و مترجم بھی تھے۔ آپ نے علامہ شہرستانی کی کتاب ملل و نحل کا ترجمہ کیا تھا۔ آپ نے علامہ اقبال کی اسرار خودی کے ضمن میں نقد اقبال لکھی

تھی۔ جو وحدت الوجود کے نظریئے پر عالمانہ تصنیف ہے۔ آپ نے متعدد درسی کتابیں بھی تحریر کی تھیں آپ کے کلام میں عارفانہ رنگ نمایاں تھا آپ کی تخلیقات میں نغمہ اور میکدہ شائع ہو چکی ہیں۔ راقم السطور نے علامہ میکش اکبر آبادی کو ۱۹۴۰ء کے دوران عزا خانہ شاہ گنج آگرہ کے سالانہ مسالموں میں دیکھا اور سنا ہے آپ کی غزل کا ایک شعر ہے۔

میں نے لالے کی طرح اس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں

آپ کے مشہور سلام کے چند شعر دیکھئے۔

حسین شان کمال محمد عربی
نبی جمال الٰہی ہیں تو جمال نبی
علی امام ولایت ہیں تو ہے جان ولا
وہ راز دار نبی کے ہیں تو ہے راز نبی
دیا دماغ سیاست کو یہ سبق تو نے
کہ اس طریق سے ہوتی ہے دیکھ حق طلبی
تجھے مٹا کے بہت منفعل ہوئی دنیا
کہ روشن اور ہوئی بجھ کے شمع مطلبی
کہیں زمانے میں تیری مثال مل نہ سکی
پھرا کیا اسی دھن میں دماغ بولہبی

حضرت علامہ میکش اکبر آبادی کے دامن فیض سے مستفیض ہونے والوں میں مجاز لکھنوی اور معین احسن جذبی بھی تھے (۵۴)

علامہ موصوف کے کمرہ نشست میں ایک ہی تغرہ آویزاں تھا جو کسی مشہور خطاط کے فن کا مظاہرہ تھا اور یہ مصرعہ لکھا تھا۔

علی کا مرتبہ اللہ اکبر (۵۵)

آپ کی تصانیف میں حرف تمنا، نقد اقبال اور داستان شب نمایاں ہیں(۵۶) علامہ میکش کی شاعرانہ منزلت کے بارے میں حضرت صبا اکبر آبادی نے لکھا کہ وقت گزراں نے شاہ صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے کہ بڑے بڑے زعمائے شعراس کی پہلی سیڑھی پر بھی بہ مشکل قدم رکھ سکتے ہیں(۵۷)

□ □ □

۲۲) جناب مخمور اکبر آبادی :- آپ کا اسم گرامی سید محمد محمود رضوی تھا آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید محمد علی منعم کے فرزند تھے۔ آپ اس عہد کے عظیم ادیب، محقق، مصنف، اور نظم نگار شاعر تھے۔ آپ کا تفصیلی ذکر باب ہفتم، شخصیات میں کیا گیا ہے اس لئے یہاں آپ کے کلام کے چند نمونوں پر اکتفا کی جا رہی ہے۔ آپ کی نظموں کا عموی پس منظر سابق مشرقی پاکستان ہے جو مشرق تاباں کے نام سے شائع ہو چکی ہیں اسی سے دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

ملاح سے متعلق مسدس کا ایک بند

دیکھنا کیا ہے کسی جانب ہو ندی کا بہاؤ
تیز ہو دھارا جوانی پر ہو پانی کا چڑھاؤ
موڑ پر طوفاں بپا کرتا ہو دریا کا گھماؤ
تو جدھر کو حکم دیتا ہے ادھر چلتی ہے ناؤ
شاہ کا چلتا ہے سکہ جس طرح بازار میں
حکم نافذ ہے اسی صورت ترا منجدھار میں

بوڑھی گنگا کے کنارے ایک شام شفق کا پس منظریوں بیان کیا ہے۔

آیئے دیکھئے ذرا رنگ شفق کی دلبری
رنگ شفق ہے یا کوئی فتنہ سحر سامری
دوڑ گئی ہے سرخ رو نبض خیال خام میں
جان سی پڑگئی ہے یا نقش بساط شام میں
صبح ازل کی ضو ہے یا نور کی جھلملاہٹیں
شمع ابد کی لو ہے یا طور کی جگمگاہٹیں
کس کے لہو کا جوش ہے رنگ کی آب و تاب میں
کس نے گلال جھونک دی جوئے شراب ناب میں

□□□

۲۴) جناب علی سردار جعفری :- آپ سادات آگرہ و نواح شاہ گنج آگرہ پہر سر ریاست بھرت پور کے عظیم فرزند ہیں۔ آپ عہد حاضر کے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر، ادیب، مصنف و محقق اور اشتراکی دانشور ہیں۔ آپ کا تفصیلی تذکرہ ہم نے باب ہفتم شخصیات میں کیا ہے اس لئے یہاں آپ کے کلام کے چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ آپ کی غزلوں کے چند اشعار۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا
باعث شکر ہے تنہا روی رہبر عشق
ہم سفر کوئی نہیں دوری منزل کے سوا
جانے کس رنگ میں آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شور سلاسل کے سوا
صبح کے اجالے پہ رات کا گماں کیوں ہے

جل رہی ہے کیا دنیا چرخ پر دھواں کیوں ہے
قطرہ ہائے شبنم میں کیا لہو کی بوندیں ہیں
رنگ و نور کا دامن اتنا خوں چکاں کیوں ہے
راستہ نہیں چلتے صرف خاک اڑاتے ہیں
کارواں سے بھی آگے گرد کارواں کیوں ہے

نئی دنیا کو سلام میں مریمؔ" کے زیر عنوان چند شعر

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے
کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے
تبسم نہیں صرف، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی
شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے
وہ تخلیق کے دل کا سوز نہاں ہے
نگاہوں میں ہے شوخی دلبرانہ
جبیں پر مگر عظمت مادرانہ
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے
جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے

اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ
وہ آغوش تہذیب کا گاہوارہ

ایک نظم کربلا کے عنوان کے تحت چند شعر

پھر العطش کی ہے صدا
جیسے رجز کا زمزمہ
پھر ریگ صحرا پہ رواں
ہے اہل دل کا قافلہ
کوئی یزید وقت ہو
شمر لعین یا حرملہ
اس کو خبر ہو یا نہ ہو
روز حساب آنے کو ہے
نزدیک ہے روز جزا
اے کربلا اے کربلا

آپ کے مرثیہ کا ایک بند

آتا ہے ابن فاتح خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب' جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برج زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑوں کی ٹاپوں کی ضرب سے

□□□

آگرہ و نواح کے دیگر ممتاز شعراء

باکمال شعراء و اساتذہ فن کے علاوہ ممتاز شعراء کی قوس قزح سی آسمان ادب پر نظر آتی ہے۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے اس لئے یہاں ایسے ہی حضرات کا مختصر ذکر کیا گیا ہے جن کا تذکرہ کرنا ناگزیر تھا۔ تاہم بعض شعراء کے کوائف دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کا تعارف ممکن نہ ہوسکا اور وہ محروم ذکر رہ گئے ہوں گے یا ان کے بیان احوال میں تشنگی اور خامی رہ گئی ہوگی۔ درج ذیل شعراء کا نہایت اجمالی ذکر بڑی حد تک ان کے عہد کی مناسبت سے ترتیب دیا گیا ہے۔

۱) **جناب میر محمد مومن عرشی :-** آپ آگرہ میں ۱۰۰۱ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۰۹۰ہجری میں وفات پائی۔ آپ کے والد میر عبداللہ وصی شہزادہ سلیمان شکوہ بن دارا شکوہ کے اتالیق تھے۔ آپ اورنگ زیب کے ابتدائی عہد حکومت میں موجود تھے۔ آپ اردو شاعری کے بالکل ابتدائی دور (سترہویں صدی عیسوی کے وسط) کے ممتاز شاعر تھے۔

□□□

۲) **جناب شرف الدین پیام :-** آپ عہد اورنگزیب (سترہویں عیسوی کے نصف ثانی) کے نمایاں شاعر تھے۔ آپ سترہویں عیسوی صدی کے نصف اول میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور اسی صدی عیسوی کے اواخر میں انتقال کیا۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر اکبر آباد اور تذکرہ ریختہ گویاں میں ملتا ہے۔

۳) **جناب میر اوصاف علی وصفی :-** آپ کے والد میر بشارت علی کے جد اعلیٰ سید اعتماد مشہدی حضرت امام علی رضا کے نواسوں میں سے تھے جو عہد جہانگیری میں اکبر آباد میں آن بسے تھے۔ موصوف کے پرپوتے جناب سید

شرف الدین مشہدی عہد قضا پر مامور تھے آخر الذکر بڑے عالم فاضل تھے اور مدرسہ عالیہ بیگم جہاں آرا میں صدر مدرس تھے۔(۵۸) جناب وصفی نے عہد عالمگیری میں آنکھ کھولی۔ طویل عرصے تک بہ سلسلہ روزگار اجمیر میں مقیم رہے اور عمائدین شہر میں شمار ہوئے۔ آپ اردو اور فارسی کے ممتاز شاعر تھے اور اردو شاعری کے دور سوم کے بڑے اہم شاعر قرار پائے۔

□□□
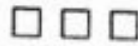
۴) جناب سید امیر خان انجام :- آپ سادات آگرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اورنگزیب کے دور حکمرانی میں آپ کا شمار امرائے سلطنت میں ہوا۔ فرخ سیر کے زمانہ حکومت میں آپ آگرہ کے صوبیدار (گورنر) رہے۔ آپ اردو شاعری کے دور اول کے نہایت ممتاز شاعر تھے۔ آپ کا تذکرہ سفینہ خوش گو اور مشاہیر اکبر آباد میں ملتا ہے۔

□□□

۵) جناب مرزا علی حسین قیصر :- آپ کے والد مرزا علی اعظم آگرہ میں وکیل عدالت اور مطبع حیدری کے مالک تھے۔ جناب قیصر غالباً ۱۸۱۵ء عیسوی میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۰ھ میں وفات پائی۔ آپ منیر شکوہ آبادی اور مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی جیسے اساتذہ کے ہم نشین اور شاگرد تھے۔ آپ عہد غالب کے بعد انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی (دور ششم) کے نامور شاعر تھے۔

□□□

۶) جناب منشی ہرگوپال تفتہ :- آپ اکبر آباد کے ہندو شعراء و ادباء میں ممتاز تھے۔ آپ مرزا غالب کے قریبی دوستوں میں سے تھے جن سے مرزا کی خط و کتابت تھی۔ آپ عہد غالب (دور پنجم) کے نمایاں شعرا میں تھے۔

□ □ □
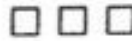
۷) جناب مولوی سید مدد علی تپش :- آپ کا نسبی تعلق سادات آگرہ سے تھا۔ آپ غالباً ۱۸۲۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور غالباً ۱۸۸۵ء میں انتقال کیا۔ آپ اردو شاعری کے دور پنجم (عہد غالب) کے ممتاز شاعر تھے۔

□ □ □

۸) جناب پروفیسر سید ضامن علی رضوی :- آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے مشاہیر میں تھے۔ آپ آگرہ کالج میں عربی وفارسی کے پروفیسر تھے اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ تذکرہ "مجید دراحوال شہید" کے پہلے ایڈیشن میں شہید ثالث سے متعلق آپ کی دو رباعیاں درج تھیں جن کو بعد کے ایڈیشن میں سے حذف کردیا گیا۔ آپ بادا سید محمد علی جعفری کے نانا تھے جو برصغیر کے عظیم افراد میں شمار ہوئے۔

□ □ □

۹) جناب غلام محمد خان رہا :- آپ آگرہ میں غالباً ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔ آپ کے دادا ریاست بھرت پور میں عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ جناب رہا اکبر آبادی آگرہ کالج میں پروفیسر رہے۔ آپ خلیفہ گلزار علی اسیر کے شاگرد تھے۔ آپ صاحب دیوان شاعر تھے اور اردو شاعری کے دور ششم کے بڑے شعراء میں شمار ہوئے۔ حضرت نجم آفندی نے اپنی مشہور نظم دارالادب اکبرآباد میں آپ کو شمع انجمن لکھا ہے۔

□ □ □
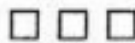
۱۰) جناب سید اعظم علی اعظم :- آپ عہد غالب (دور پنجم) کے ممتاز شعرائے اکبرآباد میں شمار ہوئے۔ آپ کے والد مولوی سید ببر علی صاحب

علم بزرگ تھے اور شارح مثنوی مولانا روم مولوی ولی محمد کے نواسے تھے۔
جناب اعظم آگرہ کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے۔ آپ نے ۱۸۲۴ء میں
"فسانہ سرور افزا" لکھی اور ۱۲۶۱ ہجری میں "مثنوی اکسیر اعظم" تحریر کی۔
آپ مرزا غالب کے احباب میں تھے۔ آپ نے ۱۲۷۱ھ میں وفات پائی۔

□□□
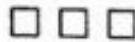
۱۱) جناب ماسٹر سید تصوف حسین واصف : ۔ آپ کے والد سید
اصغر علی اکبر آبادی تھے۔ جناب واصف اکبر آبادی ۱۲۷۹ھ میں آگرہ میں تولد
ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔ آپ مولانا سید نثار علی نثار اور مرزا خادم
حسین رئیس جیسے اساتذہ فن کے ہمعصر تھے۔ آپ کا کلام اردو معلیٰ، مخزن
اور ادیب جیسے جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ آپ پچھلے دور شاعری کے نہایت
ممتاز شعرائے اکبر آباد میں شمار ہوئے۔

□□□
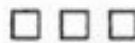
۱۲) جناب خان بہادر سید اولاد حسین رضوی مداح : ۔ آپ
سادات آگرہ و نواح کے عظیم فرزند تھے۔ آپ نے ۱۸۳۶ء میں پہر سر ریاست
بھرت پور میں آنکھ کھولی اور محرم ۱۳۲۳ھ میں شاہ گنج آگرہ میں ابدی نیند
سوگئے۔ آپ کا تفصیلی ذکر مشاہیر سادات میں الگ کیا گیا ہے۔ "زاد سبیل
آخرت" اور "منظوم مبارک" آپ کی اہم تصانیف ہیں جو شائع بھی ہو چکی
ہیں۔ آپ پچھلے دور شاعری کے ممتاز شاعر تھے۔ آپ کے خاندان میں کئی شاعر
گزرے ہیں جو مرثیہ گو بھی تھے آپ کا تفصیلی ذکر دربار حسینی (چراغ مجالس)
میں ملتا ہے۔

□□□
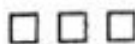
۱۳) جناب سید ذوالفقار حسنین رضوی بسمل : ۔ آپ سادات شاہ

گنج آگرہ کے ممتاز شاعر، ادیب اور مترجم تھے۔ آپ اعلیٰ درجے کے نثرنگار بھی تھے۔ فضلی کی وہ مجلس کا آپ نے مخصوص انداز میں ترجمہ کیا تھا۔ آپ غالباً ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے اور عین جوانی میں ۱۹۱۹ء میں وفات پائی۔ آپ راقم السطور کے بڑے ماموں تھے۔

□□□

۱۴) جناب سید وزیر حسین وزیر : - آپ نواح آگرہ ریاست بھرت پور کے ممتاز شاعر تھے اور انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی کی نمایاں افراد میں شمار ہوئے۔ موصوف کے والد سید ثابت علی رضوی تحصیل دار تھے جن کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران مجاہدین آزادی نے شہید کر دیا تھا۔ آپ کے بھائیوں میں خان بہادر سید اولاد حسین مداح، کمشنر بندوبست اور سید اعجاز حسین ڈپٹی کلکٹر نمایاں تھے۔ آپ اودھ میں جج بھی رہے۔ آپ کی وفات لکھنؤ میں ۱۸۸۶ء میں ہوئی تھی۔ آپ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ان کی متعدد تصانیف میں "کتاب ذائقہ ماتم" (چہل مجلس) "وظائف المومنین" اور "تاریخ آئمہ" چھپ چکی ہیں۔ آپ نے سینکڑوں سلام اور مرثیے لکھے مگر آپ کا سرمایہ کلام بہت کم شائع ہو سکا۔

□□□

۱۵) جناب سید فضل رسول فضل : - آپ نواح آگرہ (موضع پہر سر ریاست بھرت پور) کے رضوی سادات کے ممتاز فرد تھے۔ آپ کا خاندان بھرت پور کا نہایت اہم اور مقتدر خانوادہ تھا جس میں کئی صاحب تصنیف شاعر اور اعلیٰ منصب دار گزرے۔ فضل صاحب نے کلام منقبت و عزاء کے سوا کچھ اور نہ کہا۔ آپ کی فارسی زبان میں تصنیف "ہفت بند زہرا" (جام سبیل آخرت) بہت مشہور و مقبول ہوئی جو ۱۳۲۷ھ میں چھپی تھی۔ اس کی تعریف و

توصیف مولانا ناصر الملت اور مولانا نجم الملت جیسے علماء نے کی تھی۔ آپ انیسویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی میں پیدا ہوئے اور موجودہ صدی عیسوی کی چوتھی دہائی میں وفات پائی۔ "سرفراز لکھنؤ محرم نمبر" اپریل ۱۹۳۵ء میں محترمہ روپ کماری کا بیس قسطوں پر مشتمل ایک خمسہ چھپا تھا اس کی پیشانی پر یہ تمہیدی نوٹ درج تھا کہ ذیل کا خمسہ محترمہ روپ کماری تلمذ جناب فضل رسول فضل صاحب کی تصنیف و تالیف ہے۔(۵۵)

□□□
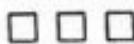
۱۶) جناب سید اصغر علی اصغر :- آپ کے والد سید ارشد علی شرفائے اکبر آباد میں تھے۔ جناب اصغر اکبر آبادی ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے حصول تعلیم کے بعد آپ ریاست پٹیالہ میں میر منشی مقرر ہوئے۔ آپ جملہ فنون میں ماہر تھے رجب علی سرور اکبر آبادی کی تصنیف "فسانہ عجائب" کے مقابلے میں ۱۲۸۱ھ میں "گلشن جانفزا" لکھی۔(۵۶) آپ کی دیگر تصانیف میں کئی مثنویوں کے علاوہ "نعت اصغری" نہایت اہم ہے۔ آپ نے متعدد فنون پر رسالے بھی لکھے۔ آپ باکمال غزل گو شاعر تھے۔ آپ نے ۱۲۹۷ھ میں عین جوانی میں انتقال کیا۔ آپ دور ششم کے بڑے ممتاز اکبر آبادی شاعر تھے۔

□□□

۱۷) جناب منشی نبی بخش حقیر :- آپ کے والد شیخ حسین بخش اکبر آبادی بڑے صاحب علم بزرگ تھے۔ جناب حقیر کی ولادت آگرہ میں ۱۲۰۰ھ میں ہوئی اور وفات ۱۲۸۳ھ میں ہوئی۔ مرزا غالب نے آپ کا قطعہ تاریخ لکھا آپ فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ اس عہد کے ممتاز سخن فہم و سخن سنج تسلیم کیے گئے۔ مولانا حالی نے آپ کی سخن سنجی کی بڑی تعریف کی ہے۔ آپ مرزا غالب کے معتمد ترین احباب میں تھے جن کے بارے میں مرزا غالب نے

لکھا کہ "جب تک میں اس بزرگ سے نہیں ملا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ سخن فہمی کیا ہوتی ہے اور سخن سنج کسے کہتے ہیں"۔(۶۰) جب مرزا غالب نے "دستنبو" کو آگرہ میں چھپوایا تو اس کی صحت طباعت کی نگرانی آپ ہی کو سونپی تھی۔ آپ اچھے اور ممتاز شاعر بھی تھے۔

□□□

۱۸) جناب احمد خان شیفتہ :۔ آپ انیسویں صدی کے نصف ثانی (دور ششم) کے بڑے شاعر تھے۔ آپ کے والد سلطان خان اکبر آبادی تھے۔ جناب شیفتہ حضرت گلزار علی اسیر کے شاگرد اور جناب قطب الدین باطن کے ہمعصر تھے۔ آپ دور ششم کے نہایت ممتاز اور باکمال شاعر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد آپ حیدر آباد دکن چلے گئے تھے جہاں آپ ۳۵ برس تک مقیم رہے اور شعرائے دکن میں بھی آپ کا شمار ہوا۔ آپ نے دکن ہی میں ۱۳۰۹ھ میں وفات پائی۔ ۱۸۷۷ء میں داغ دہلوی کی آمد و قیام حیدر آباد دکن کے سلسلے میں بعض تلخ واقعات رونما ہوئے جس کی بنیاد زبان دانی کے متکبرانہ دعوی تھے ان کا تذکرہ نقش حیدر آبادی کی کتاب "عروس الافکار" اور مفتی انتظام اللہ شہابی کی مشاہیر اکبر آباد میں بڑی وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ حیدر آباد دکن میں تلامذہ فیض اور تلامذہ وصفی لکھنوی کے ہنگامہ خیز مشاعروں میں آپ کو حکم بنایا جاتا تھا(۶۱) آپ پختہ فکر اور مشاق شاعر تھے۔ آپ کی غزلیں اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کافی تعداد میں ملتی ہیں آپ نے بہت کچھ کہا مگر اکثر سرمایہ کلام دریائے موسیٰ کی طغیانی کی نذر ہو گیا۔

□□□

۱۹) جناب قطب الدین باطن :۔ آپ ۱۲۳۰ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ستر برس کی عمر میں ۱۳۰۰ھ میں انتقال کیا۔ آپ کے والد سید محمد

طاہر شرفائے اکبر آباد میں سے تھے۔ آپ صاحب تصانیف شاعر وادیب تھے۔ دیوان غزلیات، غنچہ بہار کے علاوہ آپ کی ممتاز ترین نثری تصنیف "گلشن بے خزاں" ہے جو نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی کی کتاب "گلشن بے خار" کے جواب میں لکھی تھی۔ اس میں آپ نے ان باکمال شعرائے اکبر آباد کا ذکر بھی کیا تھا جن کو تنگ نظری کے تحت نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی نے عمداً نظرانداز کردیا تھا۔ آپ چھٹے دور شاعری کے نہایت ممتاز اور نامور شاعر تھے۔

□□□
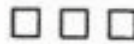
۲۰) جناب مولوی غلام غوث بیخبر : ۔ آپ ۱۲۴۰ھ میں تبت میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے نانا خواجہ فرید الدین اکبر آبادی بہ سلسلہ روزگار مقیم تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ اس وقت کے صوبہ شمال مغرب کے گورنر کے میر منشی مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں آپ ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کو خان بہادر اور ذوالقدر کے خطابات ملے۔ آپ شاعری اور انشاپردازی میں ممتاز تھے۔ آپ کے والد کے مرزا غالب اور حضرت منیر شکوہ آبادی سے گہرے روابط تھے۔ آپ نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی۔ آپ پانچویں دور شاعری کے ممتاز شعرائے اکبر آباد میں نمایاں تھے۔ آپ کا تذکرہ تاریخ ادب اردو خمخانہ جاوید اور "داستان تاریخ اردو" میں ملتا ہے۔

□□□

۲۱) جناب مولانا سید نثار علی نثار : ۔ آپ کے والد سید مشتاق علی آگرہ کے معزز وکیل تھے جن کا شمار عمائدین اکبر آباد میں ہوا۔ مولانا نثار غالباً ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں وفات پائی۔ آپ اردو شاعری کے دور ششم کے نامور شاعر تھے آپ عربی و فارسی کے عالم بھی تھے اور مرزا

حاتم علی مہر کے شاگرد تھے۔ آپ صاحب دیوان شاعر تھے اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

□ □ □

۲۲) جناب مولوی سید عنایت علی رضوی :- آپ ۱۸۹۳ء میں اجمیر میں تولد ہوئے۔ جہاں آپ کے والد مرزا اوصاف علی اکبر آبادی بہ سلسلہ ملازمت سکونت پذیر تھے۔ جناب رضوی نے علی گڑھ کالج سے ایم اے کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی آپ نے تحریری کاوشیں شروع کردی تھیں اور بہت جلد آپ ممتاز شاعر و ادیب کی حیثیت سے ابھرے۔ جناب ساغر نظامی کے افسانوں کے مجموعہ "کہکشاں" کا دیباچہ آپ نے ہی لکھا تھا جو کلاسیکی ادب میں اہم مقام رکھتا ہے۔(۴۲) آپ نے نعت گوئی کو اپنا محور کلام بنایا اور بہت بڑے نعت گو شاعر قرار پائے۔ آپ نے کراچی میں ۱۹۵۹ء میں وفات پائی۔

□ □ □

۲۳) جناب شیخ بزرگ علی عالی :- آپ حضرت شیخ سلیم چشتی کی نسل میں سے تھے۔ آپ غالباً ۱۸۸۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔ آپ کے ہم عصروں میں جناب خادم حسین رئیس، مولانا سید نثار علی نثار اور واصف اکبر آبادی جیسے اساتذہ فن تھے۔ آپ اپنے عہد کے عظیم مرثیہ گو بھی تھے۔ آپ نہایت نکتہ سنج اور دقیق نگار ادیب تھے۔ شاعری میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ آپ چھٹے دور شاعری کے بڑے ممتاز شعراء میں شمار ہوئے۔

□ □ □

۲۴) جناب سید نیاز علی پریشان :- آپ کے والد شیخ رحمت علی

مرزا غالب کے عہد کے شرفائے اکبر آباد میں سے تھے۔ پریشان کی پیدائش اور تربیت آگرہ میں ہوئی آپ مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے۔ آپ کی بہترین یادگار "تذکرہ شعر و سخن" ہے جس میں اکبر آباد کے شعراء کی اردو اور فارسی کی ایک سو ایک غزلیں شامل ہیں۔ آپ نے غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ میں بہت کچھ کہا۔ ۱۸۶۹ء میں وفات غالب کے سلسلے میں ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں آپ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جیسا کہ "تاریخ ادب اردو" میں رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے۔

□ □ □

۲۵) جناب سید حمید الحسن قتیل : - بھرت پور کے میر حسین علی کے فرزند تھے۔ آپ انیسویں صدی کی نصف ثانی میں نواح آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔ آپ نے پہلے حضرت نسیم بھرت پوری سے اور پھر فصیح الملک داغ دہلوی سے مشورہ سخن کیا مرثیہ گوئی میں خورشید علی نفیس کے شاگرد تھے۔ آپ تحت لفظ مرثیہ خوانی میں بھی ممتاز تھے آپ نے مستقل سکونت جے پور میں اختیار کرلی تھی۔ بھرت پور، جے پور اور نواح میں آپ کے شاگردوں کی تعداد بڑی تھی۔ آپ استادانہ منزلت کے شاعر تھے۔

□ □ □

۲۶) جناب سید مصطفیٰ حسین مصطفیٰ : - آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے بزرگ شاعر تھے۔ راقم السطور (تاز اکبر آبادی) نے ۱۹۳۰ء میں آپ کو ضعیف العمر دیکھا تھا اس وقت آپ کی عمر اندازاً "۶۵ برس ہوگی۔ آپ غالباً ۱۸۸۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا۔ آپ طرز قدیم کے استاد فن تھے اور غزل، سلام، قصیدہ وغیرہ میں بہت کچھ کہا لیکن آپ کے ورثا اور تلامذہ نے اس کی حفاظت نہ کی: آپ کی غزل کا ایک شعر یاد

رہ گیا ہے۔

فصد لیلیٰ کی کھلی خوں رنگ مجنوں سے بہا
دیکھ دیوانے اسے کہتے ہیں اعجاز جنوں

آپ کے سلام کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

بجھ گئی افسوس رن میں شمع قندیل حرم
کیا قیامت ہے کہ کوفہ میں چراغاں ہوگیا
رنگ لایا خوں شہیدان وفا کا مصطفیٰ
چرخ پر رنگ شفق بن کر نمایاں ہوگیا

□□□

۲۷) جناب مرزا غضنفر حسین عروج :- آپ نواح آگرہ (ریاست بھرت پور) سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد مرزا عاشق حسین تھے۔ آپ عربی، فارسی اور سنسکرت میں ماہرانہ استعداد کے حامل تھے۔ (۶۰) آپ غزل میں ظہیر دہلوی اور مرثیہ میں عارف لکھنوی کے شاگرد تھے۔ پاکستان میں جدید مرثیہ گوئی کی بنیاد رکھنے والوں میں آپ سرفہرست ہیں۔ بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ کے مطابق آپ نے ۱۹۵۱ء میں جدید مرثیہ لکھا تھا جب آپ گلبہار (گولیمار) کی اولین مہاجر آبادی میں سکونت پذیر تھے تحت لفظ مرثیہ خوانی میں بھی آپ کو اولیت حاصل تھی۔ آپ کے مراثی کا مجموعہ عروج المجالس چھپ چکا ہے۔ اس کی دس جلدوں میں سے فقط دو ہی شائع ہو سکی ہیں۔ آپ کی ولادت غالباً ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی اور ۷۵ برس کی عمر میں آپ نے ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ کراچی میں وفات پائی۔ آپ کے چند مرثیوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں۔

۱) زمزمہ سنج ہے پھر بلبل شیدائے حسین

۲) کربلا میں جو نمایاں شب عاشور ہوئی

۳) سبق آموز زمانہ ہے وفاداری حر

۴) حسن تخلیق دو عالم ہے مشیت اس کی

۵) جلوہ فگن ہوا جو رخ زرنگار صبح

جناب عروج بھرت پوری بڑے شاعر تھے اور جدید مرثیہ کے پاکستان میں بانیوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے لیکن بعض ادبی حلقے ان کا ذکر مناسب انداز میں نہیں کرتے۔ اپنے کلام کے اعتبار سے وہ اہم مقام کے حق دار ہیں۔

□ □ □

۲۸) جناب آغا محمد جواد ماژندرانی ثم اکبر آبادی :- آپ کے والد بزرگوار تقدس ماب مولانا محمد مصطفیٰ نے غالباً ۱۸۹۰ء میں افغانستان رایران سے ہجرت کی اور شاہ گنج آگرہ میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ جناب آغا جواد کی ولادت غالباً ۱۸۹۸ء میں آگرہ میں ہوئی اور ستمبر ۱۹۹۳ء میں کراچی میں وفات پائی۔ تمام عمر آپ پیشہ معلمی سے وابستہ رہے۔ آپ شاعری کے مکتب قدیم سے تعلق رکھتے تھے اور استادانہ منزلت پر فائز تھے۔ آپ نے غزل، قصیدہ اور سلام بڑی تعداد میں کہے مگر نام و نمود سے بے رغبتی اور ورثاء کی عدم دلچسپی کے باعث آپ کا کلام چھپ نہ سکا۔ آپ شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے بزرگ شعرا میں ممتاز تھے۔ آپ کی غزل کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے جس سے آپ کے انداز بیان اور اسلوب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہرچند اضطراب ہے وجہ سکون دل

بس اضطراب دل کہ مرا جا رہا ہوں میں

آپ کے ایک سلام کے دو شعر دیکھئے۔

وہ دل تو نہیں اک پتھر ہے جو دل کہ نہیں شیدائے حسین
اس سر کو بھلا کیا سر کہئے جس سر میں نہیں سودائے حسین
اے غم کی کہانی ختم نہ ہو اے درد کی دنیا بستی جا
جب تک کہ جہان ظلم و ستم خود چیخ نہ اٹھے ہائے حسین

□□□

۲۹) جناب خادم علی خان اخضر :- آپ اکبرآباد کے عہد آخر کے بزرگ شاعر تھے اور استادانہ حیثیت کے مالک تھے۔ آپ حضرت صبا اکبرآبادی کے استاد تھے "قصرالادب" آگرہ کے مشاعروں کی آپ صدارت کیا کرتے تھے اور علامہ سیماب آپ کی صدارت میں اپنا کلام سناتے تھے۔ ذیل کی رباعی سے آپ کی قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ظاہر تھی نمایاں تھی حقیقت تیری
اللہ و نبی کو تھی ضرورت تیری
کی ختم رسل نے دین حق کی تکمیل
تکمیل رسالت ہے شہادت تیری

□□□

۳۰) جناب علی محمد ندا :- آپ شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے بزرگ شاعر اور استاد فن تھے۔ آپ نعت گوئی میں ممتاز تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کافی بڑی تھی۔

□□□

۳۱) جناب سید محمد مدثر رضوی بکا :- آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے

عہد آخر کے بزرگ شاعر تھے اور رثائی شاعری (نوحوں) میں ممتاز تھے۔ آپ کے بیشتر نوحے پردرد اور پر تاثیر ہوتے تھے اور آپ متین دہلوی کے جانشین لگتے تھے۔ آپ غالباً ۱۸۷۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔ آپ ریلوے مواصلات میں ٹیلی گراف ماسٹر کے منصب سے غالباً ۱۹۳۰ء میں ریٹائر ہوئے تھے۔

□□□
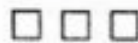
۳۲) جناب سید فرزند حسن فیض بھرت پوری :- آپ نواح آگرہ (ریاست بھرت پور) میں ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے اور ۱۵ مئی ۱۹۸۹ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ آپ نے ابتدائی عہد شعر گوئی میں سید موسیٰ رضا شاد بھرت پوری اور مرزا عروج بھرت پوری سے مشورہ سخن کیا۔ کراچی میں حسینیہ ایرانیان اور جامعہ امامیہ میں اپنے مراثی پڑھتے رہے۔ آپ کے دادا بصیر اور والد کلیم بھی مرثیہ گو شاعر تھے۔ آپ ممتاز مرثیہ گو تسلیم کئے گئے ہیں۔ آپ کے مرثیوں کی تین جلدیں 'جلد اول' جلد دوم اور مرثیہ گنج شہیداں ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۲ء کے دوران شائع ہوئیں۔ "تبرک" کے زیر عنوان آپ کا مرثیہ ۱۹۸۳ء میں چھپا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد یادگار مجلّہ "فیض بھرت پوری معاصرین کی نظر میں" شائع ہو چکا ہے۔ جس میں آپ کے کلام کی تفصیل موجود ہے۔ اسی مجلّہ میں سید محمود الحسن رضوی کا مضمون فیض بھرت پوری ایک منفرد مرثیہ گو لائق مطالعہ ہے۔ آپ کے چند مرثیوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں۔

۱) باعث رونق گلزار جہاں ہے پانی

۲) مخزن فیض کا تابندہ گہر ہے ایثار

۳) یہ زندگی میں تنازع جو ہے بقا کے لئے

۴) باعث زینت آغوش پدر ہے فرزند

□□□

۳۳) جناب سید نظیرالحسن رضوی حسرت :- آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر کے فرزند تھے۔ آپ غالباً ۱۸۹۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں کراچی میں وفات پائی۔ آپ شاعر بھی تھے اور مصنف و مترجم بھی.... آپ کی غزلیات دستیاب نہ ہو سکیں تاہم ایک سلام کا یہ شعر اب تک یاد رہا ہے۔

ولادت جب ہوئی کعبے میں خانہ زاد داور کی
بتوں سے بھی صدا آنے لگی اللہ اکبر کی

□□□

۳۴) جناب سید امیر حیدر بخت :- آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے ممتاز بزرگ شاعر تھے۔ آپ غالباً ۱۸۷۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ کراچی میں وفات پائی۔ آپ مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کے فن کے ماہر تھے۔ آپ کا اس فن سے متعلق قصیدہ ماہنامہ "مخزن" میں ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا۔

۳۵) جناب احسن اللہ ثاقب :- آپ مولوی نصراللہ اکبرآبادی کے فرزند تھے جو صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے اور جن کے بزرگ ۱۸۵۷ء کے بعد آگرہ میں آن بسے تھے۔ جناب ثاقب ۱۸۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔ آپ وکٹوریہ کالج گوالیار میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے۔ آپ نے علی گڑھ سے "قندپارسی" رسالہ نکالا تھا آپ کی تصانیف میں دیوان فارسی، مجموعہ نثر فارسی، مجموعہ نظم "ریختہ" اور "مثنوی آتش بے دود" مشہور ہیں۔ آپ نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی کی ہے آپ کی غزل کے دو شعر ہیں۔

فروغ خاطر دل خستگاں نہیں معلوم
نہیں نہیں مجھے اے آسماں نہیں معلوم

رواں ہے قافلہ غفلت کی راہ سے پیہم
کہاں تمام ہو عمر رواں نہیں معلوم

□□□

۳۶) جناب مولوی نظام الدین شاہ دلگیر :- آپ کے والد مولوی عبدالقادر شرفائے اکبر آباد میں سے تھے۔ جناب دلگیر ۱۲۷۸ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۵۲ھ میں وفات پائی۔ آپ نامور صحافی و ادیب تھے اور رسالہ "نقاد" آگرہ کے مدیر رہے۔ آپ آگرہ میں اعزازی مجسٹریٹ بھی تھے۔ آپ اکبر آباد کے عہد آخر کے بڑے شاعر قرار پائے۔

□□□

۳۷) جناب سید ابرار حسین تپاں :- آپ کے بزرگوں کا تعلق مہاین ضلع متھرا کے رضوی سادات سے تھا جن میں سے کوئی صاحب فتح پوری سیکری میں آکر بس گئے تھے۔ جناب تپاں فتح پوری چھٹے دور شاعری اور ساتویں دور شاعری کے درمیانی کڑی تھے اور استادانہ حیثیت کے مالک تھے۔ آپ حضرت نسیم بھرت پوری کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ آپ ہی نے ریاض نسیم کی ۱۹۲۷ء میں ترتیب و تدوین کا آغاز کیا جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ آپ نواح آگرہ کے ممتاز شعراء میں شمار ہوئے اور استادانہ مقام کے حامل قرار پائے۔

□□□

۳۸) جناب سید غلام علی احسن :- آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے

عہد آخر کی بڑی اہم اور ممتاز شخصیت تھے آپ شاعر و ادیب اور مصنف بھی تھے آپ کا ذکر مشاہیر میں الگ کیا گیا ہے۔

□□□

۳۹) جناب سید ساجد رضا فہیم :- آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے پہلے شخص تھے جو ڈبل ایم اے ہوئے۔ آپ وکیل تھے اور ضلعی مسلم لیگ آگرہ کے نائب صدر رہے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ آپ کی وفات ۱۹۴۷ء میں آگرہ میں ہوئی۔

۴۰) جناب شکور احمد رعنا :- آپ اکبر آباد کے عہد آخر کے ممتاز اور مشہور شعراء میں تھے۔ آپ آگرہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے اور کراچی میں ۱۹۷۶ء میں وفات پائی۔ آپ اردو فارسی اور انگریزی میں کامل دسترس رکھتے تھے۔(۶۴) آپ نے ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی اور کافی ذخیرہ ادب چھوڑا ہے۔ آپ حضرت نجم آفندی کے ان ممتاز شاگردوں میں تھے جو خود استادانہ منزلت و مقام کے حامل تھے۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ 'غزال رعنا' اور سلاموں کا مجموعہ 'تسبیح رعنا چھپ چکے ہیں۔ آپ کی غزلوں کے چند متفرق اشعار یہ ہیں۔

قید سے چھوٹے ہیں لیکن اپنے قابو میں نہیں
پاؤں کچھ بہکے ہوئے پڑتے ہیں بے زنجیر کے

اک شب غم یہاں نہیں کٹتی
ہم سمجھتے تھے زندگی کم ہے

روشنی حسن و محبت کی برابر پھیلے
لو کبھی شمع سے نکلے کبھی پروانے سے

کبھی کسی نے پڑھے ہیں خطوط کرنوں کے
بڑے پیام نمود سحر میں ہوتے ہیں

□□□

(۴۱) جناب محمود پہر سری : - آپ سادات پہر سر ریاست بھرت پور (نواح آگرہ) کے ممتاز فرد تھے۔ آپ کا نام سید محمود الحسن جعفری تھا۔ آپ چھٹے دور شاعری کے ممتاز مرثیہ گو شاعر تھے۔ آپ تحت لفظ مرثیہ خوانی میں بھی ممتاز تھے اور آگرہ جے پور' الہ آباد اور لکھنؤ جیسے مقامات پر ہر سال ماہ عزا میں مرثیہ خوانی کے لئے بلائے جاتے تھے۔ آپ کے دو مرثیوں کے ان بندوں سے آپ کی شاعرانہ قدرت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایک مرثیہ کا پہلا مصرع

حمد خدا بہار ریاض سخن کی ہے

ایک اور مرثیہ کا پہلا مصرعہ

بہار باغ فصاحت کلام ہے میرا

آپ کے بعض مراثی ہدیہ محمود میں شائع ہو چکے ہیں۔

□□□
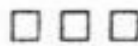
(۴۲) جناب سید علی مقدس رضوی : - آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے ممتاز فرزند تھے۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر سادات میں الگ کیا گیا ہے۔ آپ اچھے شاعر بھی تھے اور آسان زبان میں شعر گوئی کے ماہر بھی تھے۔ آپ کے سلام کے چند شعر یہ ہیں جو آپ کے مجموعہ کلام بیاض مقدس سے اخذ کئے ہیں۔

زینب کہاں اسیری ظلم و رسن کہاں
شہزادی جہاں کہاں قید محن کہاں
کیا انقلاب گلشن عالم میں آگیا
جنگل کہاں رسول کے غنچہ دہن کہاں
عالم کا پردہ پوش مقدس جو تھا شہید
چالیس دن ملا اسے گور و کفن کہاں

□□□
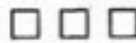
(۴۳) جناب سید محمد مظہر رضوی راز آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید افتخار حسن رضوی بن سید کلب حسن مرحوم کے فرزند تھے۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر میں الگ کیا گیا ہے یہاں آپ کے سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خون شہید بن گیا عنوان زندگی
یہ داستان نصاب دبستان زندگی
تیری بساط فقر پہ تاج و نگیں نہ تھے
پھر بھی حسین تو ہے سلیمان زندگی
باقی تمام دفتر علم و عمل سیاہ
اک باب یہ ہے باب درخشان زندگی
کس قافلے کو دیکھ لیا ہے لٹا ہوا
ہر صبح چاک ہی جو گریبان زندگی
اے راز نور حق کے سہارے سے آج تک
روشن ہے آفتاب درخشان زندگی

۴۴) جناب ظریف جبل پوری :- آپ کا اسم گرامی سید حامد رضا نقوی تھا۔ آپ سادات اول ضلع متھرا کے ممتاز فرد تھے۔ لیکن نوعمری سے تقسیم ہند تک آپ سی پی انڈیا کے مشہور شہر جبلپور میں رہے۔ اس لئے خود کو جبل پوری کہلوانے لگے۔ آپ برصغیر کے نامور مزاحیہ شاعر تھے آپ نے سلام اور مراثی بھی لکھے اور کراچی کے ممتاز مرثیہ نگاروں میں شمار ہوئے آپ کے سلام کے چند شعر یہ ہیں۔

کہتا سلام شاہ کی سرکار کے لئے
ہے فرض عین مردم دیندار کے لئے
رونا غم حسین میں بدعت نہیں ظریف
پروانہ ہے یہ خلد کے گلزار کے لئے

□□□

۴۵) جناب سید محمد جعفری :- آپ نواح آگرہ (ریاست بھرت پور) کے سادات جعفری سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد باوا سید محمد علی جعفری برصغیر کی نہایت ممتاز حضرات میں شمار ہوئے۔ سید محمد جعفری ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور دسمبر ۱۹۷۶ء میں کراچی میں وفات پائی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہوگئے اور تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد وزارت اطلاعات و نشریات کے محکمہ پریس انفارمیشن میں بھی عہدیدار رہے۔ نیز سفارتخانہ پاکستان تہران میں پریس اتاشی بھی رہے' ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ برصغیر کے نامور اور ذہین ترین مزاحیہ شاعر تھے۔ آپ کی شخصیت کی تشکیل میں سادات شاہ گنج آگرہ کے ماسٹر پروفیسر سید عبداللہ رضوی کی توجہات کا بڑا دخل تھا جو آگرہ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے(۵۹) آپ کا مجموعہ کلام

"شوخیِ تحریر" چھپ چکا ہے اس کی نظمیں خصوصی توجہ کی متقاضی ہیں۔ ایوب خانی مارشل لاء کے زمانے میں آپ کی ایک نظم کا یہ شعر اسی عہد کے ایک بیوروکریٹ کی سیاست کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

جب کوئی انقلاب ہوتا ہے قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

یو این او کے متعلق خوب شعر ہے!

یو این او کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے
وعدۂ فردا کے ٹرخانے کے فن میں فرد ہے

طرزِ نو کی شاعری سے متعلق ایک شعر ہے

طرزِ نو کی شاعری کی کوئی کل سیدھی نہیں
شہر بھر میں اونٹ بے چارہ عبث بدنام ہے

تجریدی آرٹ کے تین اشعار

نقشِ محبوب مصور نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

آڑی ترچھی سی لکیریں ہیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

ایبسٹریکٹ آرٹ کے سینے سے یہ دولت نکلی
میں تو سمجھا تھا اناس ہے عورت نکلی

□□□

(۴۶) جناب سید علی ناصر تبسم :- آپ کے والد سید امیر حسن جعفری سادات پہر سر ریاست بھرت پور (نواح آگرہ) سے تعلق رکھتے تھے اور

خود بھی شاعر تھے۔ تبسم آگرہ میں ۱۳۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۷۸ھ میں نوجوانی میں ہی وفات پائی۔ آپ افق شعروادب پر ابھرتے ہوئے ستارہ تھے۔ آپ مرثیہ گو بھی تھے آپ کے کلام کا مجموعہ "اشک تبسم" بھی شائع ہو چکا ہے جس میں مراثی بھی ہیں ان کے دو مرثیوں کے پہلے مصرعہ یہ ہیں۔

۱) کرگیا نام وفا میں حرغازی اپنا

۲) ہاں اے زبان فکر فصاحت بیاں ہو آج

□□□

۴۷) جناب سید علی سجاد انجم :- آپ بھی پہر سر ریاست بھرت پور کے جعفری سادات سے تعلق رکھتے تھے اور سید امیر حسن جعفری ہی کے فرزند بھی تھے۔ آپ شاہ گنج آگرہ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے تھے آپ نے بھی عین عالم شباب میں ۱۹۴۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ موصوف نوجوانی کے باوجود پختہ گو شاعر نظر آتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "تجلیات انجم" چھپ چکا ہے۔ آپ کی غزلوں کے تین شعر ہیں۔

مرجائے گا نوید طلوع سحر سے وہ
بیمار غم کی رات الٰہی کٹی نہ ہو

بکھر گیا تو بنا حسن زینت گلشن
سمٹ گیا تو بنی شکل ہو بہو تیری

یہ جو بکھرے ہوئے ذرے ہیں ترے کوچے میں
ان کو ترتیب اگر دوں تو مرا دل ہو جائے

□□□

۴۸) جناب سید علی اطہر جعفری پہرسری :- آپ بھی سادات پہرسر (ریاست بھرت پور) کے ممتاز مرثیہ گو شاعر تھے۔ آپ کے مراثی کا مجموعہ "گلدستہ اطہر" شائع ہو چکا ہے۔ آپ حضرت نسیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ آپ کے بعض مرثیوں کے پہلے بند کے پہلے مصرعہ یہ ہیں۔

۱) میں گیسوئے عروس ولا کا اسیر ہوں

۲) راہ عمل میں مشعل عرفاں ہیں پنجتن

۳) بنت زہرا نے بھی کیا نور نظر پائے ہیں

۴۹) جناب با گلشن داس باغ :- آپ اکبر آباد کے عہد آخر (تقسیم ہند کے وقت) کے ممتاز ہندو شاعر تھے آپ نے بڑی تعداد میں غزلیں اور سلام کہے آپ کے ایک سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہیں روشن راہ حق میں مٹنے والوں کے نشاں اب تک
کوئی دیکھے تو خاک کربلا ہے خوں فشاں اب تک
بہتر آدمی اور وہ نرالی شان کا لشکر
مری آنکھوں میں پھرتا ہے حسینی کارواں اب تک
کبھی ہندوستاں کو یاد فرمایا تھا سرور نے
ادب سے یاد کرتا ہے انھیں ہندوستاں اب تک

□□□
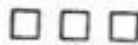
۵۰) جناب باقر علی زیدی باقر :- آپ کے والد سید صابر علی زیدی کا تعلق سادات بھرت پور سے تھا باقر پختہ گو مرثیہ نگار تھے۔ آپ نے ہندی میں بھی شعر لکھے تھے۔ آپ کے اردو مرثیوں میں بعض کے پہلے مصرعے یہ ہیں۔

۱) عروس لیلی کی چوٹی جو تا کمر آئی

۲) انقلابات کا مرکز دل عالم دیکھا

۵۱) جناب شفق اکبر آبادی : - آپ کا نام سید شہنشاہ حسین تھا۔ آپ کی ولادت آگرہ میں اور تعلیم و تربیت کانپور میں ہوئی جہاں آپ کے والد میر شجاعت علی رضوی بہ سلسلہ روزگار مقیم تھے۔ آپ کی عزاداری سے گہری وابستگی تھی۔ کراچی میں تو تصنیف مرثیوں کی مجالس کے بانیوں میں تھے جو ڈاکٹر یاور عباس کے مکان واقع فردوس کالونی میں منعقد ہوتی تھیں۔

آپ ذاکر اور نوحہ خواں بھی تھے آپ نے اپریل ۱۹۹۳ء میں وفات پائی جہاں آپ زیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ آپ کی غزلیات کا مجموعہ رنگینیٔ شفق اور سلاموں کا مجموعہ بیاض شفق چھپ چکی ہیں۔ آپ کے فرزند سرفراز ابد بھی شاعر اور مرثیہ نگار ہیں۔

□□□

۵۲) جناب مرزا ذاکر حسین ثاقب : - آپ اکبر آبادی تھے لیکن موجودہ صدی کے اوائل میں اپنے عہد جوانی میں آپ لکھنؤ جا بسے اور لکھنوی کہلانے لگے تھے۔ آپ ممتاز شاعر تھے آپ کی ایک غزل کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

ہجر کی شب نالۂ دل یوں صدا دینے لگے
سننے والے صبح ہونے کی دعا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک بھر کے دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

□□□
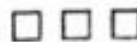
۵۳) جناب مسیح الدین صہبا : - آپ ۱۹۱۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے آپ درس و تدریس سے وابستہ رہے آگرہ میں رسالہ "شباب اردو" کے مدیر رہے۔ ۱۹۵۰ء میں ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور کراچی میں آباد ہوگئے۔ رسالہ "نئی قدریں" حیدرآباد سندھ کے خصوصی شاعر نمبر میں آپ نے حضرت صبا اکبرآبادی پر ایک مضمون لکھا تھا جو نہایت معلوماتی تھا۔ آپ کراچی میں شعرائے اکبرآباد میں نمایاں ہیں۔

□□□

۵۴) جناب سہیل آفندی : - آپ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی کے فرزند ہیں اور حیدرآباد دکن میں مستقل آباد ہیں۔ آپ نامور خطیب اور ذاکر بھی ہیں۔ آپ کے ایک سلام کے چند شعر یہ ہیں۔

حسن قاسم اور اکبر کا ، شباب
آفتاب آمد دلیل آفتاب

روح پیغام حسین ابن علی
انقلاب وانقلاب وانقلاب

بڑھ گئے حق پر قدم شبیر کے
مل گیا دو ٹوک باطل کو جواب

□□□

۵۵) جناب سخاوت علی خسرو : - آپ مولوی سید عنایت علی کے فرزند ہیں اور اکبرآباد کے علمی وادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ موجودہ عہد کے ممتاز شعرائے آگرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

□□□

۵۶) جناب منظر صدیقی :- آپ علامہ سیماب اکبر آبادی کے فرزند تھے۔ بمبئی سے "کنول" اور "ایشیا" جیسے جرائد نکالتے تھے۔ آپ نے غزلوں کے علاوہ سلام بھی بڑی تعداد میں لکھے تھے آپ کے ایک سلام کے دو شعر دیکھئے۔

اس پہ تڑپا ہے رسول اللہ کا نور نظر
کربلا کی خاک پلکوں پہ اٹھانی چاہئے
شہ نے فرمایا ہوا ہے گرم بازار فنا
آئے وہ جس کو حیات جاودانی چاہئے

□□□

۵۷) جناب معصوم الرضوی :- آپ کا نام سید معصوم علی تھا۔ آپ مولانا سید مبارک علی رضوی کے فرزند تھے اور شعروادب میں ممتاز تھے۔ آپ ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور کراچی میں ۱۹۶۵ء میں انتقال کیا۔ آپ ممتاز شاعروادیب اور صحافی تھے۔ اخبار الناظر آگرہ کے معاون مدیر بھی رہے۔ آپ نے کئی جرائد کی ادارت بھی کی۔ آپ کی مطبوعہ تصانیف میں ناوک تقدیر اور جواب شکوہ نمایاں ہیں۔ آپ نے نظم، غزل، قصیدہ اور نوحوں وسلاموں کا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے۔

آپ کے سلاموں سے چند شعر یہ ہیں۔

کعبے والے تو ہی کعبہ ہے مسلمانوں کا
گھر ہے اللہ کا اللہ کے مہمانوں کا
کچھ خلافت سے مراتب میں اضافہ نہ ہوا
تو تو پہلے ہی سے مولا تھا مسلمانوں کا

ماتم علی کا آج ہے خورشید و ماہ میں
خون شہید دوڑ رہا ہے نگاہ میں

ماہ صیام ، خانہ خالق ،سر علی
آنکھیں کئے تھا بند لعین کیا گناہ میں

□□□

۵۸) جناب ڈاکٹر سرور اکبر آبادی :- آپ کا اسم گرامی سید نور محمد ہے۔ آپ کے والد سید محمد باقر بھی شاعر تھے۔ ڈاکٹر سرور نے طویل عرصہ تک اردو کالج سری نگر میں معلمی کی۔ ہفت روزہ "ہمدرد" کشمیر سے منسلک رہے آپ نے آگرہ سے بھی رسالہ "ابروبرق" نکالا تھا آپ نے کراچی سے ادب میں پی ایچ ڈی کیا اور جامعہ کراچی میں پروفیسر ہیں۔ آپ کے مضامین اخبارات و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ آپ کی عدیم الفرصتی کے باعث آپ سے رابطہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آپ کو شعرو ادب سے گہری وابستگی ہے۔

□□□

۵۹) جناب سید مسعود احمد آثم اکبر آبادی :- آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے حاجی سید موسیٰ رضا رضوی کے نواسے تھے۔ آپ آگرہ میں غالباً ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے اور کراچی میں ۱۹۹۲ء میں وفات پائی۔ آپ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازم تھے۔ شعرو شاعری کا مشغلہ ابتدائے نوجوانی سے تھا۔ غزل ،سلام اور رباعیات کے اصناف شعر میں بہت کچھ کہا۔ عالم الرضوی صاحب کے شاگرد تھے۔ غالباً غزلوں کا مجموعہ "مضراب نظر" چھپ چکا ہے۔ انجمن پنجتنی آگرہ کے نائب صدر رہے اور تجلیات فکر مطبوعہ کراچی ۱۹۵۸ء کی تدوین میں راقم الحروف (ناز اکبر آبادی) کے شریک کار بھی رہے۔ آپ کی غزلوں کے دو شعر یہ ہیں۔

ویرانی حیات کا کیا تذکرہ کریں
دل میں کسی کی یاد کی دنیا بسا کے ہم

تمہاری صبح عشرت ہنس رہی ہے
مری تاریک شام زندگی پر

رثائی ادب میں "محرم کا چاند" زیر تدوین تھا کہ آپ کی وفات کے سبب اس کی اشاعت کھٹائی میں پڑ گئی۔

□□□

۶۰) جناب مفتی منظور احمد منظور سیفی :- آپ عہد آخر کے نوجوان شعراء میں سے تھے۔ آپ کے والد مفتی حیدر حسین تھے۔ آپ نے غزل اور سلام بڑی تعداد میں لکھے۔ آپ حضرت مصطفیٰ حسین مصطفیٰ کے شاگرد تھے اور راقم السطور (تاز اکبر آبادی) کے دوستوں میں سے تھے۔ آپ کی ایک غزل کا شعر یاد آرہا ہے۔

یہ دلیل بدنصیبی ہے دل حرماں نصیب
تیر بھی تھمتا نہیں پہلو میں ارماں دیکھ کر

□□□
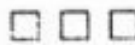
۶۱) جناب سید علی اطہر جعفری اکبر آبادی :- آپ بھی راقم السطور (تاز اکبر آبادی) کے بچپن کے دوستوں میں تھے۔ آپ فیڈرل پبلک سروس کمیشن اسلام آباد میں اسسٹنٹ سیکریٹری تھے اور کراچی یونیورسٹی کے ایم اے تھے۔ آپ نے کراچی میں ۱۹۹۳ء میں انتقال کیا۔ آپ حاجی اور زائر بھی تھے۔ آپ نے غزل اور سلام کافی تعداد میں لکھے۔ آپ کے ایک سلام کا مطلع یہ ہے جو تجلی فکر مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ میں چھپ چکا ہے۔

چند لمحات جو بعد علی اکبر کاٹے
کون جانے شہہ مظلوم نے کیونکر کاٹے

□□□
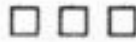
۶۲) جناب سید محمد حامد رضوی ماضی : - آپ شاہ گنج آگرہ میں غالباً ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے اور حیدر آباد میں ۲۷ جون ۱۹۹۶ء کو یکایک وفات پائی۔ آپ نے غزل اور سلام و نوحے کافی تعداد میں کہے۔ آپ کی ایک غزل کا ایک مطلع یاد رہ گیا ہے۔

آراستہ جو بزم خیالات ہو گئی
وہ آگئے اور ان سے ملاقات ہو گئی

آپ کے سلام کے دو شعر ملاحظہ ہوں

اللہ رے جلال ہے تنہا کھڑا ہوا
شبیر رن میں آئینہ حق بنا ہوا
رضوان! میں ایسی سینکڑوں جنت خرید لوں
اشک عزا سے ہے مرا دامن بھرا ہوا

□□□

۶۳) جناب منشی عنایت حسین انور : - آپ کا اصلی وطن آگرہ تھا لیکن طویل مدت تک بھرتپور میں ملازمت کے سبب وہاں مقیم رہے۔ آپ حضرت نسیم بھرت پوری کے شاگرد تھے۔ آپ صاحب دیوان شاعر تھے۔ آپ کا کلام "پیام یار" کے نام سے ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔

□□□

۶۴) جناب مولانا عالم الرضوی : - آپ علامہ سید مبارک علی رضوی مرحوم کے فرزند ہیں۔ آپ غالباً ۱۹۲۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

آپ عربی و فارسی کے مستند استاد ہیں۔ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف سے مسلسل وابستگی رہی ہے۔ آگرہ میں انجمن پنجتنی کے صدر اور اس کے سالانہ کتابچوں کی تدوین و اشاعت کے ذمہ دار رہے۔ آپ نے غزل، سلام اور قصائد بڑی تعداد میں لکھے۔ راقم السطور (تاز اکبر آبادی) کی شخصیت کی تشکیل اور فن شاعری میں جن حضرات کا خصوصی کردار ہے ان میں آپ نمایاں ترین فرد ہیں اور بالکل آغاز شاعری کے چند برسوں میں استاد رہے ہیں۔ آج کل علامہ مغفور کی سوانح (حیات مبارک) کی تالیف میں منہمک ہیں۔ آپ کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں ان میں فانوس خیال، بیت السلام، کاروان عزاء نمایاں ہیں۔ آپ کی غزلوں کے دو شعر یہ ہیں۔

ورق گل میں ملے گی نہ حدیث الفت
سرخیاں دیکھ مرے درد کے افسانے میں

اللہ اللہ اس کی انگڑائی
جیسے قوس قزح ابھر آئی

□ □ □

(۶۵) جناب شاد بھرت پوری :- سید موسیٰ رضا رضوی شاد کا تعلق رضوی سادات بھرت پور سے تھا۔ آپ ممتاز مرثیہ گو بھی تھے آپ حضرت نسیم بھرت پوری کے شاگرد تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کر کے پاکستان آگئے تھے اور یہاں کراچی میں ہی ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔ جدید اردو مرثیہ پاکستان میں مولفہ ضمیر اختر نقوی کے مطابق آپ کے مرثیے فیض بھرت پوری کی ذخیرہ مراثی میں محفوظ ہیں۔

□ □ □

۶۶) **جناب وزیر جعفری :-** آپ جناب اطہر جعفری پہرسری کے فرزند ہیں۔ حضرت نسیم امروہوی سے تلمذ تھا۔ آپ نے ۱۹۷۲ء میں پہلا مرثیہ لکھا جو "مختصر مو ثیے" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ آپ کراچی کے مرثیہ نگاروں میں نمایاں رہے ہیں۔ آپ تحت لفظ مرثیہ خوانی میں بھی ممتاز ہیں۔

□□□

۶۷) **جناب ظفر اکبر آبادی :-** آپ شاہ گنج آگرہ میں ۱۹۳۴ء میں تولد ہوئے۔ آپ کا نام ابو ظفر ہے آپ کے والد جناب انتظار حسین بن اعجاز حسین کو راقم الحروف (ناز اکبر آبادی) کی پھوپی زبیدہ خاتون عرف زبو بنت محمد تقی (اکبر جام) منسوب تھیں۔ ظفر اکبر آبادی تقسیم ہند کے ۱۹۴۷ء کے بعد سے راولپنڈی اسلام آباد میں مستقلاً سکونت پذیر ہیں۔ آپ طویل عرصے سے روزنامہ "ڈان" راولپنڈی سے وابستہ ہیں اور آج کل اس کے ریجنل مینجر ہیں۔ آپ ممتاز غزل گو جناب مضطر اکبر آبادی کے برادر خورد ہیں اور ان کی ہی ادبی صحبت سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ آپ نے غزل، سلام اور نعت بڑی تعداد میں لکھے ہیں حال ہی میں آپ کا مجموعہ غزل "خوشبوئے قبا" شائع ہوا ہے جو آپ کی بلند معیار شاعری کا آئینہ دار ہے۔ آپ کی دو غزلوں سے چند شعر دیکھئے۔

دھڑکنوں میں وہ چھپا ہو جیسے
ہر صدا اس کی صدا ہو جیسے

اک شناسا سی مہک یوں ہے محیط
تیری خوشبوئے قبا ہو جیسے

اب تو لو بھی وہ سکوں بخشتی ہے
تیرے دامن کی ہوا ہو جیسے

دل سے جب درد کی خوشبو آئے
یاد کچھ اور سوا تو آئے
آنکھ سے لب تک اندھیرے ہی رہے
نہ ہنسی آئی نہ آنسو آئے
خواہ روشن ہو کہ تاریک مگر
سامنے کوئی تو پہلو آئے

آپ کے دو سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جفا کی حد سے گزرتے رہے جفا پرور
وفا پہ خون چھڑکتے رہے وفا والے
لہو سے اپنے رقم کر کے داستان حیات
ہوئے ہیں زندہ جاوید کربلا والے

حسین کو راہ حق سے لٹا کے گھر اپنا
سکون قلب میسر تھا اضطراب نہ تھا
بنا گئی تھی جو مٹی سے کیمیا حر کو
اس اک نگاہ کرم کا کوئی جواب نہ تھا

□ □ □
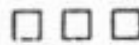
۶۸) جناب نیساں اکبر آبادی :- آپ کا نام سید علی عباد ہے آپ آگرہ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد جناب نیر اکبر آبادی اکبر آباد کے عہد آخر کے ممتاز شاعر اور استادانہ منزلت کے حامل تھے۔ آپ نے اپنے بڑے بھائی جناب مہر اکبر آبادی سے مشورہ سخن کیا۔ آپ ملٹری اکاؤنٹس راولپنڈی میں افسر رہے اور ۱۹۸۳ء میں ریٹائر ہو کر راولپنڈی میں ہی مستقلاً" آباد ہیں۔ آپ فن تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ آپ

کا شعری مجموعہ "سحاب نیساں" ۱۹۸۵ء میں چھپ چکا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں آپ نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ جیسا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ آج کل آپ صحیفہ کاملہ کو نظم کا لباس پہنانے میں مصروف ہیں۔ آپ کی دو غزلوں میں سے چند شعر یہ ہیں۔

یہ حقیقت ہے زمانہ ہمیں کیا دیتا ہے
یہ تو جیتی ہوئی بازی بھی ہرا دیتا ہے
موت کا ہے یہ پسینہ یہ نہیں سوکھے گا
کون ہے جو مجھے دامن کی ہوا دیتا ہے

کسی نے میرا مزاج پوچھا تو بڑھ گئی اور دل کی دھڑکن
مگر نہ جانے میں کہہ گیا ہوں کہ آج مجھ کو قرار سا ہے
مجھے نہیں کوئی فکر نسیاں وہ مجھ سے روٹھیں تو روٹھ جائیں
گماں بہ حد یقین ہے مجھ کو کہ ان کی خفگی میں پیار سا ہے

آپ کے ایک سلام کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

صبر کی میزاں مظالم کی سپر ہے کربلا
عشق کی معراج، معیار نظر ہے کربلا
جس کے سائے میں سکوں پاتی ہے ساری کائنات
منزل انسانیت کا وہ شجر ہے کربلا
تم اگر سمجھو تو اک آفاق اس میں گم ہوا
اور اگر دیکھو تو کتنی مختصر ہے کربلا

□□□

۶۹) جناب مہر اکبر آبادی :- آپ کا اسم گرامی سید علی سجاد ہے آپ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء کو غازی آباد میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد جناب

نیر اکبر آبادی بہ سلسلہ روزگار مقیم تھے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ اپنے والد کے ہمراہ پاکستان آگئے۔ ۱۹۵۰ء میں یہاں محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے آپ ڈیرہ غازی خان راولپنڈی اور اسلام آباد میں لیکچرار رہے۔ ۱۹۷۵ء میں فیڈرل گورنمنٹ کالج اسلام آباد کے پرنسپل کے منصب سے ریٹائر ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں انتقال کیا آپ کی دو غزلوں سے چند اشعار دیکھئے۔

دل کا کیا حال ہوا تم نے تو دیکھا ہوگا
کوئی بھی آئینہ اس طرح نہ ٹوٹا ہوگا

اتنا سناٹا تو صحرا میں بھی دیکھا نہ سنا
ہو نہ ہو یہ تو کوئی دل کا خرابہ ہوگا

اشک غم تیرے ستم یاد دلا دیتے ہیں
یہ چراغ اور اندھیرے کو بڑھا دیتے ہیں
قافلے والے ہیں ظلمت سے کچھ ایسے مانوس
جب بھی شعلہ کوئی بھڑکے یہ بجھا دیتے ہیں

آپ کے ایک سلام کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

شجاعت اور عبادت ختم ہے سبط پیمبر پر
نہ ایسی جنگ پھر ہوگی نہ ایسی بندگی ہوگی
ہزاروں دل کی دھڑکن ہے غم شبیر صدیوں سے
کسی افسانہ غم میں کہاں یہ دلکشی ہوگی
حسین اپنے لہو سے کر گئے روشن چراغ ایسے
قیامت تک نہ حائل روشنی میں تیرگی ہوگی

□ □ □

۷۰) جناب نیر اکبر آبادی آپ کا اسم گرامی سید اسماعیل حسین تھا۔ آپ ۱۸۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۸ء میں اسلام آباد میں وفات پائی۔ آپ کے والد شاعر اور مرثیہ نگار تھے۔ آپ اکبر آباد کے عہد آخر کے بڑے پختہ فکر اور مشاق شاعر تھے بلکہ استاد فن کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی غزلوں کے چند شعر یہ ہیں۔

یہ رنگ بھی دکھاتی ہے دنیا کبھی کبھی
بنتے ہیں واقعات فسانہ کبھی کبھی

ہوتا ہے وجہ تیز روی راہ شوق میں
تلوے میں میرے ٹوٹ کے کانٹا کبھی کبھی

چھوڑے ہوئے چمن کو زمانہ گزر گیا
سینے سے اب بھی اٹھتا ہے شعلہ کبھی کبھی

اب ان پہ تغافل کا کچھ الزام نہیں ہے
میری ہی نظر میں کوئی پیغام نہیں ہے

بیٹھا ہوں تری یاد میں یوں غرق تصور
جیسے مجھے دنیا میں کوئی کام نہیں ہے

بالکل وہ بھلا دیں مجھے یہ ہو نہیں سکتا
کیا میرا گنہ گاروں میں بھی نام نہیں ہے

□□□

۷۱) جناب مضطر اکبر آبادی :- آپ کا نام نامی ابو حامد ہے آپ کے والد جناب انتظار حسین بن اعجاز حسین راقم الحروف (ناز اکبر آبادی) کے پھوپھا تھے۔ حضرت مضطر اکبر آبادی شاہ گنج آگرہ میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نوجوانی سے اب تک معلمی کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں۔

۱۹۳۸ء میں شعر گوئی کی ابتداء ہوئی اور بزرگ شاعر حضرت مصطفیٰ اکبر آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۴۳ء میں آپ لاہور تشریف لے آئے ۱۹۴۷ء میں آپ ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۶۷ء میں روزنامہ "جنگ" راولپنڈی سے منسلک ہوگئے اور یہ تعلق اب تک برقرار ہے ۱۹۸۳ء میں ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد آئیڈیل کیمرج اسکول راولپنڈی میں فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ صحافی بھی ہیں اور ادیب بھی۔ نثری ادب میں بچوں سے متعلق بچی کہانیاں "پریوں کا دیس" اور "پھولوں کی شہزادی" کتابی شکل میں شائع ہوچکی ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ گریہ شب ۱۹۸۵ء سے پبلشر کی چشم توجہ کا طلب گار ہے دوسرا مجموعہ غزل "روپ دھنک" زیر تدوین ہے جو جلد شائع ہوجائے گا۔ آپ ۱۹۴۰ء میں آگرہ میں ابھرتے ہوئے آفتاب کی صورت مطلع ادب پر نمودار ہوئے اور اب استادانہ مقام و منزلت پر فائز ہیں۔ آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیت فصاحت و بلاغت کا وہ حسین امتزاج ہے جو بہت کم شعراء کو میسر آتا ہے۔

آپ کی دو غزلوں سے چند شعر دیکھئے۔

مدت سے رویہ ہے یہ باد سحری کا
جھونکا کوئی آتا ہی نہیں خوش خبری کا

دنیا نے بھی بدلی نہ روش سنگ زنی کی
طاری رہا مجھ پر بھی جنوں شیشہ گری کا

ہیں خوف زدہ بھی وہی پرواز سے میری
طعنہ مجھے دیتے تھے جو بے بال و پری کا

ہر گام پہ رستوں میں یہ بکھری ہوئی خوشبو
احساس دلاتی ہے تیری ہمسفری کا

کاش اس آنکھ میں ایسا کوئی آنسو آئے
ٹپکے دامن پہ تو اس سے تیری خوشبو آئے
تتلیوں نے تیرے ملبوس کے رنگ اوڑھ لئے
تیرے چہرے سے چمک مانگنے جگنو آئے
خوشبو و روشنی و رنگ کے پیرایوں میں
سامنے تیرے کئی رخ کئی پہلو آئے
یوں مرے دل میں تیری یاد سمٹ آئی ہے
جیسے مسکن میں پلٹ کر کوئی آہو آئے
ہو رہا ہے یہ محسوس کسی سے مل کر
جیسے مظفرؔ کوئی رنگوں کی دھنک چھو آئے

آپ کے دو سلاموں کے چند اشعار یہ ہیں۔

ہر فیصلہ یزید کا خوں کی لکیر سے
رد کر دیا حسین علیہ السلام نے
موسوم ہے جو شام غریباں کے نام سے
صبحیں نکھار دی ہیں اسی ایک شام نے
مظفر جو ترجمان تھی اقیم الصلوٰۃ کی
ایسی بھی اک نماز ادا کی امام نے

رموز عشق سے آگاہ نکتہ دان حیات
حسین رونق بزم وجود جان حیات
حسین دشت خموشی میں باز گشت صدا
حسین موت کی وادی میں نغمہ خوان حیات
وہی حسین جو اس رزم گاہ ہستی میں
بنا ہے موت سے ٹکرا کے پاسبان حیات

وہی حسین کیا جاں پہ کھیل کے جس نے
مآل زیست سے آغاز داستان حیات
جسے قیادت عظمیٰ ملی ہے ورثے میں
وہی حسین وہی میر کاروان حیات
اسی حسین کا دم کائنات بھرتی ہے
اسی حسین کو دنیا سلام کرتی ہے

□□□
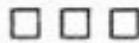
۷۲) ناز اکبر آبادی :- راقم السطور اور مولف کتاب ناز اکبر آبادی ۱۹۲۴ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوا اور نام انتظار رضا رکھا گیا۔ میرے والد سید وقار حسن بن سید کلب حسن کا نسبی تعلق میر اکبر علی رسالدار کے خاندان (اکبر جام) سے تھا۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں میٹرک کا امتحان اس شان سے پاس کیا کہ فرسٹ ڈویژن کے ساتھ تین مضامین میں امتیازی حیثیت حاصل ہوئی اور یہ تینوں اردو فارسی اور انگریزی کے ادبی مضامین تھے۔ مجھ سے قبل اور بعد میں شاہ گنج کی تاریخ میں یہ اعزاز اور کوئی نہ پاسکا۔ ۱۹۴۴ء میں منشی کامل کا امتحان پاس کیا جس کے محرک میرے چچا زاد بھائی سید محمد مظفر راز مرحوم تھے ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء کے دوران مسلم لیگ کی تحریک پاکستان میں اپنی سرکاری ملازمت کے باوجود بھرپور حصہ لیا اور اس کے حق میں متعدد نظمیں لکھیں۔ میرا ۱۹۴۳ء میں کہا ہوا سلام

حسین عالم ہستی جگا کے سوئے ہیں

خمسہ مذکورہ کا ایک بند درج ذیل ہے۔

دلوں پہ چھا گئے تصویر بے کسی بن کر
پیام درد دیا غم کی روشنی بن کر

سمائے پیکر ملت میں زندگی بن کر
نماز عصر پڑھی روح بندگی بن کر
خدا کے سجدے کو سجدہ بنا کے سوئے ہیں

بے حد مقبول ہوا اس کو آفتاب علی کاظمی نے ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو سے ایام محرم میں پڑھا تھا اور پھر وہ ہر سال پڑھتے رہے اب کئی برس سے اس کو جناب فائق حسین رضوی اور مظاہر کاظمی پڑھا کرتے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں شہد ثالث کے سالانہ ملک گیر اجتماعات کے موقع پر سید علی ظہیر اور حسین بھائی لال جی کی مسلم لیگ مخالف مہم کو ناکام بنانے میں نوجوانان آگرہ کی قیادت کی۔ ۱۹۴۶ء میں ایک بہت بڑی سماجی بدی (کھلی) کے خلاف جدوجہد کی رہنمائی کی۔ اسی زمانے میں حضرت نسیم امروہوی کے مخصوص 'مسدس' قرآن السعدین کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی۔

۱۹۴۲ء میں سینٹرل ٹیلی گراف آفس آگرہ میں ملازمت اختیار کرنا پڑی اگست ۱۹۴۷ء میں OPT کرکے پاکستان آگیا۔ یہاں لاہور کراچی' کوئٹہ' حیدر آباد سندھ' ہری پور ہزارہ اور راولپنڈی اسلام آباد میں خدمات انجام دے کر جولائی ۱۹۸۳ء میں چیف سپرنٹنڈنٹ ٹیلی گراف (گریڈ ۱۸) کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں شعر گوئی کی ابتدا ایک سلام سے ہوئی جو سالانہ طرحی مسالمہ منعقد عزا خانہ شاہ گنج آگرہ کی مطبوعہ روداد میں شامل ہے۔ اس کے بعد غالباً اوائل مئی ۱۹۳۸ء میں پہلی غزل کہی جس کا مقطع علامہ اقبال کی رحلت سے متاثر ہو کر لکھا تھا جو یہ تھا۔

اے ناز شمع شاعری خاموش ہو گئی
اقبال آہ رونق محفل نہیں رہا

غالباً اکتوبر ۱۹۴۲ء میں عید غدیر کے موقع کی مناسبت سے پہلا قصیدہ لکھا جس کا مطلع اولی یہ تھا۔

ہر اک جانب ہے شادابی گہر ریزی گل افشانی
ہے رشک صد بہاراں آج رنگ گلشن فانی

شعر گوئی کے ابتدائی چند برسوں میں مولانا عالم الرضوی سے مشورہ سخن کیا۔ موصوف عربی وفارسی کے مستند استاد ہیں اور پختہ فکر شاعر و ادیب بھی میں نے ہر صنف شعر میں بہت کچھ کہا لیکن زیادہ تر سرمایہ کلام ضائع یا گم ہوگیا۔ اب بچے کھچے کلام کو جمع کر رہا ہوں تاکہ طباعت کے زیور سے آراستہ ہوسکے۔ ۱۹۹۳ء میں ایک طویل نظم ذکر اسلام تا بہ اکبر جام تصنیف کی جو طلوع اسلام سے موجودہ عہد تک میرے خاندان کی منظوم تاریخ ہے یہ تین سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے اور شائع ہوچکی ہے محرم ۱۴۱۷ھ کے موقع پر میں نے ایک شعری کتابچہ "فرات درد" بھی پیش کیا ہے جس میں "منقبت، سلام" اور "نوحے" کے علاوہ ۹۵ بندوں پر مشتمل ایک مرثیہ بھی شامل ہے۔ اس مرثیے کا پہلا مصرعہ ہے۔

مدت سے نور دیدہ انساں ہے کربلا

اس میں ساحل دریا سے خیام اہلبیت ہٹاتے وقت مظلوم کربلا نے جو گفتگو حضرت عباس علمدار سے کی تھی اس کا ایک بند یہ ہے۔

کرنا ہے انتہائے شقاوت کا سامنا
ناقابل بیان مصیبت کا سامنا
اک مختصر گروہ سے کثرت کا سامنا

سیرت کے بل پہ زور حکومت کا سامنا
تبدیل ہوں گے معنیٔ فتح و ظفر یہاں
یہ جنگ جیتتی ہے مگر ہار کر یہاں

آلِ محمدؐ کا لٹا ہوا قافلہ کوفہ سے شام اس طرح لے جایا گیا کہ اس کے طویل راستے میں اسیرانِ کربلا کے اطفال کی درجنوں قبریں بن گئیں۔ اسی کی ایک جھلک اس بند میں دیکھئے۔

گزرا تھا راہِ شام سے کس طرح کارواں
اطفال گودیوں میں رسن بستہ بی بیاں
دوڑاتی تھی جو اونٹوں کو فوجِ ستم نشاں
گر گر کے جاں بحق ہوئے بچے کہاں کہاں
قبروں کو چوم کر جو ہوا اب بھی آتی ہے
مدھم سی سسکیوں کی صدا اب بھی آتی ہے

ذیل میں دو غزلوں کے چند شعر یہ ہیں۔

سانس لینا محال ہے یارو
جی رہے ہیں کمال ہے یارو
نقطۂ اوج پہ ٹھہر جانا
ابتدائے زوال ہے یارو
موت بھی قاطعِ حیات نہیں
یہ فقط انتقال ہے یارو
کس کو فرصت ہے دردمندی کی
کون پرسانِ حال ہے یارو

ان کو پانے کی آرزو ہے شدید
ان کو پانا محال ہے یارو

دیکھ آئی ہے ہماری نظر دور دور تک
ملتا نہیں سراغ بشر دور دور تک
کیا جانے گم ہے قافلہ اہل دل کہاں
سونی پڑی ہے راہگزر دور دور تک
خود اپنی ذات ظلمت زیر چراغ ہے
پھیلا ہے نور فکر و نظر دور دور تک
گو رنگ شب سے آخر شب کا گماں سہی
لیکن نہیں جلو میں سحر دور دور تک
یہ داغ ماہتاب یہ تاروں کا ارتعاش
پہنچی ہے میرے غم کی خبر دور دور تک
بکھری ہوئی ہیں ناز جبینوں کی تابشیں
روشن ہے ان کی راہگزر دور دور تک

میرے ایک سلام کے چند اشعار ہیں۔

درد و بلا و کرب کے چکر میں آگئی
عشرے کی شام عرصہ محشر میں آگئی
اپنے کمال اوج پہ انساں کی ہر صفت
بنکر کنیز فاطمہ کے گھر میں آگئی
فریاد العطش بھی سنی وائے علقمہ
خود کیوں نہ بڑھ کے خدمت سرور میں آگئی

ہوتا تھا جس کو سارے اجالوں کی زندگی
وہ شب بھی کربلا کے مقدر میں آگئی
پچھلی تو داستان ستم کی رہی نہ حد
سمٹی تو گردن علی اصغر میں آگئی

میرے نوحے (خمسہ) کا ایک بند دیکھئے جس کا پہلا مصرعہ ہے۔

میدان میں تھا شہہ ابرار کھڑے تھے

اب تھی تو فقط پیش خدا جانے کی جلدی
جاں دے کے حیات ابدی پانے کی جلدی
خون رگ توحید کو گرمانے کی جلدی
سر سجدہ معبود میں کٹوانے کی جلدی
خنجر کے تلے جانے کو تیار کھڑے تھے

□□□

حوالہ جات

۱) تجلیات فکر مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ ڈاکٹر اعجاز حسین کا مضمون بعنوان واقعہ کربلا کا اثر اردو ادب پر
۲) شرح دیوان غالب (اردو) علامہ طباطبائی
۳) ماہنامہ شاعر آگرہ بابت مئی ۱۹۳۳ء
۴) روح نظیر مصنفہ مخمور اکبرآبادی
۵) تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر سکسینہ
۶) حقائق شعر و سخن مطبوعہ رسالہ انجمن کراچی
۷) مجلہ انجم خود نوشت سوانح علامہ نجم آفندی
۸) تذکرہ شعرائے دکن۔ ملکاپوری
۹) یادگاری مجلہ فیض بھرتپوری معاصرین کی نظر میں
۱۰) ماہنامہ کندن کراچی بابت فروری ۱۹۹۳ء سیماب نمبر
۱۱)، ۱۲) ایضاً
۱۳)، ۱۴) ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی۔ صبا نمبر

۱۵) مشاہیر اکبرآباد۔ شہابی

۱۶) تا ۱۸) رسالہ انجمن کراچی ریاض نمبر مئی ۱۹۷۵ء

۱۹) رسالہ افکار کراچی۔ سیماب نمبر / رسالہ انجمن کراچی ریاض نمبر مئی ۱۹۷۵ء

۲۰) مشاہیر اکبرآباد۔ شہابی

۲۱) ادب اور زندگی صفحہ نمبر ۳۸۲

۲۲) نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری

۲۳) یادگاری مجلہ انجم کراچی مطبوعہ ۱۹۷۷ء

۲۴) تا ۲۸) مشاہیر اکبرآباد۔ شہابی

۲۹) تا ۳۱) بوستان اخبار۔ مارہروی / مشاہیر اکبرآباد۔ انتظام اللہ شہابی / تصویر الشعراء اکرام اللہ شہابی

۳۲) مشاہیر اکبرآباد۔ شہابی

۳۳) تجلیات فکر مطبوعہ کراچی ۱۹۵۸ء / تاریخی یادداشتیں قلمی۔ سید زوار حسین عرف بدھا

۳۴) مشاہیر اکبرآباد شہابی

۳۵) دیوان سجاد اکبرآبادی۔ شائع کردہ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۱۹۷۵ء

۳۶) ایضاً

۳۷) تذکرہ شعرائے اردو

۳۸) نکات الشعراء

۳۹) مشاہیر اکبرآباد۔ شہابی

۴۰) داستان تاریخ اردو۔ قادری / گل ہائے خنداں۔ ذکی دہلوی مطبوعہ ۱۹۹۲ء

۴۱) نکات الشعراء۔ میر تقی میر

۴۲) ذکر میر / گل ہائے خنداں / مشاہیر اکبرآباد۔ شہابی

۱۰) ماہنامہ کندن کراچی بابت فروری ۱۹۹۳ء سیماب نمبر

۱۱) ، ۱۲) ایضاً

۱۳) ، ۱۴) ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی ۔ صبا نمبر

۱۵) مشاہیر اکبر آباد ۔ شہابی

۱۶) تا ۱۸) رسالہ انجمن کراچی ریاض نمبر مئی ۱۹۷۵ء

۱۹) رسالہ افکار کراچی ۔ سیماب نمبر / رسالہ انجمن کراچی ریاض نمبر مئی ۱۹۷۵ء

۲۰) مشاہیر اکبر آباد ۔ شہابی

۲۱) ادب اور زندگی صفحہ نمبر ۳۸۲

۲۲) نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری

۲۳) یادگاری مجلہ انجم کراچی مطبوعہ ۱۹۷۷ء

۲۴) تا ۲۸) مشاہیر اکبر آباد ۔ شہابی

۲۹) تا ۳۱) بوستان اخبار ۔ مارہروی / مشاہیر اکبر آباد ۔ انتظام اللہ شہابی /

تصویر الشعراء ۔ اکرام اللہ شہابی

مالک [illegible]

۵۳) شش ماہی رسالہ غالب ۔ شمارہ ۶ تا ۲ / ۱۹۹۲ء شائع کردہ غالب لائبریری

/ یادگار غالب ناظم آباد کراچی

۵۵) تا ۵۷) مشاہیر اکبر آباد

۵۸) تا ۶۰) ایضاً

۶۱) تذکرہ شعرائے بھرتپور (مجلہ فیض بھرتپوری)

۶۲) مشاہیر اکبر آباد

۶۳) رزم نگاران کربلا ۔ ڈاکٹر صفدر حسین

۶۴) شوخیٔ تحریر (تقریظ) سید محمد جعفری

۶۵) خوشبوئے قبا ۔ ظفر اکبر آبادی (تقریظ)

اہم اعلان

مومنین کے مسلسل اصرار پر

تجلیاتِ فکر

مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ ھجری کا انتخاب پیش کرنے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ اسی میں بعض اہم عنوانات کا اضافہ بھی شامل ہوگا۔ لہٰذا آگرہ و نواح یعنی سابق ریاست ہائے بھرتپور و دھولپور اور اضلاع آگرہ و متھرا سے تعلق رکھنے والے سادات و مومنین اپنے سابقہ علاقوں اور اپنے خاندانوں کے بارے میں ضروری اور مستند معلومات فراہم کرنے میں جلدی کریں۔ نیز یہ کتاب محدود تعداد میں چھپے گی اس لئے بہتر ہوگا اگر اپنی کاپی پیشگی بک کروالیں تاکہ بعد میں مایوسی نہ ہو۔

سید انتظار رضا ناز اکبر آبادی

فون نمبر 6988877 نارتھ کراچی

باب ہفتم

سادات مذکورہ کی شخصیات

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ آگرہ و نواح سے وہ سارا علاقہ مراد لیا گیا ہے جو مشرقی راجپوتانہ میں ریاست ہائے بھرتپور اور مغربی یوپی (اتر پردیش) کے اضلاع آگرہ و متھرا پر مشتمل تھا جہاں سادات کی بستیاں واقع تھیں۔ ان بستیوں کے نامور اور ممتاز افراد کی فہرست بڑی طویل ہے ہم نے کتاب کے محدود صفحات کے باعث انتخاب کیا ہے اس لئے اچھی خاصی تعداد میں لوگ محروم ذکر رہ گئے ہوں گے۔

اس باب کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(الف) مشاہیر ـــــ ناقابل فراموش ہستیاں (ب) وہ ممتاز حضرات جن کا ذکر دیگر مطبوعات میں ملتا ہو اس میں بھی انتخاب کرنا پڑا اور صرف ایسے ہی اشخاص کو منتخب کیا ہے جن کا تذکرہ کم از کم تین مطبوعات میں ملتا ہو اور (ج) دیگر نمایاں اشخاص کی فہرستیں جن کو مختلف ذیلی عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے مثلاً اعلیٰ منصب داران ، اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ، عسکری شخصیات ، ڈپٹی کلکٹرز ، تحصیلداران ، انجینیرز ، ڈاکٹرز اور بینک افسران وغیرہ۔

قارئین ملاحظہ کریں گے کہ اتنی بڑی تعداد میں ایسے ممتاز حضرات آگرہ و نواح کے سادات کے علاوہ برصغیر میں کہیں اور نہیں ملتے۔ اسی کا اعتراف ماہنامہ شیعہ گھوہ (بہار) نے اپنے شمارے مارچ ۱۹۱۴ء میں کیا تھا۔

شیعہ کھجوہ (بہار) کو اپنے شمارے مارچ ۱۹۱۳ء میں لکھنا پڑا کہ " جتنے مقتدر اور صاحبان ثروت سادات شاہ گنج آگرہ میں بستے ہیں برصغیر میں کہیں اور نہیں ہیں۔"

(الف) مشاہیر۔۔۔۔۔ ناقابل فراموش ہستیاں

۱) جناب سید موسیٰ مبرقع علیہ رحمتہ

آپ امام علی رضا کے پوتے، امام محمد تقی الجوادؑ کے فرزند اور امام علی نقیؑ کے بھائی تھے۔ آپ مدینہ منورہ میں ۲۱۷ ہجری میں پیدا ہوئے اور قم میں ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ آپ اپنے مکان مسکونہ میں دفن ہوئے۔ جہاں اب آپ کا جدید روضہ تعمیر ہوا ہے۔ آپ نے ۲۳۰ھ میں مدینہ سے ہجرت کی۔ کچھ عرصہ کوفے میں مقیم رہے پھر ایران کے شہر قم میں تشریف لائے مگر بوجوہ یہاں سے کاشان چلے گئے۔ ۲۵۶ھ میں آپ کو عمائدین قم نے منت سماجت کرکے کاشان سے پھر قم تشریف آوری پر مجبور کر دیا۔ آپ نے امام محمد تقی الجوادؑ، امام علی نقیؑ، امام حسن عسکریؑ اور امام مہدیؑ کی غیبت صغریٰ کا زمانہ دیکھا تھا۔ آپ بڑے صاحب علم وتقویٰ اور حسین وجمیل تھے۔ اپنے حسن کو چھپانے کی خاطر آپ چہرے پر نقاب ڈالتے تھے اسی لئے مبرقع مشہور ہوئے۔ آپ ہی قم، مشہد، بیانہ، ہیلک اور شاہ گنج آگرہ کے رضوی سادات کے مورث اعلیٰ قرار پائے۔

آپ کی اولاد نرینہ میں جناب سید محمد اور جناب سید احمد ہوئے۔ آخر الذکر سید احمد کبیر کہلائے۔ جو علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں ممتاز تھے۔ آپ کی سوانح عمری دیگر کتابوں کے علاوہ کتاب بدر مشعشع جو ایران سے شائع ہوئی ہے میں کافی تفصیل سے ملتی ہے۔

۲) جناب سید محمد اعرج

آپ جناب سید احمد کبیر کے فرزند تھے۔ آپ کی ولادت اواخر تیسری صدی ہجری میں قم میں ہوئی آپ کی کنیت ابوالبقا اور لقب زرین کمر تھا۔ آپ صفات حسنہ کے حامل تھے دشمن بھی آپ کا احترام کرتے تھے۔ ارکان حکومت کو حیرانی تھی کہ ایسی ارفع شخصیت کے باوجود آپ کو منصب امامت کیوں نہ ملا۔ آپ کی وفات ۳۱۵ ھ میں عین جوانی میں ہوئی۔

آپ کے فرزند سید احمد (احمد ثانی) نقیب اقم ہوئے۔ ان ہی سے قم ونواح میں نقابت کا سلسلہ ان کی نسل میں دور تک گیا۔ آپ ۳۳۱ ھ میں تولد ہوئے اور ۳۵۸ ھ میں انتقال کیا۔

۳) جناب ابوالحسن سید موسیٰ

جناب سید احمد ثانی نقیب اقم کے کئی فرزندوں ہیں جناب ابو علی سید محمد، جناب ابو محمد سید حسن، جناب ابوالقاسم سید علی اور جناب ابوالحسن سید موسیٰ مختار تھے۔ اول الذکر تینوں خراسان (مشہد) جا کر بس گئے تھے اور مشہد مقدس میں سادات رضوی کے پہلے آباد کار قرار پائے۔

جناب ابوالحسن سید موسیٰ نے ۳۷۰ ھ میں حج بیت اللہ کیا۔ قم واپسی پر آپ کے استقبال کے لئے شہر کی آئین بندی کی گئی ۳۷۵ ھ میں آپ نے مشہد مقدس میں روضہ امام رضا پر حاضری دی اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب صبح کو آپ اپنے مکان سے آستان قدس رضویہ پر زیارت کے لئے تشریف لاتے تو حرم کے مقفل دروازے ازخود کھل جاتے اور آپ کے داخلے کو بعد پھر بند اور مقفل ہوجاتے تھے۔ آپ ہی میران سید محمد غازی مشہدی کے ان بزرگوں میں تھے

جو روضہ امام رضا کے اولین متولی ہوئے اور تولیت کا یہ اعزاز سالار سید محمد غازی تک پہنچا تھا۔ حکام آپ کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ آپ نوجوانی ہی میں منصب نقابت پر فائز ہوئے تھے۔ حضرت کا تذکرہ کتاب عمدۃ المطالب فی انساب ابی طالب، لطائف اشرفی جلد ۲، بہشت مشرق مطبوعہ مشہد ۱۹۳۲ء قم، انوار قم مطبوعہ ۱۹۷۲ء اور دوسری کتابوں میں ملتا ہے۔

۴) جناب سید محمد غازی مشہدی

آپ جناب ابوالحسن سید موسیٰ کی نسل میں ساتویں پشت میں جناب ابو محمد سید مصطفیٰ کے نامور فرزند تھے۔ آپ مشہد مقدس کے متولی خاندان کے چشم وچراغ تھے اور شہرہ آفاق فوجی کماندار بھی۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے آپ کو اپنی فوج خاص کا سالار مقرر کیا تھا۔ شمالی ہند اور سندھ قدیم میں مختلف فتوحات کے صلے میں سلطان غوری نے ۵۹۳ ھ، ۱۱۹۲ء میں آپ کو غازی اور شہزادے کے خطاب سے نوازا تھا نیز ہیلک ونواح میں ۸۴ دیہات کی جاگیر کے علاوہ بیانہ کی فوجی سرداری بھی دی تھی جو آپ کی نسل میں صدیوں تک برقرار رہی۔ اکبر اعظم نے سلطان غوری کے فرمان ۵۹۳ ھ کی ۹۸۳ء میں تجدید کی تھی۔ آپ نے ۱۲۳۶ء میں انتقال کیا اور کوٹ پگھاڑ (بیانہ) میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار زیارت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ ہی برصغیر میں مشہد کے رضوی سادات جو جناب موسیٰ مبرقع کی اولاد سے ہیں کے مورث ہوئے۔

آپ کا تذکرہ طبقات ناصری جلد اول، لطائف اشرفی جلد ۲، بہشت مشرق مطبوعہ مشہد ۱۹۶۲ء، تاریخ بلدہ بیانہ، تاریخ سادات بھرتپور، تاریخ سادات شاہ گنج آگرہ، قلمی اور دیگر متعدد کتابوں میں ملتا ہے۔

۵) جناب سید حسین مشہدی خنگ سوار

آپ چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اجمیر میں برسر عمل تھے۔ آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے سسر بھی تھے۔ آپ ہی نے اجمیر میں خواجہ صاحب کے تبلیغی مشن کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ آپ اجمیر کے کوتوال شہر بھی رہے۔ آپ میران سید محمد غازی مشہدی کے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔

۶) جناب سید عبداللہ قلندر

آپ شیراز (ایران) کے جعفری سادات سے تعلق رکھتے تھے اور خواجہ ابو بکر قندہاری کے اس لشکر میں شامل تھے جس نے پانچویں صدی ہجری میں ہند پر حملہ کیا تھا۔ آپ نے بیانہ ، لوہا گڑھ (پہرسر) اور ملحقہ علاقوں کی فتوحات میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ آپ کے ہمراہ آپ کے بھائی سید سکندر شیرازی بھی تھے۔ ان دونوں کو پہرسر جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ اول الذکر کی اولاد نے کئی صدی بعد (۸۴۳ھ) پہرسر کو باقاعدہ آباد کیا تھا جب کہ آخرالذکر کی اولاد بدستور بیانہ کے محلہ شیرازیاں میں سکونت پذیر رہی۔ ان کی نسل میں سید جلال الدین ، سید علاء الدین اور سید عبدالصمد نے پہرسر کے تین محلے بسائے تھے۔

سید علاؤالدین کی نسل میں متعدد نامور حضرات ہوئے جن میں خان بہادر سید امداد علی جعفری اور باوا سید محمد علی جعفری ممتاز تھے۔

سید سکندر شیرازی کی نسل میں ممتاز ترین افراد میں علامہ فتح اللہ شیرازی سید علی نقی جعفری ڈپٹی کلکٹر اور خاں بہادر سید ابو محمد کلکٹر ہوئے۔ ان میں بعض کا تذکرہ مشاہیر اور ممتاز شخصیات میں الگ کیا گیا ہے۔

۷) جناب سید ابو حلیم زیدی

آپ خراسان کے نامور فوجی جرنیل تھے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں شہنشاہ ہمایوں نے خراسان ونواح سے بارہ ہزار سے زائد فوجیوں پر مشتمل ایک خاص فوج تشکیل دی تھی ۔ اس کا نام ہاشمی رسالہ تھا۔ اس کا سالار آپ کو مقرر کیا تھا۔ اس رسالے نے ہندوستان میں دوبارہ حصول اقتدار میں ہمایوں کی زبردست مدد کی تھی اور نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ فتوحات کے صلے میں بادشاہ نے آپ کو راجپوتانہ میں بیانہ کے نزدیک سید پورہ میں جائیداد دی تھی ۔ آپ ہی سید پورہ اور ندبٹی کے سادات زیدی کے مورث ہوئے۔

آپ کا تذکرہ سیرالمتاخرین جلد ۲ کے علاوہ دیگر تاریخوں میں بھی ملتا ہے۔

۸) علامہ شاہ فتح اللہ شیرازی

سولہویں صدی کے وسط میں آپ ایران کے شہر شیراز سے دکنی ہند کی مسلم سلطنت بیجاپور کے علی عادت شاہ اول کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ امام جعفر صادقؑ کی نسل میں تھے۔ مورخ دوران ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی کے مطابق شاہ فتح اللہ شیرازی کی آمد ہند ایسا واقعہ تھا جس نے شیعیان شمالی ہند کی تاریخ کو بدل کے رکھ دیا۔ ان کا اثر اور دبدبہ شیعوں کے لئے قوت کا ایک ستون تھا" ۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے بموجب " وہ اپنی شیعیت میں بڑے سخت تھے اور شیعی فقہ کے واجبات سے ذرہ برابر کوتاہی برتنے کو تیار نہ تھے۔ دیوان خاص میں جہاں نماز پڑھنے کی کوئی دوسرا جرات نہیں کرسکتا تھا ۔ فتح اللہ شیرازی وہاں شیعی طرز کی نماز باجماعت بڑے

خضوع وخشوع اور بے باکی سے ادا کرتے تھے۔ "علامی ابوالفضل کے مطابق
"آپ علوم عقلی و نقلی کی تمام شاخوں پر حاوی تھے۔ علم فلسفہ، علم ریاضی،
علم نجوم اور علم ہندسہ میں وہ اپنے زمانے کے فقید المثال انسان تھے۔" ملا
بدایونی نے لکھا کہ " وہ ان تمام سائنسوں اور علوم میں طاق تھے جن میں
صلاحیت استدلال ضروری ہوتی ہے مثلاً فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، نجوم، ہندسہ
اور ریاضی وغیرہ" میکانکی امور میں وہ مہارت نامہ رکھتے تھے۔ وہ علم حدیث
سے لے کر قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر میں خاصی تربیت یافتہ تھے۔ وہ بعض
نہایت اعلیٰ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ وہ بڑے پرہیزگار اور تارک الدنیا
تھے اور اپنے ہم عصر صاحبان علم و دانش کے مقابلے میں نادر اور انوکھے تھے۔
علامی ابوالفضل کا بیان ہے کہ " ان کا علم و فضل اس پائے کا تھا کہ اگر علم
وحکمت کی پرانی کتابوں کے نسخے نایاب ہوجائیں تو وہ ان کو نئی بنیادوں پر
استوار کرنے کے اہل تھے۔ امیر فتح اللہ شیرازی علم فلکیات کی باریک سے
باریک ترازوں پر عبور رکھتے تھے۔" نظام الدین احمد بخشی نے تحریر کیا کہ
علامہ فتح اللہ شیرازی کا علمی درجہ علوم منقولات و معقولات میں علمائے
خراسان، عراق و ہند سے بہت زیادہ برتر تھا۔ اپنے ہم عصروں میں کوئی بھی
دنیا بھر میں ان کا ہم پلہ نہ تھا۔"

وہ مئی ۱۵۸۳ء میں فتح پور سیکری میں دربار اکبری کی زینت بنے اور
بہت جلد دانشوروں کے سردار بن گئے۔ ۱۵۸۵ء میں ان کو امین الملک کا خطاب
دیتے وقت اکبر اعظم نے راجہ ٹوڈرمل کو تمام مالیاتی امور میں آپ کے
مشوروں کا پابند بنا دیا۔ اکبر نامہ جلد ۳ / آئین اکبری جلد اول کے مطابق
"آپ نے نظام مالیہ میں بڑی اہم تبدیلیاں کیں جن کے باعث حساب کتاب
اور مال گزاری کی وصولیابی میں سہولت ہو گئی اور مزارع کو افسران کی لوٹ

مار سے تحفظ مل گیا۔ چاندی اور تانبہ کے سکوں کی تعین قیمت کے لئے شرح نظام زر کے لئے انہوں نے تفصیلی جدول وضع کیا۔ ان کے طرز عمل اور اقدامات سے وزیر کی عدالت خاص کو رعایا کے حق میں روشنی کا مینار بنا دیا تھا۔ • اوائل ۱۵۸۹ء میں شہنشاہ نے آپ کو راجستھان میں بھساور (نزد بیانہ کا پورے کا پورا علاقہ جاگیر میں تفویض کیا جو ملا بدایونی کا وطن بھی تھا۔ اس سال آپ بادشاہ کے ہمراہ کشمیر تشریف لے گئے اور علالت کے بعد جون ۱۵۸۹ء میں انتقال کر گئے۔ اکبر نامہ جلد ۳ / منتخب التواریخ جلد ۲ کے مطابق • ان کی موت شہنشاہ کے لئے ایک ایسا نقصان تھا جس کی تلافی ممکن نہ تھی • آپ اکبر اعظم کے خسر بھی تھے۔ فیضی نے ان کے غم میں ایک دردناک مرثیہ کہا۔

آپ متعدد اختراعات کے موجد اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ عہد اکبری میں قاضی نور اللہ شوستری کے بعد آپ سب سے بڑے اور جید عالم و معلم تھے۔ آپ کی اکثر تصانیف محفوظ نہ رہ سکیں۔ آپ نے بڑے علماء مثلاً علامہ تفتازانی اور علامہ دوانی کی تصانیف پر شرحیں لکھیں۔ ان میں حاشیہ علیٰ شرح تجدید جزی ممتاز اور دستیاب ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کی مشاہیر اکبر آباد کی رو سے • آپ قرآن حکیم کی تفسیر، منہاج الصادقین کے مصنف تھے •

ملا بدایونی کی کوتاہ فکر تحریر کے برعکس آپ کے معنوی شاگردوں کی تعداد بے شمار تھی۔

ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی کتاب عہد اکبری میں شیعوں کی مذہبی اور دانشورانہ تاریخ کے مطابق • ایران اور ہندوستان دونوں ملکوں میں شاگردوں کی ایک پوری کہکشاں آپ کے سامنے زانوئے ادب طے کر چکی تھی ان میں

بیجاپور کے عادل شاہ کے وزیر اعظم افضل خان کے علاوہ موزخ رفیع الدین شیرازی، خواجہ محمد بن محمود واہدار جنہیں بڑے صوفی ہونے کی منزلت حاصل ہوئی، مرزا عبدالرحیم خانخاناں، ملا عبدالسلام لاہوری، ملا لطف الدین فرنگی محلی، جو خود معدن علوم کا درجہ رکھتے تھے، ملا قطب الدین سہالوی جنہوں نے اپنی جلو میں علماء کی پوری کہکشاں چھوڑی، وغیرہ ممتاز تھے۔ جن سے بہت سی علمی درسگاہیں وجود میں آئیں۔ معاصر الکرام جلد ۲ مولفہ غلام علی آزاد بلگرامی کے بموجب "ایک ناقابل یقین حیران کن کثیر تعداد میں طالبان علوم نے آپ کے لیکچروں سے استفادہ کیا" مفتی انتظام اللہ شہابی کی مشاہیر اکبر آباد کی رو سے علوم معقولات پر آپ نے آگرہ میں پہلا مدرسہ فلسفہ قائم کیا تھا جس کے معلم اعلیٰ آپ ہی تھے۔ "آپ کے شاگردوں میں لطف اللہ مہندس اور نور اللہ معمار ہوئے جو بہت بڑے ماہر تعمیرات، ریاضی دان اور انجینئر تھے۔ جنہوں نے تاج محل اور اس کے نظام آب رسانی کے ڈزائین تیار کئے تھے۔"

آپ کی ایجادات میں یہ اختراعات بڑی اہم اور ممتاز ہیں۔ (۱) پتھر سے بنی ہوئی ایک چکی جو خودکار تھی (غالباً سورج کی حرارت سے چلتی تھی) (۲) ایک انوکھا آئینہ جس میں دور دراز کی اشیاء بڑی نظر آتی تھیں (یہ موجودہ عہد کے راڈر کی ابتدائی شکل تھی) (۳) ایک توپ جس کی بارہ نالیاں تھیں (دوازدہ بندوق) جس کو داغنے کے لئے ایک پہیہ گھمایا جاتا تھا۔ (۴) پہاڑوں پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے لیجانے والی بھاری توپ (۵) ایک مخصوص کلینڈر جس کو دور الہٰی کا نام دیا گیا تھا (۶) ایک نیا افلاکی کی جدول جس کی اصل بنیاد خواجہ نصیر الدین طوسی کی محققانہ کاوشوں پر تھی۔

ملا بدایونی کا بیان ہے کہ آپ جدید رسدگاہ تعمیر کرنے کی صلاحیت

رکھتے تھے لیکن شہنشاہ نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی ۔

آپ کی اولاد بھساور اور آگرہ کٹرہ حاجی حسن میں آباد تھی ۔ ان میں موجود عہد کے خان بہادر سید ابو محمد ، سید علی نقی جعفری ڈپٹی کلکٹر اور سید آل عبا جعفری ممتاز ہوئے۔ آخرالذکر نے یادگار نور کتاب لکھی جو آگرہ سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی ۔

آپ کا تذکرہ تاریخ اثنا عشری شیعیان ہند جلد ۱ ، ۲ دورِ اکبری میں شیعوں کی سیاسی اور دانشورانہ تاریخ ، مطلع انوار ، مشاہیر اکبر آباد اور دیگر کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔

(۹) جناب سید راجو بخاری

آپ اول ضلع متھرا کے سادات نقوی سے تعلق رکھتے تھے آپ سید حامد بخاری کے فرزند اور سید جلال بخاری کی نسل میں سولہویں صدی کے بڑے ممتاز عالم ، متقی اور مجاہد تھے۔ آپ ۹۵۰ھ بمطابق ۱۵۴۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۰۰ھ بمطابق ۱۵۹۱ء میں وفات پائی ۔ آپ نے شمالی ہند بالخصوص پنجاب ، سندھ اور بلوچستان میں بڑی تبلیغ کی ۔ آپ نے تقیہ کی سخت مخالفت کی اور تقیہ نہ کرنے والے سادات نقوی میں ممتاز ہوئے۔ آپ نے باڑی (ریاست دھولپور) نزد آگرہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا جہاں آپ دفن بھی ہیں۔ یہ مقام زیارت گاہ ہے جہاں سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔

بعض مورخوں اور سیرت نگاروں نے غلط فہمی کے باعث حضرت قاضی نور اللہ شوستری کی شہادت کے بعد شہید ثالث کی تجہیز و تدفین میں جناب سید راجو بخاری کی خصوصی شرکت کا ذکر کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے کیونکہ شہید ثالث کی شہادت ۱۶۱۰ء میں ہوئی تھی جب کہ

جناب راجو بخاری انیس برس قبل ۱۵۹۱ء میں وفات پاچکے تھے۔ البتہ آپ کے ایک پوتے سید حسن عرف میر جمن بن سید زین العابدین نے شہید ثالث کی تجہیز وتدفین میں حصہ لیا تھا۔ جن سے قاضی صاحب کی خط و کتابت بھی تھی اس کا حوالہ مولانا سید سبط حسن ہنسوی نے اپنی کتاب "تذکرہ مجید در احوال شہید" میں دیا ہے۔ غالباً غلط فہمی کی وجہ یہ ہوئی کہ راجن پور کا مقام سید راجو بخاری ہی کے نام سے منسوب ہے اور وہاں کے ہر متولی کو راجن شاہ ہی کہا جاتا ہے۔

آپ ہی نقوی سادات اول وباڑی کے مورث اعلیٰ قرار پائے ہیں۔

آپ کا تذکرہ مطلع انوار، یادگار نور، تذکرہ مجید در احوال شہید اور دیگر متعدد کتابوں میں ملتا ہے۔

۱۰) جناب لشکر خاں

آپ کا نام خواجہ ابوالحسن مشہدی تھا۔ آپ عہد اکبری کے ممتاز افراد میں اعلیٰ منصب دار تھے۔ عہد جہانگیر میں اکبر آباد کے صوبیدار (گورنر) رہے۔ عہد شاہجہانی میں پنج ہزاری منصب پر فائز ہوئے اس کے بعد دہلی کی حراست (خصوصی عہدہ) پر مامور ہوئے۔ آپ نے آگرہ میں موضع لشکر پور کو آباد کیا تھا جہاں ایک بڑی کربلا، متعدد مساجد، پختہ چاہ تعمیر کروائے۔ جہاں بہت سے مقبرے تھے ایک مزار پر قدم رسول اللہ نصب تھا۔ (یہ کربلا سادات شاہ گنج آگرہ کی مشہور کربلا تھی جہاں تعزیئے وغیرہ دفن کئے جاتے تھے اور جو سرائے خواجہ کے نام سے معروف تھی) آپ حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئے اور اسی دوران مشہد مقدس میں ایک مسافر خانہ اور سرائے بنوائے اور وہیں وفات پاکر ابدی نیند سوگئے۔

آگرے میں لشکر خان کی عالیشان حویلی بیس بیگہ آراضی پر واقع تھی جس میں برطانوی عہد میں ضلعی کچہری (کورٹ) کے دفاتر قائم ہوئے۔ آپ کے فرزندان سزاوار خان اور لطف اللہ خان بھی مغلیہ دور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ آپ کا تذکرہ "مرقع اکبر آباد مولفہ سعید احمد مارہروی میں بھی ملتا ہے۔

(۱۱) جناب سید حبیب اللہ

آپ سالار سید محمد غازی مشہدی کی نسل میں سید نواز علی بن سید دولت کی اولاد میں ہیلک کے تھوک فرید میں رضوی سید تھے۔ ۱۷۰۵ء میں بیانہ وہیلک پر مغل فوج سے مقابلہ کرنے کے نتیجہ میں آپ کو ہیلک سے ہجرت کرنا پڑی۔ آپ نے کچھ عرصہ فتح پور سیکری میں قیام کیا جہاں آپ حضرت شیخ سلیم چشتی کی درگاہ کے متولی کے مہمان رہے۔ آپ کو مغل بادشاہ نے کانگاروں کی گورنری بھی دی تھی لیکن آپ کا دل نہ لگا تو آپ نے آگرہ میں جائیداد حاصل کر کے یہاں مستقلاً سکونت اختیار کی اور اس طرح ایک اہم مرکز سادات ۱۷۰۷ء میں وجود میں آیا۔ یہ شاہ گنج مشہور ہوا۔ یہاں آپ نے عالیشان محل تعمیر کروایا جو بڑی حویلی کہلایا۔ شاہ عالم اول نے آپ کو آگرہ تا بیانہ کی فوجی گورنری بھی دی تھی۔ آپ بڑے صاحب اقتدار ہوئے۔ آپ کا تذکرہ تاریخ سادات مومین آگرہ مولفہ داروغہ سید احترام علی، تاریخ بیانہ مولفہ حکیم سید علی رضا بیانوی، تاریخ سادات بھرتپور، تجلیات فکر مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ اور سید زوار حسین عرف بدھا کی تاریخی یاداشتوں میں ملتا ہے۔

۱۲) جناب میر اکبر علی رسالدار

آپ رضوی سادات ہیلک وشاہ گنج آگرہ کے سید رکن الدین ڈوگر کی نسل میں تھے۔ آپ کے والد سید محمد علی بھی فوجی تھے اور مرہٹہ عملداری میں آگرہ ونواح کی علاقائی فوج میں اعلیٰ افسر تھے۔ آپ کے جد سید رکن الدین ڈوکر بھی عہد سلطانی میں بھکر کے فوجی گورنر تھے۔ جو دریائے سندھ میں روہڑی اور سکھر کے درمیان واقع ایک اہم مرکز سادات تھا۔ میر اکبر علی رسالدار عظیم فوجی تھے آپ کی عسکری خدمات کو مغل بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی درخواست پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو مستعار دیدیا تھا۔ آپ سرچارلس منٹکف اور جنرل لیک کے دوستوں میں تھے اور ان کی عسکری کامیابیوں کا محور تھے۔ آپ نے مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہلکر کو شکست دی تھی جس کے نتیجے میں فتح آگرہ کو استحکام ملا۔ عسکری خدمات کے صلے میں آپ کو بڑی جائیداد ملی تھی اور آگرہ چھاؤنی میں آپ کے نام پر اکبر بیرکس کی تعمیر ہوئی تھی ۔ آپ اور آپ کے بزرگوں کا فوجی تعلق سندھ سے پرانا تھا چونکہ آپ مقتدر فوجی بھی تھے اور شہزادگان سے نسلی تعلق بھی تھا جس کے باعث آپ کے خاندان کو اکبر جام ، کا منفرد اعزاز دیا گیا۔ آپ دیندار ، انسان دوست اور حافظ قرآن تھے۔ آپ نے شارع عام پہ پہلی مسجد تعمیر کروائی تھی جو چند سال قبل از سر نو تعمیر ہوئی ہے اور مسجد میر اکبر علی کے نام سے مشہور ہے۔

آپ ۱۷۵۶ء میں شاہ گنج آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۶ء میں وفات پائی آپ اپنی تعمیر کردہ مسجد میر اکبر علی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

آپ کا تذکرہ تاریخ سادات شاہ گنج قلمی ، تجلیات فکر مطبوعہ محرم ۱۳۷۸ھ اور دیگر کتابوں میں ملتا ہے۔

۱۳) جناب سید نجیب علی

آپ جناب سید عتیق اللہ بن سید عبدالعزیز کے فرزند اور جناب سید حبیب اللہ کے داماد تھے۔ آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے پہلے شخص تھے جس نے اپنے نام کے ساتھ " عزادار شاہ گنج " لکھنا شروع کیا تھا۔ آپ مغل فوج کی چھاؤنی واقع کانپور کے فوجی کمانڈنٹ تھے۔ آپ ہی شاہ گنج آگرہ کی عزاداری کے بانیوں میں تھے۔ جن کی نسل میں عزاداری آج تک باقی ہے۔

۱۴) جناب سید صاحب علی

آپ ہیلک کے تھوک ڈوکر کے سید خان محمد کے بیٹے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے قبل آپ تحصیلدار تھے اور سرکاری طور پر روسائے آگرہ میں شمار ہوئے تھے۔ آپ نے موضع شاہ گنج کو آگرہ میونسپلٹی کی حدود میں شامل کروانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ جنگ کابل کے دوران آگرہ کے ہندو سیٹھ جوتی پرشاد کی ایک فوجی مقدمے میں آپ نے ایک لاکھ روپیہ کی ضمانت دی تھی جو غیر معمولی بات تھی ۔ آپ اچھے مرثیہ خوان بھی تھے۔ آپ کے بیٹے سید نیاز علی بڑے مقتدر ہوئے جو ۱۸۵۷ء میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور غدر کے بعد کے حالات کے تحت شمرو کی بڑی جائیداد اور باغات پر متصرف تھے۔ موصوف کے خاندان میں کئی ڈپٹی کلکٹر اور تحصیلدار ہوئے۔ وقف کا امام باڑہ و مسجد آپ ہی نے تعمیر کروائے تھے۔ اندرون شاہ گنج زنانی مسجد بھی بنوائی تھی ۔

۱۵) جناب سید کرامت علی ہوشیار

آپ سادات پہر سر کے سید مدد علی جعفری کے فرزند تھے۔ آپ مہاراجہ گوالیار کے مدارالمہام (سکریٹری) تھے۔ روایت ہے کہ آپ کے تدبر کی

بدولت مہاراجہ گوالیار کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج میں جنگ کی نوبت نہ آسکی اس طرح میر اکبر علی رسالدار ایسٹ انڈیا کمپنی کی جس فوج کی قیادت کر رہے تھے ، سے گوالیار کا عسکری تصادم ٹل گیا تھا اور سمجھوتہ عمل میں آگیا تھا۔ آپ نے ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی اور شاہ گنج آگرہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ میاں جی مشہور تھے۔ آپ شاعر و مصنف بھی تھے ۔ آپ نے حضرت علیؑ کی خلافت پر کتاب لکھی ۔ آپ کی اولاد میں کئی شاعر گزرے جن میں سید مرتضیٰ بیدار اور سید محمد جعفری نمایاں تھے۔

۱۶) مجاہدین آزادی ۱۸۵۷ء

مستند مورخوں بالخصوص فلپ وڈرف اور کنہیالال کے مطابق ۱۸۵۶ء ۱۸۵۷ء میں شمالی ہند میں دو اہم لڑائیاں لڑی گئیں۔ ایک اودھ (لکھنو) میں دوسری آگرہ (شاہ گنج) میں جنگ شاہ گنج آگرہ کے ہیرو سادات شاہ گنج کے سید محمد باقر عرف چندا ، سید حسن رضا عرف پلندا ، سید مشرف علی زیدی ، سید حسن علی اور سید قادر علی تھے۔ ان کا تعلق بالترتیب خاندان سید گلزار علی ولد حکمت علی ، سید پورہ کے زیدی خاندان جو شاہ گنج میں آباد ہوگیا تھا اور خاندان میر اکبر علی رسالدار (اکبر جام) سے تھا۔

اس کا تذکرہ متعدد تاریخوں میں بالخصوص ، وہ جنہوں نے انڈیا پر حکومت کی مطبوعہ لندن (انگریزی) محاربہ عظیم ۱۸۵۷ء ، جنگ شاہ گنج آگرہ جس کا حوالہ سر کنین ڈائل کے ناول سائن آف فور میں بھی ہے۔

۱۷) جناب سید محمد پناہ رضوی

آپ رضوی سادات ہیلک کے نامور فوجی جرنیل تھے اور بھرتپور کے مہاراجہ سورج مل کے عہد کی ممتاز عسکری شخصیت تھے۔ آپ سادات بھرتپور

کی اس فوج کے سالار تھے جس نے بڑگوجر اور راجہ سورج مل کے مابین لڑائی میں نہایت شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مہاراجہ سورج مل کے حکم پر اس جنگ گھاسٹیرہ کا احوال نظم کیا گیا اس نظم جس کا نام چترادلی تھا، میں اس کے ہندو مصنف نے آپ اور آپ کے بہت سے ساتھیوں کی بڑی مدح کی ہے اور ان کو اپنے ہندو اوتاروں پر فضیلت دی ہے۔

آپ کا تذکرہ تاریخ سادات بھرتپور، تاریخ بلد بیانہ اور کتاب راجہ سوجرمل مصنفہ کنور نٹور سنگھ میں ملتا ہے۔

۱۸) جناب میر قائم علی

آپ میر اکبر علی رسالدار کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ آپ متھرا (بندرابن) کے کوتوال شہر تھے (یہ عہدہ موجودہ زمانے کے ایس پی کے مساوی تھا) آپ بڑے عالم، عامل باصفا اور عابد شب زندہ دار تھے۔ آپ نے پا پیادہ حج وزیارات کا شرف حاصل کیا تھا آپ کی واپسی دس برس بعد ہوئی تھی اس وجہ سے آپ نے کوتوال کے منصب کو لات مار دی تھی۔ آپ بہت بڑی جائیداد کے بھی مالک تھے جس میں علی حویلی شامل تھی۔

۱۹) خان بہادر سید اولاد حسین رضوی

آپ ہیلک کے رضوی سید تھے۔ زوال ہیلک ۱۷۷۲ء کے بعد آپ کے والد سید ثابت علی تحصیلدار نے ہیلک سے ترک سکونت کی اور پہرسر میں بس گئے تھے جن کو ۱۸۵۷ء میں مجاہدین آزادی نے سخت اذیت دے کر شہید کر دیا تھا۔ آپ برصغیر کی مسلم تاریخ میں منفرد مسلمان افسر تھے جن کو ۵۵ کے بجائے ۸۰ سال تک ملازمت کروائی گئی۔ آپ کمشنر بندوبست تھے۔ آپ کی پنشن بھی خاص طور پر لندن سے منظور ہوئی تھی کہ یہ پوری تنخواہ بطور

پینشن دی گئی تھی ۔ آپ کو خان بہادر اور سی آئی اے کے خطابات ملے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر آپ کو سب سے اگلی قطار میں نشست ملی تھی جب کہ مہاراجہ بھرتپور کو تیسری قطار میں جگہ دی گئی تھی لیکن آپ کے ایما پر اگلی قطار میں ایک کرسی کا خصوصی اضافہ کیا گیا اور مہاراجہ بھرتپور کو یہ جگہ دی گئی ۔ آپ شاعر و مصنف بھی تھے اور مداح تخلص کرتے تھے۔

آپ کے گیارہ بیٹے ہوئے جن کے نام آئمہ کے اسمائے پاک پر رکھے تھے آپ کی اولد میں سید آل محمد اس دور میں کلکٹر (ڈپٹی کمشنر) ہوئے جب کسی ہندوستانی کے لئے یہ عہدہ شجر ممنوعہ تھا۔ آپ کے خاندان میں کئی حضرات ڈپٹی کلکٹر، پولیٹیکل ایجنٹ اور جج گزرے ہیں۔ آپ زاد سبیل آخرت کے مصنف تھے اور ہفت بند کاشی کی تضمین لکھی تھی ۔ آپ ۱۸۲۸ء میں تولد ہوئے اور محرم ۱۳۲۳ھ کو آگرہ میں وفات پا کر مزار شہید ثالث کے احاطہ میں دفن ہوئے۔

۲۰) جناب میر تراب علی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید ہمت علی بن سید روشن علی رضوی کے نامور فرزند تھے۔ آپ ۱۸۵۷ء کے غدر سے قبل بجنور میں تحصیلدار تھے جہاں سر سید احمد خاں صدرامین تھے۔ ان دونوں کی بڑی گہری دوستی تھی اور قرابتدارانہ تعلقات تھے۔ آپ نے سر سید کی علی گڑھ تحریک میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ کالج کے قیام ۱۸۷۷ء میں زبردست مالی مدد کی اور کالج کی فنڈز کمیٹی کے اہم رکن رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بغاوت کے الزام میں آپ نے بجنور میں نہ کسی مسلمان کی جائیداد ضبط ہونے دی اور نہ کسی مسلمان کو تختہ دار پر چڑھنے دیا۔

آپ کے بھائی حاجی میر ضامن علی بھی ۱۸۵۷ء کے عہد میں اودھ میں تحصیلدار تھے۔ موصوف نے شاہ گنج آگرہ میں ایک عظیم مرکز عزاء تعمیر کروایا جو عزاخانہ مشہور ہوا۔ یہ عزاداری کے علاوہ سماجی اور علمی وادبی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا۔یہاں علاقے کی ایک بڑی لائبریری بھی تھی اور جزوقتی شفاخانہ بھی۔

میر تراب علی اور میر ضامن علی کا انتقال ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ ان دونوں بھائیوں کی اولاد میں کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ (پی ایچ ڈی) اور اعلیٰ عہدیدار ہوئے۔ان میں ڈاکٹر سید علی جان ، ڈاکٹر سید ابن حامد رضوی ، ڈاکٹر سید محمود حسنین ، سید حسنین احمد عرف آدم ، ڈاکٹر طاہر رضوی ، سید رضا رضوی اور سید محمد نمایاں رہے آخرالذکر ریاست بلرام پور کے نائب دیوان ہوئے۔

۲۱) جناب مولوی سید ضامن علی

آپ ہیلک کے تھوک فضیل میں رضوی سید تھے اور شاہ گنج آگرہ کے صاحبان علم میں ممتاز تھے۔آپ عربی وفارسی کے بڑے عالم تھے نیز فارسی شعر گوئی میں استادانہ حیثیت کے حامل تھے۔ مولانا سبط حسن ہنسوی کی کتاب "تذکرہ مجید دراحوال شہید" کے پہلے ایڈیشن میں آپ کی فارسی رباعیات درج تھیں لیکن دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دی گئیں۔آپ آگرہ کالج میں عربی وفارسی کے پروفیسر تھے۔جو ۱۸۱۸ء سے قبل مدرسۂ آگرہ کہلاتا تھا۔آپ باوا سید محمد علی جعفری کے نانا بھی تھے اور مربی و راہبر بھی۔

۲۲) جناب ماسٹر، پروفیسر سید عبداللہ رضوی

آپ سادات آگرہ کے نامور سپوت تھے۔ آپ ماہر تعلیم بھی تھے اور ۱۸۵۷ء کے زمانے میں آگرہ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ آپ کی مساعی کے باعث شاہ گنج کے نزدیک آگرہ کے سرکاری تعلیمی ادارے قائم ہوئے ان میں گورنمنٹ ہائی اسکول، ٹیچرز ٹرینگ کالج اور ورناکلر اسکول نمایاں تھے۔ اگر آپ کو شاہ گنج آگرہ کا سرسید کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ ہی شاہ گنج کی تعلیمی سرگرمیوں کا محور تھے۔ آپ نے شیعہ کانفرنس کے انعقاد میں پہلے سکریٹری سید علی غضنفر کے ساتھ اشتراک عمل کر کے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ آپ کے متعلق آگرہ کالج کے پرنسپل نے لکھا کہ ماسٹر سید عبداللہ رضوی ہر شعبۂ علم میں کچھ نہ کچھ درک رکھتے ہیں لیکن فلسفہ میں مکمل دسترس کے حامل ہیں۔ " سید محمد جعفری مرحوم کے مجموعہ کلام، شوخی تحریر میں آپ کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " آپ سید محمد جعفری کے پھوپھی زاد بھائی تھے جن کی توجہات کا سید محمد جعفری کی تعلیم وتربیت میں بڑا دخل تھا کہ وہ بھی درس وتدریس سے وابستہ تھے اور آگرہ کالج کے اساتذہ میں ممتاز تھے۔ " آپ نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں وفات پائی اور شاہ گنج آگرہ ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کے بیٹے سید اسد اللہ رضوی بھی درس وتدریس سے وابستہ تھے۔

۲۳) جناب حاجی سید موسیٰ رضا

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید مظفر علی بن سید امان علی رضوی کے نامور فرزند تھے جو حافظ قرآن اور متقی انسان تھے۔ آپ آگرہ میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ آپ آگرہ کے عظیم صنعت کار تھے آپ نے شاہ گنج آگرہ میں ۱۸۷۵ء میں جوتوں کا بہت

بڑا کارخانہ قائم کیا جو شاہ گنج شو فیکٹری مشہور ہوا۔ اس کے جوتے نہ صرف برصغیر کے طول وعرض میں مشہور تھے بلکہ انگلستان میں بھی وقیع تھے۔ اس کارخانے میں غدر ۱۸۵۷ء کے تباہ حال مسلمانوں کو روزگار فراہم کیا گیا تھا۔ آپ آگرہ میونسپلٹی کے دس برس تک میونسپل کمشنر بھی رہے۔ آپ بڑے مخیر اور نیک انسان تھے۔ آپ بڑی بڑی عمومی دعوتوں کے لئے مشہور تھے۔ آپ عزادار بھی تھے۔

۲۴) مولانا سید مبارک علی رضوی

آپ کا تعلق لکھنو کے سادات رضوی سے تھا اور مولانا سید حیدر علی کے عظیم المرتبت فرزند تھے لیکن نصف صدی سے زائد عرصہ تک شاہ گنج آگرہ اور اہل شاہ گنج کو دینی اور علمی تربیت فرمائی۔ آپ نے شاہ گنج آگرہ ہی کو اپنا وطن ثانی قرار دے دیا تھا اور ۱۹۱۸ء سے مستقلاً شاہ گنج ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔

شریعت مدار علامہ حکیم سید مبارک علی علوم شریعہ میں حضرت نجم الملت کے اور طب میں شفاء الملک حکیم عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ آخرالذکر حکیم اجمل خان کے ہم عصر اور طبیہ کالج لکھنو کے بانی ومدرس اعلیٰ تھے۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۷ء ہر سال عشرہ محرم کی ان مجالس کی خطابت کے لئے آگرہ تشریف لاتے رہے جو لوہا منڈی میں حاجی سید حسن ڈپٹی کلکٹر کی حویلی کے مردانے حصے میں منعقد ہوتی تھیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۷ء تک آپ مسجد وقف میر نیاز علی اور مسجد میر اکبر علی رسالدار کے امام وخطیب رہے۔ آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۱۱ء میں ہوا جب آپ نے لکھنو سے ہفتہ وار شیعہ گزٹ نکالنا شروع کیا۔ آپ نے ۱۹۲۴ء میں آگرہ سے اخبار الناظر کا اجراء کیا جس کے

آپ مدیر اعلیٰ بھی رہے۔ موصوف کی قومی اور ملی خدمات بھی لائق ستائش تھیں۔ آپ نے تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بڑی پرجوش تقاریر بھی کیں۔ شاہ گنج میں جلوس ذوالجناح پر پابندی کے خلاف احتجاجی وفد کی قیادت بھی کی۔ ۱۹۳۹ء میں محاذ حسینی (مدح ، قدح ثلاثہ کی ایجی ٹیشن لکھنؤ) کے سلسلے میں ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کر کے اس منظم جدوجہد کو تقویت دی۔

یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو آپ نے کراچی میں رحلت کی اور علی قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کی مجلس سوئم کی ذاکری مولانا سید محمد دہلوی نے اور مجلس چہلم کی خطابت علامہ رشید ترابی نے کی تھی جو امام باڑہ جعفریہ گلبہار اور حسینیہ ایرانیان کھارادر میں منعقد ہوئی تھیں۔

آپ کی متعدد تصانیف میں نظام اسلام ، تذکرہ سیدہ ، حیات زہرا اور معارج الیقین جیسی کتابیں نمایاں ہیں۔

آپ کی شخصیت بڑی ہمہ پہلو تھی اور ایسی ہمہ صفات ہستیاں اس جہان آب وخاک میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ آپ کے فرزندان میں حکیم سید صفدر علی ، حکیم سید عابد علی ، سید معصوم علی (معصوم الرضوی) اور سید عالم علی (عالم الرضوی) ہوئے۔ آخرالذکر آپ کی سوانح (حیات مبارک کی تدوین میں منہمک ہیں ۔

ہم آیت اللہ علامہ سید مبارک علی کے اس مختصر تعارف کو آپ کے فرزند ارجمند مولانا عالم الرضوی کے جامع الفاظ پر تمام کرتے ہیں کہ " مولانا مرحوم بیک وقت بیشتر خصوصیات کے حامل تھے۔ آپ منبر پر عظیم خطیب محراب عبادت میں مقدس امام ، علوم عقلیہ وشرعیہ کی مسند پر شفیق استاد ، میدان صحافت میں تیز رفتار شہ سوار ، فن طب میں ماہر نباض ، کرسی

عدالت پر فائز قاضی ، نامور مصنف اور شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے ممتاز
مقام رکھتے تھے۔

۲۵) جناب ماسٹر، باوا سید محمد علی جعفری

آپ شاہ گنج آگرہ اور پہرسر بھرتپور کے سادات کے اس صدی کے
ممتاز ترین فرد قرار پائے۔ آپ کے والد سید مرتضیٰ کو شاہ گنج کے پروفیسر سید
ضامن علی رضوی کی دختر بیاہی تھی ۔ آپ کی شخصیت کی تشکیل میں آپ کے
نانا پروفیسر مولوی سید ضامن علی رضوی کے علاوہ شاہ گنج ہی کے ماسٹر سید
عبداللہ رضوی اور ماسٹر سید محسن رضا رضوی کا بڑا دخل تھا جس کا اظہار خود
موصوف نے اپنے ایک خط بنام الحاج سید اسرار حسن رضوی بن سید مثنیٰ
حسن (اکبرجام) میں کیا ہے۔ ۱۸۹۵ء میں آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم
اے (فلسفہ) کیا۔ یہ منفرد اعزاز آپ سے قبل اور بعد کوئی اور نہ پاسکا۔ ۱۹۰۳ء
میں آپ بھرتپور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور ۱۹۰۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور
کے پہلے مسلمان پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے
تاسیسی اجلاس منعقد ڈھاکہ میں شرکت کی اور مسلم لیگ کے بانیوں میں
شمار ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں سندھ مسلم لیگ اور ۱۹۳۷ء میں پنجاب مسلم لیگ کی
تنظیم نو پر مامور ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں پنجاب مسلم لیگ اور یونینسٹ وزارت
کے مابین مصالحت کی بڑی کوشش کی ۔ اگر یہ سعی کامیاب ہوجاتی تو نہ شملہ
کانفرنس ناکام ہوتی اور نہ پنجاب کی تقسیم عمل میں آتی ۔ پنجاب کی سیاسی اور
تعلیمی زندگی پر آپ کی چھاپ بڑی گہری ہے۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں آپ کا سوسالہ

یوم پیدائش منایا گیا اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو آپ کی وفات پر جناب شیم(م) میم نے اپنی ڈائری مطبوعہ نوائے وقت لاہور مورخ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۶ء ۲۰ مئی ۱۹۶۶ء اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو خصوصی کالم لکھے۔ جن میں آپ کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔ آپ پنجاب (لاہور) میں ۱۹۰۵ء سے مسلسل آباد رہے ہیں۔

آپ کی اولاد نرینہ میں سید حسن جعفری مرحوم ایڈوکیٹ گجرانوالہ ، سید موسیٰ جعفری مرحوم کیپٹن پاک فوج ، سید محمد جعفری مرحوم نامور مزاحیہ شاعر اور سابق اتاشی سفارتخانہ تہران اور سید جعفر جعفری ریٹائرڈ ڈپٹی سکریٹری حکومت پنجاب ہوئے۔ ان کا تذکرہ ممتاز افراد میں الگ کیا گیا ہے۔

۲۶) جناب چودھری سید نظیر الحسن رضوی فوق

آپ مہابن ضلع متھرا کے سادات رضوی میں ممتاز ترین شخص تھے۔ آپ ۱۲۹۷ ہجری میں مہابن میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد سید سردار علی رضوی رئیس اعظم مہابن تھے جو مجسٹریٹ بھی رہے۔ آپ (فوق) بڑے نامور ادیب و مصنف اور شاعر تھے۔ آپ مختلف علوم میں ماہر تھے۔ آپ نے مختلف قومی تحریکات میں حصہ لیا آپ شیعہ کانفرنس کے پہلے سکریٹری سید علی غضنفر کے اہم مددگاروں اور خصوصی مشیروں میں ہوئے۔ مولانا سبط حسن کے ضمن میں قضیۂ حدیث خوانی علی گڑھ کالج میں اہم کردار ادا کیا اور مخالفین کو دندان شکن جوابات دیئے۔ آپ نے کتاب بدعات محرم کے جواب میں کتاب حسنات محرم لکھی جس سے عزاداری اور محرم کی رسومات کی ضرورت وافادیت واضح ہوئی ۔ آپ کی شہرہ آفاق تصنیف المیزان ہے جو علامہ شبلی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تحریر کی تھی ۔ اس پر علامہ شبلی نے انہیں لکھا کہ " آپ نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب

لکھا ہے جو اس زمانے میں غنیمت ہے۔ آج مجھ کو اپنے موازنے کی قدر معلوم ہوئی اس بہانے سے ایک اچھی کتاب کا اضافہ اور ایک باکمال مصنف کے جوہر اچھی طرح کھلے۔ میں آپ کی طرز تحریر کا مداح ہوں۔" آپ ہیلک کے رضوی سید تھے۔ آپ کے خاندان میں متعدد اہم اور نامور شخصیات ہوئیں جن کا ذکر ممتاز افراد میں الگ کیا گیا ہے۔

۲۷) جناب نسیم بھرتپوری

آپ کا نام سید شبیر حسن تھا۔ آپ ریاست بھرتپور کے موضع پہرسر میں ۱۲۷۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر التماس حسین جعفری تھے۔ نسیم بھرتپوری عہد انیس و دبیر کے بعد اور عصر جدید کے مابین ایک اہم ادبی کڑی تھے۔ آپ اپنے عہد کے ممتاز اساتذہ فن اور بڑے مرثیہ نگاروں میں شمار ہوئے۔ آپ نے غزلوں کے علاوہ سلام اور مراثی بھی بڑی تعداد میں لکھے۔ ۱۸۷۶ء میں آپ نے داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی باکمال استاد کو اپنے ہونہار شاگرد پر فخر تھا۔ آپ نے عربی و فارسی کی تعلیم مولوی سید محمد سونی پتی سے حاصل کی جو مومن و صہبائی کے اہم تلامذہ میں تھے۔ آپ کو دشوار اور سنگلاخ زمینوں میں شعر گوئی کا ملکہ تھا۔ آپ نے رامپور میں محفل اساتذہ میں جو برجستہ غزل کہی تھی اس کا مطلع تھا۔

دکھائے شعبدے گر وہ بت عیار چنگی میں
تو بولے طائر رنگ حنا ہر بار چٹی میں

اس کی مجلس اساتذہ میں بڑی تعریف ہوئی ۔ امیر مینائی نے اٹھ کر گلے لگایا اور استاد داغ دہلوی نے فخریہ انداز میں پیشانی چومی ۔ داغ کے کلام پر جتنے اعتراضات ہوئے سب کے آپ نے مدلل جوابات لکھے جو دہلی پنچ لاہور نے شائع کئے نیز ایک رسالہ بنام تازیانہ لکھا جو ابوالعلائی پریس آگرہ میں چھپا تھا۔ داغ کا دیوان سوم (مہتاب داغ) کی طباعت کی نگرانی کے لئے آپ

کو بھرتپور سے حیدر آباد دکن طلب کیا گیا جہاں داغ مقیم تھے۔ منشی رکن الدین جادو نے داغ کو اصلاح کے لئے اپنا کلام بھیجا تو داغ نے منشی صاحب کو لکھا کہ "نسیم بھرتپور میں آپ کے ہاں موجود ہیں ان سے مشورہ سخن کریا کرو۔" آپ کی وفات ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ آپ کے کلام کے نمونے "آگرہ ونواح آگرہ کا دبستان شاعری" میں پیش کئے گئے ہیں۔

۲۸) جناب منیر شکوہ آبادی

آپ کا اسم گرامی سید اسمعیل حسین تھا آپ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔ آپ نے عربی وفارسی کی تعلیم اپنے والد سید احمد حسین سے پائی اور علم دین کی تکمیل اپنے بڑے بھائی سید اولاد حسین سے کی۔ آپ کا شاعرانہ تعلق روسائے لکھنو، فرخ آباد و رامپور سے رہا۔ آپ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ جزائر انڈمان (کالے پانی) کی قید تنہائی تھا جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ضمن میں آپ کو بھگتنا پڑی۔ آپ نے اپنے کلام میں ان مصائب کا تذکرہ کیا ہے جو آپ کو ۵ سال تک برداشت کرنا پڑے۔

آپ مرزا غالب کے عہد کے بہت بڑے شاعر اور مستند استاد فن تھے۔ آپ کو اس عہد کا ہمہ داں اور ہمہ گیر شاعر واستاد قرار دیا گیا ہے۔ اپنی خود نوشت سوانح میں علامہ نجم آفندی نے ان کے حوالے سے اپنی نوجوانی میں اس وقت کے اہل کمال شعراء تک اپنی رسائی کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے ہر صنف شعر میں کامیاب طبع آزمائی فرمائی۔ آپ کے تین دیوان بنام منتخب العالم، تنویر الاشعار اور نظم منیر کو بڑی قبولیت واہمیت حاصل ہوئی۔ آپ کی مثنویاں، حجاب زنان اور معراج المضامین۔ آپ کے استادانہ کلام کی آئینہ دار ہیں۔ آپ نے چند مذہبی رسائل کے علاوہ فارسی میں متعدد غزلیں، خطوط اور تقریظیں بھی لکھیں جن سے آپ کے شاعرانہ کمال و عظمت اور ہمہ دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے غزل ہائے مسلسل کہہ کر اردو شعراء پر

سے یہ الزام زائل کر دیا کہ وہ منتشر الخیالی کے اسیر ہوتے ہیں اور تسلسل خیال سے عاری بھی۔ آپ کی مثنوی معراج المضامین میں آپ کے شاعرانہ کمال کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔ رسالہ نگار بابت نومبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۳۵ کے مطابق " یہ مثنوی منیر شکوہ آباد کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے اس کا موضوع مذہبی ہے جو آنحضرتؐ اور اہلبیت اطہارؑ کے معجزات پر مشتمل ہے۔ اس کو دیکھ کر منیر شکوہ آبادی کی استادی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔" اسی رسالہ نگار کے صفحہ ۳۶ پر لکھا ہے کہ " ایک نظم میں دریا کے گھاٹ کا منظر پیش کیا ہے جس میں مقامی رنگ غالب ہے۔ اس میں مشاہدہ فطرت، بیان کی صفائی اور روانی کی ایسی مثالیں اردو شاعری میں کم ہی ملتی ہیں۔ منیر کے معاصرین میں تسلیم دہلوی تو ایک حد تک ان کے قریب پہنچتے ہیں اور بس۔" آپ کے کلیات میں دیگر اصناف سخن میں بڑا سرمایہ موجود ہے۔

موصوف حضرت بزم آفندی اکبر آبادی کے ماموں بھی تھے اور استاد بھی جنہوں نے کئی غزلوں کے دیوان اور تین سو مرثیوں کا بڑا عمدہ سرمایہ چھوڑا۔ آپ انیسویں صدی کی دوسری نصف صدی کے ان باکمال شعراء میں ممتاز تھے جن سے اکبر آباد و نواح اکبر آباد کے دبستان شعر و شاعری کی عظمت قائم تھی۔ آپ کے کلام کے چند نمونے دبستان آگرہ و نواح آگرہ میں دے دیئے گئے ہیں۔

(۲۹) علامہ نجم آفندی اکبر آبادی

آپ کا اسم گرامی مرزا تجمل حسین تھا۔ آپ کو ننہیال اور دادھیال دونوں طرف سے شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ آپ آگرہ میں اپریل ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد حضرت بزم آفندی اکبر آبادی چھٹے دور شاعری کے ممتاز باکمال شاعر اور مستند استاد فن تھے۔ جن کے غزلیات کے کئی دیوان شائع ہوئے اور جو مرثیہ گوئی میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ آپ نے

تین سو مراثی لکھے تھے۔ علامہ نجم آفندی کے بزرگوں میں مرزا جعفر علی فصیح اور مرزا نجف علی بلیغ اپنے زمانے کے بڑے شاعروں میں نمایاں تھے۔ فصیح کو مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس عہد کے پانچ ممتاز مرثیہ نگاروں میں شامل کیا ہے۔ جو نواب امجد علی آف اودھ کے دور میں موجود تھے آپ طویل عرصہ تک حرمین میں رہے اور حکومت ترکی نے ان کی خدمات کے صلے میں آفندی کا خطاب دیا تھا۔

مرزا بلیغ کے مرزا عباس بلیغ ہوئے جن کے بیٹے مرزا عاشق حسین بزم آفندی تھے۔ آخر الذکر کی شادی آگرہ کے آغا حسین آغا کی دختر سے ہوئی تھی جو آگرہ کے اچھے اور بڑے شاعر تھے۔

علامہ نجم آفندی ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں ۱۹۷۱ء تک رہے یہاں آپ شہزادہ معظم جاہ شجیع کے اتالیق اور استاد رہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے آپ کو شعرائے دکن میں شمار کیا ہے (دکن میں اردو) آپ کی نوجوانی کے عہد کے واقعات میں دو اہم تھے ایک وہ جب دہلی کے ایک بڑے مشاعرے میں آپ نے مفتون کے متنازعہ شعر پر برجستہ قطعہ پڑھا تھا جو یہ تھا۔

یہ اس سے کہہ دو ہو دعویٰ زباں کا جس کو
ہمارے آگے زباں کھولے گفتگو کے لئے
زبان میر کی ہے میر آگرے کے تھے
مقام فخر ہے دہلی نہ لکھنو کے لئے

دوسرا وہ تھا جب آپ نے ۱۹۲۰ء ۔ ۱۹۲۲ء میں لکھنو کی ایک بڑی محفل مقاصدہ میں اپنا پہلا قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع تھا۔

نمود عالم ہو تھی فضائے تیرہ و تار
نہاں تھے کتم عدم میں چراغ و شمع و شرار

اس سن میں اس عہد کے بڑے اساتذہ موجود تھے جن میں مولانا صفی لکھنوی اور عزیز لکھنوی نمایاں تھے۔ آپ کے قصیدے کی بڑی تعریف ہوئی اور مذکورہ استادان فن نے کہا کہ "ہم نے اس محفل میں تقریباً بیس سال تک قصیدہ خوانی کی ہے اب آپ (نجم آفندی) کے لئے یہ مسند حاضر ہے"۔ ۱۹۳۵ء میں آپ کی طویل نظم دارلادت اکبر آباد رسالہ شاعر آگرہ میں چھپی تھی جو لائق مطالعہ ہے۔ آپ نے ہر صنف سخن میں کامیاب اور منفرد انداز کی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کو ہر صنف شعر میں کمال دسترس حاصل تھی۔ آپ کی ہندی شاعری بھی بے مثل ہے۔ تیرہ سو سالہ یادگار حسینی (۱۳۶۱ھ) کی بین الاقوامی تقاریب کے سلسلے میں آگرہ میں بہت بڑا جلسہ ہوا تھا اور بڑا مسالمہ منعقد ہوا تھا جس کی صدارت خواجہ حسن نظامی نے کی تھی اس میں آپ نے مخصوص طویل نظم "کربل نگری" پڑھی تھی۔ جو بے حد پسند کی گئی۔ آپ کی رباعیات، عزائیہ نظمیں، سلام، نوحے اور مراثی میں آپ کے منفرد لب ولہجے کی بھرپور نمائندگی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اس صدی کے بہت بڑے شاعر اور باکمال استاد فن تھے۔ آپ کی فکر اور اسلوب کی چھاپ اس دور کی شاعری پر نہایت واضح اور گہری ہے۔

آپ کے معنوی شاگرد تو سینکڑوں شعراء ہیں لیکن جنہوں نے آپ سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل کیا ان میں رعنا اکبر آبادی، رزم ردولوی، مضطر حیدری اور زیبا ردولوی نمایاں تھے۔

آپ ۱۹۷۱ء میں حیدر آباد دکن سے پاکستان تشریف لے آئے اور فیڈرل بی ایریا کراچی میں اپنے داماد کے ہاں سکونت اختیار فرمائی۔ آپ نے ایسی ضعیفی العمری اور خرابی صحت کے باوجود گولی مار (گلبہار) اور رضویہ سوسائٹی کے امام باڑوں میں محافل مقاصدہ میں خصوصی شرکت فرمائی اور صدارت کی۔ آپ نے ۲۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور جوار

آئمہ میں پہنچ گئے۔ آپ کو بڑی کسمپرسی اور عالم غربت میں دفن کر دیا گیا۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات سب گونگے ہوگئے ار کسی نے آپ کی وفات کی خبر نہ دی ۔ آپ کی آخری رسومات میں فقط چند لوگ ہی شریک ہوئے۔ علامہ طالب جوہری نے انجم میں درست لکھا کہ " ان کی تشیع جنازہ میں معدودے چند لوگوں نے شرکت کی ۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ قوم مرچکی ہے اور مردوں سے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوتی ۔ " ہمیں کراچی میں موجود اہل اکبرآباد سے ضرور شکوہ ہے کہ انہوں نے شدید بے حسی اور احسان ناشناسی کا مظاہرہ کیا۔ یہ مانا کہ ان کے داماد نے رضویہ امام باڑہ میں اعلان کروایا تاہم یہ دن تعطیل کا روز تھا اور لوگ اپنے اپنے کاموں کے ضمن میں گھروں سے باہر تھے۔ اس لئے بھاری اکثریت کو قطعی خبر ہی نہ ہو سکی کہ ملت کا بطل عظیم دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ ذرائع ابلاغ نے کوئی خبر نشر کی نہ شائع کی ۔ تاہم دفن کے بعد کی رسومات یعنی سوئم اور چہلم کی بابت بھی خاموشی رہی اور کسی کو سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ ان مجالس ترحیم کا مناسب اہتمام کیا جاتا۔ کسی مذہبی اور ادبی ادارے نے کسی مذاکرے کا بندوبست بھی نہ کیا کہ ان کی قابل تقلید زندگی اور ناقابل فراموش ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی جاتی ۔ سید العلماء علامہ سید علی نقی قبلہ مرحوم نے حاجی سید علی متقی جعفری کے امام باڑہ کی ایک مجلس میں ملت کی بے حسی کا شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ " حضرت نجم آفندی کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے " مجلہ انجم شائع کر کے جناب باقر زیدی اور جناب ضمیر اختر نقوی نے کسی حد تک اس سنگین کوتاہی کی تلافی کی ہے جو ملت جعفریہ پاکستان سے سرزد ہوئی ہے۔

علامہ نجم آفندی کی شاعرانہ عظمت و حیثیت پر معاصرین کے تبصرے (اخذ کردہ انجم) میں چند یہ تھے۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے لکھا کہ " میں ان

کی شاعری کا لوہا مانتا تھا۔ میرے نزدیک منقبت اور مرثیے میں انہیں وہ بلند مقام حاصل تھا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ان کی موت نے اردو زبان کو ویران کر کے رکھ دیا ہے اور یہ نقصان اس قدر عظیم ہے جس کی تلافی نہیں کی جاسکتی۔" مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے تحریر کیا کہ " وہ نوحہ گوئی کے منفرد رہنما تھے۔ لوگ ان کے اسلوب میں نوحے لکھنے لگے مگر ان کی بڑائی تک کوئی نہ پہنچ سکا۔" جناب صبا اکبر آبادی نے لکھا کہ " حضرت نجم آفندی کا شمار شیعہ طبقے کے ان مشاہیر شعراء میں تھا جن کے کلام نے بڑا تبلیغی کام انجام دیا ہے۔ انہوں نے اپنی تمام شاعرانہ صلاحیتیں، مناقب، مصائبِ اہلبیتؑ کیلئے وقف کردی تھیں ورنہ وہ دورِ جدید کے ایسے بہت سے نام آور شعراء سے جو صفِ اول کے غزل گو شمار ہوتے ہیں بہت بڑے شاعر تھے۔ اتنے بڑے کہ ان کے پایۂ کمال تک پہنچنے کے لئے بڑے مراحل طے کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی موت اردو ادب کے ایک درخشندہ ستارے کا غروب ہے۔" جناب نسیم امروہوی نے اپنے منظوم تاثرات میں کہا کہ " وہ تمام اصنافِ سخن میں موجد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جوش، آلِ رضا اور خود نسیم امروہوی میں کوئی بھی ان کا ادبی سہیم نہیں ہوسکتا۔" علامہ ابن حسن نجفی نے کہا کہ " جذبۂ غم کے روح پرور ترجمان اور تہذیبِ مودت کے شیوہ بیان شاعر تقریباً آدھی صدی تک ہمارے دل ودماغ پر چھائے رہے۔ نجم بہت بڑے انسان، عظیم مفکر اور ہماری صدی کے ممتاز اور منفرد سخن طراز تھے۔ انہوں نے ادب کا جو بیش بہا ذخیرہ مہیا کیا ہے اس میں اتنی تاب وتوانائی ہے کہ صدیوں تک انسانی شعور کی ہدایت کرتا رہے گا۔" علامہ طالب جوہری نے تحریر کیا کہ " حضرت نجم نصف صدی تک اردو کے رثائی ادب پر حکومت کرتے رہے۔ نسلِ نو کا ایسا کوئی مرثیہ نگار نہیں جو ان سے متاثر نہ ہوا ہو۔" حضرت صبا اکبر آبادی نے لکھا کہ " حضرت نجم آفندی میدانِ غزل کے بھی

بہت بڑے شہ سوار ہوتے اگر انہوں نے خود کو مناقب ومصائب اہلبیتؑ کے لئے وقف نہ کر دیا ہوتا۔" ڈاکٹر ہلال نقوی کے منظوم تاثرات کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

جب بھی چھڑ جائے گا ذکر جدت شعر و پیام
آئے گا لب پر ہمیشہ نجم آفندی کا نام

آپ کی ایک درجن سے زائد تصانیف چھپ چکی ہیں۔ان میں قصائد نجم، تہذیب مودت، رثائی ادب میں متعدد مجموعہ ہائے سلام ونوحہ جات اور معراج فکر اور فتح مبین جیسے مرثیے شامل ہیں۔آپ نے سینکڑوں غزلیں بھی کہیں تھیں جو شائع نہ ہو سکیں اور اکثر معیاری غزلیں معاصروں نے اپنے نام سے چھپوائیں۔آپ کے ہمہ جہت کلام کے چند نمونے ہم نے آگرہ ونواح آگرہ کا دبستان شاعری میں پیش کئے ہیں۔

۳۰) جناب مخمور اکبرآبادی

سید محمد محمود رضوی مخمور سادات شاہ گنج آگرہ کے سید محمد علی منصرم کے فرزند تھے اور ہیلک کے تھوک ڈوکر کی نسل میں تھے۔آپ قیام پاکستان سے قبل کے عہد اور بیسویں صدی کے پہلی پچیس سالہ دور کے دوران اکبر آباد کے بڑے ادیب وشاعر اور اہل قلم میں ممتاز تھے۔آپ مشہور وموقر ماہنامہ نگار کے بانیوں میں اور علامہ نیاز فتح پوری کے اہم ساتھیوں میں تھے۔ تقسیم برصغیر کے بعد آپ ڈھاکہ، خیرپور اور کراچی میں مقیم رہے۔جناح کالج کراچی میں اردو کے پروفیسر اور ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں افسر اعلیٰ رہے۔ آپ پرانے زمانے کے ایم اے، ایل ایل بی تھے۔ڈھاکہ میں دوران قیام آپ نے متعدد نظمیں لکھیں جن کا مرکزی خیال بین الصوبائی اتحاد تھا۔یہ مجموعہ نظم: مشرق تاباں" کے نام سے ۱۹۶۷ء میں چھپ چکا ہے۔جس کا مقدمہ جناب جلیل قدوائی نے لکھا ہے۔آپ کی مشہور تصانیف اور نظیر نامہ

ہیں جو بالترتیب ۱۹۲۲ء اور ۱۹۷۷ء میں آگرہ و کراچی سے شائع ہوئی ہیں۔ آپ نے ۱۹۷۶ء میں انتقال کیا۔ آپ کا شمار مشاہیر اہل قلم میں ہوا ہے۔ آپ کا تذکرہ مشاہیر اکبر آباد اور دیگر کتابوں میں ملتا ہے۔

۳۱) ڈاکٹر سید علی جان

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے میر تراب علی ڈپٹی کلکٹر کے نامور فرزند تھے جو سائنس میں پی ایچ ڈی تھے۔ آپ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے عہد کے مسلمان سائنس دانوں کے سرخیل تھے۔ آپ ایٹمی تھیوری کے اولین موجدوں میں تھے۔ جرمنی کے ممتاز سائنس دانوں سے آپ کی خط و کتابت تھی حکومت جرمنی نے آپ کو برلن میں ایٹمی تجربہ گاہ قائم کرنے کی پیشکش کی تھی مگر جنگ عظیم اول کے حالات کے تحت یہ ممکن نہ ہوسکا کہ اس وقت ہندوستان برطانیہ کے زیر نگیں تھا اور آپ آگرہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ یہ بات آپ کے فرزند میجر سید حسین جان رضوی مقیم ملتان نے اپنے ایک خط بنام سید حسن مثنیٰ میں لکھی ہے۔ آپ نے ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ آپ کا برصغیر کے ممتاز سائنس دانوں میں شمار ہوتا ہے۔

۳۲) خان بہادر سید آل نبی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید صاحب علی کے پوتے اور سید صادق حسین بن میر نیاز علی رضوی کے نامور فرزند تھے۔ آپ برصغیر کی ممتاز سیاسی قانونی اور سماجی شخصیت تھے۔ ۱۹۰۶ء میں آپ نے ڈھاکہ مسلم لیگ کے اجلاس میں خصوصی شرکت کی تھی اور اس کے بانیوں میں شمار ہوئے۔ اس وقت سے ۱۹۲۷ء میں اپنی اچانک وفات تک آپ مسلم لیگ مجلس عاملہ و کونسل کے مسلسل رکن رہے۔ آپ قائد اعظم کے پرانے اور ممتاز ساتھیوں میں تھے۔ ۱۹۱۰ء میں پریس ایکٹ کے خلاف آپ کی پہلی آواز احتجاج

بلند ہوئی تھی ۔ آپ عرصہ دراز تک میونسپلٹی آگرہ کے چیئرمین مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹی اور کونسل آف اسٹیٹ کے رکن رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی شاید ہی کوئی قرارداد ایسی ہو جس کے آپ محرک یا موئید نہ ہوں۔ ترک موالات کی تحریک میں آپ نے خان بہادر کا خطاب واپس کردیا تھا اور خطاب لوٹا دینے والے مسلم زعماء میں آپ منفرد تھے۔ آپ کے تذکرے سے مسلم لیگ کی تاریخ مزین ہے سیاسی مبصرین کی رائے ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو قائد اعظم محمد علی جناح کے جانشین ہوتے آپ نے ۱۹۱۰ء میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز احتجاج بلند کی تھی اور اس وقت یہ آواز منفرد تھی ۔ آپ برصغیر کے مسلمانوں کے عظیم سیاسی، قانونی اور سماجی رہنما تھے۔ سر محمد یامین اور جناب ریاض الدین احمد نے آپ کو بیسویں صدی کے نصف اول کا نہایت اہم سیاسی لیڈر اور آگرہ کا کوہ نور قرار دیا ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے لکھا کہ "آنریبل سید آل نبی سادات شاہ گنج آگرہ کے ممتاز فرد تھے۔ آپ آگرہ میونسپلٹی کے طویل مدت تک چیئرمین رہے آپ خواجہ غلام الثقلین کے بعد کونسل آف اسٹیٹ کے رکن مقرر ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹیوں میں آپ کا نام شامل تھا۔ سیاست میں آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ آپ نے تحریک خلافت اور ترک موالات میں بھی حصہ لیا اور خان بہادر کا خطاب لوٹا دیا تھا۔ آپ کی خدمات جلیلہ کے صلے میں ایک سڑک کا نام آل نبی روڈ رکھا گیا جو تبدیل شدہ سیاسی حالات کے باوجود اب تک اسی نام سے منسوب ہے۔" آپ نے ۳۰ نومبر ۱۹۲۷ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے یکایک وفات پائی ۔ آپ شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے ممتاز ترین سیاسی اور قانونی رہنما قرار پائے۔ فاونڈیشن آف پاکستان شاہراہ پاکستان تاریخ مسلم لیگ اور دیگر کتابوں میں آپ کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔

۳۳) جناب خان بہادر سید ابو محمد

آپ سادات پہرسر (بھرتپور) کے سید علی نقی جعفری ڈپٹی کلکٹر کے فرزند تھے جنہوں نے شہید ثالث مدفون آگرہ کے مزار مبارک کی تعمیر نو میں خصوصی کردار ادا کیا تھا۔ آپ بیسویں صدی عیسوی کی پہلی نصف صدی کے عہد کے کلکٹر (ڈپٹی کمشنر) تھے۔ جب یہ منصب ہندوستانیوں کے لئے شجر ممنوعہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو یوپی (موجودہ اترپردیش) میں صوبائی پبلک سروس کمیشن کا رکن مقرر کیا گیا۔ آپ انجمن پنجتنی آگرہ کے سرپرست اعلیٰ بھی تھے اور فروغ عزاداری میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ علامہ سید فتح اللہ شیرازی کی نسل میں تھے۔ آپ نے ۱۹۳۶ء میں آگرہ میں انتقال کیا۔

۳۴) بیرسٹر سید حسن عابد جعفری

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید زین العابدین کے فرزند تھے جو صدر اعلیٰ کے اعلیٰ منصب دار تھے۔ آپ ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں کراچی میں وفات پائی۔ آپ اس دور کے نامور بیرسٹر تھے۔ آپ قانونی، سیاسی اور ادبی اعتبار سے نہایت ممتاز فرد تھے۔ آپ نے تحریک خلافت میں حصہ لیا تھا اور اپنے خرچ پر طبی وفد کے ہمراہ ترکی تشریف لے گئے تھے۔ آپ علامہ نیاز فتح پوری کے ساتھیوں اور رسالہ نگار کے بانیوں میں تھے۔ آپ نے خود رسالہ شمع نکالا تھا جو مدت تک برصغیر کا موقر ماہنامہ قرار پایا۔ آپ نے کئی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے بھی کئے ان میں نمایاں ترین حضرت علیؑ کی نہج البلاغہ تھی جو آپ کے نام سے نہ شائع ہو سکی۔

۳۵) جناب سید جعفر حسین بیرسٹر (لندنیہ)

آپ سادات پہرسر (بھرتپور) کے سید غلام حسین جعفری ڈپٹی کلکٹر کے نامور فرزند تھے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں آپ ممتاز قانون دان اور انتظامی ماہر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں آپ طویل عرصہ تک لندن میں مقیم رہے جہاں آپ نے ملکہ انگلستان (ملکہ وکٹوریہ) کو فارسی کی تعلیم دی تھی۔ آپ ریاست جے پور میں وزیر بھی رہے اور شہر جیپور کی جدید منصوبہ بندی کی تھی۔ آپ مصنف بھی تھے اور سلطان محمد غوری پر کتاب لکھی تھی۔ آپ کا انتقال غالباً بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں ہوا۔

۳۶) خانصاحب سید حیدر کرار

آپ سادات آگرہ و بھرتپور کے ممتاز فرد تھے اور پہرسر کے سید مہدی حسن جعفری کی اولاد میں تھے۔ جو ریاست بلرام پور میں ملازم تھے جہاں سید محمد حسن بن میر ضامن علی رضوی نائب دیوان تھے۔ اسی مقام پر سید حیدر کرار جعفری ۱۵ نومبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ انجمن وظیفہ سادات و مومنین کے خصوصی نمبر ۱۹۳۹ء کی رو سے • آپ آگرہ کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے بے اے علی گڑھ کالج سے اواخر انیسویں صدی میں کیا۔ آپ نے اکاونٹس اور کامرس کے امتحانات بمبئی سے پاس کئے۔ ریاست بلرام پور میں اسسٹنٹ مینجر (نائب دیوان) کے عہدے پر فائز ہوئے (یہ عہدہ آپ کو سید محمد حسن بن میر ضامن علی رضوی کی وفات کے بعد ملا تھا جو سادات شاہ گنج آگرہ کے ایک ممتاز فرد تھے جنہوں نے شہید ثالث کے مزار کی ازسر نو تعمیر مہ ، خصوصی دلچسپی لی تھی) آپ بلرام پور میونسپل بورڈ کے چیرمین اور بلرام

پور میں طویل عرصہ تک آنرری مجسٹریٹ بھی رہے۔ آپ مرکزی شیعہ کانفرنس کے رکن اور شیعہ کالج لکھنؤ کے ٹرسٹی رہے۔ ۱۹۱۱ء میں تاجپوشی بادشاہ انگلستان کے موقع پر آپ کو تمغہ خدمت ملا تھا اور ۱۹۳۵ء میں خانصاحب کا خطاب عطا ہوا تھا۔ بلرام پور میں آپ اور آپ کے خاندان کو بڑی اہمیت وعزت حاصل رہی ہے۔

آپ کے بھائی جناب سید جعفر طیار کی اولاد بھی یہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہی ہے۔ ان میں کئی سیاست و ادب میں ممتاز ہیں۔ ان میں علی سردار جعفری، علی جرار جعفری اور علی ابرار جعفری نمایاں ترین افراد ہیں۔

۳۷) میر مومن علی

آپ شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر سے قبل کے ممتاز فرد تھے۔ آپ کی پرورش وتربیت میر تراب علی ڈپٹی کلکٹر نے کی تھی اور اڑکی سے انجینیرنگ کی سند دلوائی تھی۔ آپ اپنے عہد کے نامور انجینئر ہوئے اور ریلوے میں ڈپٹی چیف انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ صاحب جائیداد و ثروت تھے۔ آپ نے اپنی حویلی کے اندر خوبصورت عزاخانہ بنوایا تھا جہاں مجالس کی خصوصیت پابندی وقت تھی۔ آپ کو پابندی وقت کا بے حد خیال تھا۔ مشہور روایت ہے کہ آپ نے ایک دعوت میں تاخیر سے پہنچنے پر کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو واپس کر دیا تھا۔ آپ کی اولاد میں خورشید حسنین ہوئے جو ریلوے میں انجینئر تھے اور شاہ گنج آگرہ کے ممتاز عزادار بھی تھے۔

۳۸) میر محسن علی رضوی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے میر نیاز علی ڈپٹی کلکٹر کے نامور فرزند تھے۔ آپ خود بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آپ ڈھیوڑیوں (ایک بہت بڑی قلعہ نما حویلی

میں عدالت کیا کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ کمشنر آگرہ کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے اور مہاراجہ گوالیار اتر رہا تھا کہ اس کے کندھے سے آپ کا کندھا مس ہوگیا جس پر اس نے سخت لہجہ میں کہا کہ محسن علی دیکھ کر چلا کرو تمہاری ڈپٹی کلکٹر ذرا سی دیر میں تہس نہس ہو جائے گی۔ اس پر آپ نے فقط "ہوں" کہا لیکن چند گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ مہاراجہ گوالیار کو وائسرائے ہند کا تار ملا کہ تم نے محسن علی سے بدتمیزی کی ہے تم اپنی توپوں میں دو توپوں کی کمی کراؤ۔" آپ بڑے متقدر تھے اور شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر سے قبل کے ان لوگوں میں نمایاں تھے جن سے شاہ گنج کی آبرو باقی تھی۔

۳۹) جناب سید محمد یونس نقوی

آپ اول ضلع متھرا کے سادات نقوی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد سید جعفر حسین نقوی ممتاز افراد میں تھے۔ آپ کی اعلیٰ تعلیم آگرے میں ہوئی تھی اور کافی عرصہ تک آپ شاہ گنج میں رہے تھے۔ آپ پاکستان ملٹری اکاونٹس میں اعلیٰ عہدیدار اور اعزازی میجر تھے۔ آپ نے پاکستان اور فرانس کے مابین جہازوں کی خریداری کے سودے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ آپ وزارت دفاع میں مشیر بھی رہے۔ آپ ذاکر حسین بھی تھے اور مخصوص انداز کی جدید مجالس پڑھتے تھے۔ آپ نے چند سال ہوئے کراچی میں انتقال کیا۔ آپ کے علی گڑھ کالج کے ہم جماعتیوں اور ایک ہی کمرے کے ساتھیوں میں جناب یحییٰ بھی تھے۔

۴۰) جناب وکیل سید غلام علی احسن

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے ممتاز حضرات میں تھے۔ آپ کے والد سید بنیاد علی تھے جو سید مشرف علی زیدی (مجاہد آزادی ۱۸۵۷ء) کی نسل میں تھے۔ آپ شاہ گنج آگرہ میں ۲۱ جون ۱۸۸۳ء مطابق ۱۵ شعبان ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور کراچی میں انتقال کیا۔ آپ کے بزرگوں کا تعلق سید پورہ کے سادات زیدی سے تھا لیکن غدر ۱۸۵۷ء سے بہت قبل شاہ گنج آگرہ میں آباد تھے اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے باعث سید مشرف علی زیدی کو روپوش ہونا پڑا اور اسی کے نتیجے میں ان کے اخلاف نے زیدی کے بجائے جعفری کہلوانا مناسب سمجھا۔

آپ نے آگرہ کالج میں تعلیم پائی اور ۱۹۱۳ء سے آگرہ ہی میں وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ آپ آگرہ کی سماجی، دینی اور ادبی شخصیات میں نمایاں تھے۔ بزم ادب آگرہ کے سکریٹری رہے۔ تیرہ سو سالہ یادگار حسینی ۱۳۶۱ ہجری میں آپ آگرہ شاخ کے سکریٹری اور سید العلماء علامہ سید علی نقی عرف نقن صاحب کے معتمد رہے۔ آگرہ میں سالانہ مسالمہ کے محرک وروح رواں رہے۔ آپ خود بھی عزادار تھے اور مجالس ومحافل خصوصی کے مہتمم بھی۔ آپ شاعر ومصنف بھی تھے اور متعدد کتابچے لکھے تھے۔ آپ بڑے صاحب جائیداد تھے۔ آپ شیعہ کانفرنس کے رکن اور لکھنؤ شیعہ کالج کے ٹرسٹی رہے۔ نیز آگرہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین بھی رہے۔ کراچی میں اسپیشل مجسٹریٹ رہے۔ آپ کو یہ اعزاز بھی ملا کہ آپ نے قائد اعظم کو دفن کرتے وقت تلقین پڑھی تھی جو امامیہ مذہب میں مردوں کو دفنانے کی ایک نہایت مستند اور اہم روایت رہی ہے۔ آپ مشاہیر اکبرآباد میں سے تھے۔

(۴۱) میجر سید محمود الحسن رضوی

آپ رضوی سادات رارے کے نامور سپوت تھے۔ یہ مقام راجستان میں بیانہ و بھرتپور شہر کے نزدیک واقع تھا۔ ریاست بھرتپور کی بٹالین میں آپ میجر تھے اسی لئے میجر حسن مشہور ہوئے۔ جنگ عظیم ثانی میں برما کے محاذ جنگ پر فوجی خدمات انجام دے چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے قتل عام میں آپ نے ریاست بھرتپور کے سادات و مومنین کے انخلا اور آباد کاری میں خصوصی کردار ادا کیا تھا۔ پاکستان میں پہلی باضابطہ مہاجر کالونی (پیر کالونی) اور گلبہار (گولی مار) کے سو اور چار سو کوارٹرز کی تعمیرات کے محرک اور روح رواں تھے۔ قائد اعظم کی تجہیز وتدفین میں نمایاں خدمات انجام دیں اور تمام بندوبست خود کئے تھے۔ اس کا احوال روزنامہ "تعمیر" کراچی نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۳ء کے شمارے میں لکھا ہے۔ اگست ۱۹۷۳ء کے اردو ڈائجسٹ صفحہ ۲۷ تا ۲۹ پر سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ پیر الہیٰ بخش کا انٹرویو بعنوان ایثاروقربانی کا پیکر چھپا تھا جس میں پیر موصوف نے آپ کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "میں ان (میجر حسن) کی دیوانگی، مستعدی اور دیانتداری کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا مگر اس وقت کے حکمرانوں نے انہیں اپنی راہ کا سنگ گراں سمجھا۔ وہ پاکستان میں آئیڈیل معاشرے کی تشکیل کے متمنی تھے۔ امانت میں خیانت کرنے یا ہونے دینے پر ان کی مستقل مزاجی ان کے لئے بربادی کا سبب بن گئی۔ حکام بالا انتقام پر اتر آئے اور انہیں ڈی پی آر کے تحت گرفتار کرکے قلعہ لاہور کے عقوبت خانے میں کئی سال تک بے حد صعوبتیں دیں۔ جہاں انہوں نے انتقال کیا۔ میجر حسن حکومت پاکستان کے افسر آباد کاری بھی مقرر ہوگئے تھے مگر اپنے منصب اور اختیارات کے باوجود اپنے لئے یا اپنے عزیزوں کے لئے ایک جھونپڑی بھی الاٹ نہ کی۔"

جناب پیر الہیٰ بخش نے مزید فرمایا کہ " میجر حسن بھرتپور اور نواح کے مسلمانوں کے قتل عام کو رکوانے کی غرض سے جولائی ۱۹۴۷ء میں ایک وفد لے کر قائد اعظم کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے تھے نیز دیگر زعماء سے بھی ملے تھے۔ ہمارے علم اور تحقیق میں اس شیعہ وفد کے علاوہ اور کوئی وفد مسلمانوں کے اجتماعی تحفظ کی خاطر قائد اعظم، گاندھی اور نہرو سے نہیں ملا کراچی میں پہلی مہاجر کالونی (پی آئی بی کالونی) کی تعمیر کے سلسلے میں میجر حسن کی ہر ممکن مخالفت کی گئی مگر یہ مرد مجاہد اڑا رہا اور ۲۰ نومبر ۱۹۴۸ء میں اس کالونی کا افتتاح عمل میں آگیا۔ جو صرف اور صرف میجر حسن کی مستقل مزاجی، لگن اور خلوص کے باعث ممکن ہوا۔"

میجر حسن استقامت و بلند حوصلگی کا کوہ بلند تھے۔ ان کی بے لوث خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اور ان کا ذکر آنے والی نسلوں کے لئے رہنمائی کا منارہ نور ثابت ہوتا رہے گا۔ ایسے لوگ کسی بھی قوم یا معاشرے میں خال خال ہی ہوتے ہیں اور اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں تاکہ مستقبل کے قافلے ان سے منزل رسی کی روشنی اور عزم و ہمت حاصل کرتے رہیں۔

۴۲) ڈاکٹر سید ابن حامد رضوی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید محمد ڈپٹی کلکٹر بن سید میر ضامن علی رضوی کے فرزند تھے۔ آپ آگرہ میں جنوری ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے اور مارچ ۱۹۶۹ء میں ڈھاکہ میں عین جوانی میں وفات پائی۔ آپ جیومارفولوجی میں پی ایچ ڈی تھے۔ آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۴۶ء میں فلسفہ میں اور ۱۹۴۸ء میں جغرافیہ کے مذکورہ خصوصی شعبے میں ڈگری لی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں آپ ڈھاکہ یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ نے امریکہ میں اعلیٰ تعلیم مکمل کی اور پی ایچ ڈی کا اعزاز حاصل کیا۔ اس وقت سے اپنے انتقال

تک آپ ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور ڈین آف جغرافیہ رہے۔ آپ بڑے ہونہار تھے لیکن آپ کی بے وقت موت سے جغرافیہ کے ترقی پذیر علم کو شدید دھچکہ لگا۔ ۱۹۶۸ء میں جغرافیہ کانفرنس لاہور میں آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں جغرافیہ کے مختلف خصوصی شعبوں کی کیفیت اور ان کے ارتقائی مراحل پر نہایت عالمانہ خطاب کیا۔ جو جغرافیکل ریویو کے یادگاری مجلے میں شائع ہوئی تھی جو جولائی ۱۹۶۹ء میں آپ کی یاد میں جغرافیکل سوسائٹی آف پاکستان نے نکالا تھا۔ آپ کی بیوی ڈاکٹر نجمہ بھی پی ایچ ڈی تھیں اور جغرافیہ میں اہم مقام رکھتی تھیں۔

۴۳) جناب سید علی مقدس رضوی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید وحید الحسن بن سید احتشام علی رضوی کے فرزند اور سید نجیب علی کی نسل میں ممتاز فرد تھے۔ آپ آگرہ میں جولائی ۱۹۱۲ء میں تولد ہوئے۔ آپ آگرہ یونیورسٹی کے ڈبل ایم اے تھے۔ تعلیمی عہد میں آپ کالج کے ادبی عہدوں پر فائز رہے اور آگرہ کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ آپ آگرہ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز بھی رہے۔ نیز ۱۹۳۶ء میں سینٹ پیٹرس کالج آگرہ میں لیکچرار بھی۔ آپ انجمن مہدوجہ آگرہ کے صدر بھی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی کے ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ آپ کی دینی اور سماجی خدمات بھی نمایاں تھیں۔ آپ امام باڑہ شاہ نجف مارٹن روڈ کے بانیوں اور ابتدائی معماروں میں تھے۔ آپ رضویہ سوسائٹی کراچی کے پہلے جنرل سکریٹری ہوئے۔ جس نے امام باڑہ شاہ کربلا تعمیر کیا۔ آپ کو عزاداری سے گہرا لگاؤ تھا۔ آپ شاعر و مصنف بھی تھے اور سہل ترین الفاظ میں شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ آپ کے سلاموں اور

نوحوں کا مجموعہ بنام " بیاض مقدس " حال ہی میں دوبارہ شائع ہوا ہے۔ آپ کے بیٹوں نے آپ کے نام پر ناظم آباد چورنگی نمبر 1 کے نزدیک مقدس آرکیڈ تعمیر کروایا ہے۔ آپ کے فرزندوں میں سید ابراہیم حیدر عرف ابراہیم نفیس اور سید فرقان حیدر فلم اور ڈرامہ انڈسٹری سے وابستہ ہیں جب کہ سید رضوان حیدر اور سید عرفان حیدر سعودی عرب میں برسرکار ہیں جہاں وہ اہم دینی اور سماجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کے چند نمونے ہم نے دبستان اکبرآباد میں پیش کئے ہیں۔

۴۴) جناب سید رضا رضوی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید رضا حیدر تحصیلدار کے بیٹے تھے۔ آپ آگرہ میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے اور کراچی میں ۱۹۸۶ء میں وفات پائی ۔ آپ کئی بار حج وزیارات سے مشرف ہوئے۔ آپ کو کتب بینی اور کتابوں کو جمع کرنے کا بڑا شغف تھا۔ آپ کی ذاتی لائبریری میں دس ہزار سے زائد کتابیں تھیں جن کو اپنے انتقال سے قبل آپ نے جامعہ امامیہ ناظم آباد کراچی کے کتب خانے کو عطیہ میں دے دیا۔ کراچی میں پہلی پوسٹل نمائش میں آپ کو ٹکٹ اور لفافے جمع کرنے پر اول انعام ملا تھا۔ آپ آگرہ میں سماجی سرگرمیوں اور مسلم لیگ کی حمایت میں راقم السطور (انتظار رضوی) کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ آپ ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ کلرک تھے۔ اگرچہ آپ کسی بڑی ڈگری کے حامل نہ تھے تاہم علمی ذوق رکھتے تھے اور زمرہ دانشوراں میں شمار ہوئے۔

۴۵) جناب سید محمد منتظر رضوی راز اکبر آبادی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید افتخار حسن رضوی بن سید کلب حسن کے بڑے فرزند تھے۔ آپ آگرہ میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے اور ایک آپریشن کے نتیجہ میں کراچی میں ۲۲ ستمبر ۱۹۵۴ء کو وفات پائی۔ آپ ڈبل ایم اے تھے قیام پاکستان کے ابتدائی دور میں ریڈیو پاکستان میں مترجم فارسی کے منصب پر فائز تھے۔ آپ شاعر وادیب اور مصنف ودانشور تھے۔ آپ نے پاکستان کے موقر اخبارات ورسائل میں مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ اگر آپ زندہ رہتے تو یقیناً ایک بڑے ادیب ہوتے۔ آپ نے غزل، نظم اور سلام کافی تعداد میں کہے مگر سرمایہ ادب محفوظ نہ رہ سکا۔ آپ کی شاعری کے بعض نمونے دبستان اکبر آباد کے باب میں پیش کئے گئے ہیں۔ آپ شاہ گنج آگرہ کے بزرگ شاعر جناب آغام محمد جواد کے شاگرد تھے۔

۴۶) ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی

آپ سادات آگرہ و نواح آگرہ (شاہ گنج آگرہ اور پہر سر ریاست بھرتپور کے ممتاز افراد میں تھے۔ آپ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے اور کراچی میں ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔ آپ کے والد سید مہدی حسن تھے۔ آپ ۱۹۲۶ء میں اپنے طبی پیشہ سے وابستہ ہوئے اور لوہا منڈی آگرہ کے اسپتال کے ڈاکٹر انچارج رہے۔ آپ نہایت کامیاب معالج کی شہرت کے حامل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں تیرہ سو سالہ یادگار حسینی میں آپ نے اہم حصہ لیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں پولیس سرجن اور سینٹرل جیل کراچی کے میڈیکل آفیسر مقرر ہوئے۔ سینٹرل جیل میں آپ نے مجلس ومیلاد کا اہتمام کیا جو اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔ آپ کی وفات پر جناب رعنا اکبر آبادی، جناب صبا اکبر آبادی، جناب ضیا الحسن

موسوی اور جناب رئیس امروہوی نے منظوم پیغامات لکھے۔ آپ کا خصوصی ذکر مفتی انتظام اللہ شہابی نے مشاہیر اکبرآباد میں بھی کیا ہے۔

۴۷) جناب سید عظیم الحسن اکبرآبادی

آپ برصغیر کے نامور سوزخواں تھے۔ آپ کے والد سید ریاض علی بھی اکبرآباد کے ممتاز سوزخواں تھے۔ جن کے مکان پر محرم میں چاندی سونے کے علم اور تعزیے رکھے جاتے تھے۔ آپ نے کراچی میں ۱۹۸۲ء میں انتقال کلیا۔ آپ کی آواز نہایت دلکش. سریلی اور پرسوز تھی۔ آپ کے بعد آپ جیسا سوزخواں پیدا نہ ہوا۔ یہ جگہ تاحال خالی ہے۔ آپ کی تعریب کرنے والوں اور خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں پروفیسر کرار حسین، حضرت نسیم امروہوی اور جناب عقیل تراب ممتاز تھے۔ اول الذکر نے لکھا کہ " ان کی عظیم الحسن سے دوستی ۱۹۳۱ء سے تھی جب وہ (کرار حسین) آگرہ میں زیر تعلیم تھے۔ عظیم الحسن فن سوزخوانی میں ماہر تھے اور یہ ان کا موروثی فن تھا۔

۴۸) خانصاحب نواب سید اطہر حسین

آپ رضوی سادات شاہ گنج آگرہ کے نواب سید شبر حسین کے بڑے فرزند تھے اور شاہ گنج کے عہد آخر کے ممتاز افراد میں شامل تھے۔ آپ آگرے میں اعزازی مجسٹریٹ اور میونسپلٹی کے وائس چیئرمین رہے۔ جیسا کہ مشاہیر اکبرآباد مولفہ مفتی انتظام اللہ شہابی میں درج ہے۔ آپ نے نواب شبر حسین کی عزاداری کو برقرار رکھا اور محرم کی مجالس کے انعقاد میں دلچسپی لی۔ آپ آگرے کے سیاسی افراد میں نمایاں تھے اور ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء کی سیاسی کشمکش میں محتاط روش پہ گامزن تھے۔ راقم السطور کے والد کے گہرے دوستوں میں تھے۔ آپ کی کوٹھی پر سیاسی شخصیتوں کا بڑا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

نواب سر محمد یامین آگرے میں ان ہی کے مہمان ہوا کرتے تھے جیسا کہ انہوں نے اعمال نامہ میں لکھا ہے آپ ملنسار اور متواضع تھے۔ آپ پاکستان تشریف نہیں لائے تھے لیکن آپ مختصر قیام کے لئے آئے ہوئے تھے جب غالباً ۱۹۶۲ء میں آپ نے کراچی میں وفات پائی۔

آپ کے بھائی خانصاحب سید یونس رضا آگرے میں خصوصی مجسٹریٹ تھے۔ آپ پاکستان آ گئے تھے اور حیدر آباد سندھ میں بس گئے تھے جہاں آپ نے کچھ عرصہ قبل انتقال کیا۔

۴۹) جناب ڈاکٹر سید علی اوسط رضوی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے ماسٹر سید محسن رضا رضوی عرف جمعہ کے فرزند تھے۔ آپ کی ولادت ۱۹۰۲ء میں آگرہ میں ہوئی اور وفات کراچی میں ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ آپ کی شخصیت پہلودار تھی۔ آپ ایسٹ انڈیا ریلوے میں انسپکٹر واچ اینڈ وارڈ تھے۔ آپ کو وائسرائے کمیشنڈ آفیسر کا اعزاز حاصل تھا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور اور کراچی میں خصوصی انسپکٹر ریلوے واچ اینڈ وارڈ رہے۔ اپنے قیام لاہور کے دوران مغلپورہ میں مسجد امامیہ کی بناد ڈالی۔ کراچی میں انجمن جعفریہ گلبہار کے صدر رہے۔

آپ ممتاز سوزخوان و نوحہ خوان تھے آپ کا ذکر پروفیسر سبط جعفر زیدی نے اپنے مضمون مطبوعہ جنگ کراچی میں کیا ہے۔ کراچی میں اولین جلوس محرم ۱۹۴۸ء میں آپ نے مخصوص انداز میں نوحہ خوانی کی تھی جس کو " صدا " کا مخصوص نام دیا گیا اور اس ضمن میں آپ موجد قرار پائے۔ آپ خود بھی عزادار تھے اور گلبہار کراچی میں اپنے مکان میں عزاداری کرتے تھے جو اب تک باقی ہے۔ آپ انتہائی دیانت دار، مخلص اور وضع دار انسان تھے۔

آپ ہومیوپیتھی کے بڑے معالج بھی تھے اور اس فن طب میں ماہرانہ حیثیت کے حامل تھے۔ اپ بہ سلسلہ ملازمت جس شہر میں بھی تعینات ہوئے

وہاں حسینیت کی تبلیغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۵۰) جناب الحاج سید اسرار حسن رضوی

آپ سادات شاہ گنج آگرہ کے سید مثنیٰ حسن بن سید حسن علی کے فرزند اور خاندان میر اکبر علی رسالدار (اکبر جام) کے اہم فرد ہیں۔ آپ آگرہ میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ آگرہ کالج سے بی ایس سی کیا آپ کالج سے یہ ڈگری حاصل کرنے والوں میں اولین فرد تھے جن کو یہ سند جاری ہوئی تھی۔ انڈیا کے محکمہ موسمیات میں ملازم ہوئے اور پاکستان میں سینئر میٹرولوجسٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

آپ صاحب جائیداد ہیں اور بڑے خوشحال لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ دیندار اور پابند شریعت ہیں۔ دینی اور سماجی امور میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں اور مستحق لوگوں کی خفیہ مدد بھی کرتے ہیں۔ آپ نے نارتھ کراچی میں اپنے ذاتی سرمائے سے حال ہی میں ایک عالیشان مسجد بنوائی ہے جس کا نام مسجد ولی العصر ہے۔ اس سے قبل بھی اس علاقے میں ایک مسجد کی تعمیر شروائی کروائی تھی جو مکمل ہونے سے قبل ہی مفسدوں کی ریشہ دوانیوں کی نذر ہوگئی اور اس میں لگائی ہوئی ساری رقم دوسرے مفاد پرستوں کے ذاتی اور گروہی مفادات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ آپ نے گلبہار کراچی کے امام باڑہ جعفریہ کے احاطے کے اندر ایک مدرسہ کے لئے دو کمرے تعمیر کروائے ہیں نیز عزاخانہ جعفریہ گولی مار کو ایک خوبصورت ضریح عطیہ میں دی ہے۔ اس لئے اگر آپ کو میر اکبر علی ثانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

۵۱) جناب اقبال حیدر بیرسٹر

آپ شاہ گنج آگرہ کے شیخ حیدر حسین عرف حیدر پاشا یا بن منشی کاظم حسین کے نامور بیٹے ہیں۔ آپ آگرہ میں پیدا ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد کراچی اور

انگلستان میں تعلیم پائی - آپ پاکستان پیپلز پارٹی کے اہم رکن ہیں اور اس کی طرف سے سینٹ کے ممبر ہیں آپ فیڈرل گورنمنٹ کے وزیر قانون بھی رہے ہیں۔

۵۲) جناب سید علی متقی جعفری

آپ سادات پہر سر ریاست بھرتپور کے ممتاز فرد تھے۔ سی پی انڈیا میں شیشن جج رہے۔ ملی اور مذہبی معاملات میں بڑے فعال تھے۔ تیرہ سو سالہ یادگار حسینی (۱۹۴۲ء) میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں کسٹوڈین اور افسر بحالیات رہے۔

آپ نے ۱۹۵۰ء کے زمانے میں کراچی میں آباد آگرہ و بھرتپور کے سادات کو منظم کرنے کی کوشش بھی کی اور گلبہار کراچی میں ایک مدرسہ قائم کیا جہاں مفت تعلیم کا بندوبست تھا۔ اس کے کارکنوں میں سید شبر مہدی جعفری، سید شمس العباد اور سید انتظار رضا رضوی نمایاں تھے۔ لیکن اہل برادری نے تعاون نہ کیا اور ایک مفسد گروہ نے اس کی راہ میں سنگین رکاوٹیں کھڑی کر کے اس کا راستہ روک دیا۔ آپ نے محرم ۱۹۷۲ء کو کراچی میں وفات پائی - عزاداری سے گہری وابستگی تھی - آپ خود بھی بڑے عزادار تھے اور اپنی کوٹھی واقعہ آمل کالونی نزد محفل شاہ خراسان میں عزاداری بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ محرم کی مجالس جو علی الصباح ہوتی تھیں میں سید العلماء علامہ سید علی نقی عرف نقن ذاکری فرمایا کرتے تھے۔ اب یہ سلسلہ آپ کے فرزند جناب سید نجم الحسن برقرار رکھے ہوئے ہیں اور عشرہ محرم کی مجالس کی خطاب برصغیر کے مختلف نامور ذاکرین کرتے ہیں ان میں علامہ نجم آفندی کے فرزند علامہ سہیل آفندی، پروفیسر سید موسیٰ رضا آف پٹنہ وغیرہ ممتاز ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل آپ مسلم لیگ کے کارکنوں میں نمایاں تھے جس کا ذکر جناب لقا علی حیدری نے اپنی کتاب سرگزشت میں کیا ہے۔

۵۳) جناب سید محمود الحسن رضوی

آپ سادات آگرہ و نواح (فتح پور سیکری) کے ماسٹر سید منظور الحسن رضوی کے نامور فرزند تھے جن کو ۱۹۸۲ء کے شیعہ کش فسادات کے دوران گلبہار (گولی مار) کراچی میں شہید کر دیا گیا تھا۔ سید محمود الحسن رضوی شاہ گنج آگرہ میں ۳، اگست ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے اور کراچی میں ۲۳ نومبر ۱۹۹۶ء کو یکایک انتقال کر گئے۔ آپ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے ایسا لگتا ہے کہ نیند کی حالت میں دل کا دورہ پڑا اور آپ کی عارضی نیند دائمی نیند میں بدل گئی۔

آپ کی تعلیم و تربیت شاہ گنج آگرہ میں ہوئی جو برصغیر کا نہات اہم معتبر اور ممتاز مرکز سادات تھا۔ تقسیم ہند کے باعث آپ پاکستان آگئے اور گولیمار (گلبہار) کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہ ملک کی پہلی مہاجر بستی قرار پائی جس نے کراچی میں قیام و فروغ عزاداری، جدید مرثیہ گوئی اور سوزخوانی و تحت لفظ مرثیہ خوانی میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔یہاں آگرہ و نواح آگرہ کے سادات و مومنین کی بڑی آبادی ظہور میں آئی۔ اسی جگہ سے مرحوم نے اپنی سماجی اور دینی سرگرمیوں کی ابتداء کی۔ آپ نے ہر ملی تحریک کو تقویت بخشی۔ تحریک جعفریہ پاکستان کے آپ بڑے سرگرم اور ایسے لیڈر رہے جس کی غلط روش پر آپ سخت تنقید بھی کرتے رہے۔ آپ فرد واحد نہ تھے بلکہ ایک انجمن اور ادارہ تھے۔ آپ کے مکان واقعہ انچولی سادات کالونی بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا میں ہر جمعہ کو ۳ بجے سہ پہر سے رات ایک بجے تک علماء و فضلا، شعراء و ادبا اور مختلف تنظیموں کے عہدیداروں کا جمگھٹا لگا رہتا اور امور ملی پر غور و خوض کیا جاتا تھا۔

آپ نے افکار ابو سفیانی اور امویت و ناصبیت کے خلاف ایک ایسا تحریری محاذ کھول دیا تھا جو کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ آپ کا یہ قلمی جہاد ایسے تشویش ناک حالات میں بھی جاری رہا جب بڑے بڑے قلم کاروں

کی نگارشات نے دم سادھ لیا تھا اور دانشوری ملت کے مدعی حضرات گوشۂ عافیت میں پناہ لینے پر خود کو مجبور پاتے تھے۔ مرحوم نے مسلسل ایسے رسالے اور کتابچے تحریر کئے جو وقت کی اہم ترین ضرورت تھے ان میں ناصبی سازشیں، تعزیہ داری کی مخالفت کیوں، کیا ناموس صحابہ جزوایمان ہے اور نظریہ پاکستان (تھیوروکریسی یا سیکولرازم) کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔ آپ نے شریعت بل اور ناموس صحابہ بل کی مخالفت میں اس شیعی وفد کی قیادت کی تھی جو سابق وزیر مذہبی امور مولانا عبدالستار نیازی سے اسلام آباد میں ملا تھا اور حکومت پاکستان کو ان کی منسوخی پر مجبور کر دیا تھا۔

آپ حکومت سندھ کے محکمہ افرادی قوت و تربیت کے ڈائریکٹر کے منصب سے ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوئے اور کراچی میں اعزازی مجسٹریٹ بھی رہے۔ آپ اپنے فکر و نظر میں منفرد تھے۔ آپ راہرو نہ تھے بلکہ کاروان سالار تھے۔ آپ نے قوم و ملت کی تاریخ پر بڑے گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ آپ کی مجلس جہلم (۲۷ دسمبر ۱۹۹۲ء) سے علامہ طالب جوہری نے خطاب کے دوران فرمایا کہ "مرحوم کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے نہیں معلوم وہ کب اور کیسے پر ہوگا اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ خلا کبھی پر ہوگا بھی کہ نہیں۔"

راقم الحروف (ناز اکبر آبادی) کے ساتھ مرحوم کے خصوصی روابط چالیس سال سے قائم تھے اور وہ مجھے اپنا آئیڈیل بزرگ کہا کرتے تھے۔ گزشتہ چار برس سے ہم "کاروان تجلی سادات" کی تدوین میں مصروف رہے ابھی آگرہ و نواح آگرہ کے سادات کی یہ تاریخ مکمل نہ ہوئی تھی کہ مرحوم ہم سے بچھڑ گئے۔ اب مجھے تن تنہا ہی ان کی تکمیل و طباعت کی بھاری ذمہ داری اٹھانا ہے انشاء اللہ یہ کتاب تین ماہ میں چھپ کر منظر عام پر آجائے گی۔

راقم السطور نے مرحوم کے بارے میں ایک طویل نظم (بیاد محمود)

لکھی جو آپ کے جہلم کے موقع پر طبع کروا کے پیش کی تھی نیز چند رباعیاں
اور قطعات بھی تصنیف کئے ان میں دو درج ذیل ہیں۔

اس کی ہستی سے اتنا شرمائی
اس کی عظمت سے ایسا گھبرائی
جاگتے میں نظر ملا نہ سکی
موت بھی اس کو نیند میں آئی

کوئی خورشید سا تابندہ جبیں آئے گا
مجلس فکر کا کب صدر نشیں آئے گا
بزم ہستی میں بہت آئیں گے لوگ
کوئی اس جیسا نہیں آئے گا

مختصراً یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ مرحوم محمود الحسن رضوی ملت
جعفریہ کا دل و دماغ، مذہب امامیہ کا عظیم ترجمان اور پاکستان میں سادات
شاہ گنج آگرہ کی وہ منفرد شخصیت تھے جو قوم و ملت کے درد شناس بھی تھے اور
مسیحا بھی۔ ایسے افراد مر کر بھی زندہ رہتے ہیں جب کہ مرحوم قلمی جہاد میں
مشغول تھے اس لئے وہ شہیدان راہ خدا میں شامل ہیں۔ مرحوم کا جسم ہماری
نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن ان کا نور حیات باقی ہے اور اس کی روشنی
مرحوم کی ابدی زندگی کی امانت دار ہے۔

۵۴) جناب سید علی سردار جعفری

برصغیر کے نامور شاعر و ادیب اور اشتراکی دانشور سید علی سردار جعفری
۲۹ نومبر ۱۹۱۹ء کو ریاست بلرام پور میں پیدا ہوئے جو یوپی انڈیا کے ضلع
گونڈہ میں واقع ہے۔ آپ کے خاندان کا تعلق شاہ گنج آگرہ اور پھر سر ریاست
بلرام پور سے ہے۔ جیسا کہ آپ نے اپنے انٹرویو مطبوعہ رسالہ افکار کراچی علی
سردار جعفری نمبر صفحہ ۲۹ پر خود فرمایا ہے۔ آپ کے والد سید جعفر طیار بن

سید مہدی حسن جعفری ہندو ریاست بلرام پور میں عہدیدار تھے جو خانصاحب سید حیدر کرار جعفری کے بھائی تھے۔ آخرالذکر یہاں نائب دیوان (وزیر اعظم) کے منصب دار تھے۔ علی سردار جعفری اور ان کے بزرگوں کا تعلق سادات آگرہ ونواح آگرہ (شاہ گنج آگرہ اور پہرسر ریاست بھرتپور) سے ہے۔ موصوف کی ہمشیرہ ستارہ جعفری نے صفحہ ۱۹۶ پر لکھا ہے کہ "ہمارا خاندان آگرے کا ہے لیکن کوئی بزرگ ملازمت کے سلسلے میں بلرام پور آگئے تھے۔" خود سردار جعفری نے جناب رام لعل سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے خاندان کی بابت صفحہ ۳۹ پر کہا کہ "میرا خاندان دراصل آگرے اور پہرسر بھرتپور کا خاندان ہے۔ پہرسر ۱۹۴۷ء میں قتل وغارت گری کے باعث خالی ہوگیا۔ آگرے میں ہمارے خاندان کے جو لوگ تھے وہ آگرے سے بھی چلے گئے۔ شاہ گنج کے محلے کے کتنے ہی خاندان اب کینڈا میں جا کر بس گئے ہیں۔" اسی لئے بھی ہمارا موقف قطعی حق بجانب ہے کہ علی سردار جعفری سادات آگرہ بھرتپور (اکبر آباد ونواح اکبر آباد) کے نامور اور لائق فخر سپوت ہیں۔

موصوف نے بی اے کے بعد دہلی، لکھنو، علی گڑھ جامعات میں تعلیم پائی لیکن اپنی شاعری میں اشتراکی نظریات کے باعث جامعات تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے۔ اپنی نظر بندی کی وجہ سے آپ ایم اے نہ کرسکے تاہم آپ کی اردو، فارسی اور انگریزی میں استعداد بہت اچھی ہے۔ آپ نے کبھی ملازمت نہیں کی اور ادبی سرگرمیوں ہی میں منہمک رہے۔ آپ نے کیا ادب لکھنو، گفتگو بمبئی اور کتاب نما دہلی کی ادارت کی۔ آپ کو بڑے اعزازات وانعامات سے نوازا گیا۔ ان میں پدم شری ایوارڈ، نہرو ایوارڈ، اترپردیش اکیڈیمی ایوارڈ اور اقبال میڈل پاکستان نمایاں ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آپ کو ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی ڈگری دی۔ آپ کیمونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بڑے اہم اور فعال رہنما رہے ہیں۔" آپ ۲۰۰۰ء

حاضر کے ان ادیبوں اور شاعروں میں شامل ہیں جن کو بین الاقوامی عزت اور شہرت نصیب ہوئی ہے۔

اشتراکی نظریات کے باوجود مذہبی ماحول میں پرورش و تربیت کا نتیجہ ہے کہ آپ کو اسلام اور ہادیان اسلام سے عقیدت رہی ہے۔ بلرام پور میں آپ کے خاندان کی محرم، عید غدیر اور میلاد امام زمانہؑ کی محفلوں اور مجلس کے انعقاد میں گہری وابستگی کی وجہ سے آپ کو اس دور کے بڑے علماء، ذاکرین اور مجتہدین کو سننے کا موقع ملا۔ آپ نے مولانا سبط حسن کی بے پناہ خطابت اور پیارے صاحب رشید کی اعلیٰ درجے کی مرثیہ خوانی کی بڑی مدح کی ہے آپ کم عمری ہی سے تحت اللفظ مرثیہ خوانی اور حدیث خوانی کرنے لگے تھے اور سترہ برس کی عمر میں پہلا مرثیہ لکھا۔ آپ کی نو عمری کا واقعہ ہے کہ آپ نے اخبار الناظر آگرہ کے مدیر علامہ سید مبارک علی رضوی کے مضمون جو "عقد بیوہ گان" کی مخالفت میں چھپا تھا، کے جواب میں نہایت مدلل مضمون لکھا۔ اس لئے مولانا مرحوم کو گمان ہوا کہ جوابی مضمون تحریر کرنے والا کوئی واقف شریعت معمر شخص ہوگا۔ لیکن جب آپ نے سردار جعفری سے ملاقات کی تو ششدر رہ گئے کہ ایسا فقہی مضمون لکھنے والا ایک نو عمر شخص تھا جو نہ مولوی تھا اور نہ ملا جیسا کہ سردار جعفری نے اپنی خودنوشت صفحات ۷۱ - ۷۲ پر لکھا ہے۔ آپ کا حافظہ بھی غضب کا ہے آپ کو طویل نظمیں اور مرثیوں کے بند کے بند ازبر ہیں کسی بھی محفل میں آپ نے کبھی اپنا کلام لکھ کر نہیں پڑھا۔

آپ کی پہلی نثری تصنیف "منزل" ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آئی - یہ افسانوں کا مجموعہ تھا اور پہلا شعری مجموعہ "پرواز" ۱۹۴۳ء میں چھپا جو نظموں پر مشتمل تھا۔ آپ کی دس سے زائد تصانیف چھپ چکی ہیں۔ ادب، سیاست اور ثقافت پر آپ کے ۵۰ سے زیادہ مضامین اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکے

ہیں۔ آپ کی متعدد نظموں کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ اہم نقاد بھی ہیں آپ کی انگریزی میں ایک اور اردو میں چار تنقیدی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ آپ نے اپنی منظوم سوانح عمری بھی لکھی ہے۔ آپ المیہ کربلا پر ایک الگ کتاب بھی تحریر فرما رہے ہیں۔ اپنی خودنوشت میں آپ نے فرمایا ہے کہ ذکر کربلا کی بدولت جو ان کے خاندانی ماحول میں عام تھا ان کو حق وصداقت سے گہری وابستگی کا موجب ہوا" نیز میر انیس کے مرثیے جو مجالس میں پڑھے جاتے تھے، میری شاعری پر بے حد اثر انداز ہوئے۔ یہ اثر میرے کلام پر اب تک باقی ہے۔"

آپ کی ادبی منزلت اور فنی عظمت کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ وہ عصر حاضر کے بہت بڑے شاعر، ادیب اور مصنف ہیں۔ چند نامور اہل قلم کے خیالات (اخذ کردہ سردار جعفری نمبر افکار کراچی نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء) ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے لکھا کہ "اردو کا دور حاضر علی سردار جعفری کو ترقی پسند شاعر اور اشتراکی دانشور کی حیثیت سے جانتا ہے لیکن ان کی شخصیت کے اور بھی پہلو ہیں۔" خوش تقریر ہیں اور یہ فن انہوں نے مجتہدوں سے سیکھا ہے۔ نظم میں زور بیان مرثیہ گو سخنوروں سے اور پڑھنے کا انداز نامور مرثیہ خوانوں سے سیکھا ہے۔" مشہور فلسفی جناب سید محمد تقی نے تحریر کیا کہ "علی سردار جعفری اردو تہذیبی منقطع کے ان محترم افراد میں شامل ہیں جن کی دانشوری نے ہمارے ادب اور ہمارے تہذیبی اثاثے میں جو اضافہ کیا ہے وہ ہماری نسل کے چند ہی افراد سے ممکن ہوسکا ہے وہ بیسویں صدی کے ایسے افراد میں شامل ہیں جو نسل انسانی کو ایک ایسے معاشرے کی تشکیل دینے کی علمی ادبی اور عملی جدوجہد کرتے ہیں جو شرفا کا ہمیشہ سے آئیڈیل رہا ہے۔" جناب شان الحق حقی نے لکھا کہ "مجھے علی سردار جعفری کے کلام پر انیس، اقبال اور

قاضی نذرالاسلام کا ملا جلا پرتو نظر آتا ہے ان کا نام ہماری ادبی تاریخ میں مستقل اور مستحکم ہے۔

آپ کے کلام بلاغت نظام کے چند نمونے ہم نے باب ہفتم دبستان اکبر آباد و نواح اکبر آباد میں پیش کئے ہیں۔

حصہ ب

آگرہ و نواح آگرہ کے سادات و مومنین جن کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔

سید آل نبی رضوی ولد صادق حسین (بی اے ایل ایل بی) ایڈوکیٹ چیئرمین آگرہ میونسپل بورڈ، ممبر کونسل آف اسٹیٹ ہند۔ بانی آل انڈیا مسلم لیگ۔

- مشاہیر اکبر آباد۔ از انتظام اللہ شہابی
- نامہ اعمال۔ از سر محمد یامین خاں جلد اول
- نامہ اعمال۔ از سر محمد یامین خاں جلد دوئم
- تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار جلد اول
- تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار جلد دوئم

ماہ نامہ۔ شیعہ۔ کھجوہ ضلع (بہار)

- شاہراہ پاکستان چودھری خلیق الزماں
- ملت کا پاسباں۔ از کرم حیدری
- اقبال کے آخری دو سال۔ از عاشق حسین بٹالوی
- اوراق گم گشتہ۔ از رئیس احمد جعفری ندوی
- محمد علی جناح۔ (انگریزی) از مطلوب الحسن

فاؤنڈیشن آف پاکستان شریف الدین پیرزادہ

"Plain Mr. Jinnah" مرتبہ سید شمس الحسن

"کارجہاں دراز ہے" از قرۃ العین حیدر

آفتاب احمد جعفری ثمر ہوشنگ آبادی ولد سید اسد اللہ جعفری

"طور درخشاں" روداد

اسلام اور رہبران اسلام از الحاج پروفیسر سید زین العابدین

تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار جلد دوم

اردو مرثیہ پاکستان میں از ضمیر اختر نقوی

سید آل حسن رضوی ولد وزیر حسین

کتاب "زاد سبیل آخرت"

تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار از محمد وصی خاں جلد دوم

"اردو مرثیہ پاکستان میں" از ضمیر اختر نقوی

سید آل محمد رضوی کلکٹر ولد اولاد حسین صاحب سی آئی ای

"سفرنامہ یوروپ۔ بلاد روم وشام" نوشتہ محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور

"زاد سبیل آخرت" از اولاد حسین رضوی

"تجلیات انجم" از امیر حسین جعفری

دربار حسینی (چراغ مجالس)

سید آغا سلطان رضوی ولد سید سجاد حسین رضوی جج

"آتش چنار" مصنفہ جی ایم لون

"اب منزل دور نہیں" از میر عبد القیوم

. تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار" از محمد وصی خاں جلد اول

. تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار جلد دوئم

خان بہادر سید اولاد حسین رضوی سی آئی ای ولد سید ثابت علی مصنف سلاموں کا دیوان • زاد سبیل آخرت • ہفت بند ملا کاشی کی تضمین جو • منظوم مبارک • کے نام سے شائع ہوئی۔

• دبستان دبیر • از ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی

سہ ماہی مجلہ • اردو • انجمن اردو کراچی

• ۱۹۴۷ء کے آنسو • از مصطفیٰ علی بریلوی

سید اطہر حسین زیدی مصنف "The New Nazis" متعلق فسادات بوقت تقسیم ہند۔

۱۹۴۷ء کے آنسو از سید مصطفیٰ علی بریلوی

تاریخ سادات دبہرتپور از ظہیر الحسن رضوی تحصیلدار

از Historical Back ground of Pakistan 1857-1947

کے۔ے

خاں صاحب نواب سید اطہر حسین رضوی ولد نواب شبر حسین آگرہ / آنریری مجسٹریٹ

• مشاہیر اکبر آباد • از انتظام اللہ شہابی

• نامہ اعمال • از سر محمد یامین خاں جلد اول

جلد دوم

• ذکر ریاض • از مظہر صدیقی

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ منعقدہ آگرہ ۱۹۳۵ء (دوسرا حصہ)

سید انتظار رضا (ناز اکبر آبادی) ولد سید وقار حسن رضوی آگرہ۔ کراچی

تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار حصہ اول از محمد وصی خاں

حضرت علیؑ کے معجزات از محمد وصی خاں مطبوعہ کراچی ۱۹۵۴ء
مجلہ علم وآگہی مضمون "بلوچستان کے ادبی ادارے"
قران السعدین
تجلیات فکر
نظم ذکر اسلام تا بہ اکبر جام
ہر فرات ورد مطبوعہ محرم ۱۳۱۷ھ
پاکستان میں شعرائے اکبر آباد
امیر حیدر بخت ولد داروغہ صادق حسین، آگرہ
ماہ نامہ "مخزن" لاہور
سہ ماہی مجلہ اردو انجمن ترقی اردو کراچی شمارہ ۳ ۔ ۴
خاں بہادر سید ابو محمد جعفری ولد علی نقی، بھرتپور / آگرہ، کلکٹر وممبر پبلک سروس کمیشن یو پی
"تحقیق باسم اللہ" از مرزا محمد شاہ عالم
تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار" از محمد وصی خاں جلد دوم
"یادگار نور" از سید آل عبا جعفری
تجلیات انجم از امیر حسن جعفری
"کارجہاں دراز ہے" حصہ اول از قرۃ العین حیدر
"میرے پچاس سال علیگڑھ میں" از میر ولایت حسین
"میری سرگزشت" از مولانا سید ظفر حسن امروہوی
Maxims of Ali by J.A.Chapman
میر تراب علی رضوی ڈپٹی کلکٹر ولد سید ہمت علی، آگرہ
"نظیر نامہ" از محمد محمود نور اکبر آبادی

- واجد علی شاہ اور ان کا عہد ' از رئیس احمد جعفری
- بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ' از رئیس احمد جعفری
- حیات جاوید ' از الطاف حسین حالی حصہ دوم
- حیات جاوید ' از الطاف حسین حالی حصہ اول
- تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار از محمد وصی خاں جلد دوم
- "The Immortal Peotry of Mir Anils" مصنف سید غلام عباس
- اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد ' از غلام رسول مہر
- نواب خاں بہادر خاں شہید از سید مصطفیٰ علی بریلوی
- مقالات سر سید ' حصہ ششم مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی
- مقالات سر سید ' حصہ ہفتم مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی
- کار جہاں دراز ہے ' از قرۃ العین حیدر جلد اول
- سرکشی ضلع بجنور ' از سر سید احمد خاں ۔ حواشی از ڈاکٹر سید معین الحق
- مکتوبات سر سید ' مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
- مقالات سر سید حصہ شانزدہم مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی
- مسافران لندن ' سفرنامہ سر سید احمد خاں مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
- "The Great Revolution of 1857" (مرتبہ ڈاکٹر معین الحق)
- زندگانی بے نظیر ' از پروفیسر شہباز
- زاد سبیل آخرت ' از خاں بہادر سید اولاد حسین رضوی سی آئی ای
- حیات جاوید ' از مولانا الطاف حسین حالی
- سید ثابت علی رضوی ولد اولاد حسین صاحب بہرتپور / آگرہ
- دبستان دبیر ' ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی

سہ ماہی مجلہ اردو ۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۔

۔ مقالات سرسید ۔ حصہ ہفتم مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی

سید حیدر کرار جعفری ولد مہدی حسن ، آگرہ (خاں صاحب ایم ایل اے)

سلور جوبلی نمبر ا نجمن وظیفہ سادات دہلی

۔ تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار ۔ از محمد وصی خاں حصہ دوم

The Indian Khilafat Movement 1915–1933.

by K.K Aziz

۔ سرگزشت ۔ از مولوی لقا علی

حامد رضا نقوی ظریف جبلپوری ولد مہدی حسن نقوی اول (بروزن ڈھول)

جبلپور / کراچی (ملازمت کسٹم) دو مطبوعہ دیوان ۔ فرمان ظرافت ۔ و ۔ تلافی مافات ۔

سبع سموات ۔ از انیس مصطفیٰ مینا زبیری

ماہ نامہ ۔ قومی زبان ۔ کراچی بابت اپریل ۱۹۶۷ء

۔ نقوش ۔ لاہور طنز ومزاح نمبر

اردو مرثیہ پاکستان میں از ضمیر اختر نقوی

۔ طور درخشاں ۔ طرفہ قریشی ۔ شوخئ تحریر ۔ کلام سید محمد جعفری

سید حسن مبشر رضوی ولد سید علی اوسط ، آگرہ / کراچی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر ٹیلیگراف)

۔ تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار از محمد وصی خاں جلد اول

۔ ساحل ہا کس بے پر حسین کا ماتم ۔ از محمد وصی خاں

۔ تاریخ درنایاب ۔ از ظہیر الحسن رضوی تحصیلدار

۔ حضرت علیؑ کے معجزات ۔ از محمد وصی خاں

• تجلیات فکر • مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ء کراچی

<u>حسن عابد جعفری بیرسٹر</u> – ولد زین العابدین

ماہ نامہ "شیعہ" مجوہ – (بہار) بابت مئی ۱۹۱۲ء، جون ۱۹۱۳ء، واگست ۱۹۱۳ء

علی گڑھ میگزین – علی گڑھ "جوبلی نمبر"

ماہ نامہ "مخزن لاہور" لاہور اگست ۱۹۱۱ء

مترجم مختلف کتب خصوصاً مشہور "امیر علی ٹھگ" دو جلد

ایڈیٹر ماہ نامہ "شمع" آگرہ

• تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار از محمد وصی خاں جلد اول

• شاہراہ پاکستان "از چودھری خلیق الزماں

مشاہیر اکبر آباد از انتظام اللہ شہابی

• گلدستہ سادات "از منظور احمد جعفری

<u>حسن محمود رضوی</u> ولد محمود رضوی مخمور، آگرہ

• نظیر نامہ "محمد محمود رضوی مخمور

السید دلیر حیدر رضوی ولد سید ناظم حسین (بانی وصدر حسینی اسکاؤٹس) آگرہ / کراچی

ہفت روزہ "شہاب ثاقب" پشاور

جملہ قومی وملکی اخبارات

پندرہ روزہ "المظہر" پشاور مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۸۶ء

<u>سید رضا رضوی</u> ولد سید رضا حیدر رضوی

• تاریخ لکھنو حصہ دوم از زبدۃ العلماء، سید آغا مہدی لکھنوی

تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار "حصہ اول از محمد وصی خاں

تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار حصہ دوئم از محمد وصی

• کتاب • حاضرات ارواح • از رئیس امروہوی •

• تاریخ درنایاب • از سید ظہیر الحسن رضوی

تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار از محمد وصی خاں

نشریہ بی بی سی ۔ لندن اردو سروس (مضمون کتب خانہ)

تجلیات فکر مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ ہجری

نظم ذکر اسلام تابہ اکبر جام مطبوعہ ۱۹۹۶ء کراچی

نواب سید شبر حسین ولد سید محمد حسن رضوی (رئیس میونسپل کمشنر) کراچی

• مشاہیر اکبر آباد • انتظام اللہ شہابی

• ذکر ریاض • از مظہر صدیقی

حاجی سید ضامن علی رضوی ولد ہمت علی (تحصیلدار ۔ زمیندار) آگرہ

مقالات سر سید ۔ حصہ ہفتم محمد اسماعیل پانی پتی

• تذکرۃ الذاکرین • از آغا اشہر لکھنوی

جوبلی نمبر انجمن وظیفہ سادات دہلی

مشاہیر اکبر آباد از انتظام اللہ شہابی

ظہیر الحسن رضوی تحصیلدار ولد آغا سید علی حسین

روزنامہ حریت کراچی میگزین سیکشن

• ۱۹۴۷ء کے آنسو • از مصطفیٰ علی بریلوی

• برگ گل • مجلہ اردو کالج کراچی قائد اعظم نمبر ۱۹۷۶ء

• گلدستہ سادات • از منظور احمد جعفری

• اردو مرثیہ پاکستان میں • از ضمیر اختر نقوی

سید عابد علی نقوی المعروف مولوی عابد ، آگرہ

• مشاہیر اکبر آباد • انتظام اللہ شہابی

• نظیر نامہ • از محمود مخمور اکبر آبادی

عابد اصغر جعفری ولد سبط باقر جعفری، انجینئر (ٹورنٹو کینیڈا)

مدیر پندرہ روزہ اردو اخبار • امروز • ٹورنٹو کینیڈا

سرکولیشن مینجر چہار ماہی رسالہ • اردو انٹرنیشنل • ٹورنٹو

ہفتہ وار • اخبار جہاں • بابت ۱۴ تا ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء

ہفتہ وار • اخبار جہاں • کراچی بابت ۳ تا ۲۹ جون ۱۹۸۵ء

علی اطہر جعفری اطہر ولد مقصود الحسن (تحصیلدار) بھرتپور / کراچی

• بیان ادب • لاہور شمارہ پنجم بابت مئی ۱۹۶۸ء تا دسمبر ۱۹۶۸ء مضمون

• یاداشت تذکرہ مرثیہ گویاں • از مرتضیٰ حسین فاضل لکھنو

• اردو مرثیہ پاکستان میں • ضمیر اختر نقوی صفحہ

• چشم نم - گلدستہ اطہر پر ایک نظر • از ڈاکٹر ہلال نقوی

• گلدستہ اطہر • مراثی و دیگر کلام

۱۹۶۲ء کے چند جدید مرثیے

سید علی ابن حامد رضوی ولد سید محمد احمد، آگرہ / ڈھاکہ

پروفیسر جغرافیہ ڈھاکہ یونیورسٹی (ڈھاکہ)

• نظیر نامہ • از محمد محمود مخمور

Syed ali Ibne Hamid Rizivi (Memorial)

and Pakistan Geomorphology

شائع کردہ یونیورسٹی آف دی پنجاب - لاہور جولائی ۱۹۶۹ء

پاکستان جیوگرافیکل ریویو - جلد ۲۴ نمبر ۲ جولائی ۱۹۶۹ء شائع کردہ یونیورسٹی آف دی پنجاب - لاہور ۱۹۶۹ء

سید علی سردار جعفری ولد جعفر طیار، آگرہ / بلدام پور / بمبئی

بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر وادیب مصنف متعدد کتب نثر و نظم

• فتح گڑھ سے فرار • از کیپٹن نور احمد قائم خانی

• سرگزشت • از سید ذوالفقار علی بخاری صفحہ ۱۵۳ ۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء

ماہنامہ افکار کراچی علی سردار نمبر

تاریخ اشتراکیت

تاریخ آزادی ہند

سید علی مقدس رضوی ولد سید وحید الحسن (ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول) آگرہ / کراچی

جوبلی نمبر انجمن وظیفہ سادات دہلی

بیاض مقدس

تجلیات فکر

تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار جلد دوم

سید غلام علی احسن وکیل ولد بنیاد علی ، آگرہ / کراچی

جوبلی نمبر انجمن وظیفہ سادات ومومنین دہلی

• انوار قم • از صغیر حسین نقوی

• تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار • از محمد وصی خاں حصہ دوم

• تجلیات فکر • از مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ

• یادگار نور • از سید آل عبا جعفری

• تزکرہ علماء امامیہ • مرتبہ سید حسن عارف نقوی

سید فضل رسول رضوی فضل (رئیس) ولد سید وزیر حسین رضوی ، بھرتپور / آگرہ

مصنف " ہفت بند زہرا "

• تاریخ درنایاب • از ظہیر الحسن رضوی

• گلدستہ اطہر • مرتبہ وزیر حیدر جعفری

• زاد سبیل آخرت • از اولاد حسین رضوی

دربار حسینی (چراغ مجالس)

دبستان دبیر

سید محمد محمود مخمور رضوی ولد سید محمد علی (منصرم)، آگرہ / کراچی

• مطلع انوار

• مشاہدات • از ہوش بلگرامی

• بوستان قلم • از محمد عبداللہ خاں

• مشاہیر اکبرآباد • از مفتی انتظام اللہ شہابی

• تاریخ درنایاب • از ظہیر الحسن رضوی

تاریخ سادات وریاست بہرتپور از ظہیر الحسن رضوی

• گلدستہ سادات • از منظور احمد جعفری

مدبر رضوی ولد سید افتخار حسن رضوی اسکرپٹ ایڈیٹر کراچی ٹیلیویژن

کتب خانہ بی بی سی لندن اردو سروس مرتبہ رضا علی عابدی

پیام عمل لاہور دبیر نمبر

ذات ورد مطبوعہ کراچی محرم ۱۴۱۷ھ

محمد علی جعفری پہرسری موسوم ماسٹر محمد علی ولد سید مرتضیٰ علی، آگرہ / لاہور

Creation of Pakistan از جسٹس سید شمیم حسن قادری

• تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار • از محمد وصی خاں

• جدید جغرافیہ پنجاب • از سند باد جہازی (چراغ حسن حسرت)

شیخ عطا محمد صاحب کے خطوط مرتبہ مخدوم سید حامد جلالی کراچی ۱۹۶۹ء

• پنجاب پروونشل مسلم لیگ ۱۹۰۷ء از محمد انور امین
• ملک برکت علی • از ایم۔ رفیق افضل
جوبلی نمبر انجمن وظیفہ سادات دہلی
اردو مرثیہ پاکستان میں از ضمیر اختر نقوی
ہفت روزہ • معیار • کراچی
• کتاب • ۵۔اے ذیلدار پارک۔ روداد مجالس مولانا مودودی
• شوخئ تحریر • کلام سید محمد جعفری
تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار
تجلیات فکر محرم مطبوعہ ۱۳۷۸ھ
روزنامہ نوائے وقت لاہور (ش م کی ڈائری دسمبر ۶۹ دسمبر ۷۳)
سید محمد جعفری ولد سید محمد علی جعفری

• سیارہ ڈائجسٹ • لاہور
تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار • حصہ دوم
گلدستہ سادات از منظور احمد جعفری
ماہ نامہ • نقوش • لاہور

• نامہ اعمال • از سر محمد یامین خاں جلد دوم
• اردو مرثیہ پاکستان میں • از ضمیر اختر نقوی
• تجلیات انجم • مرتبہ سید امیر حسن جعفری
• تاریخ پاکستان • (منظوم) عہد قدیم سے ۱۹۶۸ء تک از تشکیل احمد ضیاء
• مرقع ادب • مرتبہ پروفیسر ابو آفتاب
• نگار • کراچی بابت جنوری، مارچ ۱۹۷۶ء صفحات ۵۔۶ تعزیتی ایڈیٹوریل
• بہ یاد مہرباں • مرتبہ مرزا اظفر الحسن۔

سید محمد حسن رضوی (نائب الریاست بلرام پور) ولد حاجی سید قصاص علی ۔

آگرہ

• مشاہیر اکبر آباد • انتظام اللہ شہابی

• یادگار نور • از آل عبا جعفری

مخطوط • حالات برادران مومنین محلہ شاہ گنج آگرہ تحریر کردہ داروغہ سید احترام علی رضوی ۱۹۰۰ء۔

تجلیات فکر مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸

میجر سید محمود الحسن رضوی عرف بابو محمود و میجر حسن رضوی ، بہرتپور / کراچی

• شاہراہ پاکستان • از چودھری خلیق الزماں

• ریاست بہرتپور کے وحشیانہ مظالم • از ایم ۔ ایچ ہاشمی

The last Journey – A Souvenir of Soroow

تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار از محمد وصی خاں جلد دوم

تاریخ سادات و ریاست بہرتپور از ظہیر الحسن رضوی کراچی ۱۹۵۰ء ۔

اردو ڈائجسٹ لاہور

• برگ گل • مجلہ اردو کالج کراچی قائد اعظم نمبر ۱۹۷۶ء

گلدستہ سادات از منظور احمد جعفری

• ۱۹۴۷ء کے آنسو • از مصطفیٰ علی بریلوی

روزنامہ جنگ کراچی خصوصی انٹرویو پیر الہیٰ بخش

مقصود الحسن صبر جعفری (سپرنٹنڈنٹ کسٹم بہرتپور)

• گلدستہ اطہر • مرتبہ وزیر حیدر جعفری

• اردو مرثیہ پاکستان میں • از ضمیر اختر نقوی

• زاد سبیل آخرت • از اولاد حسین صاحب رضوی

محمود الحسن رضوی (ڈپٹی ڈائریکٹر۔ مین پاور) ولد منظور الحسن ۔ آگرہ / کراچی
تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار از محمد وصی خاں جلد اول

تشکیل پاکستان میں شیعان علیؑ کا کردار از محمد وصی خاں جلد دوم
تجلیات فکر مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸
یادگاری مجلہ فیض بھرت پوری معاصرین کی نظر میں
میرانیس ہر زمانے کا بڑا شاعر (انگریزی)
حاجی سید محمد عبداللہ
• شوخئ تحریر • کلام سید محمد جعفری شائع کردہ مکتبہ دانیال کراچی ۱۹۸۵ء
• تنزیہ القرآن • مصنفہ سید محمد رضوی (سجاد حسین سیشن جج کے والد)
قواعد انجمن معین الطلباء جعفری و رضوی مرتبہ سید جعفر طیار جعفری شاہ گنج آگرہ

سید محمد منظر رضوی راز ولد افتخار حسین رضوی • داستان مظلومیت • مرتب مطبوعہ آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ ۱۹۳۲ء
تجلیات فکر

فرات درد
خان بہادر سید نظیر الحسن رضوی فوق ولد سید سردار علی ۔ مہابن ضلع متھرا / آگرہ مصنف • المیزان •
• مطلع انوار •
جوبلی نمبر انجمن وظیفہ سادات و مومنین دہلی)
بوستان قلم از محمد عبداللہ خاں خویشگی
• دبستان دبیر • ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی
• زاد سبیل آخرت • از اولاد حسین صاحب

سید وزیر حسین رضوی ولد سید ثابت علی ، بھرتپور / آگرہ

مصنف (ا) تاریخ الائمہ (۲) زائقہ ماتم عرف جمل مجلس (۳) زاد ۔ دبستان دبیر ۔

از ڈاکٹر ۔۔ حسین فاروقی

سہ ماہی مجلہ اردو ۔ انجمن ترقی اردو کراچی

۔ ہفت بند زہرا ۔ از فضل رسول رضوی صفحہ ۴

وزیر حیدر جعفری وزیر ولد علی اطہر جعفری اطہر ، کراچی

مرتب ۔ گلدستہ اطہر ۔ مطبوعہ کراچی

۔ اردو مرثیہ پاکستان میں ۔ از ضمیر اختر نقوی

روزنامہ ۔ حریت ۔ کراچی مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۵ء

۔ ۱۹۷۴ء کے جدید مرثیے ۔

حصہ ج

سادات کے دیگر ممتاز حضرات کو ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کرکے پیش کیا گیا ہے۔

اعلی منصب داران

ا) خان بہادر سید ابو محمد بن سید علی نقی جعفری (کلکٹر اور ممبر پبلک سروس کمیشن یو پی)

۲) سید آل محمد بن خان بہادر سید اولاد حسین رضوی (کلکٹر)

۳) میر اعجاز علی رضوی (مہابن) (اپنے عہد کے اکابرین ملت)

۴) خان بہادر سید اولاد حسین رضوی بن سید ثابت علی رضوی (سی آئی ای۔ کمشنر بندوبست سی پی)
۵) سید اخلاق حسین بن سید زین العباد رضوی (سکریٹری حکومت پاکستان)
۶) سید امام علی بن سید ببر علی رضوی (وزیر راجہ بھرتپور)
۷) سید اولاد علی بن سید مرشد علی رضوی وزیر ریاست کوٹہ)
۸) سید اقبال حیدر بن سید حیدر حسین (ممبر سینٹ پاکستان، سکریٹری پی پی پی)
۹) سید ببر علی رضوی بن میر اکبر علی رسالدار (مدارالمہام چیف سکریٹری راجہ بھرتپور)
۱۰) سید باقر مہدی بن سید حسن محمد رضوی (جنرل منیجر (پرسنل) اسٹیل ملز کراچی)
۱۱) سید بلاقی بن سید سیف اللہ جعفری (مہاراجہ سندھیا کے وزیر خاص)
۱۲) حاجی سید جعفر حسین عرف لندنیہ جعفر بن سید غلام حسین جعفری (وزیر ریاست جبلپور)
۱۳) خانصاحب سید حیدر کرار بن سید مہدی حسن جعفری (منیجر، دیوان ریاست بلرام پور)
۱۴) سید حیدر رضا بن سید تراب علی (پرنسپل پولیس ٹریننگ کالج یوپی)
۱۵) سید حیدر رضا بن سید محمود احمد رضوی (ایجوکیشن ایڈوائزر پاکستان)
۱۶) سید دائم حسین بن سید محمد ہادی جعفری (کلکٹر ریاست بھرتپور)
۱۷) سید رضا مہدی بن سید غفار حسن رضوی (پروجیکٹ منیجر پلاسٹک فیکٹری جدہ)
۱۸) سید رفیع بن سید رستم علی جعفری (سکریٹری مہاراجہ بھرتپور مدن سنگھ)
۱۹) سید زین العباد بن سید جواد حسین رضوی (افسر اعلیٰ جنگلات)

۲۰) سید شفیع بن سید رفیع جعفری (مہاراجہ سورج مل بھرتپور کے مصاحب خاص تھے)

۲۱) سید شبر مہدی جعفری بن سید شمس الحسن جعفری (ایڈیشنل سکریٹری مواصلات جنرل مینجر ریلوے اور ممبر ریلوے بورڈ)

۲۲) منشی ششماد حسین بن سید اوصاف علی رضوی (مہاراجہ بھرتپور جسونت سنگھ کے چیف سکریٹری)

۲۳) سید حسین احمد بن سید رحمت حسین زیدی (چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ)

۲۴) سید فرحت مظفر جعفری (پرنسپل باوانی کالج)

۲۵) ظفر اکبر آبادی (اسلام آباد) (ریجنل مینجر روزنامہ ڈان)

۲۶) سید علی جرار بن سید حیدر کرار جعفری (ممبر یوپی اسمبلی لکھنو)

۲۷) سید علی حسن بن سید شمشیر علی جعفری (دیوان ریاست ٹونک)

۲۸) سید محمد یونس نقوی بن سید جعفر حسین نقوی (مشیر وزارت دفاع پاکستان)

۲۹) چودھری سید شریف الحسن بن سردار علی رضوی (مہابن) میونسپل کمشنر متھرا)

۳۰) سید عبدالحسن بن سید سردار علی رضوی (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ متھرا)

۳۱) سید مستحسن رضا بن سید تراب علی (اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان)

۳۲) حاجی سید موسیٰ رضا بن سید مظفر علی رضوی (شاہ گنج شو فیکٹری کے مالک اور میونسپل کمشنر آگرہ)

۳۳) سید محمد مدبر (مدبر رضوی) بن سید افتخار حسن (اسکرپٹ ایڈیٹر ٹیلی وژن سینٹر کراچی)

۳۴) سید کلب احمد بن سید افتخار حسن رضوی (پاکستان انشورنس میں اعلیٰ عہدیدار

۳۵) سید محمد شبر بن سید محمد تہور زیدی (چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ)

۳۶) محمد حیدر برنی (اسلامی بینک کراچی کے مشیر خاص اور بینکنگ میں دماغ کا درجہ رکھتے ہیں)

۳۷) سید محمد ماجد رضا بن سید شاہد رضا جعفری (پرنسپل گورنمنٹ کالج ایجوکیشن ایڈوائزر اسلام آباد)

۳۸) سید محمد اسلم بن سید شمس الحسن جعفری (کمشنر زراعت)

۳۹) سید محمد سعید زیدی بن سید شمیم الحسن زیدی (پرنسپل ٹیکنیکل کالج)

۴۰) سید محمد مہدی بن سید شمس الحسن جعفری (ڈپٹی آڈیٹر جنرل پاکستان)

۴۱) سید محمد حسن بن میر ضامن علی رضوی (دیوان / منیجر ریاست بلرام پور)

۴۲) سید علی عارف رضوی بن سید المتجدین رضوی (ڈپٹی ڈائریکٹر تصنیف و ترجمہ کراچی جامعہ)

۴۳) میر سردار علی بن میر اعجاز علی رضوی (اسپیشل مجسٹریٹ متھرا)

۴۴) مرزا امجد علی بن مرزا واجد علی (افسر رابطہ افواج و وزارت دفاع)

۴۵) چودھری سید نظیر الحسن رضوی فوق (اسپیشل مجسٹریٹ متھرا)

۴۶) سید آل ضامن بن خان بہادر سید آل نبی رضوی (سول سرجن - مرکزی حکومت کراچی)

۴۷) خانصاحب سید علی احمد جعفری بن سید محمد ابراہیم (دیوان ریاست)

۴۸) سید محمد جعفری بن سید محمد علی جعفری (وزارت اطلاعات میں اعلیٰ افسر اور تہران میں پریس اتاشی رہے)

۴۹) سید حسنین احمد عرف آدم بن سید حسن احمد رضوی (ای آئی ریلوے میں اعلیٰ افسر اور راجہ بنارس کے داماد تھے)

۵۰) سید ضمیر حیدر بن ڈاکٹر ظفر حسین جعفری (چیف جیولوجسٹ اٹک آئل کمپنی)

۵۱) سید کرامت علی جعفری عرف میاں جی (مہاراجہ گوالیار کے چیف سکریٹری)

۵۲) سید علی شہزاد جعفری (راولپنڈی کے اہم سیاسی شخص اور قیوم مسلم لیگ کے سکریٹری تھے)

۵۳) سید محمد احسن جعفری (جوائنٹ سکریٹری دفاع)

۵۴) مرزا ممتاز حسین قزلباش (قیام پاکستان کے ابتدائی عہد میں ریاست خیرپور کے وزیر اعظم تھے)

۵۵) سید حسن فیروز بن سید تہذیب الحسن جعفری (جج)

۵۶) سید علی متقی جعفری بن احفاد حسین جعفری (سیشن جج)

۵۷) سید سجاد حسین بن مولانا سید محمد رضوی (جج)

۵۸) سید آل رضا بن سید اولاد حسین رضوی (سیشن جج)

۵۹) سید آل مقبول بن سید آل رسول رضوی (جج)

۶۰) سید خورشید حیدر بن سید ریاض احمد رضوی (جج)

۶۱) سید زین العابدین جعفری (صدر اعلیٰ)

۶۲) سید جعفر حسین بن سید ارشاد علی رضوی (صدر اعلیٰ)

۶۳) سید محمود (سید ثابت علی رضوی کے نواسے) (کمشنر بندوبست سی پی انڈیا)

اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات

۱) سید آل محمد بن خان بہادر سید اولاد حسین رضوی (بیرسٹر)
۲) سید ابو علی بن سید علی نقی جعفری (بیرسٹر)
۳) سید اقبالحیدر بن سید حیدر حسین (بیرسٹر)
۴) سید ارشد رضا بن سید آل مصطفیٰ رضوی (پرنسپل سٹی کالج حیدر آباد)
۵) ڈاکٹر سید علی جان بن میر تراب علیرضوی (پی ایچ لای سائنس)
۶) ڈاکٹر سید علی بن حامد رضی بن سید محمد احمد ڈپٹی کلکٹر (پی ایچ ڈی جغرافیہ

۷) ماسٹر سید عبداللہ رضوی بن سید فرحت علی (پروفیسر فلسفہ آگرہ کالج)
۸) سید علی ظفر بن سید علی زائر رضوی (بینک میں وی پی ہیں اور پیشہ ورانہ و ذاتی قابلیت میں درجنوں ڈگریوں کے حامل ہیں غالباً موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ افراد میں ہیں)
۹) سید حسن عابد جعفری بن سید زین العابدین جعفری (بیرسٹر)
۱۰) ڈاکٹر سید حسین جعفر بن مولانا سید علی جعفر مرحوم (پی ایچ ڈی)
۱۱) سید جعفر حسین (لندنیہ) (بیرسٹر)
۱۲) سید علی مقدس رضوی بن سید وحید الحسن (ڈبل ایم اے)

۱۳) مولوی سید ضامن علی بن سید اوصاف علی رضوی (پروفیسر آگرہ کالج)
۱۴) ماسٹر سید ظہیر احسن بن سید قریب الحسن رضوی (پروفیسر پرنسپل شعبہ کالج لکھنو)
۱۵) خانصاحب سید محمد صالح بن سید ابراہیم حسین رضوی (بیرسٹر)
۱۶) پروفیسر سید محمد سعید بن سید شمیم احمد زیدی (پرنسپل ٹیکنیکل کالج)
۱۷) سید محمد منتظر رضوی ابن سید افتخار حسن رضوی (ڈبل ایم اے)
۱۸) ڈاکٹر سید محمد طاہر (طاہر رضوی) بن سید محمد طیب رضوی (پی ایچ ڈی، صدر شعبہ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی)
۱۹) سید محمود الحسن جعفری بن جعفر حسین لندنیہ (بیرسٹر)
۲۰) ڈاکٹر سید محمود حسنین بن حکیم سید حسنین رضا رضوی (پی ایچ ڈی سائنس شمسی توانائی)
۲۱) سید وسیم جعفر بن مولانا سید علی جعفر مرحوم (چار مضامین میں ایم اے تھے)
۲۲) سید علی اصغر جعفری (کیڈٹ کالج حسن ابدال میں پروفیسر رہے اب کینیڈا میں مقیم ہیں)

عسکری شخصیات

۱) میر اکبر علی بن سید محمد علی رضوی (رسالدار)
۲) سید الطاف علی بن سید لطف علی رضوی (رسالدار)
۳) سید انجب علی بن سید لطف علی رضوی (رسالدار)
۴) سید اعجاز حسین بن سید عون محمد رضوی (لفٹیننٹ کرنل آرمی ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران جنگی قیدی تھے اور آگرہ جیل میں شہید کر دیا گیا تھا)
۵) سید امجد علی بن سید عیوض علی رضوی (افسر توپخانہ بھرتپور)
۶) سید ابراہیم بن سید عظمت اللہ رضوی عرف شاہ بڑے قلعہ دار جیلسیر
۷) سید انوار حسینین بن سید منظور الحسن جعفری (اسکوڈرن لیڈر)
۸) سید علی مدبر بن سید کاظم مہدی جعفری (ونگ کمانڈر فضائیہ)
۹) سید لطافت علی بن سید احسان علی (بہادر شاہ ظفر کی افواج میں افسر اعلیٰ)
۱۰) سید جواہر علی بن سید علی جعفری (اکبر آباد کی علاقائی فوج میں افسر اعلیٰ)
۱۱) سید حشمت علی بن سید وحید الدین جعفری (افسر توپ خانہ)
۱۲) سید تحصیل حسین بن سید شمشیر علی رضوی (ریاست اندور کی فوج میں افسر اعلیٰ)

۱۳) سید ہمت علی بن سید میونس علی رضوی (افسر توپ خانہ بھرتپور)

۱۴) سید ذوالفقار علی بن سید مرشد علی رضوی (افسر اعلیٰ فوج ریاست کوٹہ)

۱۵) سید روشن علی بن سید امجد علی رضوی (افسر توپ خانہ بھرتپور)

۱۶) سید رکن الدین ڈوکر جو ہیلک کے تھوک ڈوکر کے بانی تھے (ابتدائی عہد مغلیہ میں روہڑی کے نزدیک بھکر کے فوجی گورنر تھے)

۱۷) سید حبیب اللہ بن سید عنایت رضوی (شاہ عالم اول کے عہد حکومت میں آگرہ تا بیانہ کے فوجی گورنر)

۱۸) سید واسع عرف گھوڑا بن سید حیاث اللہ رضوی (راجہ سورج مل کے عہد میں جنگ گھاسیرہ کے ایک ہیرو)

۱۹) سید وزیر علی بن سید فیض محمد رضوی (بھرتپور کی فوج میں افسر اعلیٰ)

۲۰) سید وزیر احمد بن سید مصطفیٰ حسین رضوی (فوج میں میجر تھے اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں بھاولپور کے محاذ پر شہید ہوئے)

۲۱) سید محمد علی بن سید محمد عاقل رضوی (مرہٹہ فوج میں افسر اعلیٰ)

۲۲) سید محمد مقدس بن سید علی اقدس جعفری (گروپ کیپٹن فضائیہ اور انٹر سروسز سلیکشن بورڈ کے رکن تھے)

۲۳) سید محمد مشرف بن سید محمد مقدس جعفری (میجر آرمی)

۲۴) سید محمد مدبر رضوی بن سید محمد مدثر بکا (اسکواڈرن لیڈرن فضائیہ)

۲۵) سید منہاج الحسن جعفری بن سید مصباح الحسن قاری (کرنل اور تمغۂ شجاعت کے حامل)

۲۶) سید منتظر مہدی بن سید حسن محمد رضوی (گروپ کیپٹن فضائیہ اور فرانس میں ملٹری اتاشی)

۲۷) سید نجیب علی بن سید عتیق اللہ رضوی (مغل افواج کی چھاؤنی کانپور کے کمانڈنٹ)

۲۸) سید محمد علی سعید بن سید ضمیر الحسن رضوی (میجر آرمی اور شاہراہ ریشم کے معمار انجینئر ہیں)

۲۹) سید محمد شاہ بن سید محمد ماہ رضوی (ریاست سرت گڑہ میں اعلیٰ فوجی افسر

۳۰) سید محمود الحسن رضوی (میجر حسن) بن سید آل حسن رضوی (افواج بھرتپور میں میجر اور برما کے محاذ پر لڑ چکے تھے)

۳۱) سید مجتبیٰ حسین (بیانہ کے نامور فرزند) (فوج میں کرنل تھے)

۳۲) سید محمد تقی بن سید نثار علی رضوی (فوج میں صوبیدار تھے)

۳۳) (سید علی اوسط بن سید محسن رضا رضوی (وائسرائے کمیشنڈ افسر جنگ عظیم ثانی کے دوران)

۳۴) سید محمد احمد بن سید احمد حسین جعفری (لیفٹننٹ کمانڈر بحریہ)

۳۵) سید غفار حسن بن سید مثنیٰ حسین رضوی (صوبیدار میجر)

۳۶) سید طالب حسین بن سید کرامت حسین رضوی (کمیدان - افسر توپ خانہ)

۳۷) سید مظہر حسین بن سید حیدر حسین نقوی (کمانڈر بحریہ)

۳۸) سید ابوالہاشم بن سید ابوالقاسم جعفری (اسکواڈ لیڈر فضائیہ)

۳۹) سید موسیٰ جعفری بن سید محمد علی جعفری (کیپٹن آرمی)

۴۰) سید علی ابرار جعفری بن سید حیدر کرار جعفری (گروپ کیپٹن فضائیہ)

۴۱) سید سبط باقر جعفری بن سید مرتضیٰ جعفری (صوبیدار آرمی)

۴۲) سید محمد غازی مشہدی (کمانڈر فوج خاص سلطان غوری ۱۱۹۲ء)

۴۳) سید ابو حلیم زیدی (کمانڈر ہاشمی رسالہ بعہد شہنشاہ ہمایوں)

۴۴) سید محمد پناہ رضوی (کمانڈر افواج بھرتپور بعہد راجہ سورج مل)

۴۵) سید مہدی حیدر بن ڈاکٹر ظفر حسین جعفری (میجر آرمی تھے)

۴۶) سید سعید الحسن عرف مجاہد بن سید محمود الحسن رضوی (افسر فضائیہ)
۴۷) سید زاہد رضا جعفری ابن سید رضی الحسن قانون گو (کرنل)
۴۸) سید حسنین جان رضوی ابن ڈاکٹر سید علی جان (میجر)
۴۹) سید شکیل احمد بن سید شفیع احمد جعفری (کرنل)

عالم و متقی اور حافظ قرآن

۱) میر اکبر علی رسالدار بن سید محمد علی رضوی (حافظ قرآن)
۲) سید اقبال مند علی بن سید مدد علی رضوی (عالم و متقی)
۳) سید اسد اللہ بن سید عظیم (لوہا منڈی والے) (عالم و متقی)
۴) سید آدم مہدی بن سید محمد علی رضوی (حافظ قرآن)
۵) مولوی سید ارشاد حسین رضوی (عالم و خطیب)
۶) آغا علی سرور بن آغا علی کاظم (مجتہد)
۷) مولوی سید التفات علی جعفری (عالم و متقی)
۸) سید دائم علی بن میر اکبر علی رسالدار (عالم و فاضل)
۹) سید زبردست علی بن سید حبیب اللہ رضوی (عالم اور عامل باصفا)

۱۰) مولانا سید علی جعفر (عالم و خطیب)

۱۱) حکیم زاہد علی اکبر آبادی (عربی و فارسی کے بڑے عالم اور متقی)

۱۲) منشی سید عنایت حسین بن سید مدد علی (عالم و متقی)

۱۳) سید قائم علی بن میر اکبر علی رسالدار (عالم و عامل اور عابد شب زندہ دار)

۱۴) سید محمد اسد بن سید محسن رضا رضوی (عالم و خطیب)

۱۵) تقدس مآب مولانا محمد مصطفیٰ مازندرانی (بڑے عالم و متقی)

۱۶) سید مہدی بن سید محمد (سید اسد اللہ کے پوتے) عالم و متقی)

۱۷) سید مظفر علی بن امان علی رضوی (حافظ قرآن)

۱۸) مولانا سید محمد رضوی اکبر آبادی (عربی کے بڑے عالم)

۱۹) مولانا سید مبارک علی رضوی (عالم و خطیب اور فقیہہ)

۲۰) مولوی سید باقر حسین زیدی (عالم و خطیب)

۲۱) مولوی سید ضامن علی رضوی (عربی و فارسی کے عالم)

مصنف، مترجم اور صحافی

۱) سید اقبال جعفری بن سید انظار حسین جعفری (بی بی سی کے خصوصی رپورٹر)
۲) سید اکرام مہدی بن سید اختر مہدی رضوی (چیف فوٹو گرافر روزنامہ جنگ کراچی)
۳) سید افسر حسین جعفری بن سید افتخار حسین جعفری (کئی اخبارات و جرائد کے فوٹو گرافر ہیں)
۴) سید اختر رضا جعفری بن سید عظمت رضا شاہ (کئی اخبارات کے رپورٹر اور سب ایڈیٹر ہیں)
۵) سید انتظار رضا رضوی ناز (مصنف و مولف تجلیات فکر ، نظم ذکر اسلام تا بہ اکبر جام ، قران السعدین ، ذکر جمیل اور کتاب ہذا)
۶) سید اظہر حسین زیدی (انگریزی کتاب دی نیو نازیز کے مصنف)
۷) سید ابو مظفر عظفر اکبر آبادی (خوشبوئے قبا کے مصنف اور ڈان کے ریجنل منیجر ہیں)
۸) سید ابو حامد معظر اکبر آبادی (معروف صحافی ، بچوں سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف ، شاعر اور ادیب ہیں نیز روزنامہ جنگ راولپنڈی کے کالم نگار)

۹) داروغہ سید احترام علی رضوی (تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ کی دو جلدوں کے مصنف نیز ???????. بحار الانوار کے مترجم اور کئی دیگر کتابوں اور رسالوں کے مولف و مصنف تھے)

۱۰) سید تراب احمد رضوی (قانون پر کتاب لکھی)

۱۱) حاجی سید جعفر حسین بن سید غلام حسین (کتاب سلطان شہاب الدین غوری لکھی)

۱۲) بیرسٹر سید حسن عابد جعفری بن سید زین العابدین جعفری (نہج البلاغہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا)

۱۳) مولوی سید حسن جعفری عرف مولوی بڈا (تاریخ سادات حسنی لکھی)

۱۴) سید ذوالفقار حسنین رضوی بن سید شجاعت حسین ڈپٹی کلکٹر (فضلی کی دہ مجلس کا اردو میں مخصوص انداز کا ترجمہ کیا)

۱۵) سید عترت حسین رضوی (اخبار سرمۂ روزگار کے مدیر تھے)

۱۶) سید علی ناظر بن مظفر اکبر آبادی (پی پی آئی کے خصوصی رپورٹر اسلام آباد

۱۷) سید عزیز الحسن بن سید قادر علی رضوی (مورخ و شجرہ نگار)

۱۸) سید تطہیر الحسن رضوی بھرتپوری (تاریخ سادات بھرتپور اور دو نایاب تحریر کیں)

۱۹) سید کرامت علی جعفری ہوشیار (حضرت علیؑ کی خلافت پر کتاب تصنیف کی)

۲۰) سید فضیلت مہدی بن سید محمد مہدی رضوی (کئی اخبارات و رسائل کے معاون و ایڈیٹر اور ندیم انسائیکلو پیڈیا کے مصنف ہیں)

۲۱) مولانا سید مبارک علی رضوی (اخبار الناظر آگرہ کے چیف ایڈیٹر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے)

۲۲) مولانا سید محمد رضوی اکبر آبادی (رد عیسائیت میں تنزیہہ القرآن اور منشور غدیر تصنیف کی تھیں)

۲۳) سید محمد ادریس جعفری (رسالہ آفتاب آگرہ کے ایڈیٹر تھے نیز کراچی سے بھی ایک ماہنامہ نکالا تھا)

۲۴) سید منظور احمد جعفری (گلدستہ سادات بھرتپور لکھی)

۲۵) سید مراد علی جعفری (کتاب ندائے لاالٰہ کے مولف ہیں)

۲۶) سید محمود الحسن رضوی مرحوم بن ماسٹر سید منظور الحسن رضوی شہید (درجنوں کتابچوں اور رسالوں کی تالیف ۔ تجلیات فکر اور کتاب ہذا کی تدوین میں شریک عمل رہے میر انیس ہر عہد کا عظیم شاعر کی تالیف میں شریک تدوین رہے متعدد پر مغز مضامین لکھے جو وقت کی اہم ضرورت تھے)

۲۷) داروغہ سید نظیر الحسن رضوی حسرت (شمشیر بران تصنیف کی اور بائیبل کا اردو میں ترجمہ کیا)

۲۸) مخمور اکبر آبادی (نظیر نامہ ، روح نظر، مشرق تابان اور تاریخ صحافیہ اردو کے علاوہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے)

۲۹) سید آل عبا جعفری (مصنف یادگار نور)

۳۰) سید وزیر حسین بن سید ثابت علی رضوی (چہل مجلس ، ذائقہ ماتم اور تاریخ آئمہ کے مصنف تھے)

۳۱) سید محمد رضی بن مولوی سید انتظام علی جعفری (انگلش ٹیچر نامی کتاب ۱۹۲۳ء میں لکھی)

۳۲) سید احمد حسین بن سید محمد حسین (حق الیقین نامی کتاب تصنیف کی)

۳۳) سید کاظم مہدی جعفری (کینیڈا) ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی تاریخ ، اثنا عشری شیعیان ہند (انگریزی) دونوں جلدوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے)

ڈپٹی کلکٹرز

۱) سید آل حسن بن خاں بہادر سید اولاد حسین رضوی
۲) سید ابن علی بن سید صادق حسین رضوی
۳) سید احمد حسین (اول ضلع متھرا والے)
۴) سید تراب علی بن سید ہمت علی رضوی
۵) سید حسین بن سید ارشاد علی رضوی
۶) سید حاجی حسن بن سید انتظام علی رضوی
۷) سید علی نقی جعفری بن سید غلام حسین جعفری
۸) سید غلام حسین جعفری
۹) سید شجاعت حسین بن سید عابد علی رضوی
۱۰) سید محسن علی بن سید نیاز علی رضوی
۱۱) سید محمد بن سید ضامن علی رضوی
۱۲) سید عترت حسین جعفری
۱۳) سید وزیر حسین بن سید ثابت علی رضوی
۱۴) سید نیاز علی بن سید صاحب علی رضوی
۱۵) سید سبط محمد بن سید ابن حسن جعفری
۱۶) سید محمد احمد بن سید محمد رضوی
۱۷) سید عنایت حسین جعفری (منشی ناظر حسین کے والد)
۱۸) سید حسن (لوہا منڈی والے)

تحصیلداران

۱) سید احمد حسن بن میر قاسم علی رضوی
۲) سید اطہر حسین بن سید مقصود الحسن جعفری
۳) سید ابرار حسین بن سید دلدار حسین
۴) سید ابراہیم علی بن سید نیاز علی رضوی
۵) سید انعام حسین بن سید اکرام حسین رضوی
۶) سید آل مصطفیٰ بن سید حسین رضوی
۷) سید ارشاد علی بن سید امداد علی رضوی
۸) سید اصغر حسین بن سید سجاد حسین رضوی
۹) سید اعتقاد حسین بن سید ثابت علی رضوی
۱۰) سید انوار الحسن بن سید ظہور الحسن رضوی
۱۱) سید بشیر حیدر بن سید امیر حیدر رضوی
۱۲) سید باقر حسین جعفری
۱۳) سید تقی حسن بن سید حاجی حسن رضوی
۱۴) سید علی اطہر جعفری بن سید مقصود الحسن جعفری
۱۵) سید عترت حسین رضوی (ان کا خاندان ۱۹۳۰ء کی دہائی میں بمبئی منتقل ہو گیا تھا)
۱۶) سید علی فضیل بن سید محمد طیب رضوی
۱۷) سید عطا حسین بن سید اعتقاد حسین رضوی
۱۸) سید عطا حسنین بن سید گلزار علی ولد سید حکمت علی

۱۹) سید تراب علی بن سید ہمت علی رضوی

۲۰) سید شمس الحسن بن خان بہادر سید امداد علی جعفری

۲۱) سید حسن علی بن سید دائم علی رضوی

۲۲) سید حسین علی بن سید کاظم علی رضوی

۲۳) سید صاحب علی بن سید خان محمد رضوی

۲۴) سید صادق حسین بن سید نیاز علی رضوی

۲۵) سید ظہیر الحسن رضوی بن سید علی محسن رضوی

۲۶) سید وارث علی بن سید نیاز علی

۲۷) سید مشتاق علی بن سید نیاز علی رضوی ڈپٹی کلکٹر

۲۸) سید مصطفیٰ حسین بن سید محسن علی رضوی ڈپٹی کلکٹر

۲۹) سید رضا حیدر بن سید شبیر حسین رضوی

۳۰) میر ضامن علی بن سید ہمت علی رضوی

پولیس افسران

۱) داروغہ سید احترام علی بن سید ہدایت علی رضوی (تھانیدار)

۲) سید احمد علی بن سید اشفاق علی نقوی (تھانیدار)

۳) سید اطہر علی بن سید احمد علی نقوی (ڈی ایس پی)

۴) سید اظہار الحسن بن داروغہ سید اظہر الحسن رضوی (تھانیدار)

۵) سید احسان حسین بن سید وصی احمد جعفری (تھانیدار)

۶) سید التماس حسین بن سید رستم علی جعفری (انسپکٹر)

۷) سید احمد حسین بن سید محمد حسین (تھانیدار)

۸) سید ابو محمد بن سید اشتہار حسین (تھانیدار)
۹) سید آغا سلطان بن سید سجاد حسین رضوی (ایس پی)
۱۰) سید امداد حسین (لوہامنڈی والے) (تھانیدار)
۱۱) سید اکرم رضا بن سید کاظم رضا رضوی (انسپکٹر)
۱۲) سید حسن احمد بن سید مصطفیٰ حسین رضوی (انسپکٹر)
۱۳) سید حسین بن سید اولاد حسین جعفری (انسپکٹر)
۱۴) سید حسن اکبر بن سید حامد حسین جعفری (انسپکٹر)
۱۵) سید حکمت علی بن سید قائم علی رضوی (تھانیدار)
۱۶) سید ذوالفقار حسین بن سید شجاعت حسین رضوی (انسپکٹر)
۱۷) سید فرخ حسین بن سید مردان علی جعفری (تھانیدار)
۱۸) سید دلدار رضا بن سید ذوالفقار حسنین رضوی (تھانیدار)
۱۹) سید داور حسین رضوی (تھانیدار)
۲۰) سید زوار حسین زیدی (کورٹ انسپکٹر)
۲۱) سید سیف الحسن (تھانیدار)
۲۲) سید شہنشاہ حسین بن سید ارشد حسین رضوی (انسپکٹر ایکسائز)
۲۳) سید علی رضا بن سید عباس علی رضوی (تھانیدار)
۲۴) سید علمدار حسین بن سید ذوالفقار حسنین رضوی (تھانیدار)
۲۵) سید علی اظہر بن سید مقصود الحسن جعفری (تھانیدار)
۲۶) سید علی اوسط بن سید سجاد حسین رضوی (انسپکٹر)
۲۷) سید علی بن سید محسن رضا رضوی (تھانیدار)
۲۹) سید عزیز الحسن بن سید صادق علی جعفری (کوتوال شہر)
۳۰) سید غضنفر حسین بن سید مرتضیٰ حسین رضوی (تھانیدار)

۳۱) میر قائم علی بن میر اکبر علی رسالدار (کوتوال شہر)

۳۲) سید مقصود الحسن بن سید علی حسن (ایس پی)

۳۳) سید محمد اطہر بن سید امیر حیدر بخت (تھانیدار)

۳۴) سید محمود علی بن سید منصور علی (کوتوال شہر جھانسی)

۳۵) سید مظاہر حسین بن سید وصی احمد جعفری (تھانیدار)

۳۶) سید محمود الحسن بن سید حامد حسین جعفری (انسپکٹر)

۳۷) سید محمد احمد بن سید علی محمد رضوی (تھانیدار)

۳۸) سید مرتضیٰ حسین بن سید علی حسین رضوی (تھانیدار)

۳۹) سید علی احمد جعفری (داروغہ)

۴۰) سید منظور حسین بن سید ابوالحسن جعفری

۴۱) سید نصیب احمد جعفری (تھانیدار)

۴۲) سید نظیر الحسن بن سید شجاعت حسین رضوی (تھانیدار)

۴۳) سید وصی احمد بن سید فرخ حسین جعفری (انسپکٹر)

وکلاء

۱) سید ابو طالب بن سید احفاد حسین جعفری

۲) سید ابو حامد بن سید ابو طالب جعفری

۳) آغا سید محمود الحسن بن سید عترت حسین

۴) سید ال حسن بن میر ضامن علی رضوی

۵) خان بہادر سید امداد علی بن سید یعقوب علی جعفری

۶) سید امام علی بن سید اکبر علی رضوی

۷) سید دائم علی رضوی بن میر اکبر علی رسالدار

۸) سید سبط احمد بن سید احمد حسین

۹) سید ساجد رضا بن سید عابد رضا رضوی

۱۰) سید صابر حسین بن سید جعفر حسین نقوی

۱۱) سید علی شیر بن الحاج سید اسرار حسن رضوی

۱۲) سید علی مظاہر بن ڈاکٹر سید علی عبداللہ جعفری

۱۳) سید علی اسلم بن سید علی مظاہر جعفری

۱۴) سید غلام علی احسن بن سید بنیاد علی

۱۵) سید کاظم حسین بن سید غلام حسین جعفری

۱۶) سید ناظم حسین بن سید کاظم حسین جعفری

۱۷) سید ناصر عباس بن ڈاکٹر سید انصار حسن رضوی

۱۸) سید مرتضیٰ حسین بن سید انتظام علی جعفری

۱۹) سید محمد بن سید مصطفیٰ حسین جعفری

انجینئرز

۱) سید حسین حمزہ بن سید شہر مہدی جعفری

۲) مومن علی (میر تراب علی رضوی کے خاندان سے وابستہ

۳) سید ابوالحسن بن آغا سید ابوالقاسم رضوی

۴) سید خورشید حسنین بن میر مومن علی

۵) سید محمد عباس بن سید ناصر عباس رضوی

۶) سید گوہر مہدی بن سید انتظار رضا رضوی

۷) سید کامران رضا بن سید انتظار رضا رضوی

۸) سید انتظار علی بن سید جرار حسین جعفری

۹) سید محمود احمد بن سید محمد احمد نقوی

۱۰) سید مظہر عباس زیدی

۱۱) سید جواد حسین بن ڈاکٹر سید مختار حسین جعفری

۱۲) سید حسن بن محسن بن سید محسن رضا

۱۳) سید علی مہندی بن سید علام رسول

۱۴) سید حامد حسین بن سید مرتضیٰ حسین زار

۱۵) مرزا احمد علی بن مرزا محمد علی (سپرنٹنڈنگ انجینئر)

۱۶) سید علی غضنفر بن الحاج سید اسرار حسن رضوی (کینیڈا)

۱۷) سید انتظار مہدی بن سید دلدار رضا رضوی (امریکہ)

۱۸) سید محمد غازی بن سید تہذیب الحسن رضوی

۱۹) سید علی عابد جعفری مرحوم

۲۰) سید نہال احمد بن سید کلب احمد رضوی

۲۱) مرزا عباس علی بن مرزا محمود علی ایرانی

۲۲) سید شفیق احمد بن سید الثقلین رضوی

۲۳) سید تقی رضا بن سید یاور حسین جعفری

۲۴) سید ظفر رضا بن سید یاور حسین جعفری

۲۵) سید عباس احمد بن سید حسن احمد جعفری

۲۶) سید علی ناصر بن سید داور حسین جعفری

۲۷) سید مصاحب رضا بن ڈاکٹر سید ناصر حسین جعفری

۲۸) سید ساجد رضا بن ڈاکٹر سید ناصر حسین جعفری

۲۹) سید شاہد رضا بن ڈاکٹر سید ناصر حسین جعفری

۳۰) سید خورشید رضا بن ڈاکٹر سید ذاکر حسین جعفری

۳۱) سید مظاہر حسین بن سید داور حسین جعفری

ڈاکٹرز

۱) سید محمد احسن بن سید آل مصطفیٰ رضوی

۲) سید علی سجاد بن سید زین العابدین

۳) سید حسن بن سید احمد رضوی

۴) سید محمود الحسن بن سید مہدی حسن رضوی (پولیس سرجن کراچی)

۵) سید محمد حسن بن ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی (بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر امراض چشم)

۶) سید نیر رضا بن سید افتخار رضا رضوی ناز (مقیم امریکہ)

۷) سید آل ضامن بن سید آل نبی رضوی (سول سرجن کراچی تھے)

۸) سید ضیاالحسن بن سید اقبال مند علی رضوی (سول سرجن تھے)

۹) سید محمد احسن بن ڈاکٹر سید غفار حسین جعفری (مقیم نیو جرسی امریکہ)

۱۰) سید اقتدار حسین بن سید سرکار حسین جعفری

۱۱) سید شاہ حسین بن سید جرار حسین جعفری

۱۲) سید ظفر حسین بن سید حسین احمد زیدی

۱۳) سید انصار حسن بن سید مثنیٰ حسن رضوی

۱۴) سید غضنفر حسین ابن سید ابوالحسن

۱۵) سید غفار حسین جعفری بن سید زوار حسین عرف بدھا

۱۶) سید منظور الحسن بن سید مہدی حسن جعفری

۱۷) سید اسرار حسن عرف نواب حسن بن ڈاکٹر منظور الحسن جعفری

۱۸) سید حسن رضوی بن سید حسین رضوی عرف مولوی بھائی

۱۹) سید علی رضا بن سید رضا رضوی

۲۰) سید علی اوسط بن سید محسن رضا رضوی (ہومیو پیتھی کے بڑے معالج)

۲۱) سید علی عامر بن سید ابراہیم نفیس (مقیم امریکہ)

۲۲) سید علی عبداللہ جعفری (ماہر امراض دماغ)

۲۳) سید نوید احمد بن سید کلب احمد رضوی

۲۴) سید ندیم احمد بن سید کلب احمد رضوی

۲۵) ڈاکٹر سید آغا ظافر رضوی (محلہ تاج گنج آگرہ والے)

۲۶) سید ظفر حسین جعفری (سول سرجن)

۲۷) سید ندیم الحسن بن سید محمود الحسن رضوی (مقیم حال کینیڈا)

۲۸) سید ضامن رضا بن سید ذاکر حسین جعفری

بنیک اور مالیاتی اداروں کے افسران

۱) سید ببر حسن بن سید علی احمد رضوی (آڈیٹر حبیب بنیک)

۲) سید جواد احمد بن سید محمد خضر جعفری (افسر پاکستان انشورنس کارپوریشن

۳) سید حبیب احمد بن آغا سید ابوالقاسم رضوی (مینجر بنیک)

۴) سید حمید احمد بن وکیل سید رفیق حسین رضوی (وی پی)

۵) سید حفاظت حسین بن سید محمد ادریس جعفری (افسر اسٹیٹ بنیک)

۶) سید سلطان احمد بن سید محمد احمد رضوی (وی پی)

۷) سید سرکار حسین بن ڈاکٹر سید غفار حسین جعفری / (اسسٹنٹ ڈائریکٹر زرعی بنیک)

۸) سید شبیہ حیدر بن سید اسرار حسین جعفری / (وی پی)
۹) سید عادل حسین بن سید شریف الحسن جعفری / (افسر بینک)
۱۰) سید غلام حسین عرف علی ظہیر بن سید مظاہر حسین جعفری (ایس اے وی پی)
۱۱) سید علی تجمل بن سید شبر مہندی جعفری (اے وی پی)
۱۲) سید علی ظفر بن سید علی زائر رضوی (وی پی)
۱۳) سید قمر رضا بن شیخ سید سجاد حسین (اے وی پی)
۱۴) سید کوثر مہدی بن سید غفار حسن رضوی (افسر بینک)
۱۵) سید محسن رضا عرف خورشید بن سید حسن بن محسن (افسر بینک)
۱۶) سید محمد عباس بن سید علی قیصر زیدی (آڈیٹر الائیڈ بینک)
۱۷) سید محمد علی نقوی بن سید موسیٰ رضا نقوی (بینک افسر)
۱۸) سید نواب اختر بن داروغہ سید ابو محمد (اے وی پی)
۱۹) سید سبط احمد جعفری عرف بابو (بینک مینجر)
۲۰) سید قاسم حسن بن ماسٹر سید اکبر حسن رضوی (افسر زرعی ترقیاتی بینک)

دیگر اہم اور نمایاں شخصیات

۱) سید امان علی بن سید حسین رضوی بڑے مخیر اور فیاض تھے بابو گنج آگرہ میں اناج کی بڑی منڈی تھی جس کا ایک حصہ غریبوں میں مفت بانٹ دیتے تھے۔

۲) سید آل نیاز بن خان بہادر سید آل نبی رضوی (انکم ٹیکس آفیسر اور لیکچرار رامپور کالج)

۳) سید امیر حیدر بخت بن سید صادق حسین رضوی (فن مختصر نویسی میں ماہر

۴) سید ابوالحسن بن آغا سید ابوالقاسم رضوی (ڈپٹی سکریٹری حکومت سندھ)

۵) آغا سید محسن جعفری (رضویہ سوسائٹی کے صدر رہے اور پاکستان کے ابتدائی زمانے میں سادات پہر سر کی آبادکاری میں نمایاں رہے)

۶) سید آل حیدر بن خان بہادر سید آل نبی رضوی (ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمیات کراچی)

۷) سید آل امام (کونسلر)

۸) آغا سید قمر حسین بن آغا سید محمد حسنین (دینی اور سماجی رہنما تھے)

۹) سید اوصاف رضا عرف رجن بن سید ضرغام حسین جعفری (دینی اور سماجی کارکن)

۱۰) سید انتظار حسین بن سید اسرار حسین جعفری (ڈپٹی مینجر سیکورٹی پرنٹنگ پریس)

۱۱) سید محمد فاضل بن محسن رضا جعفری (اعلیٰ انجینئر ڈاک)

۱۲) مرزا فرخ علی بن مرزا امجد علی (گارمنٹ فیکٹری کے مالک)

۱۳) سید جواد حسین بن سید طالب علی رضوی (ماہر تعمیرات لارنس ڈاؤن برج سکھر کی تعمیر کے نگران تھے)

۱۴) سید حسن محمود رضوی بن سید محمود اکبر آبادی (اسسٹنٹ کلکٹر کسٹمز)

۱۵) حکیم سید حسنین رضا بن آغا سید ابوالقاسم رضوی (ہمدرد فاؤنڈیشن سے وابستہ رہے ہیں اور اکثر حکیم محمد سعید دہلوی کی نیابت کرتے ہیں)

۱۶) سید حیدر رضا بن ڈاکٹر سید ناصر حسین جعفری (اکاونٹس آفیسر)

۱۷) سید حسن رضا بن سید ببر علی رضوی (اکاونٹنٹ محکمہ انہار اور سب رجسٹرار)

۱۸) سید ذوالفقار حسین عرف لالہ بن سید افتخار حسین جعفری (اسسٹنٹ ڈائریکٹر رجسٹریشن)

۱۹) سید رشید حیدر بن سید بشیر حیدر رضوی (جامعہ امامیہ کے ٹرسٹی ، سیاسی مفکر)

۲۰) سید دلیر حیدر بن سید ناظم حسین رضوی (بانی و صدر حسینی اسکاوٹس)

۲۱) سید ریاض احمد بن سید آل مصطفیٰ رضوی (سب رجسٹرار)

۲۲) سید شریف احمد بن سید حسن احمد جعفری (ڈپٹی ڈائریکٹر ملٹری آڈٹ)

۲۳) سید سجاد حیدر بن سید شریف احمد جعفری (ریسرچ آفیسر سائنس کینوپ)

۲۴) سید شمس العباد بن ڈاکٹر سید زین العباد جعفری (عظیم سیاسی و سماجی کارکن)

۲۵) سید عشرت صالح بن سید محمد صالح زیدی (عشرت آرکیڈ کے مالک اور دینی و سماجی کارکن)

۲۶) سید سلطان حیدر وسبحان حیدر اور رضوی برادران (مقدس آرکیڈ کے مالک)

۲۷) مرزا شجاع علی بن مرزا امجد علی (امریکہ میں ہوٹل کے مالک)

۲۸) سید ابراہیم نفیس اور سید فرقان حیدر بن سید مقدس رضوی (فلم اور ڈرامہ سے وابستہ)

۲۹) سید صفدر حسین بن سید حیدر حسین نقوی (اسٹیٹ آفیسر کراچی)

۳۰) سید ظفر علی شہید (جنگ گھاسیرہ نزد بہانہ کے ایک ممتاز ہیرو تھے)

۳۱) سید علی اوسط بن سید جواد حسین رضوی (انسپکٹر آف اسکولز میرٹھ اور ریاضی کے ماہر معلم تھے)

۳۲) سید علی جرار بن سید زوار حسین رضوی عرف جھبو (مسلم لیگ نیشنل گارڈز آگرہ کے سالار رہے)

۳۳) سید علی مختار رضوی (مشہور طالب علم رہنما اور سیاسی لیڈر)
۳۴) سید عظمت رضا شاہ بن سید احسن رضا جعفری (مخدوم زادہ سید حسن محمود کے سکریٹری رہے)
۳۵) سید عرفان حیدر بن سید علی مقدس رضوی (کعبہ کی اندرونی تعمیر نو آپ کی نگرانی میں ہوئی)
۳۶) سید علی کوثر بن سید علی جان رضوی (انسپکٹر الیکٹریکل سندھ)
۳۷) سید علی اطہر بن سید محمد رضی جعفری (سکریٹری کے ڈی اے)
۳۸) سید علی جان بن سید صادق حسین رضوی (سب رجسٹرار)
۳۹) سید ضیاء الحسن بن سید آل سبطین رضوی (کونسلر)
۴۰) سید علی غضنفر بن سید شوکت حسین (کونسلر)
۴۱) سید علی مردان شاہ بن سید غفار حسین جعفری (کونسلر اور جسٹس آف پیس)
۴۲) سید عالم علی بن ماسٹر سید ابن رضا نقوی (کونسلر)
۴۳) سید علی مظاہر بن سید شوکت حسین (ہوٹل لارڈز کے مالک)
۴۴) سید علی حیدر بن سید اسرار حسین جعفری (ریسرچ آفیسر زراعت)
۴۵) سید لطافت علی عرف صدرو (شاہ گنج آگرہ کے عہد آخر کے محقق بزرگ تھے)
۴۶) سید لئیلاف حسن بن سید محمد ابراہیم (کمشنر آگرہ کے ہیڈ اسسٹنٹ)
۴۷) سید کلب حسن بن سید حسن علی رضوی (عظیم کرکٹر اور باولر تھے)
۴۸) سید کاظم رضا بن سید تراب علی رضوی (بانی و مہتمم ہائی اسکول چکوال)
۴۹) سید محمد مہدی بن سید وقار حسن رضوی (اسسٹنٹ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ٹی اینڈ ٹی اسلام آباد)
۵۰) سید مقصود الحسن بن سید آل حسن (ڈائریکٹر ایکورنیم کلفٹن)

۵۱) سید محمد مقصود بن سید محسن رضا رضوی عرف جمعہ (بڑے عزادار تھے اور انجمن پنجتنی آگرہ کے تاحیات جنرل سکریٹری رہے)۔

۵۲) سید مقرب حسین بن سید حسن علی رضوی (دہلی میں ایک جنگ حق و باطل میں شہید ہوئے اور اوکھلا میں مزار ہے)

۵۳) سید محمد نصیر بن سید محمد قدیر رضوی (پاسپورٹ آفیسر)

۵۴) سید محسن رضا عرف جمعہ بن سید حسن رضا رضوی (گنہ فوجی اسکول کے صدر مدرس تھے ترک موالات تحریک میں استعفیٰ دیدیا تھا)

۵۵) مرزا محمود علی ایرانی (آگرہ و کراچی کے مشہور عکاس اور انجمن پنجتنی آگرہ کے بانیوں میں تھے)

۵۶) سید مظاہر حسن رضوی بن سید علی فضیل رضوی (SDOT)

۵۷) سید مظہر حسین عرف ابن حسن بن داروغہ سید نظیر الحسن رضوی (افسر سیکوریٹی پرنٹنگ پریس)

۵۸) سید نسیم احمد بن سید آل احمد رضوی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر پی ٹی سی اسلام آباد رہے)

۵۹) سید وسیم احمد بن سید آل احمد رضوی (کسی جہاز ران کمپنی میں ریڈیو آفیسر)

۶۰) سید علی اعلیٰ عرف پپو بن سید علی عین اللہ رضوی (کسی جہاز راں کمپنی میں کپتان)

۶۱) سید جعفر جعفری بن سید محمد علی جعفری (حکومت پنجاب کے ڈپٹی سکریٹری رہے)

۶۲) سید اصغر عباس ابن ڈاکٹر سید انصار حسین رضوی مرحوم (ڈپٹی ڈائریکٹر صنعت)

حوالہ جات

سادات آگرہ و نواح کی قدآور ممتاز ہستیوں کی بابت درج ذیل کتابوں، رسالوں اور جریدوں سے اخذ کردہ کوائف پیش کئے گئے ہیں۔

۱) بدر مشعشع علامہ مجلسی
۲) بہشت مشرق مطبوعہ تہران ۱۹۶۴ء
۳) انوار قم مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء
۴) مطلع انوار از مولانا مرتضیٰ حسین فاضل
۵) کنز الانساب علامہ اجل سید مرتضیٰ علم الہدیٰ
۶) لطائف اشرفی جلد ۱
۷) مختصر تاریخ ہند۔ ابو ظفر ندوی
۸) قدیم تاریخ راجستھان للتا پرشاد میرٹھی / کرنل ٹوڈ
۹) مشاہیر اکبرآباد۔ مفتی انتظام اللہ شہابی
۱۰) منتخب التواریخ ملا بدایونی
۱۱) مرقع اکبرآباد سعید احمد مارہروی
۱۲) بیانہ۔ ایک قدیم تاریخی بستی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
۱۳) تاریخ بلدہ بیانہ۔ سید علی رضا جعفری بیانوی
۱۴) تاریخ سادات بھرتپور۔ تحصیلدار از ظہیر الحسن رضوی
۱۵) تاریخ سادات و مومنین شاہ گنج آگرہ قلمی۔ داروغہ سید احترام علی رضوی (جلد دوئم)

۱۶) تجلیات فکر (سلور جوبلی نمبر انجمن پنجتنی آگرہ) مطبوعہ کراچی محرم ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۸ء

۱۷) سلطان محمد غوری - از حاجی سید جعفر حسین بن سید غلام حسین

۱۸) طبقات ناصری جلد ۱ / ۲ از منہاج سراج

۱۹) ماہنامہ شورہ آگرہ ، شمع آگرہ ، الناظر آگرہ ، شیعہ مجوہ (بہار) کے مختلف شمارے

۲۰) تاریخ اثنا عشری شیعان ہند (انگریزی) جلد ۱ / ۲ ترجمہ سید کاظم مہدی جعفری مقیم حال کینیڈا

مالی مددگاران

یہ میرے ان قرابت داروں کی فہرست ہے جن کے عطیات نے اس کتاب کی طباعت واشاعت کو ممکن بنادیا ہے۔

(۱) جناب سید رضوان حیدر
(۲) جناب سید عرفان حیدر
جناب سید سلطان حیدر
جناب سید ریحان حیدر
ابن سید علی مقدس رضوی مرحوم

(۵) جناب سید رضا مہدی
(۶) جناب سید کوثر مہدی
ابن سید غفار حسن رضوی

(۷) جناب سید منتظر مہدی
(۸) جناب سید باقر مہدی
ابن سید حسن محمد رضوی

(۹) جناب سید ناصر عباس
(۱۰) جناب سید اصغر عباس
ابن ڈاکٹر سید انصار حسن رضوی مرحوم

(۱۱) جناب سید حسن عمران — ابن مولوی سید محمد اسد رضوی مرحوم

(۱۲) جناب سید حسن عابد — ابن سید حامد حسین رضوی مرحوم

(۱۳) جناب سید اختر رضا جعفری — ابن سید عظمت رضا شاہ جعفری

(۱۴) جناب ڈاکٹر سید محمود حسنین — ابن حکیم سید حسنین رضا رضوی

(۱۵) جناب سید گوہر مہدی
(۱۶) جناب ڈاکٹر سید نیر رضا
(۱۷) جناب سید کامران رضا
(۱۸) جناب سید عامر رضا
ابن سید انتظار رضا ناز

مولف کے معاونین خصوصی

اس کتاب کی تدوین و تالیف کے ضمن میں ان حضرات کی خصوصی معاونت ناقابل فراموش ہے جس کے بغیر اس کتاب کی پیشکش اس پر شکوہ انداز میں ممکن نہ ہوتی۔

۱) سید محمود الحسن رضوی مرحوم ابن ماسٹر سید منظورالحسن رضوی شہید پاکستان میں ملت جعفریہ کے ممتاز دانشور، منفرد مجاہد اور نامور ترجمان و مصنف تھے۔ اس کتاب کی تالیف میں مرحوم کی مسلسل معاونت و مشاورت مولف کے لئے بے بہا اثاثہ تھی اور کتاب کے اعلیٰ معیار و منزلت کی ضامن بھی۔

۲) سید حسن مشیر ابن ڈاکٹر سید علی اوسط رضوی مرحوم تاریخی کتب اور حوالہ جات فراہم کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ بذات خود ایک جیتی جاگتی لائبریری ہیں۔ موصوف کے تعاون و مدد نے کتاب کی قدروقیمت بڑھائی ہے۔

۳) سید اختر رضا جعفری ابن سید عظمت رضا شاہ

صحافی ہیں نیز کئی اخباروں اور جریدوں کے سب ایڈیٹر ہیں۔ موصوف نے کتاب کے آخری مرحلہ تدوین میں مولف کا بڑا ہاتھ بٹایا اور قابل رشک خدمات انجام دی ہیں۔

تصحیح نامہ Corrigendum

نمبر شمار	صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۱	۱۰	۱۸	معملہ	معاملہ
۲	۱۰	۱۸	دشوار وپچیدہ	دشوار وپیچیدہ
۳	۱۷	۶	درج حضرات	درج ذیل حضرات
۴۔	۱۷	۹	ابتداوائے کار	ابتدائے کار
۵	۳۳	آخری	ابو طالب	ابو طالب، عبداللہ
۶	۵۳	۱۶	جماعتکا	جماعت کا
۷	۶۲	۷	تمہرا	تمہارا
۸	۷۰	۳	مکروفرین	مکروفریب
۹	۱۰۹	۳	الصفات	الصفت سورۃ ۳۷
۱۰	۱۲۷	۱۴	بنو تیم	بنو تمیم
۱۱	۱۳۰	۱۱	مطلق	متعلق
۱۲	۱۶۱	۱۲	السی	الغی
۱۳	۱۷۹	۱۵	دیل	دیول
۱۴	۱۸۷	۸	انلایا و نیز فریڈم	انڈیا و نز فریڈم
۱۵	۲۱۱	۲۰	دستویزات	دستاویزات
۱۶	۲۱۳	۶	تعلیمی	تعلیمی
۱۷	۲۵۲	۱۱	(حوالہ) اردو	اودھ
۱۸	۲۵۳	۸	ٹروث	ٹورسٹ
۱۹	۲۶۲	۲	اوویس	اور اویس
۲۰	۲۶۲	۱۷	اوذکر	اول الذکر

نمبر شمار	صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۲۱	۲۸۰	۱۷	تباکو	ٹوبیکو
۲۲	۲۹۲	۶	ڈیجنٹ	ڈیجنٹ چچہ
۲۳	۳۰۸	آخری	ویٹنری	ویٹرنری
۲۴	۳۱۰	۸	چشمووچراغ	چشم وچراغ
۲۵	۳۱۴	آخری	یزد	یزید
۲۶	۳۲۵	۱۸	جہاجہانیاں	جہاں جہانیاں
۲۷	۳۲۵	۱۹	قندر	قلندر
۲۸	۳۳۱	۱۷	انگیزوں	انگریزوں
۲۹	۳۳۹	۹	۲۰ مرحم	۲۰ محرم
۳۰	۳۴۱	۴	اکھارے / لتوار	اکھاڑے / تلوار
۳۱	۳۴۱	۱۶	اقریری	فقیری
۳۲	۳۴۲	۱۵	بنی	بندھی
۳۳	۳۴۶	۱	اعتار	اعتبار
۳۴	۳۴۶	۲	تعیہ	تعزیہ
۳۵	۳۴۸	۷	ساتیوں	ساتویں
۳۶	۳۴۸	۲۲	آلفدی	آفندی
۳۷	۳۴۹	۲۲	تعزیروں	تعزیوں
۳۸	۳۵۰	۹	پنچ	پہنچ
۳۹	۳۵۵	۳	استعقا	استسقاء
۴۰	۳۶۱	۱۳	دستم	اہتمام

نمبر شمار	صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط لفظ	صحیح لفظ
٣١	٣٦٨	آخری	لانفیک	لاینفک
٣٢	٣٧٢	١٣	مسجیں	مسجدیں
٣٣	٣٧٣	١٥	باستثنائے	بااستثنائے
٣٤	٣٧٧	٣	نذر	نظر
٣٥	٣٧٨	١٦	منذر	منظر
٣٦	٣٨٠	٣	ذوالجنح	ذوالجناح
٣٧	٣٨١	٢١	بچتے	پہنچے
٣٨	٣٨٣	٧	پتنگ	پچکے
٣٩	٣٨٣	آخری	منظر	منتظر
٥٠	٣٨٣	١٩	ربیع الاول ترک	ربیع الاول تک ترک
٥١	٣٨٧	١٩	صاحب فرمائی	صاحب نے فرمائی
٥٢	٣٨٩	١٣	دو جن	دو درجن
٥٣	٣٩٢	٧	فی الاخبار پتمور	فی الاخبار تیمور
٥٤	٣٩٧	٢	موضوع	موضع
٥٥	٤١٣	٢	منزل	منزلت
٥٦	٤٥٨	١٣	مشیوں	مثنویوں
٥٧	٤٧٦	٦	١٩٩٣ء میں وفات پائی	١٩٩٣ء میں قم میں وفات پائی
٥٨	٤٨٩	١٦	اقیم الصواۃ	اقیم الصلواۃ
٥٩	٥٠١	٣	بھرتپور اور مطربی	بھرتپور، دھولپور اور مطربی
٦٠	٥٠٧	١٨	امین المک	امین الملک

نمبر شمار	صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۶۱	۵۰۸	۱۵	دستیاب	نایاب
۶۲	۵۰۹	۱۹	لے لیجانے	لے جائی جانے
۶۳	۵۱۲	۱۱	مہان	مہمان
۶۴	۵۱۷	۱۰	تفضمین	تضمین
۶۵	۵۲۴	۱۸	ہر بار چٹی میں	ہر بار چٹکی میں
۶۶	۵۲۵	آخری	بم دانی	بسہ دانی
۶۷	۵۳۱	آخری	تصانیف اور	تصانیف روح نظیر اور
۶۸	۵۳۸	۱۵	مبتتم	مبتسم
۶۹	۵۳۹	۱۴	مستدی	مستعدی
۶۹	۵۷۱	۲	پنٹگ	پنٹنگ
۷۰	۵۷۱	۲	حیدر برنی	حیدر مہدی برنی
۷۱	۵۷۳	۶	علیرضوی	علی رضوی
۷۲	۵۷۳	۶	پی ایچ لای	پی ایچ ڈی
۷۳	۵۷۳	۷	حامد رضی	حامد رضوی
۷۴	۵۷۵	۹	جیلسیر	جیسلمیر
۷۵	۵۷۵	۱۰	حسنین	حسین
۷۶	۵۷۷	۱۵	اسکواڈ	اسکواڈرن
۷۷	۵۸۱	۹	مولوی بڈا	مولوی بڈا
۷۸	۵۸۲	۱۳	روح نظر، مشرق تاباں اور صحفیہ اردو	روح نظیر، مشرق تاباں اور صحیفۂ اردو
۷۹	۵۸۳	۱۳	جعری	جعفری
۸۲	۵۹۳	۱۹	بھانہ	بیانہ

کاروانِ تجلی سادات کی کیفیت سفر و قیام